ماهنامه
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
فروری 2017
معراج رسول
FEB-2017 PRICE RS. 60
REGD. NO. MC-13
Monthly JASOOSI DIGEST

جلد 47 • شمارہ 02 • فروری 2017ء
زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200

فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021)
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا
مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیراعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم

سال کا دوسرا شمارہ آپ کی نذر ہے۔ عالمی منظرنامے میں اپنی جائز و ناجائز پسند کے رنگ بھرنے کے مریض یعنی امریکا کے نئے متعصب صدر کے خلاف دنیا بھر میں مرد و زن سڑکوں پر آگئے ہیں۔ ٹرمپ ”پہلے امریکا“ کے نعرے لگا کر چین کے خلاف صف آرا ہوا ہے کہ ہر مشقت طلب صنعتی شے چین سے درآمد ہو رہی ہے۔ چین کے سستے اور محنتی مزدوروں کے مقابلے میں عیش کوش امریکیوں کو دہکتی بھٹیوں کے سامنے فولاد کوٹنے پر ٹرمپ تو کیا، کوئی بھی آمادہ نہیں کر سکے گا پھر اس نے دہشت گردی کو کھلے الفاظ میں خود ساختہ اسلامی انتہا پسندی سے منسلک کر کے جملہ مسلمانوں کے دلوں میں اشتعال، غصے اور نفرت کو ہوا دی ہے۔ عورتوں کے بارے میں بد کلامی اور بودے کلمات کے خلاف دنیا کے ساٹھ ملکوں میں خواتین جس بڑی تعداد میں سڑکوں پر آئی ہیں، وہ ٹرمپ کے خلاف ان کی نفرت کا کھلا اظہار ہے لیکن بہرحال وہ امریکا کا منتخب صدر ہے۔ اسے امریکیوں ہی نے نہ صرف اپنے سروں پر بلکہ دنیا پر مسلط کیا ہے۔ بربنائے عہدہ وہ ہولناک سیاہ بریف کیس بھی اسی ارب پتی ریسلر کے ہاتھ آگیا ہے جس کو وائٹ ہاؤس کے پُرپیچ گلیاروں میں فٹ بال کے کوڈ نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسے استعمال کر کے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں موجود امریکی ایٹمی ہتھیاروں کو چشم زدن میں اپنے منتخب نشانوں پر برسا سکتا ہے۔ یہ سب عالمی صورتِ حال ہے۔ ہم بحیثیت مسلمان اور پاکستانی...... صرف امید ہی کر سکتے ہیں کہ صدر موصوف اپنے انتہا پسندانہ انتخابی نعروں کو فراموش کر کے وہی راہ اختیار کریں گے جو عالمی امن اور رواداری کے فروغ میں بھرپور مدد دے سکے۔ امریکا کی صدارت میں ریسلنگ کے ہنر آزمائے گئے تو یہ اس ملک اور وہاں بسنے والی قوم کی بدقسمتی ہوگی۔ ان خوش گمانیوں کے ساتھ چلتے ہیں اپنے اکھاڑے میں جہاں زبردست قلمی ریسلنگ ہو رہی ہے۔

سندیلیانوالی سے وارث علی کی خواہش ”نئے سال کا شمارہ 28 دسمبر کو جب ملا تو دل نہال ہوگیا۔ ٹائٹل پر لکھا 2017ء کا مبارک نامہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ حسبِ معمول پڑھنے کا آغاز انگارے سے کیا۔ قسطینا اور شاہ زیب کے لیے کیا کہیں، بہت زبردست طریقے سے رائے زل کے ساتھیوں کو تباہ و برباد کرنے انہی کے کلب میں جا پہنچے۔ قسطینا کو جس کی تلاش تھی وہ تو نہ ملا البتہ جتنا ان لوگوں کا نقصان کیا وہ لائقِ تحسین ہے۔ افغانی کی شکل میں ایک اور دشمن سامنے آچکا ہے جو آئندہ قسط میں دیکھیں کہ کس کو چارے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ دوسرے نمبر پر آوارہ گرد پڑھی۔ شہزی آخرکار بہت سے مصائب کے بعد اپنے ساتھیوں تک جا پہنچا۔ جن کا حال بھی وہاں کے قبائلیوں جیسا ہی ہو چکا ہے۔ سوشیلا بدستور غائب ہے۔ حسام بٹ کی اولین صفحات پر برعکس پڑھی۔ اس کا اختتام توقع کے مطابق ہی ہوا کہ شوہر کو مارنے میں بیوی کا ہی ہاتھ ہوگا ساتھ میں مجھے لگ رہا تھا کہ مراد نور پاشا ہی ہوگا جو کہ غلط اندازہ تھا میرا۔ بہرحال سلمٰی کو اندھی خواہشوں اور ہوس پرستی نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ اچھی تحریر تھی مگر موضوع پرانا ہی تھا۔ رنگوں میں زویا اعجاز نے دل خوش کر دیا۔ پل پل رنگ بدلتی تحریر جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھی۔ معیز بے خبری میں ارسلان کو مار کر بہت بڑا کام کر گیا جس کی خبر اسے بعد میں ملی۔ نمرہ کے ساتھ ارسلان اور جمی نے جو کیا اس کے بدلے کے طور پر ارسلان کو تو بہت آسان موت مل گئی۔ ملک دشمن عناصر کے خلاف اور ان کی سازشوں کا پردہ چاک کرتی تحریر حب الوطنی کا جذبہ ابھار رہی تھی۔ سجاد نے بہت زبردست طریقے سے بدلہ لیا۔ لیکن افسوس کہ سب دشمنوں کو نیست و نابود نہ کر سکا جو اپنے ملک میں بیٹھ کر ابھی تک انہی سازشوں میں مصروف ہیں۔ اسما قادری بہت عرصے بعد اپنا پرل گروپ لے کر آئیں اور چھا گئیں۔ پرل گروپ کے ساتھ ہی شامی، تیمور اور جلیل راجا وغیرہ کردار نجانے کیوں یاد آگئے، آہ! خیر رگِ جاں شوبز کی چکاچوند روشنیوں کے بیچ ہونے والے حالات کو بیان کرتی اور رشتوں کی نزاکت کو بیان کرتی ایک زبردست تحریر تھی۔ تمکین رضا کی وفادار میں فلپ نے جان پر کھیل کر خود پر لگا خود غرضی اور بے پروائی کا لیبل ہٹا کر وفادار لکھوایا۔ بہت اچھی تحریر تھی۔ پروین زبیر کیوں نہیں آرہیں نہ ہی مریم کے خان ہیں: ان کی منت کریں جی کہ کوئی کہانی لکھیں۔ (پروین زبیر سے جلد ملاقات ہو رہی ہے آپ کی) مغربی کہانیاں کچھ خاص اثر نہ ڈال سکیں۔ کالی زندگی، اکھاڑا، پیغام اور فنکار بس گزارے لائق ہی رہیں۔ تبصرے سب کے جاندار تھے۔ منصور حبیب پلیجو کو کرسیِ صدارت کی مبارک جبکہ بہاولپور سے مومنہ کشف کو خوش آمدید۔ بہنا جی! ہر ماہ آیا کریں اپنے تبصرے کے ساتھ۔ طاہرہ گلزار اس دفعہ کالی فہرست میں بھی نہ تھیں حیرت ہوئی، آپا جی جلدی آئیں۔ آپ لوگوں سے پوچھنا تھا کہ پروین زبیر جاسوسی میں لکھتی تھیں کیا وہی ہیں جو آج کل اخبارِ جہاں میں خواب نگر لکھ رہی ہیں۔ لگتا ہے وہی ہیں آپ تصدیق کر سکتے ہیں؟“ (جی ہاں۔ آپ کے سوال کا جواب ہے)

خیرپور میرس سے فراز سومرو کی ممنونیت ”نئے سال کا شمارہ غیر متوقع 27 دسمبر کو ملا۔ ٹائٹل پر حسینہ کو پستول تھامے گھورتے ہوئے پایا۔ اوپر ہینڈسم نوجوان غیر مرئی دیوار سے ٹیک لگائے ہراساں دکھائی دیا۔ فہرست پر سرسری نظر ڈال کر دوستوں کی محفل کا رخ کیا۔ اداریہ پڑھا، بات ہو رہی تھی کرکٹ کی، ہار جیت ہی تو ہوتی ہے کھیل کے اختتام پر بس گیم یکطرفہ نہ ہو، مسندِ صدارت پلیجو بھائی سنبھال رہے تھے، اچھا تبصرہ تھا، محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ بہترین رہا، پرویز احمد لانگاہ، لیلیٰ کوثر لاشاری، ماہ تاب گل اور اے ایچ کاظمی بھائی کو خط شائع ہونے پر مبارک باد۔ حسبِ عادت مطالعے کا آغاز مغل انکل کی انگارے سے کیا۔ قسطینا اور شاہ زیب کا ساتھ، کلب کی تباہی، بنکر میں مخدوش سچویشن، افغانی سے پہلی ملاقات ہی ناخوشگوار رہی۔ آوارہ گرد میں

شہزی بھی خوب ایکشن میں رہا، ہم تو پہلے سے ہی فین ہیں ڈاکٹر صاحب کے۔ ایک مدت بعد استاد نرالے کی انٹری اچھی رہی، بعید از قیاس میں تھامس کو ہوشیاری لے ڈوبی، اسفندیار کی فنکار میں بلیئر جذبات پر قابو نہ رکھ سکا، اکھاڑا میں کارمن کارنامہ انجام دے کر بھی پس پشت رہ گیا، وفادار میں فلپ واقعی وفادار نکلا، پہلا رنگ تاوان کا ایک ایک لفظ بڑے سلیقے سے پرویا گیا تھا۔ کہانی متوسط طبقے کے سیدھے نوجوان اور ملکی حالات کی مکمل عکاسی کرتی نظر آئی۔ آخر تک کہانی نے اپنا سحر قائم رکھا۔ غالباً زویا اعجاز کی پہلی تحریر ہے جاسوسی میں؟ (جی نہیں، دوسری کاوش تھی) کبیر عباسی اور زویا اعجاز بہترین اضافہ ہیں جے۔ ڈی۔ پی کے لیے۔ نواب انکل، کاشف زبیر، مختار آزاد کے بعد سلیم فاروقی کے انتقال کی خبر افسردہ کرگئی۔ گیارہ سال سے خاموش قاری ہوں، فیس بک آفیشل منظر سلیم ہاشمی کی ہمت افزائی سے خط لکھ رہا ہوں، ادارے سے بھی حوصلہ افزائی کی امید ہے۔'' (یقیناً آئندہ بھی حوصلہ افزائی ہو گی۔ آپ کی آرا کے منتظر رہیں گے)

مانسہرہ سے اے۔ ایچ کاظمی کی باتیں '' جاسوسی اس بار 6 جنوری کو ملا اسی دن فیس بک پر پڑھا کہ سلیم فاروقی چل بسے ہیں۔ بہت دکھ ہوا۔ جاسوسی ادب کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ جاسوسی کا اس بار بہت بے تابی سے انتظار تھا کیونکہ ہم نے اپنا تبصرہ جو بھیجا تھا۔ شمارہ ملتے ہی سب سے پہلے چٹ پٹی نکتہ چینی میں چھلانگ لگائی۔ تبصرہ نگاروں میں اپنا نام دیکھ کر جو خوشی ہوئی، اس کو صرف وہی جان سکتا ہے جس کا تبصرہ پہلی بار شائع ہوا ہو۔ اس بار ابتدائی صفحے پر منصور حبیب کا قبضہ تھا۔ ان کا تبصرہ واقعی لائقِ تحسین تھا۔ باقی احباب کے تبصرے بھی بہترین تھے۔ اس بار ابتدائی صفحات پر حسام بٹ چھائے رہے۔ قدم قدم پر سسپنس سے بھرپور تحریر نے لطف دیا۔ منظر امام بھی استاد کے تازہ کارنامے کے ساتھ موجود تھے۔ انگارے روز بروز نکھرتی جارہی ہے۔ مغل صاحب کا مخصوص انداز اور ان کے قلم کی روانی قاری کو اپنے سحر میں اس قدر جکڑ لیتی ہے کہ قاری کہانی کو ایک نشست میں ختم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس بار مترجم کہانیاں کچھ زیادہ دکھائی دیں۔ چونکہ ہم مترجم کہانیوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے اس لیے ان پر تبصرے سے معذرت۔ سرورق کا پہلا رنگ تاوان پڑھا۔ پوری کہانی میں کہیں پر یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ کسی نوآموز مصنفہ کی تحریر ہے۔ زویا اعجاز کو مبارک باد۔ انہوں نے تبصرہ نگار سے مصنفہ تک کا سفر بہت کم عرصے میں طے کیا ہے۔ (جی ہاں...... بہت دیر سے جاگی ہیں) امید ہے کہ ان کی جانب سے آئندہ بھی ایسی تحاریر ملتی رہیں گی۔ دوسرا رنگ بھی اسما قادری کی بہترین تحریر تھی۔ اللہ کاشف زبیر مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ راجا اور جگیل کے کردار تو انہی کے ساتھ چلے گئے۔ اس بار راجا اور جگیل کے ساتھ ساتھ بزدل میاں کی کمی بھی بہت محسوس ہوئی۔'' (ہمیں بھی ہوئی مگر احمد اقبال کی انگلیاں سٹی ہوئی ہیں سرد خیری میں)

مسقط عمان سے شاہد امین کی دل گداز یادیں '' یہ ایک سرد رات تھی اور کل ہماری متوقع چھٹی کی وجہ سے ہم نے جاسوسی کو سرہانے رکھا اور بیرونی دنیا سے رابطہ منقطع کر کے خاموشی سے جاسوسی کا مزہ لینے لگے۔ سرورق کی حسینہ کی آنکھوں میں ڈوبتے ڈوبتے بچے۔ ایک بار تو ارادہ بنا کہ آگے بڑھنا موقوف کر کے رات اس حسینہ کے نام کر دیں لیکن پھر پستول پر نظر پڑی اور ایک بندہ پیچھے کھڑا اس امید سے دیکھ رہا تھا کہ فائر کرتی ہے کہ نہیں۔ ہم اس کی امیدوں پر پانی پھیرتے نکتہ چینی کی طرف لپکے۔ انکل نے نئے سال کی مبارک دی اور امید دلائی کہ اس سال میں بہتری ہوگی۔ حالانکہ سال کے شروع میں پاکستانی چکن گونیا مچھر کی زد میں اور پاکستانی کرکٹ ٹیم آسٹریلیا کی ضرب میں ہیں۔ دونوں ہی مارتے نہیں بس رُلا رہے ہیں۔ منصور احمد پلیجو اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ نئے دوستوں کو خوش آمدید کہتے بہت اچھے لگے۔ رانا بشیر صاحب سردی سے نڈھال لرزتے کانپتے مزے کا تبصرہ فرما گئے۔ پرویز احمد لانگاہ سعودیہ سے تشریف لائے۔ ہم ان سے متفق ہیں، تمام تبصرے اچھے لگے۔ کہانیوں کی جانب بڑھے تو حسام بٹ برعکس کے ساتھ موجود تھے۔ کہانی عمدہ تھی۔ اچانک ایک زوردار دھما کا ہوا۔ دھما کا اتنا شدید تھا کہ ایسا لگا بیڈروم میں ہی ہوا ہے۔ بہت کمال کا ماحول بنایا آخر میں ہمیں سلمٰی کے ساتھ ہمدردی محسوس ہوئی۔ انگارے کی یہ قسط عمدہ رہی۔ کہانی آگے نہیں بڑھ رہی۔ پتا نہیں مغل سر نے کس چکر میں سیف کو رقیب بنا دیا ہے۔ اکھاڑا مختصر کہانیوں میں ٹاپ پر رہی، تخیل کی پرواز بہت بلند تھی۔ وفادار میں مسز ایکس نے خوب سراغرسانی کی۔ ایکو سلیم انور کی ایک شاندار کہانی رہی۔ سسپنس اور تھرل سے بھرپور۔ کالی زندگی میں محبت کا ایک نیا روپ نظر آیا۔ پیغام ایک آسان کیس ثابت ہوا۔ تاوان زویا اعجاز کی محبت اور انتقام سے بھرپور پرانی یادیں تازہ کر گئی۔ بہت اچھی کہانی لکھی۔ آوارہ گرد کی یہ قسط خوب رہی۔ بھٹی صاحب نے سردی میں ماحول گرم کر دیا۔ آخر میں شمارے کی بہترین کہانی پرل گروپ کی سراغرسانی اور اسما قادری کی کمال کی کردار سازی اور منظر نگاری ایک بچھڑے مصنف کی یاد دلا گئی۔ پرل گروپ کی سیریز کا مطالبہ ہے۔ نہیں تو جینا ہوگا مرنا ہوگا ...... دھرنا بہرحال نہیں ہوگا۔ کاشف زبیر سر کی تین اگست کو سالگرہ تھی۔ بہت یاد آئے۔ ایک عہد تمام شد۔ لیکن اپنے کرداروں کی شکل میں ہمیشہ ہمارے دل میں زندہ رہیں گے۔''

اصغر علی کا چنیوٹ سے چنچل پن '' جاسوسی اس دفعہ پانچ تاریخ کو ملا۔ سرورق کی حسینہ سالِ نو کی مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ شاید یہ دھمکی دے رہی تھی کہ اگر تعریف نہ کی تو؟ مدد طلب نگاہوں سے پیچھے کھڑے آدمی کی طرف دیکھا تو اس نے کہا جناب میں تو خود ڈرا ہوا ہوں۔ مجبوراً کہنا پڑا کیا بات ہے کمال کا سرورق ہے۔ اداریے میں مدیر اعلیٰ کرکٹ ٹیم کے بارے میں پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ تبصرہ نگاروں میں جاسوس اعظم (منصور حبیب پلیجو) کرسیِ صدارت پر براجمان نظر آئے۔ بہت اچھا تبصرہ تھا مبارک ہو۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے بھی بہترین تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ یہ قسط کافی سنسنی خیز اور دھما کا دار رہی۔ برعکس گزارہ کر گئی، کہانی کو بے جا طوالت دی گئی تھی۔ تاوان میں مصنفہ دشمن ممالک کی شازشوں اور ارسلان شاہ جیسے ڈبل مائنڈ لوگوں کے چہروں سے پردہ اٹھاتی نظر آئیں۔ بہت ہی اچھی تحریر تھی۔ رگِ جاں میں اسما قادری کافی عرصے بعد پرل گروپ کو میدانِ عمل میں لے کر آئیں۔ کہانی پڑھنے کا مزہ آگیا۔ ایڈونچر اور مزاح سے بھرپور کہانی تھی۔ آوارہ گرد بھی ٹھیک چل رہی ہے بس ایکشن تھوڑا کم ہو جائے تو کیا بات ہے۔ مختصر کہانیوں میں ابھی تک صرف دو پڑھی ہیں۔ استاد نامہ میں استاد کی جدید اردو سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی نیک نیتی پر رشک بھی آیا۔ اکھاڑے میں مصنفہ نے اپنے تخیل کی پرواز کے ذریعے مستقبل کی جنگوں کی داستان سنا دی۔

کارمن نے کمزور ہونے کے باوجود اپنی عقل سے ایلین کو مار گرایا۔ اب اجازت چاہوں گا۔“

کراچی سے سعدیہ قادری کی سیاحی ”حسب معمول انگارے سے ابتدا کی، شاہ زیب جس طرح نئی نئی الجھنوں میں گھر رہا ہے، مشکل ہی ہے کہ جلدی واپسی ہو، ابتدائی صفحات پر حسام بٹ کو پڑھ کر مزہ آ گیا، مصنف حال اور ماضی کامیابی کے ساتھ لے کر چلے اور کہانی میں آخر تک تجسس کا عنصر برقرار رہا، تنویر ریاض کی بعید از قیاس میں تھا سِ خدا ملا نہ ہی وصالِ صنم کے مصداق برا پھنسا، ایک لاکھ ڈالر معاوضہ بھی دیا پھر بھی پکڑا گیا۔ ناقابلِ برداشت میں سوشل میڈیا کی بدولت مجرم پکڑے گئے، منظر امام طویل عرصے بعد استاد کے ہمراہ حاضر ہوئے اور استاد نے رابن ہڈ کا کردار ادا کر کے دل جیت لیا۔ شکیل صدیقی کا فنکار ذرا سی غیر حاضر دماغی کی بنا پر پکڑا گیا۔ ادھورا انتقام میں پروفیسر نے مرتے مرتے بھی اپنے ماں باپ کا بدلہ لے لیا۔ اکھاڑا میں میرا پسندیدہ موضوع خلائی فکشن تھا، کارمن نے اپنی ذہانت سے خلائی مخلوق کو جسمانی برتری کے باوجود شکست دی۔ وفادار میں پولیس نے سستی دکھائی (ہماری پولیس کی طرح) لہٰذا مسز ایس کو خود ہی میدان میں آنا پڑا۔ ایکو میں ڈیون خود تو مر گیا مگر الیگزینڈر کو برا پھنسایا۔ کالی زندگی میں عاشق نے کیا خوب بدلہ لیا۔ پیغام میں بہت آسانی سے اصل قاتلہ پکڑی گئی اور اب بات ہو جائے رنگوں کی جہاں صنفِ نازک کا راج ہے، سال کے ابتدا ہی میں اتنے بہترین رنگ، امید ہے پورا سال ایسی ہی یادگار تحاریر پڑھنے کو ملیں گی۔ زویا اعجاز، وہ آئی، اس نے دیکھا، اور فتح کر لیا۔ تاوان ہمارے معاشرے کے بہت سے تاریک پہلو اجاگر کر گئی، خاص طور پر تعلیمی اداروں میں جس طرح نوجوان نسل کو منشیات کا عادی بنایا جا رہا ہے وہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے، بدقسمتی سے نظامِ تعلیم جن کے ہاتھوں میں ہے ان کی اپنی اولاد بیرونِ ملک پڑھتی ہیں تو انہیں ہمارے درد کا احساس کہاں ہوگا، انہیں اپنے الاؤنس اور مراعات سے غرض ہے باقی عوام جائے بھاڑ میں، زویا کے بہت سے جملوں پر بے اختیار سر دھن کر رہ گئی۔ امید ہے جلد ہی زویا کی مزید شاہکار تحاریر پڑھنے کو ملیں گی۔ اسما قادری لمبے عرصے بعد آئیں اور کیا خوب تحریر لائیں، لگ رہا تھا کہ کاشان مون کا بیٹا ہوگا لیکن وہ اس کا بھانجا نکلا، نانی نے پیسے کے لیے اپنے نواسے کو بھی نہ چھوڑا، پرل گروپ نے بھی خوب جاسوسی دکھائی۔“

چنیوٹ سے لیلیٰ کوثر لاشاری کی سرشاری ”دھند میں لپٹا ہوا سورج غروب ہوا تو شام کا ملگجا اندھیرا گھر کی منڈیروں پر اتر آیا۔ ہم نے شام کی چائے پیتے ہوئے جاسوسی کے سرورق پر نظر ڈالی۔ کوٹ ٹائی میں ملبوس شخص اور برہنہ سر دوشیزہ کا انداز ایک دوسرے سے خفگی کا تاثر دے رہا تھا۔ پستول کی موجودگی سے پتا چلتا تھا، وہ چار شائیں ضرور ہوں گی۔ آپ کا اداریہ عوام کے جذبات کا صحیح عکس پیش کر رہا تھا۔ واقعی سیاستدان، سیاست سیاست کھیل کر عوام کو اپنے حق میں ووٹ ڈالنے پر آمادہ کر لیتے ہیں اور عوام پھر نئے وعدوں پر اعتبار کر کے امیدیں باندھ لیتے ہیں اور بقول شاعر صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے۔ کرکٹ سے ہمیں خاص دلچسپی نہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ ہار جیت کھیل کا حصہ ہوتی ہے۔ چیتی نکتہ چینی میں اپنے خط کی موجودگی سے ہمیں اتنی خوشی ہوئی جتنی انگریز امر میں کامیابی کے بعد ہوتی تھی۔ اعزازی تبصرے میں منصور حبیب پلیبورا جا اندر کی طرح گردن اکڑائے چلے آرہے تھے کہ ان کا ٹاکرا صفدر معاویہ سے ہو گیا جو کراچی سے پشاور کے لیے رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ سعدیہ قادری اور پرویز احمد لانگاہ کی آمد اچھی لگی۔ دیگر تبصرہ نگاروں میں رانا بشیر احمد ایاز، وارث علی اور اے ایچ کاظمی کی شمولیت اور ان کے اختصاریے اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ابتدائی صفحات کی سوغات حسام بٹ کی تحریر برعکس توقع کے برعکس ہمیں متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ سطر سطر دل میں تجسس پیدا کرتی کہانی نے آخری سطور تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا، واقعی تقدیر کے سامنے ہر تدبیر دھری رہ جاتی ہے۔ سلمیٰ بیگم کے بیانات کا تضاد اسے قاتل ٹھہرا گیا۔ یعنی گھر کو لگی آگ گھر کے چراغ سے۔ پاشا کے ساتھ دل کی لگی بالآخر نظامی کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا موجب بنی۔ دوسرے نمبر پر جو کہانی مطالعے میں آئی، وہ منظر امام کی استاد نامہ تھی۔ کافی عرصے بعد استاد نرالے عالم کو فارم میں دیکھا جو فرستادۂ شب خون اور چشم گریہ ناک سے الم ناک ہو کر گلی کوچے میں سنگ آرزوؤں کی طرح موسم فراق فغاں تھے۔ انگارے کی موجودہ قسط بہت دلچسپ رہی۔ سنسنی خیزی نے دم بخود کیے رکھا۔ لگتا ہے شاہ زیب کا کمانڈر افغانی کے ساتھ زوردار ٹاکرا ہونے والا ہے، اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ سرورق کے رنگوں میں زویا اعجاز نے توقع کے خلاف اچھی کہانی تخلیق کی۔ موضوع کے روایتی پن سے قطع نظر، مربوط انداز اور اسلوب کی دلکشی اچھی لگی۔ معیز بیگ کا کردار پاور فل تھا۔ باقی شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔“

کھیوڑہ سے شفقت محمود کی تجزیہ نگاری ”یکم جنوری 2017ء کی روشن صبح کے وقت جاسوسی میرے ہاتھ میں تھا۔ خوب صورت سرورق پر ایک ماڈرن حسینہ فلمی ہیروئن کی طرح پستول پکڑ کر نئے سال کا آغاز کر رہی تھی۔ عین اس حسینہ کے پیچھے ٹائی کوٹ میں ملبوس بھائی صاحب پستول سے دبکے ہوئے نظر آرہے تھے جبکہ سب سے نیچے سالِ نو کا نیون سائن بھی جگمگا رہا تھا۔ اداریے میں نئے سال کے لیے نیک خواہشات اور کرکٹ پر جامع تبصرہ لیے ہوئے تھے۔ 2016ء تو ویسے ہی پاکستان کے لیے تاریک ترین سال ثابت ہوا ہے اور پھر دسمبر ہمیشہ کی طرح برباد کر دینے والا ثابت ہوتا ہے۔ سقوطِ ڈھاکا ہو یا آرمی پبلک اسکول کا سانحہ یا جنید جمشید کی شہادت اور ہماری عزیز ہستی میرے والد صاحب بھی دسمبر میں فوت ہوئے تھے۔ یہ سب دسمبر کے دیے ہوئے دکھ ہیں۔ اس کے علاوہ مختار آزاد، کاشف زبیر، محی الدین نواب، عبدالستار ایدھی، اور اب سلیم فاروقی ہم سے بچھڑ گئے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ...... یہ سال ہمارے لیے اور ہمارے ملک کے لیے ترقی اور خوش حالی کا ضامن ہو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی جو کہ کافی حوصلہ افزا قسط ثابت ہوئی۔ نائٹ کلب میں ہونے والے خونیں واقعات اور شاہ زیب کی سرگرمیاں بہت چونکا دینے والی ہیں۔ قسطینا بلا شبہ ایک عظیم سپہ سالار ہے اور شاہ زیب اس سے بھی زیادہ تیز ثابت ہو رہا ہے۔ زینب بے چاری بہت مایوس کن حالات میں گھری ہوئی ہے اور خیام اپنے منطقی انجام کی طرف گامزن ہے۔ اب آخر میں افغانی کیا شوشہ چھوڑنے لگا ہے اس کے لیے اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ آوارہ گرد بھٹی صاحب کی کہانی اس وقت بامِ عروج پر ہے۔ شہزی پورا سپر مین بنا ہوا ہے۔ حسام بٹ صاحب کی برعکس بہت اچھی تحریر تھی۔ شہر قائد کے حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ایک لاجواب تحریر تھی۔ منظر امام صاحب کی استاد نامہ پُر مزاح اور سبق آموز کہانی تھی۔ استادِ محترم کا کارنامہ بہت شاندار تھا لیکن فقیروں کو لوٹنا بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ جمال دستی کی ناقابلِ برداشت اور شکیل صدیقی کی فنکار

بھی بہت اچھی تھیں۔ زویا اعجاز کی تاوان بہت لاجواب کہانی تھی۔ معیز اور نمرہ کے حالات اور واقعات پڑھتے ہوئے مجھے وفاقی یونیورسٹی یاد آ گئی جس کے بارے میں کچھ دن پہلے خبر آئی تھی کہ وہاں پر منشیات کا استعمال عروج پر ہے۔ یہ ہمارے تعلیمی اداروں کا حال ہے۔ نئی نسل کو ذہنی اور جسمانی طور پر ناکارہ بنانے کی یہ عالمی سازش بہت بھیانک ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اسما قادری کی رگِ جاں بن جانے والے رشتوں کی ڈور سے بندھی نہایت ہی پراثر تحریر تھی۔ اس کے علاوہ اکو اور اکھاڑا بھی لاجواب کہانیاں تھیں۔''

دبئی سے طلعت مسعود کا تشکرانہ انداز ''ہم جاسوسی کے کافی پرانے قاری ہیں لیکن چٹی نکتہ چینی کی محفل میں کچھ دوستوں خاص طور پر مظہر سلیم ہاشمی صاحب کے تحریک دلانے پر آج پہلی دفعہ شرکت کی جسارت کر رہے ہیں۔ نئے سال کا جاسوسی ہمیں 2017ء میں ہی ملا۔ سرورق کی حسینہ کو انکل شاید نئے سال کی مبارکباد دے رہے ہیں لیکن وہ گن دکھا کر کہہ رہی ہے کہ گفٹ کے بغیر مبارکباد قبول نہیں سو ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھے اور خطوط کی محفل میں پہنچے جہاں انکل نئے سال کی آمد پر سیاست اور کھیل سے متعلق امید بھری باتیں کر رہے ہیں۔ منصور حبیب پلیجو صاحب اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ محمد صفدر معاویہ صاحب کا تفصیلی تبصرہ بھی اچھا لگا اس کے علاوہ کافی سارے جانے پہچانے چہرے محفل میں نظر آئے۔ پرویز احمد لانگاہ، سعدیہ قادری، سید عبادت کاظمی، ملیحہ کوثر لاشاری اور دوسرے سب دوستوں کو مبارک۔ کہانیوں میں اس دفعہ ابتدائی صفحات پر حسام بٹ برعکس لے کر حاضر تھے۔ حسام صاحب کی ابتدائی صفحات پر شاید پہلی تحریر ہے۔ کہانی میں کردار کم ہونے کی وجہ سے آدھی کہانی پڑھنے کے بعد سلمیٰ پر شک ہونے لگا تھا جو بعد میں درست ثابت ہوا۔ بہرحال مجموعی طور پر یہ کہانی اچھی رہی۔ انگارے حسبِ معمول عمدہ جا رہی ہے۔ اب کہانی میں کچھ تیزی آ گئی ہے۔ آوارہ گرد کی ابھی پچھلی بھی کچھ اقساط رہتی ہیں اس لیے اس پر ابھی تبصرہ محفوظ ہے۔ رنگوں میں پہلے زویا اعجاز کی تاوان پڑھی۔ ارسلان شاہ جیسے نہ جانے کتنے درندے ہمارے ہر شعبے میں موجود ہیں جو اسی ملک کا کھا کر اسی کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ بین الاقوامی اور اندرونی سازشوں کو بےنقاب کرتی عمدہ تحریر۔ بہت کم وقت میں زویا اعجاز نے اک مقام بنایا ہے۔ ان کی مزید کامیابیوں کے لیے دعاگو ہیں۔ اسما قادری کافی عرصہ بعد پرل گروپ کے ساتھ آ گئیں۔ ازل سے برائی کی جڑ دولت کے لیے اپنے ہی بیگانے ہو جاتے ہیں لیکن اینڈ اچھا لگا۔ مون کو اس کی خواہش کے مطابق اک خوابوں کا گھر مل گیا۔ مختصر کہانیوں میں ابھی تک منظر امام کی استاد نامہ ہی پڑھی ہے۔ شگفتہ انداز میں ایک بڑا اچھا پیغام دیا ہے۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

کوٹ ادو سے عبداللہ ادیب کی ناپسند ''جنوری 2017ء کا شمارہ 28 دسمبر کو ملا۔ بےحد خوشی ہوئی۔ سرورق اس مرتبہ واقعی خوب صورت ہے۔ سرورق پہ نظر آنے والی محترمہ کی آنکھوں پر تو کوئی شعر کہنے کو دل چاہتا ہے مگر یہ شاعری...... ! کاش یہ ہمارے بس کا روگ ہوتا۔ (کوشش کر لیں) چٹی نکتہ چینی میں منصور حبیب سرفہرست رہے، مبارکباد۔ تبصرہ جاندار ہے۔ صفدر معاویہ، اوریس احمد خان اور سعدیہ قادری نے بہترین تبصرہ لکھا۔ اولین صفحات پہ حسام بٹ اچھوتے انداز میں طویل کہانی لائے، بہت خوب رہی۔ انگارے میں شاہ زیب قسطینا کی طرف جھک گیا ہے اور تاجور کو بھلانے کی کوشش میں ہے۔ خیال ہے کہ پہلے مغل صاحب کی کہانیوں میں ہیروئن شادی شدہ ہوا کرتی تھی اس بار ہیرو یہ عہدہ سنبھالے ہوئے ہے۔ بہرحال بروناتی میں ہنگامہ خیز واقعات پسند آ رہے ہیں۔ انیق بھی اپنا کردار بخوبی نبھا رہا ہے۔ مجھے انیق کا کردار کافی زیادہ پسند ہے۔ پہلا رنگ زویا اعجاز کا کچھ خاص نہیں تھا۔ دوسرا رنگ اسما قادری نے زبردست لکھا۔ مصروفیات کی وجہ سے باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

جاسوس 007 کا خفیہ مقام سے حملہ ''مجھ کو پہچان لو، میں ہوں کون؟ کچھ وقت پہلے میں بھی انہی راہوں کا مسافر تھا۔ نئے سال کی پہلی تبدیلی کے طور پر جاسوسی ڈائجسٹ 28 دسمبر کو مل گیا۔ اب چونکہ رسم چلی آ رہی ہے کہ پہلے ٹائٹل کا تیا پانچا کرنا ہے تو میں بھی یہ فریضہ سرانجام دیے دیتا ہوں۔ سیدھی مانگ میں تیڑھے تاثرات لیے سوہنی کڑی بہت اچھی لگی۔ مسکین سی شکل بنائے تائی ٹینک ہیرو کی مشابہت والا اسمارٹ سا منڈا بھی بہت اچھا تھا۔ اداریے میں کرکٹ کی خبریں نظر آئیں جس سے مجھے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ نکتہ چینی میں سب سردی سے خاموش اور ٹھٹھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ منصور حبیب پلیجو کا خط بہت رواں اور شائستہ تھا۔ بھائی وارث علی! جس کا جتنا ظرف ہوتا ہے وہ اسی حساب سے کہانی اور مصنف کو دیکھتا ہے۔ سمجھ گئے ناں! مومنہ کشف کی معصومیت بڑی اوپری سی لگی۔ عبادت کاظمی اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا! اے ایچ کاظمی کا تبصرہ اور قلم تو سردی سے سکڑا سمٹا نظر آ رہا تھا۔ بھائی! اسے ذرا دھوپ لگواؤ۔ باجی گل کہیں نظر نہیں آئیں اس دفعہ۔ باجی آپ غیر حاضر نہ ہوا کریں۔ کہانیوں کا اسٹارٹ آوارہ گرد سے کیا۔ بھٹی صاحب بہت محنت سے لکھ رہے ہیں۔ لیکن ایکشن میں کوئی اسپیڈ بریکر لگا دیں تو کہانی ایک دم سپر ہو جائے گی۔ انگارے میں خون گرما دینے والا ایکشن اور رومانس۔ شاہ زیب کی حقیقت پسندی اچھی لگی۔ دوسرے ہیروز کی طرح وفا اور خوابوں کے ماحول میں نہیں رہتا۔ سرورق کے پہلے رنگ میں ایک نیا نام نظر آیا زویا اعجاز۔ کہانی میں مصنفہ کی محنت اور سنجیدگی خوب جھلکتی رہی۔ امید ہے مستقبل میں بھی لکھتی رہیں گی۔ اسما قادری کافی عرصے بعد نظر آئیں۔ اچھی کہانی تھی۔ پرل گروپ نے بڑے عرصے بعد درشن کروائے۔ حسام بٹ کی برعکس میں کچھ باتیں بار بار دہرائی جاتی رہیں۔ اس تکرار نے کافی بور کیا۔ کہانی جلدی سمیٹ دی گئی۔ اس کہانی کی جگہ زویا اعجاز کی تاوان ابتدائی صفحات کے لیے زیادہ فٹ رہتی۔ منظر امام کے استاد نے تو دل جیت لیا۔ مغربی کہانیوں میں صرف وفادار اور اکھاڑا پڑھی ہیں۔ اس لیے ان پہ تبصرہ ادھار رہا۔ محی الدین نواب، کاشف زبیر، مختار آزاد کے بعد اب سلیم فاروقی بھی ان کے پیچھے چل دیے۔ اپنی کہانیوں کا عجلت میں اختتام کرنے والے فاروقی صاحب نے اپنی زندگی کی کہانی بھی تا فٹ ہی سمیٹ لی۔ لواحقین کے لیے صبر کی دعا ہے۔''

اعتزاز اینڈ زریاب وصلی، ٹانڈلیانوالہ سے دلی کیفیات بیان کرتے ہیں ''سال کا پہلا جاسوسی کسی فاتح حکمران کی طرح ہمارے دل کی زمین پر انتیس دسمبر کو وارد ہوا تو ایسا لگا جیسے شدید سردی میں نرم دھوپ نکل آئی ہو۔ ٹائٹل پر سالِ نو کی مبارکباد دیتی حسینہ تیکھی نظروں سے ہمارے دل پر بجلیاں گرا رہی تھی۔ نیچے کسی بھائی صاحب کا ہاتھ پستول لیے لہو پکارے گا آستین کا، کی مثال بنا ہوا تھا۔ اوپر ایک نفیس آدمی مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ کہانیوں کی

فہرست پر سرسری نگاہ دوڑا کر چینی نکتہ چینی کی طرف بڑھے۔ اداریے میں مدیر اعلیٰ صاحب نے ہمیں جتنی امیدیں دلوائیں، وہ ساری پاکستانی ٹیم نے خاک میں ملا دیں۔ محفل کے سردار بنے منصور حبیب بلیجو نے شاندار تبصرہ لکھا۔ محمد صفدر معاویہ کراچی کے مسائل اپنے انداز سے بیان کرتے نظر آئے۔ پرویز لانگاہ اور لیلیٰ کوثر لاشاری کو محفل میں خوش آمدید۔ کہانیوں میں حسب معمول سب سے پہلے انگارے سینکے۔ قسطینا اور شاہ زیب کی جوڑی نے تہلکہ مچادیا۔ زیرزمین بنکر کی گرتی چھت کی منظر نگاری نے رونگٹے کھڑے کردیے۔ واقعی موت کا احساس جان لیوا ہوتا ہے۔ کمانڈر افغانی کی دشمنی شاہی کو مشکل میں ڈالے گی۔ آوارہ گرد کی یہ قسط بہتر رہی۔ گلی منجارو کے جنگلات میں شہزی کاکے اور راوالوں کی لڑائی جنگل میں منگل کا سماں پیدا کررہی ہے۔ اس بار جس کہانی نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ زویا اعجاز کی تاوان تھی۔ کہانی حقیقت کے قریب لگی۔ نمرہ عاقب اور سجاد کی جدوجہد نے بہت متاثر کیا۔ دعا ہے تعلیمی اداروں کے لیے کی گئی دشمن کی سازشیں ہمیشہ ناکام ہوں۔ کافی عرصے بعد اسما قادری کی شاندار واپسی ہوئی۔ پرل گروپ کی محنت رنگ لائی اور اصلی مجرم بے نقاب ہوگیا۔ اولین صفحات پر حسام بٹ کی تحریر برعکس نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ یہ پلاٹ اب کافی پرانا ہوچکا ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں منظر امام کی استاد نامہ تاپ پر رہی۔ استاد کی سازش نے پیشہ ور فقیروں کو سبق سکھادیا۔ باقی کہانیوں میں ادھورا انتقام اور فنکار ہماری پسند کے معیار پر پورا اتریں۔ مجموعی طور پر جنوری کا شمارہ شاندار رہا۔“

عبدالجبار رومی انصاری کی لاہور سٹی سے تبصرہ نگاری ”دوشیزہ اپنے تئیں عزم و ہمت کی چٹان نظر آرہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے پسٹل سے ابھی کچھ کردے گی لیکن پسٹل پر مردانہ ہاتھ کوئی اور ہی کہانی بیان کررہا تھا۔ سالِ نو کی مبارک باد سے مزید ٹائٹل اچھا لگا۔ خوب صورت کہانیوں کے رائٹر سلیم فاروقی کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ نکتہ چینی کی دل نگار باتیں تو یاد آتی رہیں گی جب تک نام نہاد جمہوریت کے نام لیوا باری باری اقتدار میں آتے رہیں گے اور عوام بھولی بھالی بن کر انہیں منتخب کرتی رہے گی۔ یہ الگ بات کہ بعد میں اسے پچھتانے اور رونے کے سوا کچھ نہیں ملتا اور جہاں تک کرکٹ کا تعلق ہے تو نئے کھلاڑیوں کی شمولیت سے یہ کھیل اچانک آسمان پر پہنچ گیا اور خوب خوشیاں منائی گئیں اور پھر لگتا ہے کسی نے نیچے سے سیاسی سیڑھی کھینچ لی اور کرکٹ کی کامیابی بیچ میں ہی معلق رہ گئی۔ اب پھر شکست در شکست کی باتیں ہی سننے کو مل رہی ہیں۔ جے ڈی پی کے شماروں کی آمد کی نئی ڈیٹ کا اعلان خوش آئند ہے۔ منصور حبیب بلیجو کی عمدہ تبصرہ نگاری پر مبارک باد۔ محمد صفدر معاویہ بھی قابلِ تعریف رہے اس طرح رانا بشیر احمد ایاز اور وارث علی نے بھی خوب خوب محنت کی۔ ادریس احمد خان، پرویز لانگاہ، لیلیٰ کوثر لاشاری، ایچ کاظمی، ماہتاب گل رانا، سعدیہ قادری، عبادت کاظمی اور مومنہ کشف کی معصومیت کے ساتھ ساتھ بھی نے بہترین تبصرہ نگاری کی۔ رام رام کا نام لینے والے ارسلان کو رام رام کی چتا میں ہی جلنا پڑا۔ سجاد اور نمرہ نے معیز بیگ کو مہرہ بنا کر اپنے وطن دشمنوں سے خوب انتقام لیا۔ زویا اعجاز کی ٹائٹل کہانی اچھی رہی۔ اسماء قادری کے قلم سے رگِ جاں نے 2017ء کے آغاز کو خوب صورت بنادیا۔ اناڑی کڈنیپر جلد ہی پکڑے گئے۔ شاہنواز کو اپنا بیٹا تو ملا ہی ساتھ میں مون کی صورت خوب صورت شریکِ حیات بھی۔ فائٹر لڑکی قسطینا نے اس دفعہ حیران کردیا۔ ساتھ ہی شاہ زیب نے بھی خوب رنگ جمایا۔ افغانی اب پتا نہیں کون سا کرتب

ایک چراغ اور بجھ گیا

سلیم فاروقی بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ وہ ایک کہنہ مشق قلم کار تھے۔ قارئین کے لیے دلچسپ اور خوب صورت کہانیاں تخلیق کرتے رہے...... رسائل کے صفحات سے لے کر بصری ذرائع تک اپنے فن کے جوہر بکھیرتے رہے۔ ہنس مکھ اور ملنسار آدمی تھے۔ عمر بھر اَن گنت موضوعات پر معاشرتی، تحیر انگیز اور سنسنی آمیز کہانیاں لکھتے رہے اور 5 جنوری 2017ء کی صبح خبر آگئی کہ وہ ایک کہانی لکھتے لکھتے صبح دم، 3 بجے لمحوں ہی لمحوں میں خالقِ حقیقی سے جاملے۔ 65 برس ملازمت سے ریٹائرمنٹ کی عمر ہے لیکن سلیم فاروقی اسی عمر میں دنیا سے منہ موڑ گئے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
آسماں اس کی لحد پہ شبنم افشانی کرے

ادارہ پس ماندگان کے دکھ میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین مرحوم کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔

دکھانے لگا ہے۔ لگتا ہے اس کی بھی پنچھی شامت آنے والی ہے۔ طاہر جاوید مغل انکل کی انگارے سپر ہٹ جارہی ہے۔ ’’انتقام خوش حال کن تو ماورائے امکان‘‘ استاد نے پیشہ ور بھکاریوں سے خوش کن انتقام لیا اور مجبور و بے کس عورت کی مدد کر کے خود کو عظیم بنالیا۔ منظر امام کی خوب صورت تحریر نے خوب محظوظ کیا اور اچھا تاثر دیا۔ سونگ کھلا اور اس کے پتا عبرت کی موت سے دو چار ہوئے۔ برمی مسلمانوں اور قبائلیوں پر ظلم وہاں کوئی اُن کی دادرسی کرنے والا جو نہیں ہے جو اس ظلم و بربریت سے باز رکھے۔ باقی شہزی کو اپنے ساتھی تو نظر آئے مگر وہ بھی عجیب ہی حالت میں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی تیز رفتار آوارہ گرد بہت اچھی جارہی ہے۔ جب وقت ہاتھ سے نکل جائے تو ہر داد و فریاد بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ سلمٰی نے پاشا کو حاصل کرنے کے لیے اپنے شوہر کو آہستہ آہستہ موت کی طرف دھکیلا مگر ان دیکھے مراد علی کے کردار نے اسے پھنسا دیا۔ حسام بٹ کی برعکس بہترین کہانی رہی۔ باتیں کرتی چھپکلی خلاؤں کی عجیب و غریب کشمکش اکھاڑے کی صورت نہ سمجھ آنے والی کہانی، فرزانہ نگہت نے کچھ کچھ سمجھا ہی دیا، اچھی تھی۔ کالی زندگی کے مسافر نے اپنی محبوبہ کو بھی کالی زندگی کا ہمسفر بنالیا۔ اس نے جو کیا تھا وہ بھر لیا۔ محسن صدیقی کی مختصر اسٹوری بھی عمدہ رہی۔ فلپ نے اس کے سامان کی حفاظت میں اپنی جان دے دی اور مسز ایس کو پتا بھی نہ چلا۔ جب اس کی وفاداری کا پتا چلا تب تک اس کا قاتل بھی پولیس کی تحویل میں آ گیا۔ تمکین رضا کی وفادار بھی اچھی رہی۔‘‘

میانوالی سے احسان سحر کی تلخ نوائی ’’بعض لمحے حد سے زیادہ خوشی دیتے ہیں اور بعض لمحے حد سے زیادہ اداس کرتے ہیں۔ محبت کا لباس پہن کر بھی کچھ لوگ اداسیوں سے رشتہ نہیں توڑتے۔ جانے والوں کو خدا حافظ کہنا اور آنے والوں کو گلے لگانا ہی یہاں کا رواج ہے۔ نیا سال آ گیا...... جانے والا بہت کچھ اپنے ساتھ لے گیا۔ خوشیاں، اداسیاں، مسکراہٹیں، سب یادیں بن کر دل کی میموری کارڈ میں سیو ہو چکی ہیں۔ سالِ نو مبارک۔ پیارا جاسوسی ہمارے پاس ہے۔ خوشگوار سا احساس ہے من بھی شاد باد ہے۔ صنفِ نازک نے لبھایا ہے دل کو، صنفِ کرخت بالکل بھی نہیں بھایا ہے دل کو۔ آگے کی طرف قدم بڑھایا ہے ہم نے، جاسوسی نے جہاں محبتوں کا شہر بسایا ہے۔ کوئی یہاں پر اپنا ہے، ہر کسی کا رنگ الگ ہی سپنا ہے۔ مرحاگل کی پھیلاتی گل خبریاں، خوشبو نے کیا ہمارا احاطہ، خوب صورت رہا یہاں آپ کا اضافہ۔ نیازی صاحب بھی آئے حکیموں کی نگری سے۔ دھیما سا انداز رہا آپ کا پھولوں کی نگری میں۔ اپنے تبصرے کی جو دیکھی ہم نے حالت...... تو فرمایا ہم نے غصے اور دکھ سے کچھ یوں...... ذرا تحمل سے سنیے گا حضور...... چھکے چھوٹ جائیں گے آپ کے ضرور جس کی امید ہو، جیسا سوچا جائے ویسا نہ ہو تو مایوسی ہی ہوتی ہے۔ ایسی مایوسی جو نا امیدی کے اندھیرے میں پھینک دے۔ ایسا ہی حال ہمارا تھا۔ آخر دل جو دیوانہ تھا۔ جب پڑی نظر اپنے تبصرے پر...... آدھے سے بھی زیادہ ہو گیا ایڈٹ۔ (کیا کریں جناب مجبوری میں آرے بھی چلانے پڑتے ہیں) آغاز کیا آتشِ جنوں کے آخری حصے کا اختتام ہوا اہتمام کا تمام۔ پاکستانی سیاست کی عکاسی، صدر حیات کا بھیانک انجام، آفتاب کا بھی ہوا کام تمام۔ پشمینہ کی جدوجہد آخر رنگ لے ہی آئی اور زندگی آخر مہرباں ہوئی۔ دہرا جنون مختار آزاد کی خوب صورت کاوش، پروفیسر کے دہرے کردار کے جنون نے اسے عبرتناک انجام سے دو چار کر دیا لیکن جس خوب صورتی سے اس نے یہ دونوں کردار نبھائے داد دینی پڑے گی۔ اعلیٰ تحریر، فرض...... بوائڈ نے مر کر ایک خوب صورت فرض ادا کیا۔ واقعی انسان نرم بھی ہے اور گرم بھی۔ سنگ دل بھی رحم دل بھی۔ دو عورت، ایک فیچ لنک اور الجھی ہوئی تحریر۔ جس میں پوشیدہ بہت کچھ رہا اور اس پوشیدگی میں ہمدردی اور وفاداری کا عنصر شامل تھا۔ چینی اور آرٹ کا منصوبہ بہت ہی زبردست پر زیادہ دیر چھپا نہ رہ سکا۔ پیار اور خلوص میں اس حد تک بھی جانا پڑ جاتا ہے۔ خزانے کا عفریت سسپنس سے بھرپور تحریر رہی۔ لالچ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا اور لالچ جب خزانے کا ہو تو انسان کو جنونی بنا دیتا ہے۔ جیک میڈلن نے بھی کیا کیا جتن کیے پر انجام وہی ہوا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ انگارے کی قسط اس دفعہ کافی سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ جنگ کا ہونا، شاہ زیب کا کامیابی سے فرار ہونا، کامیاب کندھے کا آپریشن، زینب کا الجھاوا اور ایک دفعہ پھر شاہ زیب، قسطینا کا دشمن علاقے میں گھسنا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا کی طرح اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ آوارہ گرد کی یہ قسط کچھ ہلکی مگر شاندار رہی۔ زیادہ ایکشن بھی اب بور کرنے لگا تھا۔ شہزی کا بربیوں کے درمیان جانا کسی نئے فتنے کا ساماں لگتا ہے۔ اور اینڈ پر دھماکوں نے ثابت بھی کر دیا۔ سوشیلا کے بارے میں بھی اگلی قسط میں جا کر معلوم ہو شاید۔ مجموعی طور پر یہ قسط اچھی رہی۔‘‘

رانا بشیر احمد ایاز احسان پور ضلع رحیم یار خان سے لکھتے ہیں ’’نئے سال کی آمد کا اعلان 29 دسمبر کو جاسوسی کے دستیاب ہونے سے ہی ہو گیا۔ سرورق پر اس دفعہ بھارتی اداکارہ پریانکا چوپڑا کی ہم شکل حسینہ بالوں کو کھلا چھوڑے، آسمانی رنگ کا سوٹ زیبِ تن کیے ہاتھ میں پستول تھامے 2017ء کی مبارکباد دیتی نظر آئی۔ سرخ رنگ کے بیک گراؤنڈ میں بابر عباس بھائی تھری پیس سوٹ پہنے چہرے پر خراشیں لگوائے رحم طلب نظروں سے پستول کو دیکھ رہے تھے۔ بزمِ یاراں میں داخل ہوئے تو اس مرتبہ منصور حبیب بلیجو براجمان تھے۔ کافی دلکش اور بہترین تبصرہ رہا۔ مبارکاں جناب۔ کرسیِ وزارت پر محمد صفدر معاویہ بھائی اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ رونقِ محفل بنے رہے۔ شہرِ قائد کو چھوڑ کر معاویہ بھائی پشاور میں باجی طاہرہ گلزار کے پڑوس میں آ بسے ہیں۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ آپ کو پشاور میں بھی کامیابی عطا کرے۔ بھائی عبادت کاظمی آپ نے مختصر تبصرہ کیا مگر شاندار لکھا اور یہ آپ کا بڑاپن ہے کہ آپ نے اتنے اچھے الفاظ استعمال کیے۔ انگاروں کی تپش محسوس کرتے ہوئے انیق اور شاہ زیب کی کارکردگی ملاحظہ کی۔ مغل صاحب کی ہیروئن ہمیشہ شادی شدہ یا منگنی شدہ کیوں ہوتی ہے؟ یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ آوارہ گرد اب بہت بورنگ ہو گئی ہے۔ کہانی میں فینٹیسی بڑھ گئی ہے اور ٹیمپو بہت تیز ہے۔ بھٹی صاحب ہتھ ہولا رکھیں۔ منظر امام آخر کار اس دفعہ استاد نرالے عالم کو واپس لے ہی آئے۔ استاد صاحب اس دفعہ بھکاریوں کو چونا لگا گئے۔ پہلے تو حیرانی ہوئی کہ استاد بے ایمان کیسے ہو گئے مگر پھر پتا چلا کہ ایک غریب و مجبور عورت کی مدد کرنے کے لیے یہ سارا کھیل کھیلا تھا۔ محسن صدیقی کالی زندگی میں پتا نہیں کیا کہنا چاہ رہے تھے، سمجھ نہیں آئی۔ پہلے رنگ میں زویا اعجاز ہمارے ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ہونے والی غیر قانونی سرگرمیوں پر قلم کے جوہر دکھاتی نظر آئیں۔ ارسلان شاہ کا بھیانک چہرہ ششدر کر گیا۔ ثمرہ عاقب کو جرمِ بے گناہی کی سزا ملی اور ارسلان شاہ ڈارک ہنٹر کے ذریعے معیز بیگ کے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچا۔ زویا اعجاز کی تحریر میں کاشف زبیر کی جھلک نظر آئی۔ وہی کہانی پر گرفت۔ دوسرے رنگ میں اسما قادری کا نام جگمگا رہا تھا۔ کہانی صرف دو چار کرداروں کے گرد گھومتی رہی۔ تمکین رضا کی وفادار معقول تھی۔ دیگر ترجمہ شدہ کہانیاں بس گزارے لائق تھیں۔‘‘

درابن کلاوڈی آئی خان سے مرحا گل کی گل کاریاں ''جنوری 2017ء کا خوب صورت ٹائٹل سے سجا ڈائجسٹ سامنے پڑا ہمارے دل کو لبھا رہا ہے۔ نئے سال کے موقع پر ایک گول مٹول خوب صورت ماڈرن افغانی جوڑا جاسوسی کے ٹائٹل کو سجا گیا۔ نئے سال کے موقع پر بہت سے نئے دوست محفل میں رونق لگانے پہنچ گئے جس سے خوب رونق بچی۔ منصور حبیب صدارت مبارک ہو۔ محمد صفدر بھیا کی قابلِ غور باتیں کافی غور سے پڑھیں۔ بھئی اپنی سالگرہ تو بہاروں کے مہینے جس مہینے گل کھلتے ہیں، بہاریں جھومتی ہیں، ہوائیں، خوشبوئیں بکھیرتی ہیں بس اس مہینے مرحا گل کی سالگرہ 3 مارچ کو ہوتی ہے اور آپ کو ہمارا گفٹ تیار رکھنا ہے دعاؤں کا۔ عبادت کاظمی اللہ تعالیٰ آپ کو نیا سال کافی ساری خوشیاں دے آمین، ویسے آپ کی شریکِ سفر کی ڈیتھ کیسے ہوئی؟ سب سے پہلے اپنے موسٹ فیورٹ ناول انگارے کو پڑھا۔ سرد دسمبر میں اب کی بار یہ انگارے واقعی انگارے کی طرح لگے۔ جب سے سجاول گیا ہے کہانی میں لگتا ہے دم نہیں لیکن کہانی نہایت سنسنی خیز موڑ لے کر آگے بڑھ رہی ہے۔ دیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں کہ آگے کہانی کتنے بل کھاتے موڑ لے کر آتی ہے اور ہمیں بھی ساتھ دوڑاتی ہے۔ آوارہ گرد ایک قرار دینے والی کہانی ہے واقعی ایسی شاہکار کہانیاں جاسوسی والے ہی لکھ سکتے ہیں۔ اس ماہ جاسوسی ڈائجسٹ کی جان رگِ جاں نے ہمیں ہماری جان ہی لوٹا دی۔ ویلڈن اسما قادری۔ مون کے لیے وہ نائٹ تو صحیح معنوں میں مون نائٹ ہی ثابت ہوئی ہو گی۔ پہلا رنگ پڑھ کر دل ہی جل گیا۔ دل چاہتا ہے الوؤں کے پٹھوں کو الٹا ہی لٹکا دوں بہرحال بہت دھماکے دار رنگ لے کر حاضر تھی زویا اعجاز۔ پلیز ایک التجا ہے کہ آخری صفحات پر کچھ پرانے شامی تیمور والے رنگ لے آئیں، کم از کم چار دفعہ تو ضرور حاضر ہوں اگر زیادہ نہیں ہو سکتے تو...... پلیز ان میں میری جان ہے میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتی ہوں۔ پہلی کہانی برعکس حساس دلوں کے لیے ایک دکھی تحریر تھی۔ منظر امام کی تحریر میں بہت بڑا سبق موجود ہوتا ہے جو ہمارے دماغ کو کھول دیتا ہے۔ کالی زندگی دسمبر کی کالی سرد رات میں یہ کہانی کسی ہارر موی کی طرح لگی۔ ویلڈن محسن صدیقی! سال کے بارہ مہینوں میں دسمبر کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ شاعری، اداس شامیں، محبت اور بارش۔ 2016ء میں کاشف زبیر، محی الدین نواب، مختار آزاد ہم سے بچھڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نئے سال کا سورج ہم سب کی زندگی میں خوشیاں و کامیابیاں لے کر آئے۔''

فورٹ عباس سے عمر فاروق ارشد کی پہلی حاضری ''عرصہ دس سال سے خاموشی کے ساتھ جاسوسی پڑھتے ہوئے اس بار تبصرہ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ نئے سال کے لحاظ سے سرورق زیادہ متاثر کن نہیں تھا۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر انکل رضائی میں گھس کے ٹائٹل ترتیب دیتے ہیں۔ اب بھلا بند رضائی میں نئے آئیڈیاز کہاں سے نازل ہوں گے۔ (یقیناً) سعدیہ قادری صاحبہ میرا مشورہ ہے کہ ہمارے جیجا جی کو زیادہ تنگ نہ کیا کریں۔ یہ نہ ہو کہ وہ جاسوسی لانا بند کر دیں اور آپ تارے گنتی رہ جائیں۔ صفدر معاویہ، اللہ آپ کو ہمت دے۔ آپ پر گزرے سانحہ کا جان کر دکھ ہوا۔ میری طرف سے تعزیت قبول فرمائیں۔ چنیوٹ سے لیلیٰ کوثر صاحبہ حاضر تھیں۔ بہت ہی نفیس اندازِ بیاں ہے۔ ہو سکے تو اگلی دفعہ تبصرے کے ساتھ چنیوٹ کا فرنیچر بھی بھیج دیجیے گا۔ ادارے کے دفتر میں کام آئے گا۔ اپنے عبادت کاظمی بھی موجود ہیں وہی شوخ و شریر انداز۔ تیکھے اور کٹیلے جملے۔ مولا خوش رکھے۔ ابتدائی صفحات پر حسام بٹ کی کہانی عمدہ تھی مگر بیچ میں کہیں کہیں ٹمپو اتنا سست تھا کہ کچھوے کی پیٹھ پر سواری کا احساس ہونے لگتا۔ منظر امام صاحب کا اپنا ایک مخصوص اسٹائل ہے جو ہمارے دل میں اتر جاتا ہے مگر اس دفعہ استاد نامی کردار نے دماغ کا بھرکس نکال دیا۔ گویا استاد نہ ہوا لکھنؤ کا بانکا ہو گیا۔ ثقیل پن کے سارے ریکارڈ توڑ کے رکھ دیے۔ ہم نے موٹے موٹے الفاظ کے معنی پوچھ پوچھ کر دادا جی کو بھی ڈسٹرب کر دیا۔ بہرحال کہانی کا اختتام جاندار تھا۔ مختصر کہانیوں میں فنکار سب سے عمدہ رہی۔''

اٹک جیل سے اسرار ساقی کی تبصرہ نگاری ''شمارہ ملتے ہی موسم نے انگڑائی لی اور بارانِ رحمت برسی، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ طویل عرصے بعد بارش ہوئی۔ خیر اس موسم کو مزید خوب صورت ہمارے پیارے جاسوسی نے بنایا۔ شمارے پر نظر پڑی، ٹائٹل سالِ نو کی طرح بہت پیارا تھا۔ پیارے بھائی محترم صفدر معاویہ کے والد کا سن کر انتہائی دکھ ہوا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین! بھائی اس دکھ کی گھڑی میں آپ کے ساتھ ہوں آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ ابتدائی صفحے پر منصور حبیب براجمان تھے۔ جناب کا ذوق انتہائی اچھا ہے۔ رانا بشیر احمد ایاز خوب صورت انداز میں تبصرہ کرتے نظر آئے۔ وارث علی صاحب کی حاضری خوب رہی۔ ادریس احمد خان، پرویز لانگاہ، اے ایچ کاظمی کے تبصرے اچھے لگے۔ چنیوٹ سے لیلیٰ کوثر بھی خوب صورت انداز میں انٹری دے رہی تھیں۔ راجن پور سے ماہ تاب گل کا تبصرہ جاندار تھا۔ عبادت کاظمی رسالہ لیٹ ملنے پر پریشان نظر آئے، پر تبصرہ خوب کیا۔ بہاولپور سے مومنہ کشف کو ویلکم! اچھا تبصرہ تھا پر اپنا دل تھوڑا بڑا کر لیں کیونکہ آپ کا خط شائع ہو گیا ہے۔ اس مرتبہ طاہرہ گلزار، مرحا گل، عبدالجبار رومی، بلقیس خان، عباس برادران، محمد اقبال کو بڑا یاد کیا۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف، سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ طاہر جاوید مغل دی گریٹ شاہ زیب بڑی خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ قسطینا کا کردار انتہائی خوب صورت اور جاندار ہے۔ سیف کا تاجور سے رشتہ کہانی کو مزید دلچسپ بنا دے گا۔ اب آگے دیکھتے ہیں کہ شاہ زیب تاجور سے مل پاتے ہیں کہ نہیں۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی۔ شہزی واقعی آوارہ گرد بنا ہوا ہے۔ سونگ کھلا کا انجام اسی طرح ہونا چاہیے تھا۔ شہزی کے منع کرنے کے باوجود اس نے کہنا نہیں مانا خود بھی جان سے گئی اور شہزی کو پھنسا دیا۔ شہزی اپنے ساتھیوں کو کھوجنے میں کامیاب تو ہو گیا ہے پر بلراج سنگھ کی صورت میں اس کے سامنے ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ شہزی اس مشکل مرحلے سے کیسے نکلتا ہے۔ اس کے بعد تاوان پڑھی کافی سبق آموز کہانی تھی۔ ارسلان شاہ جیسے ناسور ہمارے معاشرے میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ نمرہ اور اس کے بھائی کی ذہانت کے کیا کہنے۔ کہانی کا انجام بڑا اچھا تھا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔ محمد صفدر معاویہ، خانیوال۔ محمد جاوید خان، تحصیل علی پور۔ بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس، کھاریاں۔ ادریس احمد خان، کراچی۔ سجاد علی شگری، گلگت بلتستان۔ انجینئر محمد یاسر سعادت، راولپنڈی۔ ساگر تلوکر، میانوالی۔

جنونِ وفا

پروین زبیر

کرکٹ کی دنیا کا چمکتا ستارہ... دنیا بھر میں اس کے کروڑوں چاہنے والوں میں وہ لڑکیاں بھی شامل تھیں جو اس کی ایک جھلک، ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کردینے پر تیار تھیں اور وہ ہر میدان میں کھل کر کھیل رہا تھا... ان سب کے درمیان وہ بھی ایسی ہی لڑکی تھی جس کا دعویٰ تھا کہ ایک وقت آئے گا جب اس کے عروج کا سورج ڈھلے گا اور سب اس سے دور ہو جائیں گے... تب وہ اسے بتائے گی کہ "میں ہوں جو تم سے سچی محبت کرتی ہوں، تمہارے اسٹارڈم سے نہیں" وہ کھلاڑی کے سحر کی اسیر تھی اور کوئی تیسرا اس کی محبت کا اسیر تھا۔ لیکن ایک دن وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی... وہ اسے ڈھونڈتا رہا پھر اک سراغ ہاتھ لگا... کون تھا مجرم جس نے اس کی آرزو کو اس سے چھین لیا تھا... وہ سرگرداں رہا پھر انکشاف ہوا کہ غلطیاں تو ہمیشہ سے وہی کرتی آئی تھی... سو اس بار بھی غلطی اسی کی نکل آئی۔

محبت کی رعنائیوں اور آنکھوں کے فریب میں

پور پور ڈوبے جنوں پسندوں کی وفا پرست داستاں......

اسٹیڈیم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کانٹے دار مقابلہ چل رہا تھا۔ پہلے ون ڈے میں انگلش ٹیم اچھا خاصا بڑا اسکور کر چکی تھی اور قومی ٹیم اس کو چیز کر رہی تھی۔ ہر بال اور ہر ہٹ پر تماشائی بھرپور جوش و خروش سے اپنی اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ زیادہ تر انکلوژر میں انگلش تماشائی اپنی ٹیم کی بالنگ اور فیلڈنگ پر تالیاں بجا کر داد دے رہے تھے جبکہ صرف ایک جنرل انکلوژر تھا جہاں ہر طرف قومی پرچموں کی بہار تھی۔

ایک شورِ قیامت اٹھتا تھا ہر اچھی ہٹ پر...... اور جو بال باؤنڈری کراس کر جائے تو نعروں، سیٹیوں، باجوں اور بوتلیں بجانے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک ہنگامہ بپا تھا۔

☆☆☆

"امی! ذرا دیکھیے گا، یہ کہیں آپ کی لاڈلی بھتیجی تو نہیں ہے؟" ارسل نے ٹی وی پر میچ دیکھتے ہوئے ماں کو ٹی وی کی طرف متوجہ کیا جہاں اپنی قومی ٹیم انگلینڈ سے ون ڈے کھیل رہی تھی اور اس میچ کو براہِ راست دکھایا جا رہا تھا۔

"کہاں ہے؟" انہوں نے ارسل کو چائے کا مگ تھماتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹھ جائیے! ابھی کیمرا ہٹ گیا ہے۔ دوبارہ زوم کرے گا تو وہ لازمی نظر آئے گی۔ سبز قمیص اور سفید ٹراؤزر میں ہے۔'' ارسل کے کہنے پر وہ بھی ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئیں۔

بالر نے اسٹارٹنگ پوائنٹ سے دوڑنا شروع کیا تو تماشائیوں کی یکساں آواز، اس کی رنگ کے بیک گراؤنڈ میں گونجی۔ اس نے بال پوری طاقت سے بیٹسمین کی جانب پھینکی اور بیٹسمین نے ایک زبردست فلک کے ساتھ بال باؤنڈری سے باہر پھینک دی۔

جنرل انکلوژر میں ایک شور قیامت بپا ہوگیا۔ قومی پرچم لہرانے لگے۔ سارے تماشائی کارڈ ہوا میں لہراتے ہوئے خوشی سے اچھل رہے تھے۔ کیمرے وہاں کے مناظر دکھا رہے تھے کہ ایسے میں ہی کیمرے نے اس شرارے کو فوکس کیا۔

سبز قمیص اور سفید ٹراؤزر پہنے، سر پر کاغذی کیپ لگائے وہ کرسی پر کھڑی ...... دونوں ہاتھ لہراتے ہوئے پورے جوش و خروش سے نعرے لگا رہی تھی۔ کیمرے نے اس کے چہرے کو فوکس کیا۔ اس کا چہرہ اور کان لال سرخ ہو رہے تھے۔ گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور وہ پوری طاقت سے چلا چلا کر ''حسنات! حسنات'' کے نعرے لگا رہی تھی اور ہاتھ میں پکڑے اس کے فوٹو پوسٹر کو زور زور سے لہرا رہی تھی۔

حسنات خان چھٹے نمبر پر بیٹنگ کے لیے آیا تھا۔ وہ قومی ٹیم کا مایہ ناز آل راؤنڈر تھا۔ گورے رنگ اور نیلی آنکھوں کے سبب وہ انگریز ہی نظر آتا تھا۔ سنا تھا کہ پاکستان کے کسی بڑے جاگیردار کا بیٹا ہے۔ بچپن میں ہی پڑھنے کے لیے لندن آگیا تھا اور اس وقت بھی آکسفورڈ یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ یہیں اس نے کرکٹ کھیلنا سیکھی لیکن انگلینڈ کی نیشنلٹی رکھنے کے باوجود...... اپنی قومی ٹیم میں کھیلنا پسند کیا۔

''ارے ہاں! یہ تو نویرہ ہی ہے۔ اسے کرکٹ سے اتنی دلچسپی کب سے ہوگئی؟ دیکھو تو، کس طرح پاگل ہو رہی ہے۔ کرسی پر کھڑے ہو کر اس طرح نعرے لگا رہی ہے...... اچھل کود کر رہی ہے...... گر گئی تو؟'' ثمینہ نے بھتیجی کی فکر کرتے ہوئے سوال کیا تو ارسل ہنس پڑا۔ تقریباً سب ہی کا یہی حال تھا۔

ارسل بڑے شوق سے میچ دیکھ رہا تھا۔ بالر کے اسٹائل، بیٹسمین کے چوکے چھکے، میچ کی اپ ڈاؤن ہوتی پوزیشن، ڈاٹ بالز اور نو بالز...... سب کا وہ باقاعدہ حساب کتاب رکھ رہا تھا اپنے ذہن میں......

لیکن اچانک ہی یہ سب چیزیں ذہن سے غائب ہوگئیں اور اب وہ صرف اس انتظار میں تھا کہ کب کوئی اچھا شاٹ لگے۔ وہاں جنرل انکلوژر میں ہنگامہ ہو، کیمرا زوم اِن کرے...... اور بہاروں کا وہ منظر اسکرین پر پھیل جائے جس میں ایک گلگوں چہرہ سبز لباس کے پس منظر میں رنگوں اور روشنیوں کا فسوں پھیلا رہا تھا۔

نویرہ اس کی ماموں زاد تھی۔ ماموں سالوں سے لندن میں رہائش پذیر اور کنسٹرکشن کا بہت اچھا بزنس کر رہے تھے۔ ملک کے حالات سے بددل تھے لیکن سال میں ایک مرتبہ اپنی اکلوتی بڑی بہن سے ملنے پاکستان ضرور آتے تھے مع اپنی فیملی کے۔ رامس اور نویرہ دونوں ہی ارسل کے ہم عمر تھے اس لیے ان میں گہری دوستی تھی۔ اور وہ دس بارہ دن کا یہ وقت گھومنے پھرنے اور ایڈونچر کرنے میں گزارتے اور یہ ایڈونچر زیادہ تر نویرہ کے ہی ہوتے تھے۔

☆☆☆

سیٹلائٹ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس کی مخصوص رنگ ٹون سنتے ہی شاہ صاحب نے اخبار لپیٹ کر رکھا اور فون اٹھایا۔

''شاہ صاحب! ایک نمبر نوٹ کر لیجیے۔ اس نمبر سے آپ کے پاس فون آئے گا۔ اس بندے سے میٹنگ سیٹ کر لیجیے گا۔ وہی آپ کو کام کی ساری تفصیل بتائے گا۔'' غلام محمد نے لندن سے فون کر کے انہیں اطلاع دی تھی۔ انہوں نے نمبر نوٹ کیا اور فون بند کر دیا۔ ناگواری کے تاثرات ان کے سرخ و سفید چہرے پر پھیل گئے تھے۔

ایک گھنٹے بعد ہی اسی سیٹلائٹ فون پر اسی نمبر سے کال آگئی۔

''شہزاد انور بات کر رہا ہوں۔ امید ہے میرے بارے میں اطلاع آپ کے پاس آچکی ہوگی، کب حاضر ہو جاؤں؟''

''کتنی دیر میں آسکتے ہو؟'' شاہ صاحب نے سرد مہری سے پوچھا۔

''ایک گھنٹے میں۔''

''ٹھیک ہے۔''

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ آنے والا اپنے ساتھ ایک لیپ ٹاپ لے کر آیا تھا۔

''آپ کے صاحب زادے نے آپ کو بہت کچھ بتا

دیا ہوگا لیکن پھر بھی بھیجنے والوں نے آپ کو ایک ویڈیو دکھانے کے لیے کہا ہے اگر اجازت ہو تو شروع کروں یا کھانے کے بعد؟'' شہزاد انور نے بیگ سے لیپ ٹاپ نکال کر ٹیبل پر رکھا۔

''کھانے کو چھوڑو...... دکھاؤ کیا دکھانا ہے۔'' شاہ صاحب نے نہایت بدمزگی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا تو شہزاد انور نے سر ہلاتے ہوئے لیپ ٹاپ آن کیا اور ایک ویڈیو اسٹارٹ کردی۔ جیسے جیسے ویڈیو آگے بڑھ رہی تھی، شاہ صاحب کا چہرہ خطرناک حد تک لال ہوتا جارہا تھا۔ شاید غصے نے انہیں کھولا دیا تھا۔

''بند کرو یہ بکواس۔'' وہ غصے میں دہاڑے تو ملازم نے فوراً کمرے کے دروازے کو کھول کر اندر جھانکا اور سوالیہ نظروں سے اُن کو دیکھا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے واپس جانے کو کہا اور اسی عالم میں آنے والے کو گھورنے لگے۔

''شاہ صاحب! میں صرف ایک پیغامبر ہوں، جو کچھ مجھے آپ کو بتانے کے لیے کہا گیا، میں نے آپ کو کہہ دیا۔ اب آپ جو کچھ کہیں گے۔ وہ میں متعلقہ پارٹی کو کہہ دوں گا۔ آپ سوچ لیں میں دو دن بعد حاضر ہو جاؤں گا۔''

''خانہ خراب! ایک دو دن بعد بھی یہی گند لے کر آجاؤ گے۔ تمہارے لوگ مجھے کیچڑ میں گرانا چاہتے ہیں اور تم چاہتے ہو کہ میں ہنسی خوشی کیچڑ میں گر جاؤں؟''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ بدنامی اور رسوائی ایسی ہی بری چیز ہے۔ کوئی شخص اس میں خوش نہیں ہوتا۔ اسی سے بچنے کے لیے انہوں نے آپ سے تھوڑی سی مدد مانگی ہے۔ اگر آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں گے تو ان کی مدد کر کے آپ بھی نقصان میں نہیں رہیں گے۔ یہ تھوڑی سی زمین اور بڑی سی حویلی...... یہ تو کچھ بھی آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ ایک بہت بڑی سیلیبریٹی کے والد ہو، آپ کے پاس تو مل ہونا چاہئیں...... ایک نہیں ہر بڑے شہر میں کم از کم ایک...... پھر باہر بھی کچھ فلیٹ یا لاج وغیرہ...... سفر کے لیے اپنا جیٹ طیارہ اور اعلیٰ ترین پروٹوکول......''

''او بس کر! یہ جو تو سب کچھ کہہ رہا ہے، اس کی قیمت کیا لو گے تم لوگ...... میرے منہ پر کالک...... دنیا بھر میں میری اور میرے خاندان کی رسوائی۔''

''اگر آپ انکار کرتے ہیں تو شاید یہی سب کچھ ہو لیکن اگر آپ ان کی بات مان لیتے ہو تو...... آپ کا

اسٹیٹس بلند ہوگا۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' شہزاد انور نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''تم لوگوں نے اور اس خبیث نے مجھے فیصلہ کرنے کے قابل چھوڑا کہاں ہے جو کہہ رہے ہو کہ فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔ دو چار روز میں مکمل پلان لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کی طرف سے مثبت پیش رفت ہوگی۔''

☆☆☆

''رامس کے بچے! ٹھیک سے پکڑو! تمہاری سائڈ سے یہ نیچے ہو رہا ہے۔ ٹیڑھا لگ جائے گا۔'' وہ بیڈ پر چڑھی اپنے پسندیدہ اسٹار کرکٹر کا بڑا سا پوسٹر دیوار پر لگانے کے لیے اپنے بھائی کی مدد لے رہی تھی۔

''تم تھوڑا نیچے کرو کارنر، اس قدر اوپر چڑھا کر کیوں لگا رہی ہو؟'' رامس نے تنگ آکر کہا۔

''نہیں، یہ اوپر ہی لگے گا۔ کیونکہ نیچے مجھے دوسرے پوسٹر لگانے ہیں۔'' اس نے رامس کو جواب دیا اور آخر کار اچھی خاصی محنت کے بعد وہ حسنات خان کا بڑا سا پوسٹر دیوار پر لگانے میں کامیاب ہوگئی۔ اس پوسٹر میں وہ بڑی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ جلوہ گر تھا۔

''کیا خوب صورت ہے بھئی؟ بندر کا ہم شکل...... بالکل پھیکا شلجم، مسکراہٹ اس لیے کم آتی ہے اس کے ہونٹوں پر...... کیونکہ بے انتہا مغرور اور بددماغ ہے۔'' رامس نے جل کر تبصرہ کیا۔

''اللہ نے بنایا ہی اسے ایسا ہے کہ جتنا بھی غرور کرے، کم ہے اور تمہارا باقی تبصرہ...... تمہارے جلے دل کی پکار ہے کیونکہ جن میں خود کچھ نہیں ہوتا، وہ دوسروں کی خوبیوں سے جلتے ہیں۔ حسد کرتے ہیں۔ ہے نا؟'' اس نے رامس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''تم تو پاگل ہو۔ ایک اجنبی اور غیر شخص کے لیے تم اپنے بھائی کو ڈی گریڈ کر رہی ہو، شرم نہیں آتی تمہیں؟'' رامس نے غصے سے پوچھا۔

''اوں ہوں...... بالکل بھی نہیں، وہ تمہارے لیے اجنبی اور غیر ہوگا میرے لیے نہیں۔ میں اس کے بارے میں ایک ایک بات جانتی ہوں۔ نیٹ پر اس کے بارے میں جو کچھ موجود ہے، میں نے گھول کر پی لیا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی، اس کے کھیل کا ہر ہر مرحلہ، اسکورنگ، ہر چیز میری فنگر ٹپس پر ہے۔'' اس نے تیزی سے بولتے ہوئے بھائی کو

بتایا تو وہ حیرت سے منہ کھولے ستارہ گیا۔
''کریزی! ریئلی یو آر کریزی!'' وہ بڑبڑایا۔
''وہ تو میں ہوں۔''
بھائی سے گفتگو کے دوران میں وہ دیوار پر چسپاں پوسٹر کی نوک پلک سنوارتی رہی۔ اور آخر میں ایک کپڑے سے اس کی سطح کو رگڑ رگڑ کر چمکا دیا اور اب کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اس کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لے رہی تھی۔ رامس اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اس وقت اس کی موٹی موٹی شربتی آنکھوں میں قربان ہو جانے کا جو تاثر اسے نظر آیا، اس نے رامس کو بڑا مایوس کیا۔ وہ اسے اور اس کے پاگل پن کو دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کی بہن کتنی پاگل ہے۔ جو سراب کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔
رامس نے اس کا پاگل پن دیکھتے ہوئے اس کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کہاں سمجھنے والی تھی۔

☆☆☆

سورج نے ابھی سر نہیں ابھارا تھا۔ دور تک پھیلا گھنا جنگل اور اس کے پیچھے نظر آنے والا پہاڑی سلسلہ ابھی تک اوس میں بھیگا سرمئی سا محسوس ہو رہا تھا۔ خاقان علی شاہ نے گھوڑے کی رفتار سست کرتے ہوئے دور تک پھیلے اس خوب صورت منظر پر نظر ڈالی۔ دور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیت اور اس سے پرے جنگل...... یہ سب ان کی جاگیر کا حصہ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ پہاڑوں کے اس پار پڑوسی ملک کی آبادیاں ہیں۔ یہ پہاڑی سلسلہ دراصل ان کے اور ہمارے درمیان سرحد کا کام کرتا تھا لیکن ان سلسلوں میں بے شمار رخنے تھے جن سے اکثر ناپسندیدہ عناصر شرپسندی کے لیے یا چوری چھپے جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی طاقت کے حساب سے اس سلسلے پر ایک بند سا باندھا ہوا تھا لیکن مکمل طور پر اس سلسلے کو روکنے پر قادر نہ تھے۔
وہ گہری سوچوں میں غرق سست رفتاری سے گھوڑے کو چلاتے ہوئے حویلی کی طرف جا رہے تھے کہ دور انہیں جنگل سے دھواں اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔
''رستم! یہ جنگل سے دھواں کیسے اٹھ رہا ہے، کہیں آگ تو نہیں لگی؟'' انہوں نے ملازم سے پوچھا۔
''نہیں شاہ صاحب! آگ لگی نہیں ہے۔ آگ جلائی ہو گی، کل ہمارے فاریسٹ آفیسر نے اطلاع دی تھی کہ آپ کے دوست شہباز خان ایم این اے نے اپنے کچھ لوگوں کو جنگل میں کیمپنگ اور شکار کے لیے اجازت دینے کو کہا تھا تو انہوں نے تین دن کی اجازت دے دی تھی۔ وہاں وہی لوگ ہوں گے۔'' ملازم نے تفصیل بتائی۔
''اچھا، لیکن یہ بات میرے علم میں کیوں نہیں آئی؟'' خاقان شاہ نے ملازم کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔
''صاب یہ تو معمول کی بات ہے۔ شہباز خان آپ کے پرانے دوست ہیں اگر وہ کسی کو بھیجتے ہیں تو آپ کبھی انکار نہیں کرتے اس لیے شاید اطلاع دینا اتنا اہم محسوس نہیں ہوا مجھے...... میں معافی چاہتا ہوں۔'' ملازم نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔
''آئندہ خیال رکھنا، اس طرح کی کوئی بھی کارروائی ہو تو پہلے مجھ سے اجازت لو، فاریسٹ آفیسر کو بھی کہہ دینا، ابھی چلو۔ ذرا دیکھتے ہیں چل کر، کون لوگ ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟'' انہوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جنگل کے اس حصے کی طرف رخ کیا جہاں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔
''کون ہو تم لوگ؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' انہوں نے گونج دار آواز میں انہیں مخاطب کیا تو وہ سب ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ چار مرد اور دو عورتیں تھیں۔ انہیں دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ ان میں سے دو مرد اور ایک عورت غیر ملکی ہیں۔ مردوں کی طرح عورت بھی ٹی شرٹ اور ہاف پینٹ میں ملبوس تھی پھر ان میں سے ایک مقامی ان کی طرف بڑھا۔
''سر! ہم نے یہاں کیمپنگ اور شکار کا باقاعدہ اجازت نامہ لیا ہے، تین دن کے لیے۔ آج ہمارا پہلا دن ہے۔'' اس نے اجازت نامہ ان کی طرف بڑھایا تو خاقان شاہ نے ایک سرسری نظر اس پر ڈال کر سر ہلایا۔
''کس چیز کا شکار کرنے آئے ہو؟'' انہوں نے ان کا اسلحہ دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''سر! لومڑیاں...... اور اگر مل جائے تو ایک آدھ چیتا بھی...... اور کھانے کے لیے خرگوش۔''
''ہم م م م......'' انہوں نے غور سے اس آدمی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہنکارا بھرا اور آس پاس رکھی جدید رائفلوں کو غور سے دیکھا۔ کچھ چھوٹے ہتھیار بھی نظر آئے جبکہ ایک مقامی اپنے چاقو کی تیز دھار کو چیک کر رہا تھا۔
''خیال رہے، جتنی تعداد کی اجازت دی گئی ہے، اس سے تجاوز نہ کیا جائے۔'' انہوں نے اچٹتی سی نظر غیر ملکیوں پر

ڈالی جو اس صورتِ حال سے لاتعلق کافی پی رہے تھے۔ کیونکہ ہر طرف کافی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے عورت کے بارے میں محسوس کیا کہ وہ انہیں خاصی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اور اپنے مختصر لباس سے بھی اپنے آپ کو مزید نمایاں کرنے کی شعوری کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے اپنی بات مکمل کی اور گھوڑے کی باگیں موڑتے ہوئے اسے واپسی کے راستے پر ڈال دیا۔

''رستم! کچھ ایسا انتظام کرو کہ ان لوگوں کی ساری سرگرمیوں کی خبر ہمیں ملتی رہے کہ یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ دن میں بھی...... اور رات میں بھی لیکن اس بات کی خبر انہیں بالکل نہیں ہونی چاہیے کہ کوئی ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔'' وہ حویلی پہنچ چکے تھے۔ گھوڑا انہوں نے رستم کے حوالے کرنے کے بعد اسے یہ ہدایات دیں۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اپنے دفتر میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ ان کے سیلائٹ فون کی گھنٹی گنگنائی۔ انہوں نے اس پر ابھرنے والے نمبر کو ناگواری سے دیکھا اور کان سے لگایا تو انہیں غلام محمد کی آواز سنائی دی۔

''صاب! چھوٹے صاب آپ سے بات کریں گے۔''

''السلام علیکم بابا!'' ابھی اس نے سلام ہی کیا تھا کہ ان کا صبر وضبط جواب دے گیا۔ ''بابا کی خبیث اولاد! یہ تو نے کیا کیا؟ تجھے کوئی کمی رہنے دی تھی میں نے...... تیری ضرورت سے زیادہ دیا ہمیشہ...... پھر بھی اگر کوئی کمی تھی تو مجھے بتاتا۔ میں تجھے دفن کر دیتا پیسوں کے ڈھیر میں...... پر یہ تو نہ کرتا جو تو نے کیا۔ سالوں کی منتوں مرادوں سے مانگا تھا تجھے اللہ سے...... چھ بیٹیوں کے بعد اللہ نے تجھے دیا تھا، کیا اس لیے کہ تو میری اور میرے بزرگوں کی صدیوں میں بنائی عزت کو پامال کر ڈالے، کیوں کیا تو نے ایسا...... جواب دے، کیوں کیا؟'' وہ دہاڑے۔

''پر...... پر میں نے کیا، کیا ہے بابا؟'' اس نے گھبراہٹ میں ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا، کیا ہے؟ یہ مجھ سے پوچھتا ہے؟ کیا تو نہیں جانتا؟ جس وقت تو کسی منحوس سے پونڈوں کی گڈیاں وصول کر رہا تھا تو تجھے پتا تھا کہ اس ساری ادائیگی اور وصولی کی ویڈیو بن رہی ہے۔ تیری شکل اور تیری آواز اس میں بالکل صاف اور واضح محسوس ہو رہی ہے اور مجھے یہ سب دیکھ کر شرم آرہی تھی کہ یہ میرا بیٹا ہے۔'' وہ ضبط سے گھٹ کر رہ گئے۔

''ویڈیو؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں...... جو ویڈیو بناتا...... پھر......؟'' وہ بوکھلا گیا۔

''ہاں، کوئی نہیں تھا، سوائے کیمرے کے...... اور میری بدنصیبی کے۔''

''لیکن بابا! یہ تو سب ہی کرتے ہیں، کسی کے بارے میں بھی پتا کر لیں سب انوالو ہیں۔''

''ہاں، لیکن ویڈیو شاید سب کی نہیں بنائی گئی ہوگی اور وں کی بات اگر کھلی تو وہ شاید خود ہی بھگتیں گے لیکن تمہارا کیا ہوا صرف تم ہی نہیں بلکہ تمہارا سارا خاندان بھگتے گا، وہ بھی جو زندہ ہیں اور وہ بھی جن کی ہڈیاں تک گل چکی ہوں گی لیکن نام باقی تھا، ہم بھی بھگتیں گے۔'' ان کے لہجے کی آزردگی نے اسے بھی بے چین کر دیا۔

''بابا! میں اُن کے پیسے واپس کر دیتا ہوں۔''

''اب کوئی فرق نہیں پڑتا، تم نے جو کچھ لیا، اس کا ثبوت ہے۔ جو واپس کرو گے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔''

''پھر میں کیا کروں بابا؟'' وہ پریشان ہو کر بولا۔

''کچھ نہیں، عیش کرو، اب جو کچھ کرنا ہے، مجھ ہی کو کرنا ہے۔'' انہوں نے جھلاہٹ میں فون بند کر دیا۔

☆☆☆

''صبح ثاقب کا فون آیا تھا، وہ لوگ پندرہ دن بعد پہنچ رہے ہیں۔ جاذل تو کینیڈا جا چکا ہے، اب ان سب کا خیال تمہیں ہی رکھنا ہے ارسل۔'' ثمینہ نے بیٹے کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں ماں! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ کیونکہ ان دنوں میں یونیورسٹی سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لوں گا اور ان لوگوں کو جاذل بھائی کی کمی بالکل محسوس نہیں ہونے دوں گا۔''

''لیکن بیٹا! یہ تمہارا فائنل سیمسٹر ہے۔ ایک ہفتے کی چھٹی سے تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟'' ثمینہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

''نو مام، بالکل نہیں۔ اس لیے کہ ہم لوگوں کو فائنل تھیسس کی تیاری کرنا ہے اور ان تاریخوں کے فوراً بعد پروجیکٹ سب مٹ کرنا ہے اور اس کی تیاری کے لیے چھٹیاں تو ہمیں ویسے ہی ملیں گی۔ اس لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' ارسل نے ماں کو بتایا۔

''تو اس مہمان داری میں تم اپنا تھیسس کیسے مکمل کرو گے؟'' وہ پھر پریشان ہو گئیں۔

''ایسے کہ اس کی تیاری میں نے ابھی سے شروع کر

دی ہے، یہ جو آپ دیکھ رہی ہیں نا کہ اس ڈرائنگ بورڈ پر میں کتنے گھنٹوں سے کھڑا ہوں تو یہی کام تو کر رہا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا بنا رہے ہو؟'' انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میں نے جو تھیم منتخب کی ہے، وہ کچھ اس طرح ہے کہ بہت پرانی بلڈنگز، جیسے حویلیاں، محلات، قلعے، چرچ، مسجدیں...... اور اسی طرح کی تعمیرات...... جو گزرتے وقت کے ساتھ قدامت کا تاثر رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا ظاہر و باطن ایک سا ہی ہے۔ یعنی تعمیراتی اعتبار سے وہ جتنی پرانی باہر سے ہیں، اتنی ہی پرانی وہ اندر سے بھی ہیں۔ انہیں اب آثارِ قدیمہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

''میرا پروجیکٹ یہ ہے کہ کس طریقے سے ان قدیم شاہکار عمارتوں کے حسن کو بدنما کیے بغیر...... ان میں جدید سہولتیں فراہم کی جاسکتی ہیں اور میں بحیثیت سول انجینئر اس میں کیا کیا کمال دکھا سکتا ہوں۔'' ارسل نے ماں کی دلچسپی دیکھتے ہوئے انہیں تفصیلی جواب دیا۔

''ارے واہ! یہ تو بہت زبردست پروجیکٹ ہے۔ میں نے تو یہاں کراچی میں ہی اتنی خوب صورت قدیم عمارتیں دیکھی ہیں جن کا آرکیٹیکچر ہر دیکھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔ جیسے فریئر ہال، ایمپریس مارکیٹ، ہندو جم خانہ وغیرہ۔ تم جب مکمل انجینئر بن جاؤ تو ان عمارتوں کے بارے میں بھی سوچنا۔''

''بالکل، میری پیاری ماں! ضرور سوچوں گا لیکن اس وقت میں صرف ایک گرما گرم چائے اور اس کے ساتھ کچھ 'وائے' کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں، میں لے کر آتی ہوں۔'' ثمینہ یہ کہہ کر چلی گئیں۔ اس نے پنسل ہاتھ سے رکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر تھام لیا اور زیرِ لب بڑبڑایا۔

''کیسا پروجیکٹ؟ اور کون سا پروجیکٹ؟ والدہ! آپ نے خبر ہی ایسی سنا دی کہ ذہن میں موجود سارے خیالات پنچھی بن کر اُڑ گئے۔ اب میں انہیں کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر پکڑوں۔ ہو گیا میرا پروجیکٹ برائے مغفرت۔ اناللہ! بس اب تو وہ ہے، وہ ہے، صرف وہی ہے۔''

☆☆☆

رات تاریک تھی۔ گہرے اندھیرے میں جنگل میں ہوا کی سائیں سائیں خوفناک تاثر پیدا کر رہی تھی۔ وہ تینوں عجیب سا لباس پہنے، درختوں میں گھوم رہے تھے اور نہ جانے کیا کر رہے تھے کہ بظاہر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اندھیرے میں بھی وہ واضح طور پر دیکھ رہے ہیں۔ کسی درخت کے پاس رکتے، وہاں کچھ کرتے اور پھر پیچھے ہو جاتے۔

پتھروں کے درمیان ایک جگہ الاؤ دہک رہا تھا۔ اس میں چٹخنے والی لکڑیوں سے رہ رہ کر چھوٹی چھوٹی چنگاریاں اُڑتیں اور فضا میں تحلیل ہو جاتیں۔ کچھ دور خاکی سے رنگ کا ایک خیمہ لگا ہوا تھا۔ وہ لڑکی الاؤ کے نزدیک ایک پتھر سے ٹیک لگائے بے پروائی سے نیم دراز تھی۔

وہ درخت کی اونچی شاخوں میں چھپا، پتوں کی اوٹ سے ان کی حرکات وسکنات کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور وقفے وقفے سے ان کی تصاویر بھی لے رہا تھا۔

اس نے ان کی آخری تصویر لے کر کیمرا ایک شاخ میں نکلے ٹھنٹھ پر لٹکایا ہی تھا کہ ٹھائیں کی آواز آئی...... اور ایک جلتا ہوا انگارا اسے اپنے سینے میں اترتا محسوس ہوا۔ شدید ترین اذیت کا آخری احساس اس کے ذہن میں ہلچل مچا کے خاموش ہو گیا۔

گولی لگتے ہی ایک تومند انسانی جسم درخت کی شاخوں اور پتوں کو توڑتا، جھنجوڑتا نیچے جھاڑیوں میں آ کر گرا۔ ان میں سے ایک اٹھا اور اسے کاندھے پر لاد کر لایا اور الاؤ کے نزدیک ڈال دیا۔ اسے چھو کر دیکھا۔

''زندہ ہے؟'' اس نے اعلان کیا۔

''ہوش میں لاؤ۔'' دوسرے نے کہا تو وہ لڑکی خیمے سے ایک میڈیکل باکس اٹھا لائی۔ ایک نے اس میں سے ایک بوتل نکال کر مجروح کے چہرے پر کوئی دوا اسپرے کی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ کسمسایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ حلیے سے وہ کوئی مقامی دیہاتی نظر آتا تھا۔

''کون ہو تم؟ اور اتنی رات کو اس درخت پر چھپے کیا کر رہے تھے؟'' ایک نے سوال کیا تو مجروح نے لیٹے لیٹے اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ وہ سب اس کے چاروں طرف جمع تھے۔ اس کی نظر لڑکی پر پڑی تو وہ کچھ دیر اسے غور سے دیکھتا رہا پھر اذیت سے کھنچے اس کے ہونٹوں پر ایک بے نام سی مسکراہٹ ابھری۔

''اس کو دیکھتا تھا۔'' اس نے آنکھوں سے لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو انتہائی ناکافی لباس میں بے پروائی سے سگریٹ پی رہی تھی۔

''کیوں؟'' درشتی سے سوال پوچھا گیا۔

''ام کو اچھا لگتا ہے۔'' اس نے دیہاتی اسٹائل میں جواب دیا۔

"گو تھیل۔" ایک آواز آئی اور ایک گولی اس کی پیشانی کے درمیان پیوست ہوگئی۔ اس کی ہلکی سی آخری چیخ محدود ہو کر وہیں ختم ہوئی تھی کہ اچانک ایک گونج دار بف کے ساتھ ایک گرانڈیل کتے نے پستول بردار پر چھلانگ لگائی اور اسے لڑھکاتے ہوئے دوسرے ہتھیار بردار پر چھلانگ لگا کر پنجوں سے اس کا چہرہ ادھیڑتا ہوا دوسری طرف بڑھا ہی تھا کہ پہلے والے نے اپنے دور گر جانے والے پستول کو اٹھایا۔ کتے نے اس کے فائر کرنے سے پہلے ہی جھاڑیوں میں چھلانگ لگائی اور دوڑتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ پستول بردار نے جھنجلا کر اس سمت میں کئی فائر کر ڈالے جدھر کتا دوڑا تھا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کتا تاریکی میں گھنی جھاڑیوں کے اندر کہیں غائب ہوگیا۔ پھر باقی لوگ دونوں زخمیوں کی طرف متوجہ ہو گئے ان کو طبی امداد دی جانے لگی۔

"یہ کوئی جاسوسی کرنے والا تھا یا سچ مچ کوئی دیہاتی کسان ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے اسے جاسوس سمجھ کر مار ڈالا، اور وہ معصوم ہو۔" لڑکی نے سوال کیا۔

"اس کی تلاشی لو، کچھ نہ کچھ پتا چل ہی جائے گا۔" ایک شخص اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ ایک جیب سے ایک رومال اور پچاس روپے کے نوٹ نکلے جبکہ دوسری جیب سے نسوار کی دھاتی آئینے والی ڈبیا نکلی، اور کچھ نہ ملا۔

یہ تو واقعی کوئی دیہاتی ہی تھا، ڈیبورا کے چکر میں خوامخواہ مارا گیا۔" تلاشی لینے والے نے تبصرہ کیا۔

"ہو کیئرز، ایسے بہت سے مرتے رہتے ہیں، چلو اپنا کام کرو، وقت کم ہے۔" کسی نے درشت لہجے میں جواب دیا۔

ابھی وہ اٹھے ہی تھے کہ انہیں اندھیرے میں دور سے چکراتی ہوئی روشنیاں نظر آئیں جو اسی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"ہوشیار! کچھ گاڑیاں اِدھر آرہی ہیں۔ ڈیبورا! جلدی کرو، ساری مشکوک چیزوں کو محفوظ کر کے چھپا دو، جلدی ہری اَپ۔"

وہ کم از کم چار گاڑیاں تھیں جن کی روشنیاں تیزی سے بڑھتی آرہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ان کے آس پاس ہی آکر رک گئیں۔ ان میں سے کچھ لوگ نکل کر چاروں طرف پھیل گئے اور چند افراد ہاتھوں میں ٹارچ لیے ان کی طرف آنے لگے تو انہوں نے دیکھا کہ آگے آگے وہی کتا اچھلتا ہوا بڑھتا آرہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے ان کے فائرز کی زد سے نکل کر بھاگ گیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے آیا اور اس شخص کے سامنے آکر بری طرح بھونکنے لگا جس نے اس دیہاتی کو گولی ماری تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس آدمی کو بھنبھوڑ کر رکھ دے۔

"موتی! اِدھر آ۔" ایک آدمی نے اسے بمشکل قابو کیا اور ایک طرف ہٹایا تو جو چہرہ اس کے سامنے آیا، وہ خاقان علی شاہ کا تھا۔ وہ ہاتھ میں خطرناک گن اٹھائے، غضب ناک تیوروں سے اسے گھور رہے تھے۔

"تم نے وزیر خان کو کیوں مارا؟" انہوں نے گرج دار لہجے میں پوچھا۔

"میں نے اسے جان بوجھ کر نہیں مارا۔ وہ درخت پر چھپا ہوا تھا۔ درخت کی شاخیں ہلیں تو ہم سمجھے شاید کوئی تیندوا ہم پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ گھبراہٹ میں مجھ سے گولی چل گئی جس سے وہ مر گیا۔" اس گورے نے جس بے پروائی سے وزیر خان کو مارنے کی واردات کے بارے میں بتایا، اس نے شاہ صاحب کو سیخ پا کر دیا۔

"بہت خوب! گھبراہٹ میں ماری گئی گولی...... کیسے درست نشانے پر لگی ہے، واللہ...... تم لوگوں کو جانور شکار کرنے کی اجازت دی تھی۔ انسان نہیں۔ چلو! اٹھاؤ اپنا سامان اور ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ میرے علاقے سے...... فوراً...... ورنہ یاد رکھو، ہمارے ہاں قتل کی سزا...... قتل ہے۔" انہوں نے انتہائی ضبط سے ان لوگوں کو اپنا فیصلہ سنایا۔

"لیکن ہم لوگ تو یہاں مہینے بھر کی اجازت لے کر آئے ہیں۔" ایک گورے نے گھورتے ہوئے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اُن کی طرف بڑھایا۔

"ایک مہینا؟ یعنی تیس دن؟ کس نے دی یہ اجازت؟" انہوں نے کاغذ ہاتھ میں تھام کر روشنی میں دیکھا، اس میں صاف محسوس ہو رہا تھا کہ تین کے ہندسے کے آگے اضافی صفر بعد میں لگایا گیا ہے۔ وہ اور بھی آگ بگولہ ہو گئے۔

"تیس نہیں...... صرف تین دن کی اجازت تھی اور وہ تین دن ختم ہو گئے۔ شرافت سے رہتے تو کل آرام سے چلے جاتے لیکن تم نے میرے آدمی کو قتل کیا ہے اس لیے ابھی اور اسی وقت دفان ہو جاؤ، ایک منٹ رکنے کی اجازت نہیں ہے۔" وہ دہاڑے اور اجازت نامے کے کاغذ کو توڑ مروڑ کر آگ میں پھینک دیا۔

"لیکن ہم اپنا سامان...... " وہ کچھ کہنے لگا تھا کہ شاہ

صاحب نے اپنی گن کو لوڈ کیا اور اس گورے کے پیروں کے نزدیک ایک فائر کیا۔

''کچھ نہیں...... تمہارا یہ سامان بیچ کر...... پیسا ہم اس غریب آدمی کے گھر والوں کو دیں گے جس کو تم نے قتل کیا ہے صرف اپنی گاڑیاں لے جاسکتے ہو۔''

''لیکن کچھ ضروری چیزیں تو لے جانے کی اجازت دیں۔ ان کے بغیر ہم آگے کیسے جائیں گے؟'' لڑکی نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

''دس منٹ! صرف دس منٹ، جلدی کرو اور صرف ضروری چیزیں اور کچھ نہیں۔'' شاہ صاحب نے گھڑی کے ڈائل پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

وہ جلدی جلدی میں وہاں سے رخصت ہوئے تو ایک گاڑی اُن کے پیچھے تھی اور وہ پیچھے رہی جب تک وہ شکاری آگے نہیں نکل گئے۔ ان کے علاقے کی حدود سے آگے۔

وہ بھی اپنے آدمیوں اور مرنے والے کی لاش لے کر واپس حویلی آگئے۔

''انہوں نے مار ہی دیا اسے...... اب کیا پتا کہ اس نے کیا دیکھا اُدھر...... کوئی رپورٹ دی تھی اس نے؟'' شاہ صاحب نے کسی سے پوچھا تو ایک ہتھیار بند شخص آگے بڑھ آیا۔

''شاہ جی! اس نے بتایا تھا کہ وہ تصویریں لے گا۔ ہم نے اسے اندھیرے میں تصویریں بنانے والا کیمرا دیا تھا۔ یہ کیمرا اُدھر درخت کی شاخ پر ٹنگا ہوا تھا۔'' اس نے کیمرا شاہ صاحب کی طرف بڑھایا تو ایک دوسرے شخص نے آگے بڑھ کر لیا اور لیپ ٹاپ منگوا کر اس پر تصویریں دیکھنے کا بندوبست کیا۔

''خنزیر کی اولادیں! یہ اُدھر درختوں کے پاس کیا کررہے ہیں، مشکوک حرکتیں ہیں ان کی...... تم اپنے آدمیوں کو لے کر جاؤ...... جس جس درخت کے پاس یہ رکے ہیں، ان کو اچھی طرح دیکھو، انہوں نے وہاں کیا کیا ہے؟'' خاقان علی شاہ سخت غصے میں تھے لیکن ان کے اندر کہیں فکرمندی کے آثار بھی تھے۔

بادی النظر کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر اچانک دریافت ہوا کہ درخت کی لکڑی کے رنگ کے کچھ چھوٹے چھوٹے ڈیوائس ان درختوں میں اس طرح فٹ کیے گئے کہ کوئی ان کا سراغ نہ پاسکے اور شاہ جی کے ماہرین نے بتایا کہ یہ ڈیوائس، آڈیو اور ویڈیو سگنل کیچ کرتے ہیں اور ان کے ذریعے کہیں دور بیٹھے ہوئے لوگ اس علاقے میں ہونے والی سرگرمیوں کو ریسیونگ سسٹم پر بڑی آسانی سے مانیٹر کرسکتے ہیں۔

''اوئے یہ خبیث کی اولادیں کیا کرنا چاہ رہے تھے اِدھر...... کیوں لگایا یہ سسٹم؟ میرے علاقے میں کام کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے ہی چھپا کر......؟''

''جی شاہ جی! ہمارے علاقے میں پڑوسی ملک کی سرحد بہت نزدیک ہے اسی لیے اسمگلر وغیرہ تو آتے ہی رہتے ہیں۔ یہ بھی شاید یہی کام کرنا چاہتے ہوں گے۔ پر ذرا زیادہ بڑے پیمانے پر...... شاید اسی لیے ایسے انتظام کررہے ہیں۔'' بہرام خان نے تھوڑی وضاحت کی۔

''نہیں، میں اس علاقے کا مالک ہوں۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکنا ممکن نہیں ہے اور بھی لوگ آتے جاتے ہیں مگر میری اجازت سے...... اس طرح اپنی مرضی سے یہ کچھ بھی نہیں کرسکتے...... اب اگر گھسنے کی کوشش کریں تو سبق سکھاؤ اُن کو...... اور ہاں اپنے آدمیوں کو ہوشیار کردو، پہلے سے زیادہ چوکس ہوجائیں......''

''جی شاہ جی...... آپ کے حکم پر عمل ہوگا۔'' بہرام خان نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

☆☆☆

اپنے بستر پر اوندھا لیٹا وہ لیپ ٹاپ پر ماموں کے پچھلے ٹرپ کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔

پچھلے لان میں سائیکل چلانے کی کوشش میں وہ کس بری طرح چاروں شانے چت گری تھی پھر وہیں پڑے پڑے کس طرح ہاتھ ہلا ہلا کر ارسل کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ ساحلِ سمندر پر ریت سے گھروندے بناتے ہوئے، پھر گول گپے کھاتے ہوئے کس طرح اس کے منہ، ناک اور کان لال ہورہے تھے، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان کے ساتھ فٹ بال اور کرکٹ کھیلتے ہوئے...... یا پھر چیکو کے درخت پر چڑھ کر چیکو توڑتے ہوئے...... اس کا ہر ہر انداز نرالا تھا، دلربا تھا۔

وہ تصویریں دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس ایک سال میں...... اس کے اندر پتا نہیں کتنی تبدیلی آئی ہوگی۔

لیکن جو تبدیلی آئی تھی، وہ ارسل کو پہلی نظر میں دکھائی دے گئی تھی۔ ائرپورٹ کے گیٹ سے سب سے پہلے ماموں باہر آئے تھے۔ ان کی نظریں ہر طرف اپنی آپا اور بھانجے کو تلاش کررہی تھیں۔ ان کے پیچھے مامی برآمد ہوئیں۔ جدید لباس اور سیاہ چشمے کے ساتھ پُرنخوت انداز لیے، ان کے

بعد رامس...... اور سب سے پیچھے وہ تھی۔ بے فکری اور بے نیازی سے وہ اپنے شولڈر بیگ میں منہ ڈالے، کچھ تلاش کرتی ہوئی...... رامس اسے دیکھ کر رک گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا کہ وہ اس سے آٹکرائی...... ہڑبڑا کر سر اٹھایا تو ارسل سامنے ہی نظر آ گیا۔

''اوہ! ہائے ارسل!'' وہ نکاسی کے کوریڈور میں جانے کے بجائے، وہیں لگی ریلنگ کو چھلانگ لگا کر عبور کرتے ہوئے سیدھی ارسل سے آٹکرائی...... اور اس سے اس قدر گرمجوشی سے ہاتھ ملایا کہ اسے ہلا ڈالا۔

رامس نے بھی ایک نظر والدین پر ڈالی جو سامان کی ٹرالی لیے پورٹر کے پیچھے پیچھے طویل راستے سے باہر جا رہے تھے تو اس نے بھی بہن کی طرح چھلانگ لگا کر ریلنگ کو عبور کیا اور ارسل سے لپٹ گیا پھر وہ اسی طرح ہنستے بولتے باقی لوگوں سے جا ملے۔ ارسل نے گہری نظروں سے نویرہ کا جائزہ لیا تو اسے جس تبدیلی کا احساس ہوا وہ بڑی خوشگوار تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔

پھر ان کے وہی ہنگامہ خیز روز و شب شروع ہو گئے۔ دن بھر نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرنا، رات گئے دور دور جا کر آئسکریم، برگر کھانا، شور ہنگامہ......

اس دن بھی وہ تینوں شدید گرمی میں نہ جانے کہاں کہاں سے گھومتے پھرتے رات گئے واپس آئے تو مامی شدید غصے میں تھیں۔ انہوں نے بڑی ٹھیک ٹھاک کلاس لی۔

''خبردار! جو اب قدم بھی گھر سے نکالا۔ کل ہی واپسی کے لیے پیکنگ ہو جائے گی۔ ایک دن نہیں رکنے دوں گی تم لوگوں کو...... حالت دیکھو ذرا اپنی...... منہ لال ہو کر اب کالے ہو رہے ہیں۔ اور تم نویرہ! یہ تو لڑکے ہیں، تم لڑکی ہو کر اپنا کیا حشر بنا کر لائی ہو۔ دھوپ میں پھر پھر کر رنگ دیکھو ذرا...... کالا سیاہ ہوتا جا رہا ہے۔ واپس جاؤ گی...... تو کوئی پہچانے گا بھی نہیں...... چلو اپنے کمروں میں، آج میں دیکھتی ہوں...... تم لوگ رات کو کیسے نکلتے ہو۔''

مامی نے انتہائی غصے میں اپنا حکم سنا دیا اور وہ تینوں سیڑھیوں پر مرے مرے قدم رکھتے ہوئے، اوپر اپنے کمروں میں چلے گئے۔

ارسل نہا دھو کر باہر نکلا تو ذرا تازہ دم ہونے کے لیے...... پچھلا دروازہ کھول کر ٹیرس پر نکل آیا۔ لان کے درختوں کے پیچھے سے چودھویں کا چاند ابھر رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے گدگداتے جھونکے بہت فرحت بخش تھے۔ وہ وہیں ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ موسم اور ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبی سانس لی اور زیر لب کچھ گنگنانے لگا۔

اچانک اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ کھڑی ہوئی تھی۔

''ڈور نہیں کھلتا تو کیا ہوا؟ کھڑکی تو کھلتی ہے۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

وہ اس کی دیدہ دلیری پر حیران رہ گیا۔ وہ کہاں ٹِکی بیٹھنے والی تھی۔ سب گھر والوں سے چھپ کے اس نے باہر کھانے کا منصوبہ تشکیل دے دیا تھا۔ اور کود کے وہ تینوں اب گھر سے باہر تھے۔

باہر نکلے تو پتا چلا پیسے کسی کے پاس نہیں۔ تینوں نے اس کا حل بھی نکال لیا اور زمان خان سے پیسے ادھار لے لیے۔

رات کے دو بجے، وہ سستے اور مزے دار کھانے کی تلاش میں پتا نہیں کہاں کہاں گھومتے رہے، کیونکہ جیب میں صرف تین ہزار روپے تھے۔ وہ بھی ادھار کے، بڑے ہوٹل، ریسٹورنٹ بند ہو چکے تھے۔ اب تو کسی چھوٹے موٹے کھلے ریسٹورنٹ سے ہی کچھ مل سکتا تھا، وہ اندھا دھند انجانے راستوں پر کھانے کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔

''ارے رکو...... رکو...... رکو...... وہ دیکھو، وہ چھوٹا سا چھپر ہوٹل کھلا ہوا ہے۔ پراٹھے بن رہے ہیں، یہاں تک خوشبو آ رہی ہے۔'' نویرہ نے چلا کر روکا اور لمبی لمبی سانسیں لے کر پراٹھوں کی خوشبو سونگھنے لگی۔ سامنے ہی چھوٹا سا ہوٹل تھا۔

ان کے آرڈر پر تھوڑی دیر میں ایک لڑکا چنگیر میں پراٹھے اور اس پر انڈے کا آملیٹ لے کر آیا۔ ایک چھوٹی پلیٹ میں بالائی بھی تھی جس پر چینی پڑی ہوئی تھی۔ وہ سب کچھ ارسل کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

نویرہ دروازہ کھول کر نیچے اتری اور صاف ستھری فٹ پاتھ دیکھ کر انہیں بھی اشارہ کیا۔

''یہاں لے آؤ...... یہاں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔'' وہ بے تکلفی سے فٹ پاتھ پر بیٹھی تو وہ دونوں بھی بیٹھ گئے۔ آملیٹ بہت چٹپٹا اور پراٹھے نہایت خستہ اور کرکرے تھے۔

''میں نے اس سے زیادہ لذیذ کھانا زندگی میں کبھی نہیں کھایا۔ یار! کیا ذائقہ ہے اس عجیب و غریب آملیٹ کا......'' رامس نے بڑا سا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''یار! یہ انڈے کی ڈش کا کیا نام بتایا تھا تم نے؟''

ارسل نے لڑکے سے چائے لیتے ہوئے پوچھا۔

''انڈا گھوٹالا ہے صیب!'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''زبردست ہے،ایسا کرو...... ایک پلیٹ اور لے آؤ......اور ہاں پراٹھے بھی لے آنا۔''

نویرہ نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ مرچوں اور گرما گرم پراٹھوں کے سبب اس کی آنکھ ناک ایک ہو رہی تھی۔ منہ لال اور آنکھوں میں پانی نظر آ رہا تھا۔ سُوں سُوں بھی کر رہی تھی، ارسل نے دلچسپی سے اسے دیکھا اور ہنس پڑا۔

کھا پی کر وہ دودھ پتی چائے کے مزے لے رہے تھے۔

واپسی میں زمان خان کے لیے انہوں نے چائے لے لی تھی...... چائے دیکھ کر وہ خوش ہو گیا اور فوراً دروازہ کھول دیا۔

پھر دھکا دے کر گاڑی اندر پہنچانے میں مدد کی۔ ان تینوں کے ٹیرس پر پہنچنے کے بعد سیڑھی واپس اپنی جگہ رکھی۔ اوپر کھڑے ان تینوں کو بتیسی دکھاتے ہوئے یاد دہانی کروائی۔

''ارسل صیب! کل تین ہزار تین سو مبلغ۔'' ارسل نے مُکا دکھایا تو وہ ہنستا ہوا گیٹ کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

وہ حویلی کی دوسری منزل پر بالکنی میں کھڑے کھڑے...... دور تک پھیلی حویلی کی چار دیواری اور بہت فاصلے پر موجود اس کے بڑے سارے گیٹ کے داخلی حصے کو دیکھ رہے تھے۔ جس کے دونوں جانب محافظوں کی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔

وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھے۔ چہرے پر سختی کے ساتھ ساتھ ہلکے ہلکے فکرمندی کے سائے بھی پھیلے ہوئے تھے۔

''شاہ صیب! آپ کا فون ہے۔'' ملازم سیٹلائٹ فون لیے سامنے کھڑا تھا۔ انہوں نے جیسے ہی فون کا بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ ایک اجنبی اور کھردری سی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا شاہ صاحب۔''

''کیا اچھا نہیں کیا میں نے؟''

''آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ میں کس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ سمجھتے ہوئے بھی نہیں سمجھنا چاہتے تو میں وضاحت کر دیتا ہوں کہ آپ نے جن شکاریوں کو اپنے جنگل سے دھمکیاں دے کر اور خوف زدہ کر کے نکالا ہے وہ ہمارے آدمی تھے۔''

''پہلی بات تو یہ کہ میں تمہیں ہی نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور دوسری بات یہ کہ انہوں نے جانوروں کا شکار کرنے کے بجائے انسانوں کا شکار کرنا شروع کر دیا تھا۔ میرے ایک مزارع کو انہوں نے گولی ماری تھی۔ میرے علاقے میں ان کی یہ جرأتیں برداشت نہیں کی جا سکتیں۔'' شاہ جی کا لہجہ تیکھا تھا۔

''وہ آپ کا مزارع نہیں تھا بلکہ آپ کا جاسوس تھا۔ وہ چھپ کر ہمارے آدمیوں کو دیکھ رہا تھا۔''

''تمہارے ان منحوس صورت حرام مردوں کو کوئی کیوں دیکھے گا۔ وہ جو ایک بے شرم، بے غیرت لڑکی کو لے کر آئے تھے۔ جو آدھے کپڑوں میں برہنہ پھرتی تھی، اس نے اس معصوم آدمی کی نیت میں فتور پیدا کیا اور وہ اسے دیکھنے کے لیے چھپ کر درخت پر بیٹھا تھا جسے ان لوگوں نے گولی مار کر جان سے مار دیا۔ ہم سب کا دل چاہ رہا تھا کہ اس بے ہودہ لڑکی کو گولی مار دیں...... پیشانی پر، دونوں آنکھوں کے بیچ میں۔'' وہ غصے میں تلملاتے ہوئے بولے۔

''آپ جانتے ہیں کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ وہ ہمارے لوگوں پر نظر رکھنے کے لیے وہاں بٹھایا گیا تھا۔'' دوسری جانب سے انتہائی ٹھنڈے لہجے میں کہا گیا۔

''اور تم بھی جانتے ہو کہ یہ سارا علاقہ میری ملکیت ہے۔ یہاں کوئی دوسرا آ کر اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔ اس لیے آئندہ میرے علاقے میں گھسنے کی کوشش بھی نہ کرنا، ورنہ......''

''شاید آپ کو اپنے بیٹے سے بالکل بھی پیار نہیں ہے۔ ایسا بیٹا جس نے دنیا میں آپ کا اور آپ کے خاندان کا نام بہت بلند کیا ہے۔ آج جو دنیا آپ لوگوں کی واہ...... واہ کر رہی ہے کل اسے تھو...... تھو...... کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی۔ دنیا بھر کے ٹی وی چینلز پر...... اور آپ کے ملک کے ہر چینل پر اس کی وہ ویڈیو ہفتے بھر سے بھی زیادہ چلتی رہے گی جس میں اسے میچ فکسنگ کے لیے لی گئی بھاری بھرکم رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے اور وہ ویڈیو آپ خود بھی ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اس لیے اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ یا تو ہمیں اپنے علاقے میں چھوٹا سا کام کر لینے دیں یا پھر دنیا بھر میں رسوا ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔'' دوسری جانب سے صراحت سے کہا گیا۔

''لعنت ہو تم پر...... ہزار بار لعنت۔'' انہوں نے غصے

میں آ کر فون آف کر دیا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا لیکن وہ جاگ رہی تھی۔ لیپ ٹاپ پر حسنات خان کی این جی او کی فنڈ ریزنگ ڈنر کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی ساری پاکٹ منی لگا کر سو پونڈ کا ٹکٹ لیا تھا اور مزید سو پونڈ اس کے چیریٹی فنڈ میں دیے تھے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنا ڈونیشن صرف حسنات خان کو دے گی۔ جب اس کی باری آئی تو اسٹیج پر جانے سے پہلے...... اس نے اپنا کیمرا اپنی دوست کیتھی کو دیا اور زیادہ سے زیادہ تصویریں کھینچنے کی ہدایت کرتی ہوئی اسٹیج پر چلی گئی۔

اپنا ڈونیشن شیشے کے باکس میں ڈالنے کے بجائے...... وہ دوسری جانب کھڑے ہوئے حسنات کی جانب بڑھ گئی۔ ایک سرپرائز ڈسی کیفیت میں...... وہ اکیلے سامنے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ بھول ہی گئی کہ وہ وہاں کیوں آئی تھی۔ وقت شاید ٹھہر گیا تھا۔ پھر وہ اس کی طرف بڑھا۔ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی طرف جھکا اور مسکراتے ہوئے مخاطب ہوا۔

''میڈ ماڈیل! فرنچ اسٹائل میں اس کا ہاتھ تھام کر بوسہ دیا تو ہلکے سے جھٹکے سے وہ ہوش میں آ گئی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ شرمندہ سی ہوئی اور گھبراہٹ میں ڈونیشن والا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''تھینکس آلاٹ میم!'' اس کے الفاظ اور انداز نے اسے سرشاری اور طمانیت کے احساس میں بھگو دیا۔ اور اس کے یہ یادگار لمحات کیتھی نے بڑی سرعت سے کیمرے میں محفوظ کر لیے۔ جو اُب اس نے ای میل کے ذریعے بھیجے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح ان تصویروں کو بار بار دیکھے جا رہی تھی۔

ہر وہ تصویر جس میں وہ حسنات کے ساتھ کھڑی ہے، وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کا ہاتھ تھامے کھڑا ہے۔ ہاتھ کی پشت پر بوسہ دے رہا ہے۔ اس نے بے خیالی میں اپنا بایاں ہاتھ غور سے دیکھا۔ شاید یہاں اس کے ہونٹوں کا نشان اب بھی باقی ہو۔ وہ بار بار روشنی کے سامنے زاویہ بدل بدل کر دیکھتی رہی پھر اپنی بے وقوفی پر خود ہی ہنس پڑی۔

کچھ دن بعد اُن کی واپسی کا وقت ہو گیا۔

لاؤنج کے دوسرے گوشے میں امی اور ماموں بڑے چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں۔'' پتا نہیں دونوں بہن بھائیوں میں کیا کانفیڈنشل گفت وشنید ہو رہی ہے۔'' ارسل نے لاؤنج کے دوسرے گوشے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بتا دیتا ہوں وہ کانفیڈنشل موضوعِ گفتگو...... پاپا، پھوپھو کو لندن شفٹ ہونے کا مشورہ دے رہے ہوں گے اور وہ بڑے پیار سے ان کی طرف گُگلی پھینک رہی ہوں گی۔ پاپا کہہ رہے ہوں گے 'یہاں کے حالات بہت خراب ہیں، رہنے کے قابل نہیں...... مجھے فکر رہتی ہے۔'

پھوپھو کہہ رہی ہوں گی 'ہو جائیں گے حالات بھی ٹھیک۔ اپنا ملک چھوڑ کر کوئی کہاں رہ سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔''

رامس نے مردانہ اور زنانہ آوازوں میں مکالمے ادا کیے تو ارسل ہنس پڑا۔ حالانکہ ان دونوں بہن بھائیوں میں کچھ اور ہی موضوع چھڑا ہوا تھا۔ ارسل اور نویرہ کے بارے میں۔

☆☆☆

''ثاقب! میرا جاذل ماشاء اللہ وہاں کینیڈا میں بہت اچھی طرح سیٹل ہو چکا ہے۔ وہاں میری ایک دوست رہتی ہے۔ اس کی بیٹی سے میں نے اس کا رشتہ بھی طے کر دیا ہے۔ جلد ہی اس کی شادی کر دوں گی۔ اب رہ گیا ہے ارسل...... تم نے دیکھا ہے نا میرے بیٹے کو...... ماشاء اللہ ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک ہے...... ہے نا؟''

''ہاں آپا اس میں کوئی دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں۔ وہ ایسا ہی ہے۔'' ثاقب نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''اب کچھ عرصے میں ہی وہ سول انجینئر بن جائے گا۔ کافی روشن مستقبل ہے اُس کا۔ کیا میں اپنے ارسل کے لیے تم سے تمہاری نویرہ کا ہاتھ مانگ سکتی ہوں؟'' انہوں نے بھائی کو پُرامید نظروں سے دیکھا تو وہ کچھ سوچتے ہوئے نظر آئے، وہ پھر گویا ہوئیں۔

''دراصل دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر خوش رہتے ہیں اور اتنی زیادہ دوستی ہے کہ مجھے لگتا ہے... شاید قدرت نے یہ جوڑا بنا کر ہی ہمارے گھر میں اتارا ہے، کیا میں توقع رکھوں کہ تم میرا مان رکھو گے؟'' ثمینہ نے التجائیہ لہجے میں کہا تو ثاقب کچھ شرمندہ ہو گئے۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپا، نویرہ آپ کی بیٹی ہے۔ اس پر آپ کا حق ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی اگر یہ رشتہ ہو جاتا ہے تو...... لیکن آپ جانتی ہیں کہ میرے اکیلے کے کچھ کہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ بہتر ہے پہلے دونوں بچوں کی رائے

لے لی جائے۔ اگر وہ دونوں راضی ہوئے، تو ہم یہ رشتہ خوشی خوشی کریں گے۔ کیونکہ میں بھی سمجھتا ہوں کہ مجھے ارسل سے اچھا داماد مل نہیں سکتا۔''

''میں تو رانیہ کی شادی بھی جاذل سے کرنا چاہتا تھا لیکن آپ جانتی ہیں کہ بچوں کی مرضی نہیں تھی۔ اس لیے بات بنی نہیں۔ اب ان دونوں کے معاملے میں بھی پہلے پوچھ لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ورنہ خوامخواہ کی بدمزگی ہو گی۔'' انہوں نے صراحت سے بات سمجھائی۔

''یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے تو صرف تمہاری مرضی پوچھی تھی۔ تم راضی ہو تو اب میں ارسل سے پوچھ لوں گی۔ تم بھی نویرہ سے بات کر لینا۔ اگر دونوں راضی ہو جائیں تو ہم تمہارے اگلے ٹرپ پر ان دونوں کی باقاعدہ منگنی کر دیں گے اور نویرہ کی تعلیم مکمل ہوتے ہی شادی کر دیں گے۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا؟'' ثمینہ نے بڑی چاہ سے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ہنس پڑے۔

''آپا! لگتا ہے آپ بہت عرصے سے یہ خواہش دل میں پال رہی تھیں۔ سب کچھ طے کیے بیٹھی ہیں۔ فکر نہ کریں بچے راضی ہوئے تو ہم ایسا ہی کریں گے جیسے آپ نے سوچا ہے۔'' انہوں نے بہن کو مطمئن کرنے کے لیے کہا تو وہ بہت خوش ہو گئیں۔

''جیتے رہو، خوش رہو۔ آج تم نے میری بہت بڑی فکر دور کر دی۔ میں تمہارے اگلے ٹرپ کا بے چینی سے انتظار کروں گی۔''

اگلے ہی روز وہ واپس لندن روانہ ہو گئے اور جاتے جاتے گھر کی ساری رونقیں، ساری خوشیاں اور ساری ہلچل اپنے ساتھ لے گئے۔ اور دے گئے بے شمار خوب صورت یادیں...... جو کچھ دل و ذہن میں ہلچل مچا رہی تھیں۔ کچھ تصویریں اور ویڈیوز کی شکل میں محفوظ تھیں اور بار بار دیکھے جانے کی وجہ سے...... ان کی موجودگی کا ہلکا سا احساس دلا رہی تھیں۔

☆☆☆

ہزار بار لعنت بھیج دینے کے باوجود...... اس لعنت نے اُن کا پیچھا چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا جو اُن کے بیٹے کے تعلق سے وبالِ جان بن کر ان سے چمٹ گئی تھی۔ خاقان شاہ کو سلگتے ہوئے ذہن سے سوچنے کے باوجود...... اس عذاب سے جان چھڑانے کا کوئی حل سوجھ نہیں رہا تھا۔

نادیدہ لوگوں کی جانب سے دی گئی آخری وارننگ کا وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا اور وارننگ یہ تھی کہ اگر ان کو جنگل میں جگہ نہ دی گئی تو نہ صرف حسنات خان لی پیچے ینے والی ویڈیو وائرل ہو جائے گی بلکہ ہر ٹی وی چینل اور اخبارات میں ساری تفصیلات کے ساتھ پروگرام بھی ہوں گے کہ ملک کے معتبر اور معزز، جدی پشتی نیک نام سیاست داں خاقان شاہ کا بیٹا...... دولت کا لالچی اور ہوس کا مارا ہے، پیسے کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہے۔ کیونکہ اسٹار کھلاڑی ہے۔ اس لیے نہ جانے کب سے میچ فکسنگ کے ذریعے بلیک منی کما رہا ہے۔

''اس کا باپ جدی پشتی رئیس ہے نابنجار! اور ایسے باپ کے اکلوتے بیٹے کو دولت کی پیسے کی کوئی کمی ہے کیا...... جو وہ بلیک منی کمائے گا؟ سراسر الزام تراشی ہے اور وہ ویڈیو جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں...... تم لوگوں نے اس کو بہکا کر پھنسایا ہے۔ تاکہ مجھے بلیک میل کر کے اپنے گندے ارادوں کو پورا کر سکو۔'' وہ غصے میں تھرتھراتے ہوئے بولے۔

''جب ہر جگہ یہ ویڈیو چل جائے ہر چینل پر آپ کو اور آپ کے لاڈلے نواب زادے کو گالیاں پڑ چکیں اپنے ملک اور دنیا بھر میں جب آپ کی عزت کا گراف زیرو پر آ جائے تو پھر آپ یہ وضاحتیں جاری کیجیے گا۔ ہر جگہ جا کر دہائیاں دیجیے گا کہ میرا بیٹا تو نادان ہے۔ یہ اس کی معصوم سی خطا ہے جو قطعاً قابل توجہ نہیں ہے۔ اس لیے آپ لوگ میری اور میرے بیٹے کی اسی طرح عزت کیجیے جیسے پہلے کرتے تھے۔ پھر لوگ آپ کو تمسخرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے بڑے معصوم معصوم سے سوال کریں گے۔ جنہیں سن کر پسینے پسینے ہو جائیں گے آپ، جواب نہیں بن پڑیں گے آپ سے۔'' اس نامعلوم آواز نے کہا۔ اور یہ آواز کس فون سے اور کہاں سے آتی ہے خاقان شاہ سر توڑ کوشش کے باوجود اس کا سراغ نہ لگوا سکے اور ان کی ان کوششوں کے جواب میں ایک دن اس جانب سے کہا گیا۔

''آپ بلاوجہ ہمارا سراغ لگوانے کے چکر میں ہلکان ہو رہے ہیں۔ ہم آپ کے ملک میں ہیں ہی نہیں اور آپ سے گفتگو سیٹلائٹ فون پر ہوتی ہے جس کا نمبر آپ بھی ٹریس نہیں کرا پائیں گے۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ آپ ہماری بات مان جائیں۔''

''اور اگر میں آپ کی بات نہ مانوں تو......؟'' خاقان شاہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''تو آپ ناقابل تلافی نقصان اٹھائیں گے۔ ہمیں تو اپنا کام ہر صورت میں کرنا ہے، آپ چاہیں یا نہ چاہیں......

دیکھنا یہ ہے کہ آپ برداشت کی کتنی صلاحیت رکھتے ہیں؟"

"جہنم میں جاؤ تم...... میں بھی دیکھتا ہوں کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔ تم جیسے ٹکے ٹکے کے لوگ بھی اگر میرے منہ آنے لگیں تو تف ہے مجھ پر کہ میں تمہارے ہاتھوں بلیک میل ہوتا رہوں، اور کچھ نہ کروں۔"

خاقان شاہ کا نوابی خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا تو انہوں نے فون بند کردیا۔ شدید غصے نے ان میں ناقابلِ برداشت اذیت بھر دی تھی اور وہ بے چین ہو کر کمرے کے طول وعرض ناپنے لگے۔ ان کی اسٹک فرش پر کھٹ کھٹ کر کے بج رہی تھی۔ ان کے جلال نے پوری حویلی میں سناٹے بکھیر دیے۔ سب اپنی اپنی جگہ دبکے ہوئے اس کوشش میں تھے کہ کہیں اس کا سامنا شاہ صاحب سے نہ ہو جائے۔ ورنہ بجلی گرنے کا پورا امکان تھا۔ نہ جانے کب تک یہ کیفیت رہی پھر وہ اپنی جھولنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ غصے کا ابال کچھ کم ہوا تو ذہن نے سوچنا شروع کیا۔

اگر ان خبیثوں نے واقعی ایسا کردیا جیسا کہہ رہے ہیں تو واقعی میں اور میرا خاندان تو سب کچھ کھو دے گا۔ عزت و وقار، سیاسی عہدے اور مرتبے، بیٹے اور آنے والی نسلوں کا مستقبل بھی داؤ پر لگ جائے گا۔ کچھ باقی نہیں بچے گا، کیا کروں؟ کیا کرنا چاہیے؟ وہ بڑی دیر تک سوچتے رہے پھر ایسا لگا کچھ فیصلے کر رہے ہیں۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہ کبھی اثبات میں سرہلاتے اور کبھی نفی میں، پھر ایک لمبی سانس لے کر سر کو جھٹکا۔ سگار بجھ چکا تھا، اسے دوبارہ جلایا۔ کش لیتے ہوئے سوچتے رہے اور کرسی پر جھولتے رہے۔

اچانک فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ انہوں نے اٹھایا تو وہی منحوس آواز دوبارہ اُن کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تو خان صاحب! آپ نے کیا سوچا اور کیا فیصلہ کیا؟" دوسری جانب سے اُن سے سوال کیا گیا۔

"تم ایسا کرو، جتنی رقم تم نے اسے میچ فکسنگ کے لیے دی ہے، میں تمہیں اس سے دگنی، تین یا چار گنا، جتنی تم چاہو وہ رقم تمہیں لوٹانے کے لیے تیار ہوں، بولو! کتنی چاہیے؟"

انہوں نے پوچھا تو دوسری جانب سے انہیں مضحکہ اُڑاتی ہوئی ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ "پیسا ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ بتائیں آپ کی جاگیر پر جنگل کا وہ حصہ کتنی قیمت رکھتا ہے۔ ہم اس کی منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہیں جب اور جیسا کہیں ادائیگی ہو جائے گی۔ کیا آپ راضی ہیں اس کے لیے؟"

"بکواس بند کرو...... کوئی اپنی زمین بیچتا ہے کیا؟ وہ بھی تم جیسوں کے لیے...... جو نہ جانے کیا گند پھیلانے کا ارادہ رکھتے ہو اُدھر...... اب کہا ہے آئندہ اس کا نام بھی نہ لینا...... خبردار!" وہ غصے میں چلائے تو پھر وہی دل جلانے والی مدھم سی ہنسی کی آواز ان کے کانوں میں آئی۔

"آپ کا جواب یہی ہوگا۔ اسی لیے تو ہم نے خریدنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کیونکہ پیسا آپ کے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن ہمیں ہر صورت یہ جگہ چاہیے...... تو مجبور ہو کر ہم نے آپ کے بیٹے کو میچ فکسنگ کے لیے مجبور کیا۔ جو رقم اسے دی گئی، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مقصد وہ وڈیو بنانا تھا، وہ قیمتی وڈیو...... جو بہت جلد ہر ٹی وی چینل کو بھیجی جانے والی ہے۔ بہت جلد سوشل سائٹ پر اپ ڈیٹ ہونے والی ہے۔ اگر آپ نے ہماری بات نہ مانی تو...... ورنہ دوطرفہ تعاون سے دونوں کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو......"

"او خدائی خوار! تم اُدھر کرنا کیا چاہتے ہو، یہ تو مجھے معلوم ہونا چاہیے۔"

"کچھ خاص نہیں، آپ جانتے ہیں کہ آپ کا علاقہ سرحد کے ساتھ ہے۔ ہمارے کچھ ساتھی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جاتے آتے رہتے ہیں۔ انہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ سرحد پار کرنے کے بعد بھی آگے لمبا سفر درپیش ہوتا ہے۔ اس لیے ہم یہاں صرف اپنے اُن ساتھیوں کے لیے ایک عارضی ٹھکانا یعنی ایک کیمپ یا ایک ذرا بڑا کاٹیج بنانا چاہتے ہیں تاکہ آنے جانے والے مسافر یہاں کچھ وقت ٹھہر کر...... آرام کر کے...... آگے جاسکیں، بس اتنی بات ہے۔"

"بس اتنی بات ہے؟ نہیں، یقیناً بس اتنی بات نہیں ہے اور بھی بہت کچھ ہوگا۔ اسمگلر تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کے چھوٹے موٹے خفیہ ٹھکانے بھی بنے ہوئے ہیں جنگل میں...... یہ بات ہم سب جانتے ہیں لیکن وہ خاموشی سے نکل جاتے ہیں۔ ان سے ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی اس لیے ہم انہیں کچھ نہیں کہتے کیونکہ وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔" خاقان شاہ نے ضبط کے ساتھ جواب دیا تو انہیں پھر وہی منحوس مدھم ہنسی سنائی دی۔

"جی خان جی! وہ آپ کو نقصان نہیں پہنچاتے...... صرف فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اس لیے ان سے کوئی تعرض نہیں کرتے کیونکہ آپ کے آدمی ایجنٹوں کے بھیس میں وہاں موجود ہوتے ہیں اور ان سے راہداری وصول کرتے ہیں۔

بڑی ٹھیک ٹھاک اور بھاری بھرکم راہداریاں وصول کرتے ہیں آپ ان اسمگلروں سے...... ہم سب جانتے ہیں۔"

"ولیکن...... لیکن...... تم کون ہو؟ اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟" خاقان شاہ کی آواز میں غصے کے ساتھ پریشانی بھی جھلک آئی۔

"خان جی! ہم بہت عرصے سے اس علاقے کی مانیٹرنگ کر رہے ہیں۔ مانیٹرنگ تو ہم اپنے مقصد کے لیے کر رہے تھے۔ اب کیا کریں کہ اس میں یہ مفت کی ٹپس بھی مل گئیں ہمیں...... اگر آپ کہیں تو اس کے ثبوت بھی آپ کی خدمت میں بھجوا دیں ہم؟"

"بکواس بند کرو، یہ بھی الزام ہے۔ بلیک میلنگ کا نیا اسٹف...... لعنت ہو تم پر۔" انہوں نے فون بند کر کے پٹخ دیا۔

☆☆☆

لندن سے آئے مہمانوں کی بے شمار تصاویر اور ویڈیوز تھیں اور ارسل کا بیشتر فارغ وقت انہی کو دیکھنے میں گزر رہا تھا۔ ان میں اگرچہ اور لوگ بھی تھے لیکن اس کی مرکز نگاہ، صرف وہی دشمنِ دل، دشمنِ جاں ہی تھی۔

کہیں وہ مغربی لباس میں سیاہ چشمہ لگائے، اُڑتے بالوں کو سنبھال رہی تھی۔ تو کہیں مشرقی لباس میں حسن کا جادو جگا رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں...... وڈیوز کی شکل میں اب بھی ارسل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر رہی تھیں۔ یادوں کا یہ خزانہ اُن کی اگلی آمد تک...... ارسل کا دل بہلانے کے لیے کافی تھا۔

وہ تصویریں دیکھ رہا تھا۔ لیپ ٹاپ اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا اور اسکرین کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ تصویروں میں اس کے اول جلول پوز دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔

"ایسا کیا دیکھ رہے ہو کہ تمہاری مسکراہٹ گہری سے گہری ہوتی جا رہی ہے۔" ثمینہ نہ جانے کب سے اُسے اس طرح مسکراتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

"ارے امی! آیئے، بیٹھیے، آپ کو بھی دکھاتا ہوں۔" وہ لیپ ٹاپ کا رخ موڑتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ارے! یہ تو نویرہ ہے، یہ کیا کر رہی ہے؟ اور ٹوپی بھی لگائی ہوئی ہے۔" ثمینہ نے ڈیسک ٹاپ پر نظر آنے والی تصویر کو دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"جی امی! یہ ٹوپی اس نے زمان خان سے لے کر پہنی تھی اور اس سے پہلے اس نے زمان سے خٹک ڈانس بھی کروایا، وہ بے چارہ شرما رہا تھا مگر اس نے مجبور کر دیا اس کو......"

ثمینہ غور سے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھ رہی تھیں جس پر ایک عجب سی سرخوشی اور چلا تھی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کے گہرے رنگ اترے ہوئے تھے اور وہ بے ساختہ اور بے خیالی میں صرف نویرہ کی ہی باتیں کیے جا رہا تھا۔

"نویرہ تمہیں بہت اچھی لگتی ہے؟" انہوں نے اچانک جو سوال کیا وہ تیر کی طرح اُسے لگا۔ وہ بھونچکا ہو کر ماں کی شکل دیکھنے لگا بالکل اس ننھے سے بچے کی طرح جس کی کوئی چوری ماں نے پکڑ لی ہو۔

"جی...... امی...... امی......" وہ گڑبڑا گیا۔

"میں نے پوچھا ہے کیا نویرہ تمہیں بہت اچھی لگتی ہے؟" انہوں نے پھر پوچھا۔

"ہاں آں...... لیکن وہ تو سب کو بہت اچھی لگتی ہے کیا آپ کو اچھی نہیں لگتی؟" اس نے کسی موہوم سے خدشے کے پیشِ نظر پوچھا۔

"یہ میں نے کب کہا، لیکن میں تو تمہارا پوچھ رہی ہوں کہ تمہیں کیسی لگتی ہے؟" انہوں نے ہنسی دباتے ہوئے پوچھا تو ان کی آنکھوں میں کچھ شرارت بھرا تاثر دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے غور سے ان کی طرف دیکھا، ٹھنڈی سانس بھر کر دونوں ہاتھ ملے پھر زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ ان کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"بہت محبت کرتے ہو اُس سے؟" ان کی بات سن کر اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر پوچھا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں۔ مجھے تو معلوم ہو گیا لیکن کیا اُسے بھی خبر ہے اس بات کی، تم نے کبھی اس کو بتایا کہ تم کتنی محبت کرتے ہو اُس سے؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"محبت خود اپنے آپ کو منوا لیتی ہے۔ اس کے اظہار کے لیے لفظ بہت چھوٹے پیمانے ہیں۔ ایک دن اسے خود ہی معلوم ہو جائے گا۔" ارسل نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تو ثمینہ کو بیٹے پر بہت پیار آیا، انہوں نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"بیٹا! میں نے سوچا ہے کہ اگلے سال ثاقب آئے تو میں باقاعدہ تمہاری بات پکی کر کے تمہارے نام کی انگوٹھی

نویرہ کی انگلی میں پہنا دوں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"
"نہیں، بالکل نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے ماں سے کہا تو انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کمرے سے چلی گئیں۔

☆☆☆

"پاپا! مجھے آسٹریلیا جانا ہے۔" اس نے باپ کے گلے میں پیار سے بانہیں ڈالتے ہوئے فرمائش کی تو وہ حیران رہ گئے۔
"ہائیں، آسٹریلیا؟ یہ کیا سوجھی ہے تمہیں، کیا کرو گی آسٹریلیا جا کر؟" انہوں نے سوال کیا۔
"کچھ نہیں، ایسے ہی کالج کا گروپ جا رہا ہے گھومنے، اس میں زیادہ تر میرے دوست ہیں۔ وہ سب اصرار کر رہے ہیں کہ تم بھی چلو۔ آسٹریلیا بہت خوب صورت ملک ہے پاپا!" اس نے کن انکھیوں سے رامس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ رامس جو سامنے صوفے پر اپنا لیپ ٹاپ لیے بیٹھا تھا، اس میں منہ گھسا کر بلند آواز میں بولا۔
"پاکستان کرکٹ ٹیم آسٹریلیا میں ٹرائینگولر سیریز کھیلنے جا رہی ہے۔ پہلا میچ ملبورن، دوسرا پرتھ اور تیسرا سڈنی میں ہوگا۔" اس نے بلند آواز میں نیوز ریڈر کی طرح خبریں سنائیں تو ثاقب نے حیران ہو کر بیٹے کو دیکھا تو اس میں سوال تھا۔
"پاپا! میں نیوز دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی یہ نیوز آئی ہے۔" اس نے ترچھی نظروں سے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو نویرہ نے باپ کی نظر بچا کر اسے مُکا دکھایا۔
"ہاں نویرہ! کیا کہہ رہی تھیں تم؟" انہوں نے نویرہ کو مخاطب کیا تو وہ گڑبڑا کر بولی۔
"وہ...... آسٹریلیا......"
"کتنے دن کے لیے جاؤ گی؟"
"بس بابا، پندرہ دن کے لیے...... اتنے ہی دن کا ٹور ہے۔"
"لیکن اکیلے؟ تمہاری ممی اجازت نہیں دیں گی۔"
"اکیلے کہاں پاپا! دس پندرہ لوگوں کا گروپ ہے۔"
"پھر بھی...... انہیں اعتراض ہوگا۔ بہتر ہے تم انہی سے پوچھ لو۔" ثاقب نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔
"پاپا! یہ کام بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا انہیں کنوینس کرنے کا...... کیونکہ مجھے تو وہ صاف انکار کر چکی ہیں۔"
"اوہ...... پھر تو مجبوری ہے، میں کچھ نہیں کر سکتا۔"
"پاپا آ آ......" وہ چلائی تو ثاقب نے بے پروائی سے ہاتھ نفی میں ہلاتے ہوئے اخبار میں منہ گھسا لیا۔
سارے راستے بند ہو گئے تو اس نے مدد طلب نظروں سے رامس کی طرف دیکھا جو اپنے لیپ ٹاپ میں غرق تھا لیکن توجہ شاید پوری طرح باپ اور بہن کے مکالموں کی جانب تھی اور اب اس جگہ آ کر اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ نویرہ کی توپوں کا رخ اب اس کی جانب گھومنے والا ہے چنانچہ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے پہلے ہی اعلان کرنا شروع کر دیا۔
"اوہو... اوہو...... اگلے ماہ کی چھ تاریخ...... ٹیسٹ شروع...... اور...... اور...... اور...... پندرہ اور دو سترہ دن تک چلیں گے...... یعنی پڑھائی...... پڑھائی...... اور صرف پڑھائی...... یعنی کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں، اگلے.... ماہ سترہ دن تک۔"
اس نے بڑبڑانے والے انداز میں سارا کچھ بیان کیا تو نویرہ کی جان جل گئی، وہ انتہائی غصے میں جھپٹتی ہوئی اس کی طرف آئی، اس کو دھکیلتے ہوئے لیپ ٹاپ چھین کر اس پر نظر ڈالی۔
"ہم م م م...... کہاں ہے یہ پروگرام؟ اس پر تو مجھے نظر نہیں آ رہا۔ سیدھا تمہارے دماغ پر اترا ہے، وایا سیٹلائٹ ہے نا؟"
اس نے اسکرین پر فیس بک دیکھتے ہی اس کی چوری پکڑ لی تھی اور اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اسے اس اعلان کی ضرورت کیوں پڑی کہ کہیں وہ اسے ساتھ چلنے کے لیے نہ کہہ دے، ورنہ پاپا بھی راضی ہو جاتے۔
"بھئی، فرینڈ نے وال پر لکھ کر پوسٹ کر دیا تھا۔ میں نے پڑھ لیا۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔
"اچھا، کون سی وال پر؟ یہ تمہاری وال تو خالی پڑی ہے اور کہیں اور بھی ایسا میسج نہیں ہے۔" اسے جھوٹے کو گھر تک چھوڑنا تھا۔
"بھئی وہ ڈیلیٹ ہو گیا غلطی سے۔" اس نے ڈھٹائی دکھائی تو وہ چلائی۔
"رامس کے بچے! میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔"
"ارے باپ رے باپ! کیسا ظلم ہو رہا ہے آپ کے بیٹے پر...... اور آپ کیسے باپ ہیں اخبار پڑھ رہے ہیں اور مسکرا بھی رہے ہیں۔" رامس نے اس کے مکوں سے بچتے ہوئے باپ سے فریاد کی۔ لیکن وہ کچھ بولے نہیں خاموشی سے اخبار پر نظریں جمائے مسکراتے رہے۔

اس کے بعد اس نے نہ جانے کیا کیا جتن کر کے ماں کو راضی کیا، باپ سے اچھی خاصی رقم اینٹھی، رامس کو دونوں انگوٹھے دکھا کر چڑاتی ہوئی، اپنا بیگ پیک اٹھا کر آسٹریلیا روانہ ہوگئی۔

رامس کو اس کی فکر تھی اس لیے اس نے اپنے دوست کو اس کا خیال رکھنے کو کہا جو اپنے چند دوستوں کے ہمراہ میچ دیکھنے جارہا تھا۔

''دیکھو یار! نہ اُس کے سامنے میرا دوست بن کر جانا اور نہ اس سے کوئی تعارف حاصل کرنے کی کوشش کرنا، بس دور سے اس پر نظر رکھنا اس طرح کہ اسے پتا نہ چل سکے، ورنہ میں بتادوں جنگلی بلی ہے میری یہ نادان بہن...... اگر کوئی مسئلہ ہو جو کہ میں جانتا ہوں کہ ضرور ہوگا کیونکہ وہ انتہائی ایڈونچرزم کی شوقین ہے تو ممکن ہو تو اس کی مدد کردینا، ورنہ مجھے فون کردینا، میں اگلی فلائٹ سے پہنچ جاؤں گا۔''

رامس کا دوست حیران ہو کر اس کی باتیں سنتا رہا، پھر دیدے گھماتے ہوئے بولا۔

''یعنی تو نے فرض کرلیا ہے کہ میں ایجنٹ جیمز بانڈ 007 بن کر...... آسٹریلیا میں ہونے والی کسی قسم کی سازش کی بُو سونگھتا پھروں، اور اگر دشمن سے ٹاکرا ہو جائے تو دھائیں...... دھائیں...... دھائیں...... اور ہیروئن کو بچا کر...... محفوظ طریقے سے لندن واپس لے آؤں، یہی چاہتا ہے نا تو؟''

''لاحول ولاقوۃ...... ارے یار! ایسا کچھ بھی نہیں ہے بس وہ ذرا ایڈونچرز کی شوقین ہے۔ اس لیے تجھے اس کا خیال رکھنے کو کہہ رہا ہوں۔'' رامس نے جھلا کر کہا تو اس نے اپنا سر ہلا دیا۔

''اچھا، یہ بات ہے چل تو فکر نہ کر...... میں خیال رکھوں گا۔'' دوست تسلی دے کر چلا گیا۔

پہلا میچ پندرہ تاریخ کو ملبورن میں تھا۔ وہ اور اس کے جیسے کتنے ہی شوقین ملبورن پہنچنا شروع ہوگئے تھے۔ زیادہ تر نے ٹھہرنے کے لیے اس ہوٹل کو منتخب کیا تھا جو اسٹیڈیم کے بہت نزدیک تھا اور ہوٹل سے پیدل وہاں تک پہنچا جاسکتا تھا۔

اس نے بھی ایسے ہی ہوٹل کا انتخاب کیا تھا اور سنگل روم ایسے رخ پر لیا تھا جس کی کھڑکیوں سے اسٹیڈیم صاف نظر آتا تھا۔

دو دن سے پریکٹس چل رہی تھی۔ پاکستانی ٹیم کے کھلاڑی صبح نو بجے اسٹیڈیم میں آجاتے تھے۔ نیٹ پریکٹس

بیٹی کو ڈھونڈ رہی ہوں کل سے کسی کے ساتھ ڈیٹ پر نکلی ہوئی ہے

کرتے، ایکسر سائز کرتے، دوڑیں لگاتے اور گپ شپ کرتے رہتے تھے۔

وہ صبح آٹھ بجے ناشتے سے فارغ ہو کر اسٹیڈیم میں پہنچ جاتی، اور جب تک کھلاڑی پریکٹس کرتے، وہ انہیں دیکھتی رہتی اور انہیں کیا صرف اسے دیکھتی رہتی تھی، حسنات خان کو...... اس کی چال ڈھال، اس کے انداز، اس کی مسکراہٹ، بالنگ، بیٹنگ، اس کا ہر ہر انداز اس کے لیے دلربا تھا۔

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس کی ایک ایک ادا کو دنیا کو دکھائے اور کہے۔

''دیکھو یہ ہوتا ہے سپر اسٹار...... اس کے شاہانہ انداز، اس کی شخصیت کا جادو، اس کے ایکشن کا طوفان، اور اس کا انوکھا اسٹائل۔ ہے کوئی اس جیسا؟ کوئی نہیں کوئی بھی نہیں، کم از کم اس دنیا میں تو کوئی نہیں؟''

وہ اپنی دیوانگی میں اتنی بڑھ گئی تھی کہ حسنات سمیت تقریباً سب ہی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا جذبہ صرف ایک کھلاڑی کے کھیل کو سراہے جانے کا نہیں ہے بلکہ وہ بھی بے شمار لڑکیوں کی طرح...... حسنات کی مقناطیسی شخصیت کے ہالے میں کھنچ کر بہت آگے آگئی ہے۔ یہ دیوانگی صرف کھیل کو یا کھلاڑی کو سراہے جانے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس میں محبت کے جذبات کا جنون ہے اور عشق کا سیلاب بلاخیز ہے جو کسی بھی وقت حسنات کے وجود سے ٹکرانے والا ہے۔

حسنات کے لیے کسی لڑکی کی ایسی دیوانگی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نہ جانے کتنی ایسی تھیں جو ایسی دیوانگی کا شکار ہو کر...... اس کے آگے پیچھے گھومتی رہتی تھیں اور وہ اکثر کو خوش آمدید بھی کہتا رہتا تھا۔

وہ اوائل عمری سے ہی لندن میں تعلیم کی غرض سے رہائش پذیر تھا۔ اس کے فیوڈل لارڈ باپ نے اکلوتے بیٹے کو لندن میں بھی...... زندگی کی ہر سہولت فراہم کر رکھی تھی۔ لندن کے امرا کے علاقے میں شاندار فلیٹ، جو شاہانہ انداز میں سجا ہوا تھا، دو کل وقتی ملازمین، شاندار گاڑی اور بے حدو حساب دولت...... اس کا بینک اکاؤنٹ ہر وقت چھ ہندسوں میں رہتا تھا۔ ذرا جو کمی آتی تو مزید پیسے پہنچ جاتے۔

پھر آہستہ آہستہ کرکٹ کی دنیا میں اس کی آمد ہوئی، انگلینڈ میں اب بھی کرکٹ لارڈز اور نائٹس کا کھیل سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی کرکٹ میں آمد...... ایک خوشگوار اضافہ ثابت ہوئی۔ کچھ ہی عرصے میں اس نے اپنی ذاتی صلاحیتوں کے جوہر دکھانا شروع کیے تو بہت جلد یو کی دنیا میں اسے کرکٹ کا ایک ابھرتا ہوا روشن ستارہ تسلیم کرلیا گیا۔

تعلیم مکمل ہوتے ہی جب اس نے ساری توجہ کرکٹ پر مرکوز کی، تو دنیائے کرکٹ میں ایک زلزلہ برپا کر دیا۔ ایک دنیا اس کے مداحوں میں شامل ہوگئی۔ اس کی شہرت بہت جلد سرحدیں پھلانگتی ہوئی پوری دنیا میں پھیل گئی۔

اب اسے خود بھی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ اس کا مقام شہزادوں اور نوابوں سے بھی کہیں اونچا ہے اسے اوپر جانا ہے اور اوپر...... اور اس احساس نے اس کی پہلے سے پُرغرور گردن کی اکڑ میں مزید اضافہ کردیا۔

اپنے مداحوں کی بھیڑ، اور ان کے پاگل پن کو...... دور سے دیکھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن ان کا نزدیک آنا اور اسے چھونا، بے حد ناگوار محسوس ہوتا تھا۔ میچ جیتنے پر میدان میں خوش ہو کر دوڑتے ہوئے بچوں اور نوجوانوں سے ہاتھ ملانا، اسے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ بادل ناخواستہ ان سے ہاتھ ملانے پر اسے کراہیت کا سا احساس ہوتا اور وہ جیب سے رومال نکال کر...... دیر تک اپنے ہاتھ پونچھتا رہتا۔ ناگواری کا احساس اس کے چہرے سے عیاں ہوتا تھا۔

لیکن اس کے پیار میں پاگل لوگ، اسے بھی اس کی ادا سمجھتے اور کبھی اس کی بے اعتنائی اور گھٹیا اور متعصب رویے پر برا بھی نہیں مانتے، بلکہ شاید اس کا حق سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔

☆☆☆

دور افق پر کہیں ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی اور اس کے پیش منظر میں بھیگی بھیگی پہاڑیاں گہری سرمئی نظر آرہی تھیں۔ اوس میں بھیگا سیاہی مائل سبز گھنا جنگل آہستہ آہستہ بیدار ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

بہرام خان نے گھوڑے پر زین کستے ہوئے حویلی کے دروازے پر نظر ڈالی تو وہ گرم شال کاندھوں پر لپیٹے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔

''چلو بہرام!'' وہ گھوڑے پر سوار ہو کر معمول کے مطابق صبح کی سیر کو نکلے...... تو بہرام نے بھی ان کے ساتھ گھوڑا بڑھا دیا۔

''آج دوسری طرف چلتے ہیں۔'' وہ روزانہ کے معمول سے ہٹ کر آج دوسری طرف نکل پڑے۔

''ادھر جنگل میں وہ خبیث لوگ دوبارہ تو نہیں آئے؟''

''نہیں خان جی! پر سرحد کے ادھر سے آج کل کچھ زیادہ ہی لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا ہے۔ پرانے لوگ تو آتے ہیں، آگے چلے جاتے ہیں پر کچھ نئے بھی آرہے ہیں۔ وہ جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہتے ہیں۔'' بہرام نے اطلاع دی تو خاقان شاہ نے گردن موڑ کر اسے گھورا۔

''تو ہمارے آدمی اُدھر کیا کرتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا تھا چوکیدار بڑھا دو...... کوئی مشکوک شخص نظر آئے تو پہلی فرصت میں نکالو اُدھر سے۔ نہ مانے تو انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اُڑاؤ...... اور پھینک دو...... دور پہاڑوں میں...... جنگلی جانور لے جائیں گے۔'' وہ غصے سے بولے۔

''جی خان جی! ایسا ہی کر رہے ہیں ہمارے آدمی...... اسی چکر میں کبھی کبھی چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ فائرنگ کے تبادلے میں کوئی زخمی بھی ہو جاتا ہے، تو وہ لوگ بھاگ جاتے ہیں۔'' بہرام نے وضاحت کی۔

''ادھر گوروں نے جدھر کیمپ لگایا تھا ادھر تو کوئی آکر نہیں بیٹھا؟ وہ خانہ خراب ابھی بھی اسی چکر میں ہیں۔''

''نہ جانے جنگل کے اس حصے میں کیا خاص بات ہے خان جی! کہ اُدھر کئی مرتبہ مختلف لوگوں نے آکر رکنے کی کوشش کی، کبھی کوئی آرام کرنے رک جاتا ہے، کبھی کھانا پکانے کے واسطے ٹھہر جاتا ہے۔ کبھی کسی کے گھوڑے ادھر آکر تھک جاتے ہیں، تو ان کو رکنا پڑ جاتا ہے، بارش پڑ جائے، تب بھی لوگ اُدھر ہی ٹھہر جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا...... ایسا کیا ہے اس جگہ پر؟'' بہرام کے لہجے میں الجھن کے ساتھ فکرمندی بھی تھی۔

''بہرام! اب کسی کو وہاں رکنے نہیں دینا ہے، میں سمجھ

رہا ہوں ان لوگوں کے بہانے...... وہ ہر صورت یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ الگ الگ شکلوں میں اپنے بندے بھیج رہے ہیں، تم ایسا کرو، ٹھیک اسی جگہ اپنا بدرقہ کیمپ بنا دو...... یہاں ہر وقت ہماری اچھی خاصی فورس موجود ہونا چاہیے اور کچھ اچھے کچھ دار خاصے دار ادھر بٹھاؤ جو آس پاس کے علاقوں کے اجنبیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے...... مناسب کارروائیاں کر سکیں...... وہاں ٹھہرنا تو دور کی بات، وہاں سے کوئی گزر بھی نہ سکے، بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے بہرام۔'' وہ بھی کچھ فکرمند ہو رہے تھے۔

''جی خان جی! میں نے دو دن پہلے ہی بدرقہ کیمپ بنوا دیا ہے...... دس جوان ہیں وہاں، اور نصیب گل ان کا ذمے دار ہے، رات کو نصیب گل نے پیغام بھیجا تھا سب ٹھیک ہے ادھر۔'' بہرام نے خبر دی۔

''یہ اچھا کیا تم نے...... چلو ادھر بھی چلتے ہیں۔'' خان نے رخ موڑا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ بہرام بھی ان کے ساتھ ہو لیا، ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا انہوں نے کہ دور گھنے درختوں سے کوئی آدمی نکل کر تیز تیز قدموں سے ان کی جانب بڑھتا نظر آیا۔

''یہ تو ہمارا آدمی ہے خان! وہ دور سے ہاتھ ہلاتا ہوا آرہا ہے، شاید کوئی خبر ہے اس کے پاس۔'' بہرام کے لہجے میں تشویش تھی۔

''خان جی! ادھر کیمپ میں ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ شہروز اور خیر خان ڈیوٹی پر تھا۔ علاقے میں گشت کر رہا تھا تو وہ دونوں غائب ہو گیا۔ چار بجے انہیں واپس آنا تھا اور دوسرا گروپ کو گشت پر جانا تھا۔ پر وہ چار بجے نہیں آیا، باقی لوگوں نے ان کو تلاش کیا، سب ڈھونڈ رہے ہیں لیکن وہ نہیں ملا۔ آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا ہے، پر ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔''

''رات اندھیرا تھا، اب روشنی ہو گئی ہے اب بھی ان کا کوئی سراغ نہیں ملا؟'' خاقان شاہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''نہیں خان جی! رات سے اب تک...... سب انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ ابھی تک کوئی نشان نہیں ملا ان دونوں کا......'' وہ اداسی سے بولا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ انہونی ہو گئی ہے۔

وہ تیزی سے گھوڑے دوڑاتے جنگل میں اندر کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ کیمپ کے نزدیک ہی انہیں نصیب گل نظر آگیا۔ قریب ہی دوسرا آدمی بجھتے انگاروں میں لکڑیاں ڈال کر انہیں سلگا رہا تھا۔ خان کو آتا دیکھ کر وہ دونوں ان کی جانب بڑھ آئے۔ ان کی سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے نصیب گل نے خود ہی تفصیل بتانا شروع کر دی۔

''خان جی! وہ دونوں دوسرے گروپ میں تھے۔ پہلا گروپ بارہ بجے گشت سے واپس آیا تو ان دونوں کی ڈیوٹی شروع ہوئی، انہیں چار بجے واپس آنا تھا۔ وہ آتے تو اگلا گروپ تیار تھا۔ پر وہ نہیں آئے۔ جب دیر ہونے لگی تو ہم لوگوں نے انہیں تلاش کیا۔ آس پاس دیکھا۔ آوازیں دیں، کچھ فائر بھی کیے، پر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ جب سے ہم سب انہیں ڈھونڈ رہے ہیں، وہ خود تو کیا کوئی ایسا نشان یا اشارہ بھی نہیں ملا کہ کچھ معلوم ہو جاتا کہ ان پر کیا

ناول نگار

ماہر نفسیات نے ایک بڑے امریکی ناول نگار کو نفسیاتی مریض قرار دیا۔ اس پر اس نے عدالت میں ماہر نفسیات پر ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ وہ کئی ہفتوں سے بدستور ایک کامیاب ناول لکھ رہا ہے۔ ثبوت کے طور پر اس نے عدالت کے سامنے پچاس صفحوں پر مشتمل ایک ٹائپ وہ مسودہ پیش کیا۔ جج اسے لے کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔ ''جنرل جیکسن اچھل کر گھوڑے کی پشت پر بیٹھ گیا اور باگیں اٹھا کر اس سے کہا۔ دوڑو...... دوڑو...... دوڑو......'' پچاس صفحوں تک مسودے میں یہی ایک لفظ نظر آیا۔

''جج نے متبسم ہو کر پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ ناول نگار نے جواب دیا۔ ''گھوڑا اڑیل تھا ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔''

ملتان سے صبا کا تعاون

بل

بیوی: ''پچھلے اتوار کو تم کتنی مچھلیاں شکار کر کے لائے تھے، ڈیئر؟''

شوہر: ''بھول گئیں؟ چھ بڑی بڑی شاندار مچھلیاں لایا تھا، ڈارلنگ۔''

بیوی: ''مچھلی والے نے آٹھ مچھلیوں کا بل نہ جانے کیوں بھیج دیا۔''

کراچی سے دانیال حسن کا تعاون

گزری...... جنگل پار پہاڑوں تک انہیں ڈھونڈ لیا، نہیں ملے۔''

''ان کے جانے کے بعد، کوئی خاص بات، یا کوئی نئی بات...... کوئی آواز...... کسی کی موجودگی کا احساس...... کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا تم لوگوں کو......؟'' بہرام نے سوال کیا تو نصیب گل سوچ میں پڑ گیا، پھر کچھ سوچ کر گویا ہوا۔

''پتا نہیں، یہ خاص یا اہم بات ہے یا نہیں۔ پر اُن کے جانے کے تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد...... مجھے رات کی خاموشی میں عجیب سی آواز آئی، ایسا لگا جیسے بہت ساری شہد کی مکھیاں...... فضا میں اُڑتی ہوئی ہماری طرف آ رہی ہیں۔ میں حیران ہوا کہ اتنی رات میں شہد کی مکھیاں اُڑ کر کہاں جا رہی ہیں۔ میں نے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا، جنگل میں ہر طرف گہرا اندھیرا تھا۔ لیکن آواز مسلسل آ رہی تھی۔ لگتا تھا ہزاروں مکھیاں بھن بھن کرتی...... ہمارے سروں کے اوپر ہی اُڑ رہی ہیں۔ میں نے ٹارچ جلا کر روشنی اوپر کی سمت گھمائی...... تو بس ایک لمحے کے لیے وہ سیاہ مکھیوں کا بڑا سا غول سا نظر آیا...... پھر وہ روشنی کی زد سے نکل گیا۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی آواز بھی دور ہوتے ہوتے سنائی دینا بند ہوگئی۔ مجھے ابھی تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کون سی مکھیاں تھیں جو رات میں اس طرح نکلی تھیں۔ کہاں سے آئی تھیں؟ اور کہاں چلی گئیں؟

''ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ ان دونوں کو بھی ان مکھیوں نے ہی نقصان نہ پہنچایا ہو لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ کم از کم ...... فائر تو کرتے، مگر ہمیں کسی فائر کی آواز بھی سنائی نہیں دی، اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہاں ڈھونڈیں انہیں؟'' نصیب گل نے سنجیدگی سے اپنے خدشات کا اظہار کیا اور خاقان شاہ کی طرف دیکھا تو وہ دور خلا میں دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں غرق نظر آئے۔

''مکھیاں رات میں اس طرح کبھی نہیں نکلتیں، تم نے جو دیکھا وہ شاید کچھ اور تھا۔''

''بہرام! یہاں کم از کم پچاس لوگ اور بھجواؤ...... جو نہ صرف پوری طرح مسلح ہوں بلکہ تمام ضروری چیزوں سے بھی لیس ہوں۔ سب کو واکی ٹاکی سیٹ بھی دو تاکہ یہ ہر وقت ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں......'' خان نے ہدایات دیتے ہوئے گھوڑا موڑ کر حویلی کا رخ کر لیا۔

چڑھتے سورج کی تیز اور روشن دھوپ میں وہ وسیع و عریض حویلی نہایت شاندار نظر آ رہی تھی۔ بالکل کسی تراشیدہ ہیرے کے مانند۔ آس پاس پائے جانے والے سنگِ سرخ اور سرمئی پتھروں سے تعمیر شدہ یہ قدیم حویلی...... خاقان شاہ کے آباؤ اجداد نے چار پانچ نسل پہلے تعمیر کروائی تھی اور پھر آنے والی ہر نسل نے اس کی تعمیر میں خوب صورت اضافے کر کے...... اس کی شان بڑھائی۔

خاقان شاہ جب بھی صبح کی سیر سے واپسی پر...... دور سے اپنی اس شاندار حویلی کو دیکھتے تو اپنے دل میں فخر و انبساط محسوس کرتے تھے۔ لیکن آج وہ خاصے فکرمند تھے۔ اس لیے نہایت الجھے الجھے انداز میں...... گھوڑا دوڑاتے ہوئے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئے، سائیس نے گھوڑے کی لگام تھامی اور وہ بھاری بھاری قدم رکھتے مہمان خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے، حویلی کے اندرونی گیٹ میں داخل ہو گئے۔

☆☆☆

اس رات ڈنر کے لیے وہ اس فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچ گئی۔ جہاں قومی کرکٹ ٹیم ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ شاید کچھ جلدی ہی پہنچ گئی تھی۔ کیونکہ ڈائننگ ہال ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ ٹیم کے لیے مخصوص ٹیبلز پر ''ریزروڈ'' کے کارڈز لگے ہوئے تھے۔ اس نے ڈھونڈ کر نزدیک ترین ٹیبل پر قبضہ جمایا۔ ایسی جگہ پر...... جہاں سے وہ ہر کرسی دیکھ سکے۔ وہ چاہے کسی بھی سیٹ پر بیٹھتا، اس کی نظروں کے حصار سے باہر نہیں ہو سکتا تھا۔

بیرا آرڈر لینے آیا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بعد میں آنے کو کہا اور یوں ظاہر کیا جیسے اسے کسی آنے والے کا انتظار ہے۔

کچھ ہی دیر میں کھلاڑیوں کی آمد ہوئی۔ ان کے آگے آگے شاید پروٹوکول اور سیکیورٹی سے متعلق کچھ عملہ تھا۔ سیاہ سوٹ اور مخصوص ٹائی کے ساتھ ان کے بے تاثر چہرے یہی بتا رہے تھے۔

ویٹرز نے جلدی جلدی کرسیاں کھینچنے کے ساتھ ساتھ پلیٹیں بھی سیدھی کر کے لگائی تھیں۔ اس کی نظریں ہال میں اترنے والی سیڑھیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں کھلاڑی ایک دوسرے سے باتیں کرتے، ہنستے، قہقہے لگاتے نیچے اترتے نظر آئے۔ وہ سب ہی مخصوص سفید ٹی شرٹ اور گرین ٹراؤزر میں ملبوس تھے اور ملتے جلتے نظر آ رہے تھے لیکن اس کی آنکھوں کا دل کے سامنے دعویٰ تھا کہ وہ اسے لاکھوں میں بھی پہچان سکتی ہیں۔ سو انہوں نے پہچان لیا، وہ سب سے پیچھے تھا۔

پھر وہ اپنی مخصوص مستانی سی چال چلتا ہوا اپنے

ساتھیوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا آیا تو اس کی نظریں اس کے ہر ہر قدم پر نگراں ہوگئیں۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر...... بس اسے ہی دیکھتی رہ گئی۔

وہ کب آگے بڑھ کر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا۔ ساتھیوں کو کیا بتارہا تھا۔ سمجھا رہا تھا۔ وہ کچھ سن نہیں رہی تھی۔ بس اس کے ہونٹوں کے بنتے بگڑتے دائروں، اس کی انگلیوں کے مخصوص اشاروں...... سر کی جنبش سے ہلکورے لیتے اس کے گھونگریالے بال...... اور ہونٹوں کو بھینچ کر لبوں پر آنے والی مسکراہٹ کا انداز...... دیکھ رہی تھی۔ اس کی ایک ایک خوش ادائی پر اس کی نظریں جم سی گئی تھیں۔ گردن کو ہلکا سا خم دیے وہ محویت سے اسے تک رہی تھی۔

باتیں کرتے کرتے اس نے بھی ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی۔ فاصلہ ہی کتنا تھا...... اس کی محویت کو اس نے بھانپ بھی لیا ہو۔ تب بھی اس کا اظہار نہیں کیا، یہاں تک کہ ویٹرز نے کھانا ٹرالیز سے ٹیبل پر سرو کرنا شروع کردیا۔ نویرہ کی محویت بھی ٹوٹ گئی جب اس کے ویٹر نے دوبارہ آکر اس سے آرڈر پلیس کرنے کی درخواست کی۔ اس نے کھانا آرڈر کیا، ویٹر نوٹ کرکے چلا گیا تو اس کی نظریں پھر سے اس کے وجود کا طواف کرنے لگیں۔

کھلاڑیوں کی ٹیبل پر سرو ہونے کے بعد...... کھانا شروع ہوگیا تھا۔ باتیں اور کھانا ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایسے میں ہی اس کی نگاہ ایک بار پھر اس لڑکی پر پڑی۔ جو اس کے بالکل سامنے والی ٹیبل پر بیٹھی، بڑی محویت سے اسے تک رہی تھی۔ گردن خم کیے ہونٹوں پر ایک بے نام سی مسکراہٹ لیے، اس انداز میں بیٹھی تھی جیسے وہ کھانا کھانے نہیں...... بلکہ صرف اسے دیکھنے آئی ہے، ویٹر کھانا سرو کررہا تھا لیکن اس کی توجہ ویٹر کی طرف ہونے کے بجائے، مکمل طور پر صرف اسی کی طرف تھی۔ اس صورتِ حال پر اسے ہنسی آئی جو ایک لمحے کے لیے اس کے ہونٹوں پر آئی اور پھر معدوم ہوگئی، وہ جھک کر سوپ پینے لگا۔

اگرچہ وہ ایک لمحاتی مسکراہٹ تھی لیکن نویرہ کو صاف محسوس ہوا کہ وہ اس کے لیے تھی صرف اس کے لیے...... اس کے دل نے زور سے دھڑک کر گواہی دی اور خوشی کے ایک بے پایاں احساس نے ہلکی سی پھوار کی طرح اس کے پورے وجود کو بھگو دیا۔ وہ بھرپور انداز میں مسکرائی اور اس پر ایک نگاہ ڈال کر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

تھوڑی دیر وہ اپنے شولڈر بیگ میں کچھ ڈھونڈتی رہی پھر کچھ کاغذات نکال کر اٹھی اور حسنات خان کی طرف بڑھی۔ اس کے ارادے دیکھ کر سیکیورٹی کا ایک اہلکار اس کی راہ میں حائل ہوگیا۔ اس نے نہایت مہذب طریقے سے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''یس میم؟'' اس نے مخصوص انگلش اسٹائل میں اس

امن پرور

ڈاکو بینک میں مال سمیٹ کر تھیلوں میں بھر رہے تھے کہ باہر سے ان کا ساتھی گھبرایا ہوا اندر آیا اور بولا۔ ''یار، اندھیر ہے...... کراچی میں قانون ہے نہ کوئی قاعدہ۔ ہر طرف لوٹ کا بازار گرم ہے۔ میں کار میں بیٹھا تم لوگوں کا انتظار کررہا تھا کہ ایک لڑکے نے گن پوائنٹ پر مجھ سے پرس، موبائل فون اور گاڑی تک چھین لی...... اب ہم کیا کریں گے؟''

''یہ لے!'' ایک ڈاکو نے اپنا پستول اس کی طرف اچھالتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ''تو جلدی سے کسی اور کی گاڑی چھین لا۔ دیر ہوئی تو ہم سب مارے جائیں گے!''

☆☆☆

ذائقہ

سردی آتے ہی قمر لبے کو ڈرائی فروٹ کھانے کا دورہ پڑ گیا۔ بازار گئے تو سب کچھ مہنگا اور ان کی استطاعت سے باہر تھا مگر شوق تو بہرحال پورا کرنا تھا۔ چلغوزے ان کی کمزوری تھے، دام ہوش رُبا...... ہمت کرکے انہوں نے پورے سو روپے کے خریدے جو ایک ننھی سی تھیلی میں سما گئے۔

گھر آکر وہ چلغوزوں سے شوق فرمارہے تھے کہ ان کی دوست بولی۔ ''ڈیئر! ذرا مجھے بھی چکھانا!''

قمر لبے نے فیاضی سے ایک چلغوزہ اسے تھما دیا۔

''بس ایک؟'' اس نے اکلوتے چلغوزے کو چھیل کر دانتوں میں کچلتے ہوئے کہا۔ ''اور دو نا!''

''ایک چکھ لیا...... سب کا ذائقہ اسی جیسا ہے!''

قمر لبے نے رکھائی سے کہا اور وہ ناراض ہوکر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

ڈھاکا سے خرم علیم کا تحفہ

سے پوچھا۔ تو نویرہ نے نرمی سے اسے دھکیل کر ہٹاتے ہوئے ''آٹوگراف'' کا لفظ کہا اور آگے بڑھ گئی۔ حسنات خان کے سامنے پہنچ کر اس نے ایک کاغذ اس کے سامنے رکھا۔

''معذرت خواہ ہوں...... آپ کو کھانے کے دوران زحمت دے رہی ہوں۔ میں لندن سے آپ کا میچ دیکھنے آئی ہوں، کیا آپ مجھے آٹوگراف دے سکتے ہیں پلیز۔''

''شیور! لیکن یہ تو میچ کے پورے سیزن کا ٹکٹ ہے۔ اگر میں نے اس پر آٹوگراف دیا تو یہ دو کوڑی کا ہو جائے گا۔'' حسنات نے ٹکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کہا۔

''نہیں سر! پھر تو یہ اتنا قیمتی ہو جائے گا کہ کبھی اس کو استعمال کرنے کے بارے میں سوچوں گی بھی نہیں۔ میں دوسرا خرید لوں گی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''کافی مہنگا ہے۔'' حسنات نے ایک بار پھر اسے نقصان کا احساس دلایا۔

''ہاں...... لیکن آپ کے لکھے ہوئے الفاظ جتنا قیمتی اور مہنگا نہیں۔''

اس کے الفاظ اور انداز سے سارے کھلاڑی مسکرانے لگے جو اپنا کھانا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ کھلاڑیوں کے ہنسنے پر حسنات کا چہرہ نہ جانے کن جذبات کے تحت سرخ ہوا اور اس نے جلدی سے نویرہ کے ہاتھ سے قلم لے کر ٹکٹ پر کچھ لکھ کر سائن کیے پھر اس کا قلم واپس کرنے لگا تو اس نے جلدی سے اپنی بائیں کلائی اس کے سامنے کر دی۔

''سر! ایک سائن یہاں بھی، پلیز!'' اس نے درخواست کی تو وہ کچھ شش و پنج میں پڑ گیا۔ ساتھی کھلاڑیوں کی معنی خیز...... زیرِلب مسکراہٹ دیکھ کر کچھ شرمندہ سا ہوا اور جان چھڑانے کے لیے...... اس نازک اور گوری سی کلائی پر...... تیزی سے سیاہ مارکر نما قلم چلا دیا۔

نویرہ نے ایک نظر اپنی کلائی پر نمایاں نظر آنے والے اس کے سائن پر ڈالی اور دوسری حسنات پر...... تو حسنات کو اس کی آنکھوں میں تکلیف کے سے آثار نظر آئے...... شاید جلدی اور بوکھلاہٹ میں اس نے مارکر کو اس کی کلائی پر گہرا گھسیٹ دیا تھا لیکن وہ مسکرائی...... میچ کا ٹکٹ اور قلم واپس لیتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے شکریہ کہا اور واپس اپنی ٹیبل پر آ گئی۔

جب اس نے ٹکٹ پر نظر ڈالی تو اس کا دل بے طرح دھڑکا تھا۔ اس پر کچھ غیر نمایاں انداز میں جو الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ وہ اس کو ہواؤں میں اُڑا رہے تھے۔

''لو یو۔'' کے الفاظ کچھ اس طرح تحریر تھے کہ بادیُ النظر میں وہ صرف ایک پرندے کا اسکیچ نظر آ رہے تھے لیکن اس کی گہری نظروں نے ان کی اصل کو کھوج لیا تھا۔ اب اس کے دل کی دھڑکنیں قابو سے باہر ہونے لگیں تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر انہیں سنبھالنے کی کوشش کی۔ چہرے پر ابھر آنے والی حدت آمیز سرخی نے...... اس کا چہرہ ہی بدل دیا۔ وہ اپنے اندر اٹھنے والے اس طوفانِ بلاخیز سے بری طرح گھبرا گئی۔

جلدی سے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ پانی پی کر...... چند گہرے گہرے سانس لے کر...... اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ چند لمحے آنکھیں بند کر کے...... کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بیٹھی رہی۔ جب ذرا جان میں جان آئی تو آنکھیں کھولیں...... آنکھیں کھول کر بڑی ہمت کر کے، اس طرف نظر ڈالی جہاں وہ دشمنِ جاں بیٹھا ہوا تھا لیکن صرف اس کی ہی نہیں بلکہ ساری سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ وہ سب کھانا کھا کر واپس جا چکے تھے۔

اس نے ایک نظر اپنی کلائی پر ڈالی، سفید مومی سی کلائی پر...... گہرے سیاہ مارکر سے کیے گئے اس کے سادہ سے سائن جگمگا رہے تھے اور مارکر کی رگڑ...... اور اس کی روشنائی کے اثر سے...... اسے ہلکی ہلکی سی جلن محسوس ہو رہی تھی۔

''تمہارے یہ سائن...... ساری عمر مجھے اپنے ساتھ...... تمہاری موجودگی کا احساس دلاتے رہیں گے۔ میں انہیں کبھی بھی مٹنے نہیں دوں گی۔'' اس نے زیرِلب بڑبڑاتے ہوئے...... کلائی پر اپنی انگلی ہلکے سے پھیری۔ روشنائی کب کی خشک ہو چکی تھی۔ وہ مسکرائی۔ بل کے پیسے پلیٹ میں رکھ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

''کیا یہاں آس پاس کوئی ٹیٹو بنانے والا ہے؟'' وہ اپنے ہوٹل میں ریسپشن پر کھڑی لڑکی سے پوچھ رہی تھی۔

''یس میم! وہاں لابی کے آگے کوریڈور میں ایک سوونیئرز شاپ ہے۔ وہاں ایک چائنیز لڑکی ہے وہ بہت اچھے ٹیٹوز بناتی ہے۔ آپ وہاں سے معلوم کر لیں۔'' ریسپشنسٹ لڑکی نے مسکراتے ہوئے اس کی راہنمائی کی۔

''تھینکس!'' وہ سن کر خوش ہو گئی اور اسی وقت تیز تیز قدموں سے سوونیئرز کی طرف چل پڑی۔

''مجھے ان میں سے کوئی ڈیزائن نہیں چاہیے۔ میرا

اپنا ڈیزائن ہے یہ دیکھو! میں اپنی کلائی پر بنوا کر لائی ہوں۔ بس اسی کو ٹیٹو کر دو۔'' اس نے چائنیز لڑکی کی فراہم کردہ ڈیزائن بک کو پرے ہٹا کر...... اپنی کلائی اس کے سامنے کر دی تو وہ ہنس پڑی۔

''او کے میم! آیئے ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں۔''

اس نے نویرہ کو ایک نیچی کرسی پر بٹھا کر اس کا ہاتھ ٹیبل پر رکھوایا اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ کچھ ہی دیر میں اس نے حسنات خان کے سائن کو، اس کی کلائی پر ٹیٹو کر دیا۔ اب وہ زندگی بھر مٹ نہیں سکتے تھے۔ جب وہ لڑکی ٹیٹو بنانے میں مصروف تھی تو سن کر دیے جانے کے باوجود اس کی کلائی پر ہلکی ہلکی چبھن نے بے چین کیا ہوا تھا لیکن اب جب اس کا کام ختم ہوا اور اس نے کلائی پر نظر ڈالی تو خوشی کی ایک لہر جاگی اور ایک تفاخر بھرے احساس نے اسے اندر سے بڑا مضبوط کر دیا۔

''اب تم میری زندگی کا حصہ ہو۔ وہ حصہ جو کبھی الگ نہ ہو سکے گا۔ تم چاہو گے تب بھی نہیں۔'' اس نے سوچا اور طمانیت کے احساس کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔ 'زندگی کے کسی حصے میں کیا وہ کبھی مجھے مل سکے گا؟' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''اگر میرا جذبہ سچا ہے تو یقیناً اس میں اتنی طاقت ہوگی کہ وہ اسے میری طرف کھینچ ہی لے گا۔'' اس نے خود ہی جواب دیا اپنے آپ کو اور مسکرا دی۔

☆☆☆

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ ٹیرس پر اپنی مخصوص جھولنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گئے۔ ملازم نے حقہ تازہ کر کے لا کر رکھ دیا تھا۔ وہ پیشانی پر ابھرتی شکنوں کے ساتھ...... پُرخیال انداز میں آہستہ آہستہ کرسی پر جھول رہے تھے۔ کبھی کبھی حقے کا کش لگا لیتے۔ پھر سوچ میں گم ہو جاتے۔ جانے کن گمبھیر سوچوں میں الجھے ہوئے تھے۔ جب وہ اس موڈ میں ہوتے تھے تو گھر والے تو کیا کوئی ملازم بھی ان کے سامنے نہیں جاتا تھا۔ سب ان کے مزاج شناس تھے۔

جھولتے جھولتے ان کی نظر دور حویلی کے پھاٹک پر گئی تو چوکیدار ہاتھ میں کوئی بھاری سا لفافہ لے کر حویلی کے اندر آرہا تھا۔

''خان جی! ڈاک خانے سے یہ ڈاک آئی ہے آپ کے نام۔'' ملازم نے دست بستہ وہ لفافہ انہیں پیش کیا۔

''بہرام!'' انہوں نے بہرام کو پکارا تو وہ ملازم کے ہاتھ سے لفافہ لینے آگے بڑھا اور اسے واپس جانے کا اشارہ کیا پھر اس نے وہیں کھڑے کھڑے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک سی ڈی برآمد ہوئی۔ جس کے ساتھ ایک کاغذ پر جلی حروف میں ''بنام خان خاقان شاہ'' لکھا ہوا تھا۔ بہرام نے سی ڈی تپائی پر رکھی اور اندر گیا۔ تھوڑی دیر بعد لیپ ٹاپ لے کر آیا اور خان کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو انہوں نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔

سی ڈی لیپ ٹاپ میں لگا کر چلائی گئی تو اسکرین پر پہاڑی علاقوں کا منظر نظر آیا۔ کیمرا چلتا ہوا کسی غار میں داخل ہوا اور پھر کسی ایسی جگہ ٹھہر گیا جسے دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ پہاڑ کے اندر کسی غار کو اور کشادہ کر کے اسے کمرے کا روپ دے دیا گیا ہو...... وہ جگہ کچھ نیم تاریک سی لگ رہی تھی پھر اچانک وہاں روشنی ہوئی اور کیمرا گردش کرتا ہوا ایک کونے پر جا کر رک گیا۔

دو آدمی وہاں زنجیروں سے بندھے بیٹھے تھے۔ پھٹے ہوئے لباس اور زخم زخم چہروں اور ہاتھ پیروں کو دیکھ کر صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بدترین تشدد سے گزرے ہیں۔ ان کے سر جھکے ہوئے اور آنکھیں بند تھیں۔ بال لہو اور گرد میں اٹ کر ان کے چہروں پر لٹکے ہوئے تھے۔ چہروں پر زخموں اور چوٹوں کے بے شمار نشان تھے۔

''یہ...... یہ تو...... یہ تو شہروز اور خیر خان ہیں خان جی!'' بہرام کی آواز پھٹی پھٹی سی تھی۔

''اوئے خانہ خراب! یہ کیا ظلم کیا ہے ان بے چاروں کے ساتھ؟'' خان خود بہت تکلیف محسوس کر رہے تھے۔

کیمرا انہی دونوں پر تھا کہ کسی نے ان کو زوردار ٹھوکر ماری پھر پے در پے کئی اور ٹھوکریں پڑیں۔ لیکن وہ بے چارے ہوش میں ہی کہاں تھے۔ جو کسی ردعمل کا اظہار کرتے پھر کسی نے بھاری پستول لوڈ کیا اور ایک ایک کر کے دونوں کی پیشانی پر گولی مار دی۔

''او میرے خدا! یہ جرأت کس نے کی ہے؟ پتا کرو بہرام خانا...... پتا کرو...... میں اس کے خاندان کے ایک ایک شخص کو ایسی ہی موت دوں گا جیسے یہ دونوں مارے گئے ہیں اور یہ سب کچھ ہمارے ہی آس پاس کے پہاڑوں میں کہیں ہوا ہے۔ ہماری ناک کے نیچے...... ہمارے دشمن اتنا طاقتور اتنا نڈر ہو گیا...... کہ ہمارے آدمیوں کو اتنی بے رحمی سے مار ڈالا...... وہ بھی بغیر کسی وجہ کے۔''

''یہ جگہ کہاں ہے؟ تلاش کرواؤ بہرام...... ابھی اپنے بندے لگاؤ، سارے پہاڑ چھان مارو...... آس پاس جتنے پہاڑ ہیں...... انہی میں کہیں یہ جگہ ہوگی' ہمارے دشمنوں کا

مسکن۔'' خاقان شاہ سرخ چہرہ لیے، ضبط کی آخری منزلوں پر تھے۔

اتنے میں سی ڈی پر کوئی پیغام چلنا شروع ہو گیا۔

''خاقان شاہ! یہ تو صرف ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ تم اس علاقے میں ہزاروں سپاہی بھی لگاؤ گے تب بھی انہیں بیکار کرنا ہمارے لیے کچھ خاص مشکل نہیں ہے۔ تم ہمارا راستہ روک نہیں سکتے۔ ہمیں ہر صورت جنگل کے اس حصے میں اپنے لیے ایک ٹھکانا چاہیے۔ چاہے تم چاہو یا نہ چاہو...... بہتر ہے اپنا کیمپ وہاں سے ہٹالو، اور نگرانی کرنے والوں کو بھی واپس بھیج دو...... ورنہ ایسی ایسی کتنی ویڈیوز ہم تمہیں بھجواتے رہیں گے؟ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ امید ہے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو گے۔ ورنہ ہمارے پاس اپنے مقصد کے حصول کے لیے اور بھی بہت سے آپشنز ہیں۔ فی الحال تو ہم تمہارے کیمپ میں موجود سپاہیوں کو یہ ویڈیو دکھانے کا انتظام کرنے والے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آدھے سے زیادہ تو صرف یہ ویڈیو دیکھ کر ہی بھاگ جائیں گے جو باقی بچیں گے ان سے ہم نمٹ لیں گے۔''

یہ پیغام ختم ہوا تو اسکرین خالی ہو گئی۔

''بہرام!'' خاج جی گرجے۔ ''حویلی کے دس کمانڈوز اُدھر بھیجو اور انہیں حکم دو کہ اُدھر جنگل میں ہمارے آدمیوں کے علاوہ جو بھی نظر آئے، اسے گولی ماردیں۔ کوئی بھی ہو...... جو سامنے نظر آئے...... اُڑادواسے...... بدبخت! کیا سمجھا ہے انہوں نے ہم کو...... چوہے؟ جو اُن سے ڈر کر بلوں میں گھس جائیں اور انہیں دندنانے کی اجازت دے دیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ من مانی نہیں کر سکتے...... ابھی...... فوراً کمانڈوز کو کھلے آرڈر کے ساتھ بھیجو...... فوراً...... اور ہاں انہیں اندھیرے میں دیکھنے والے چشمے بھی دینا۔''

''جی خان جی!'' بہرام الٹے پیروں واپس ہوا اور فوراً ہی انتظامات میں مصروف ہو گیا۔

اگلے سات دنوں میں خاقان شاہ کے آدمیوں نے اپنے علاقے میں چوری چھپے گھسنے والے پانچ آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ وہ اجنبی چہرے تھے اور الگ الگ راستوں سے جنگل کے اندر داخل ہوئے تھے۔ پہلے دو آدمی اس کوشش میں مارے گئے۔ اگلے دو دنوں میں پھر دو افراد گولیوں کا نشانہ بنے اور پھر ایک آدمی نے اکیلے ہی ہمت دکھائی اور زبردستی گھسنے کی کوشش کی۔ اس کے پاس اسلحہ بھی کچھ نئی قسم کا تھا اور کچھ اور ایسی چیزیں تھیں جن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے باقاعدہ تیار کر کے بھیجا گیا ہے۔ شاید وہ کچھ کرتا...... لیکن خان کے سخت آرڈرز کے سبب اُن کے آدمیوں نے انتظار ہی نہیں کیا۔ سر پر اس نے کچھ خاص قسم کا ہیلمٹ پہنا ہوا تھا۔ خان کی سیکیورٹی والے نے کوئی بھی رسک لیے بغیر...... اس کے چہرے کو نشانہ بنایا۔ بڑے بور کے ہتھیار کی گولی نے اس کے چہرے کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ گولی چہرے کو سوراخ میں بدلتی ہوئی پار نکل گئی تھی۔

لمحہ بہ لمحہ رپورٹ خاقان شاہ کو مل رہی تھی۔ نصیب گل نے جب یہ اطلاع انہیں دی تو انہوں نے فوراً ہی اس کو ہدایات دیں۔

''اس کے جسم پر جتنی بھی چیزیں ہیں، سب اتارلو...... ایک ایک چیز اپنے قبضے میں کرو۔ یہاں تک کہ اس کے کپڑے بھی۔ اس کے بدن پر کچھ بھی نہیں چھوڑنا ہے سب کچھ لے کر اِدھر پہنچاؤ...... اور اس کا مردہ جسم اُدھر پہاڑوں میں دور پھنکوادو۔''

خاقان شاہ کو کسی نہ کسی نشان...... کسی اشارے کی سخت ضرورت تھی۔ کیونکہ وہ اس کے ذریعے ان لوگوں تک پہنچنا چاہتے تھے جنہوں نے ان کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ ان کو بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ایسے ایسے لفنگے بلیک میلرز سے بہت اچھی طرح نمٹ سکتے تھے لیکن وہ ہیں کون؟ سامنے تو آئیں۔ وہ سوچ سوچ کر غصے میں پاگل ہوئے جا رہے تھے۔

''خان جی! نصیب گل نے یہ چیزیں بھجوائی ہیں۔'' بہرام ایک تھیلا ہاتھ میں اٹھائے کھڑا تھا۔

بہرام خان کو بھجواؤ یہ چیزیں اس کو کہو...... بہت اچھی طرح اور باریک بینی سے ان چیزوں کو چیک کرے، اور پھر مجھے آکر بتائے۔'' انہوں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے حکم دیا اور حقہ گڑگڑانے لگے۔

☆☆☆

اگلے دن پہلا ون ڈے تھا۔ اس کی آنکھ صبح بہت جلدی کھل گئی۔ روم سروس کو فون کر کے چائے منگوائی اور پھر بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ آج اس نے پاکستان کی مناسبت سے سبز اور سفید لباس کا انتخاب کیا تھا۔ سفید ٹراؤزر کے ساتھ سبز قمیص پہن کر اپنے آپ کو تنقیدی نگاہ سے آئینے میں دیکھا۔ بالوں میں دو چار برش مار کر انہیں ٹھیک کیا اور اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر نیچے ڈائننگ میں چلی گئی۔

ناشتا کرنے والوں سے تقریباً سب ڈائننگ ٹیبلز

بھری ہوئی تھیں۔ اسے بھی بڑی سی گلاس ونڈو کے پاس جگہ مل گئی۔ وہ اپنے مختصر سے ناشتے کی ٹرے لے کر وہاں بیٹھ گئی۔

پاس ہی کی ٹیبل پر آٹھ دس لڑکے بیٹھے ہوئے ناشتا کر رہے تھے۔ وہ سب پاکستانی تھے اور مختلف شہروں سے آئے تھے۔ یورپ اور امریکا کے پاکستانی خاندانوں سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ...... شاید پاکستان سے بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی رواں اردو میں گفتگو سے اس نے یہی اندازہ لگایا۔

وہ لوگ دونوں ٹیموں کی کارکردگی پر مسلسل محو گفتگو تھے۔ نویرہ غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی...... وہ اب ٹاس کی بات کر رہے تھے۔ تبھی نویرہ بول پڑی۔

''حسنات خان سے اچھا کپتان دنیا کی کسی کرکٹ ٹیم کے پاس نہیں ہے۔ وہ جو بھی فیصلہ کرتا ہے، درست ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ باقی کھلاڑی اس کی توقعات پر پورا نہ اتریں۔ ایسا ہوتا ہے تب ہی ٹیم میچ ہارتی ہے۔ اس کے فیصلوں کی وجہ سے ہم نے کبھی میچ نہیں ہارا۔''

نویرہ نے ان سب کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے اپنی ٹیم کے کپتان کی زبردست وکالت کی۔

''اوہ یاہ! تم بھی میچ دیکھنے جارہی ہو؟'' ایک لڑکے نے اس کی ڈریسنگ دیکھتے ہوئے سوال کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوکے، پھر ہمارے ساتھ ہی بیٹھنا، ہم لوگ زبردست ہلے گلے کا پروگرام بنا کر آئے ہیں۔'' اس نے پیشکش کی تو نویرہ کو نہ جانے کیوں احساس ہوا کہ اس کا چہرہ کچھ دیکھا ہوا سا ہے۔

''تم لوگ پاکستان سے آئے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہم م م م...... کراچی سے۔'' اس نے منہ چلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ، ہم لوگ اکثر کراچی جاتے رہتے ہیں۔'' اس نے بات بڑھائی۔

''رہائش کہاں ہے؟''

''لندن میں۔''

''دیٹس ساؤنڈز گڈ، اوکے آئی ایم ود گروپ۔''

اس کی باتیں غور سے سنتے ہوئے لندن سے آئے ایک لڑکے نے طمانیت سے سر ہلایا اور اپنے فون پر ٹیکسٹ کرتے ہوئے لکھا۔

''راس! مائی فرینڈ! اب وہ ہمارا گروپ جوائن کر چکی ہے اور تمام میچز میں ہمارے ساتھ ہی ہوگی اس لیے تم اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ سب کچھ ٹھیک ہے۔''

پھر وہ سب ہنستے، بولتے پیدل ہی اسٹیڈیم کی طرف روانہ ہو گئے اور اندر داخل ہونے سے پہلے اسٹیڈیم گیٹ کے نزدیک لگے اسٹال سے انہوں نے پرچم والی ٹی شرٹس، کیپ، چوکے چھکے والے پلے کارڈز، اور طرح طرح کے زیادہ سے زیادہ شور مچانے والے باجے اور سیٹیاں وغیرہ خریدیں اور اندر پہنچ گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں دونوں ٹیموں کے کپتان، امپائرز کے ساتھ میدان میں داخل ہوئے۔ قومی ٹیم کے کپتان نے ٹاس جیتا اور میزبان ٹیم کو بیٹنگ کی دعوت دی۔ حسنات خان نے جو فیصلہ کیا، سب نے تالیاں بجا کر اس کی داد دی۔ کیونکہ سب کے خیال میں یہ ایک درست فیصلہ تھا۔

پھر دھواں دھار میچ شروع ہوا۔ قومی ٹیم کے ہر ہر بالر کو اس کی ہر بال پر زبردست داد مل رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں پہلی وکٹ کیا اُڑی کہ اسٹیڈیم میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ہر طرف نعروں کا...... سیٹیوں کا اور باجوں کا شور گونج اٹھا۔

وہ بھی اپنے گروپ کے ساتھ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہی تھی۔ شور مچا رہی تھی۔ قومی پرچم کو لہراتے ہوئے، سرخ چہرہ لیے وہ کئی بار کیمروں کی گرفت میں آئی۔

اور ایسے میں ہی کراچی میں بیٹھے ارسل نے اسے ٹی وی اسکرین پر خود بھی دیکھا اور امی کو بھی دکھایا۔ کیونکہ میچ کی لائیو کوریج چل رہی تھی۔ ''پاگل ہے بالکل۔'' ارسل نے مسکراتے ہوئے زیر لب کہا اور بعد میں میچ کی کلپس میں سے اس کے چار چھ ایسے ہی پوز کاپی کر کے...... اپنے فنی کلپس والے فولڈر میں ڈال کر محفوظ کر لیے۔

تین میچز ملبورن میں تھے اور تین پرتھ میں...... اور یہ سیریز تقریباً پندرہ روز چلنی تھی۔ اس نے ان پندرہ دنوں میں تقریباً روزانہ ہی حسنات خان سے براہِ راست رابطے کی کوششیں کیں، یہ کوششیں ناکام بھی ہوئیں اور کچھ کامیاب بھی...... کامیاب یوں کہ ان کوششوں کے نتیجے میں وہ تین چار مرتبہ حسنات سے مختصراً لیکن براہِ راست ملنے میں کامیاب ہو گئی۔

انہی ملاقاتوں میں اسے معلوم ہوا کہ حسنات کسی چیریٹی کرنے والی این جی او کی سرپرستی بھی کرتا ہے۔ تو اس نے بلا تامل ایک اچھی خاصی رقم اس کے چیریٹی فنڈ میں دے ڈالی۔ اپنا ڈنر روزانہ اس نے اسی ہوٹل میں مخصوص کر

لیا تھا جہاں پاکستانی ٹیم ٹھہری ہوئی تھی۔
وہ ڈنر سے کافی پہلے جا کر اپنی مخصوص ٹیبل پر بیٹھ جاتی تھی۔ جب قومی ٹیم کی ڈنر کے لیے آمد ہوتی...... وہ سب آ کر اپنی ریزروڈ ٹیبل پر بیٹھتے...... ہنستے بولتے، کھاتے پیتے رہتے......اور وہ اپنے پاگل جذبوں کو قابو کرنے کی کوششیں کرتے ہوئے کبھی براہِ راست اور کبھی کن انکھیوں سے اسے دیکھتی رہتی۔ الگ الگ موڈز میں اس کی تصویریں اپنے موبائل فون سے کھینچتی رہتی...... آخری دنوں تک اس کے پاس بے شمار تصویروں کا خزانہ جمع ہو چکا تھا اور اس میں سب سے قیمتی تصویر وہ تھی جس میں وہ خود حسنات کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔
یہ تصویر اس وقت کی تھی جب اس نے حسنات کی این جی او کے لیے ایک بڑی رقم کا چیک دیا تھا اور بدلے میں ایک تصویر کی فرمائش کی تھی۔ حسنات نے اسے قبول کر لیا تھا۔ اس نے اپنا فون ایک دوسرے کھلاڑی کو دے کر یہ تصویر بنوائی تھی۔
ہر روز کتنی ہی مرتبہ وہ اس تصویر کو دیکھتی تھی۔ اس کی دیوانگی، اس کا پاگل پن، خود اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔
نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن سب پیچھے رہ جائیں گے اور وہ اکیلی ہوگی جو اس کے ساتھ ہوگی۔
وہ اکثر سوچتی اور اپنے آپ کو اس بات کا یقین دلاتی کہ آخرکار اس کے جذبے رنگ لائیں گے اور وہ حسنات کو جیت لے گی کیونکہ اسے حسنات سے عشق تھا...... کسی اسٹار سے نہیں۔

☆☆☆

اس دن سنڈے برنچ پر سب ساتھ تھے۔ ان کے گھر کا یہ دستور تھا۔ ورکنگ ڈیز میں وہ سب الگ الگ اوقات میں ریڈی میڈ ناشتا کر کے اپنے اپنے کاموں کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ ثاقب اپنی کنسٹرکشن کمپنی کے آفس، ان کی بیگم سیماب اپنی جاب پر...... نویرہ اور راس اپنے کالج۔
صرف اتوار کی چھٹی میں وہ سب گھر پر ہوتے تھے اس لیے سیماب اس دن برنچ کا خصوصی اہتمام کرتی تھیں۔ کچھ نہ کچھ نیا ضرور بنتا تھا اور وہ سب کافی دیر تک ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے اور ہنستے بولتے رہتے...... اس دن بھی برنچ کا خصوصی آئٹم 'ہیلو پچو بریڈ' اور نہ جانے کیا کیا آئٹم ٹیبل پر موجود تھے اور وہ سب ان سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو!'' ثاقب نے فون اٹھایا۔
''جی آپا! السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟'' وہ خوش ہو گئے۔ انہوں نے راس کو اشارے سے چائے کا کپ پکڑانے کو کہا اور خود وہیں صوفے پر آرام سے بیٹھ گئے۔ سیماب اور نویرہ ٹیبل سے برتن سمیٹ کر لے گئیں اور راس بھی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اطمینان سے اپنی آپا سے گپ شپ کرنے لگے۔
''جی! آج تو ایک عرصے کے بعد ہمارے ہاں سورج نکلا ہوا ہے۔ دن بڑا روشن روشن سا محسوس ہو رہا ہے۔ ابھی برنچ سے فارغ ہوئے ہیں۔ آپ سنایئے، وہاں پاکستان میں کیا چل رہا ہے؟''
''اللہ کا شکر ہے بھیا! یہاں بھی سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔'' آپا نے جواب دیا تو وہ مسکرائے۔
''آپ تو ہمیشہ ٹھیک ٹھاک کی خبر دیتی ہیں لیکن آپ کے ٹی وی چینلز کچھ الگ ہی خبریں دیتے ہیں۔''
''ارے بھیا! وہ سب تو ہماری زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ اس مارا ماری کے بغیر تو شاید ہمارا کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا۔ اس لیے ان پر پریشان ہونا چھوڑو......اور میری بات کا جواب دو۔''
''کون سی بات کا آپا؟''
''تم جا رہے تھے تو میں نے تم سے نویرہ اور ارسل کے رشتے کے بارے میں کہا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ گھر میں مشورہ کر کے جواب دوں گا۔ تو تم نے سب سے بات کی...... یا بھول گئے؟'' انہوں نے بھائی کو یاد دلایا۔
''نہیں بھولا نہیں تھا بس وہ نویرہ پچھلے دنوں پندرہ دن کے لیے آسٹریلیا چلی گئی تھی۔ کچھ میری مصروفیات بھی زیادہ تھیں۔ اس لیے میں کسی سے یہ بات ڈسکس نہیں کر سکا لیکن آپ فکر نہ کریں، میں آج ہی بات کرتا ہوں پھر آپ کو فون کروں گا۔''
انہوں نے اپنی آپا کو مطمئن کیا اور فون رکھ کر وہیں بیٹھے پُرخیال انداز میں چائے کے گھونٹ لیتے رہے......تھوڑی دیر میں سیماب بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔
''کیا کہہ رہی تھیں آپا؟ سب خیریت تو ہے پاکستان میں؟''
''سب خیریت ہے...... دراصل آپا نے مجھ سے ایک بات کہی تھی جب ہم پاکستان سے واپس آ رہے تھے۔ وہ اپنے بیٹے ارسل کے لیے نویرہ کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔ اب

بھی انہوں نے دوبارہ مجھے اسی بات کی یاد دہانی کروائی ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں سب سے بات کر کے آپ کو جواب دیتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر یہ رشتہ ہو جاتا ہے تو دونوں کے لیے مناسب ہے یا نہیں؟'' انہوں نے پہل اپنی بیگم سے ہی کی۔

''ارسل اچھا لڑکا ہے، مہذب، خوش اطوار، اچھی شخصیت کا مالک...... پھر تعلیم بھی اچھی ہے۔ ابھی کچھ ہی دنوں میں سول انجینئر بن جائے گا تو یقیناً ایک اچھا مستقبل اس کے انتظار میں ہوگا۔ پھر ہماری نویرہ سے اس کی دوستی بھی بہت اچھی ہے۔ مجھے تو کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ وہ پاکستان میں ہے۔ اب وہ بن چکی ہے خطروں کی سرزمین...... اس لیے میں چاہوں گی کہ وہ شادی کے بعد یہاں آ کر رہے تاکہ ہمیں سکون رہے...... ورنہ ہم جو وہاں کی خبریں سن سن کر وحشت میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں...... بچوں کے وہاں رہنے سے کم از کم میری وحشت میں تو نہ جانے کتنا اضافہ ہو جائے گا۔'' سیماب نے اپنے خیالات صراحت سے پیش کیے تو ثاقب ہنسنے لگے۔

''فکر صرف اپنی اولاد کی ہوگی دوسرے لوگ بھی تو وہاں رہتے ہیں، ان کا کچھ نہیں؟'' انہوں نے سیماب کو چھیڑا۔

''نہیں بھئی! اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ پریشانی تو سب کے لیے ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے اپنی اولاد کے لیے زیادہ ہوتی ہے۔''

''اچھا ایسا کرو، راسں اور نویرہ کو یہیں بلالو...... ابھی بات کر لیتے ہیں۔'' سیماب نے سر ہلایا اور دونوں کو آواز دی۔

''پاپا! ارسل ایک بہت اچھا انسان ہے۔ لیکن وہ میرا ... صرف دوست ہے۔ بہت اچھا دوست...... اس سے شادی کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔'' نویرہ کے لہجے میں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کچھ پریشانی کی بھی جھلک تھی۔

''پہلے کبھی نہیں سوچا...... تو اب سوچ لو...... اگر وہ ایک اچھا دوست ہے...... تو ہمیشہ ہی رہے گا...... یعنی شادی کے بعد بھی...... شوہر اور بیوی اگر اچھے دوست ہوں، تو زندگی بہت اچھی گزرتی ہے بیٹا!'' ثاقب نے مسکرا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''نہیں پاپا! ایسا کبھی نہیں ہوتا...... اچھا دوست شادی کے بعد صرف شوہر بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے اندر کا اچھا دوست پتا نہیں کہاں کھو جاتا ہے۔''

''یہ کوئی فارمولا نہیں ہے، ہر ایک کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا...... ارسل کو ہم بچپن سے دیکھتے آ رہے ہیں۔ وہ ایک بہت لونگ اور کیئرنگ نیچر رکھتا ہے، بچپن سے لے کر اب تک بھی...... وہ تمہارا کتنا خیال رکھتا ہے...... بلکہ شاید محبت بھی کرتا ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے خدشات کیوں ہیں؟''

''خدشات نہیں ہیں پاپا! اس کی اچھائی میں کوئی شک نہیں ہے لیکن آئی ایم سوری ٹو سے کہ میں اس سے شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''تو کیا تم کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہو...... کیا کوئی اور ہے تمہاری زندگی میں...... اگر ایسا ہے تو بتاؤ...... بتاؤ؟''

سیماب نے پوچھا تو نویرہ کچھ دیر نظریں جھکائے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی پھر اچانک اٹھ کر چلی گئی۔ وہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

''بے چاری میری آپا! پہلے انہوں نے اپنے جاذل کے لیے رانیہ کو مانگا...... تو اس نے انکار کر دیا اور اپنی پسند سے شادی کر کے چلی گئی اور اب یہ دوسری بار...... ارسل کے لیے دامن پھیلایا...... تو میری بدقسمتی دیکھو کہ اس مرتبہ بھی ان کی جھولی میں ڈالنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہوگا۔ سیماب! اس سے پوچھو تو سہی...... کون ہے اس کی زندگی میں...... جو ارسل سے زیادہ اچھا ہے آخر وہ کس کی خاطر ارسل جیسے ہیرا شخص کو ٹھکرا رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں اسے پچھتانا پڑے۔'' ثاقب نے جذبات سے بوجھل انداز میں بیوی سے کہا۔

''ٹینشن نہ لیں۔ میں پوچھتی ہوں اُس سے... سمجھانے کی کوشش بھی کرتی ہوں...... ہو سکتا ہے کہ اس بے وقوفی سے باز آ جائے ورنہ رانیہ کی طرح پچھتاتی رہے گی۔'' سیماب نے اٹھتے ہوئے ان کے کاندھے کو ہلکے سے دبایا اور تسلی دینے کی کوشش کی۔

☆☆☆

''بولو بہرام خان! کیا رپورٹ ہے؟'' خاقان شاہ نے پوچھا۔

''خان جی! لاش سے ملنے والا سارا سامان میں نے اچھی طرح چیک کیا۔ یہ کوئی معمولی لڑکا نہیں تھا۔ اس کا سارا سامان اور ہتھیار بہت جدید قسم کے ہیں۔ جو ابھی تک اس علاقے میں کسی نے دیکھے بھی نہیں ہیں۔ دس چیزیں تو صرف اس کے ہیلمٹ میں تھیں۔ ریسیور اور مائک،

اندھیرے میں دیکھنے والا چشمہ...... ٹارگٹ کو فوکس کرنے والا لینس، لائٹ اور اس میں سینسر بھی لگے ہیں جس سے بندے کی لوکیشن کو بھی چیک کیا جا سکتا ہے۔''

''اوئے خانہ خراب! تو ابھی بھی لوکیشن تو چیک ہو رہی ہوگی۔ انہوں نے اِدھر حملہ کیا تو پھر کیا ہوگا؟'' خان کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''نہیں خان، میں نے اسے ڈی ایکٹی ویٹ کر دیا تھا۔ اب اس کی لوکیشن چیک نہیں ہو سکتی۔ اس کے ہتھیار بھی خطرناک ہیں۔ ایک بھاری گن ہے جس کے کلپ بدل بدل کر الگ الگ سائز کی گولیاں فائر کی جا سکتی ہیں اور سب سے خطرناک لیزر گن ہے۔ اس کا ٹریگر دبتا ہے تو نیلے رنگ کی صرف ایک شعاع نکلتی ہے جو سامنے ٹارگٹ کو بھسم کر دیتی ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو...... عجیب طرح کی گھڑی ہے۔ ٹارگٹ کے لیے اس کا ڈیٹا اس میں فیڈ کرو، وہ خود راستہ بتاتی ہوئی صحیح جگہ پہنچا دیتی ہے۔ یہ سب کسی بہت ہی ترقی یافتہ ملک کی چیزیں ہیں، وہیں سے آئی ہیں۔''

''مرنے والا بندہ بھی گورا تھا۔ گورے تو ہمارے پڑوسی ملک کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ پر وہ مسلمان بھی نہیں تھا۔'' بہرام نے اطلاع دی۔

''اس کا مطلب ہے ہمارا مقابلہ چھوٹے موٹے دشمن سے نہیں ہے بلکہ کسی بڑی طاقت نے ہمارے ساتھ پنجہ آزمائی کا پروگرام بنایا ہے۔ خدا خیر کرے۔'' خان کے لہجے میں تشویش تھی۔

''خان جی! آپ اپنے دوست میجر شہباز سے بات کریں۔ شاید آپ کو ان کی مدد کی ضرورت پڑ جائے۔'' بہرام نے مشورہ دیا۔

''نہیں...... ابھی نہیں...... دیکھو اور انتظار کرو...... وہ آگے کیا کرتے ہیں...... پھر سوچیں گے۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

لیکن انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ نصیب گل کا آدمی گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا تھا۔

''خان جی! کیمپ پر حملہ ہو گیا ہے۔ لگتا ہے کسی فوج نے حملہ کیا ہے۔ جہاں کیمپ لگا ہوا تھا وہاں ایک میزائل آ کر لگا ہے۔ میزائل چھوٹے سے اور عجیب سے جہاز سے فائر ہوا تھا۔ کیمپ تباہ ہو گیا۔ ہمارے کئی لوگ مارے گئے جو باہر آس پاس گشت پر تھے بس وہی بچے ہیں۔ ہم لوگوں نے اس عجیب سے جہاز پر فائر کیے پر وہ اونچا تھا۔ فائر اسے لگا نہیں، وہ واپس مڑا اور سرحد کی طرف چلا گیا اور وہی سامنے تھا ہی نہیں...... ہم کس سے لڑتے...... ابھی کیا حکم ہے؟'' اس نے رپورٹ دینے کے بعد سوال کیا۔

''تم چلو...... ابھی ہم اُدھر آتے ہیں نصیب گل تو ٹھیک ہے؟''

''جی خان جی! وہ بھی کیمپ سے باہر تھا اس لیے بچ گیا۔''

''بہرام! جتنے لوگ مرے ہیں اتنے ہی اور لوگ اُدھر کیمپ میں بھیج دو۔ انہیں ہدایت دو کہ ایک جگہ جمع نہ ہوں۔ ٹکڑوں میں بٹ کر کام کریں۔ کچھ راکٹ لانچر اور ایمونیشن بھجواؤ۔ جہاز کو دیکھتے ہی راکٹ ماریں اس کو...... یہ چھوٹی موٹی لڑائی نہیں رہی...... جنگ ہو گئی ہے...... میں مدد حاصل کرنے کا انتظام کرتا ہوں...... بہرام! میجر شہباز کو فون لگاؤ۔''

خاقان شاہ کو غصے کے ساتھ ساتھ اب تشویش نے بھی گھیر لیا تھا۔ لگتا تھا دشمن ان سے کہیں زیادہ طاقتور ہے، وہ کب تک اس کا مقابلہ کر پائیں گے؟ انہیں میجر شہباز سے مدد کے لیے درخواست کرنا ہی پڑے گی۔ وہ اپنی سوچوں میں غلطاں مسلسل ٹہل رہے تھے۔

''خان جی! میجر صاحب دوست ملک کے ساتھ ہونے والی جنگی مشقوں میں حصہ لینے کے لیے ان کے ملک گئے ہوئے ہیں۔ ایک ہفتے کے بعد واپسی ہوگی۔'' بہرام نے اطلاع دی۔

''اچھا! اس کا مطلب ہے ابھی ہمیں اپنے ہی بل بوتے پر ان کا مقابلہ کرنا ہوگا چلو! دیکھتے ہیں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ گھوڑے نکلواؤ...... چل کر دیکھتے ہیں کہ کتنا نقصان ہوا ہے اور آگے ہمیں کیا کرنا ہے۔''

ابھی وہ بات کر ہی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔

''خان جی! لندن سے فون ہے غلام محمد بات کرے گا۔''

''ہاں غلام محمد! وہاں سب ٹھیک ہے؟ حسنات کے کیا حال ہیں؟''

''خان جی! یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ چھوٹے خان جی جم گئے تھے شام کو۔ اُن کی واپسی نہیں ہوئی ہے ابھی تک...... دیر ہوئی تو میں نے انہیں فون کیا...... پر ان کا فون بند جا رہا تھا۔ میں نے ان کے انسٹرکٹر کو فون کیا تو اس نے بتایا کہ وہ تو اپنے وقت پر نکل گئے تھے اور گھر جانے کا ہی کہہ کر گئے تھے۔ اب کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔ میں نے اُن

کے سب دوستوں سے بھی پوچھ لیا۔ کسی کو نہیں معلوم...... جہاں جہاں میں تلاش کر سکتا تھا میں ڈھونڈ چکا ہوں...... نہ وہ ملے ہیں...... نہ ان کا کوئی پیغام...... پتا یا نشان...... مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں...... کیا میں پولیس کو اطلاع دے دوں؟''

''او خدائی خوار! فوراً پولیس میں رپورٹ لکھواؤ...... رپورٹ لکھوانے جاؤ تو علاقے کے پولیس اسٹیشن کا فون نمبر لے کر مجھے بھجواؤ...... میں بھی کچھ لوگوں سے بات کرتا ہوں...... جاؤ...... جلدی جاؤ۔''

ابھی وہ بات کر ہی رہے تھے کہ ان کے سیٹلائٹ فون پر کال آئی۔

''بیکار ہے خاقان شاہ! حسنات کو تم...... یا کوئی بھی تلاش نہیں کر پائے گا۔ وہ ہمارے پاس ہے۔ ابھی تک تو خیریت سے ہے لیکن کب تک خیریت سے رہے گا۔ اس کا دارومدار تم پر ہے۔ تم اپنی ضد کی وجہ سے ہمارا اور اپنا...... دونوں کا نقصان کروا چکے ہو۔ ہمارے قیمتی آدمی مار دیے تم نے...... ہم نے جواب میں تمہارا کیمپ اُڑا دیا۔ یہاں تک تو بات برابر ہوگئی......

پر اب تمہارا اکلوتا...... اسٹار بیٹا ہمارے پاس ہے، بے فکر رہو...... ہم اسے ماریں گے نہیں۔ صرف اس کے ہاتھ اور پاؤں توڑ دیں گے۔ پھر وہ زندگی بھر کھیلنا تو دور کی بات ہے، بلّا بھی نہیں پکڑ سکے گا۔ عبرت کا نشان بن کر رہ جائے گا۔'' دوسری جانب سے وہی آواز اور اس کی ہلکی سی زہریلی ہنسی سنائی دی تو خاقان شاہ چیخ پڑے۔

''بکواس بند کرو خانہ خراب! تم آخر چاہتے کیا ہو...... میرا ہی علاقہ تم کو کیوں چاہیے...... اور بہت جگہیں ہیں وہ لے لو...... یہی کیوں؟''

''اس لیے کہ ہمیں اپنے مقصد کے لیے سب سے مناسب جگہ یہی لگتی ہے اس لیے ہمیں ہر صورت یہاں جگہ چاہیے...... اب اگر تمہیں اپنا بیٹا کرکٹ کھیلتا ہوا چاہیے تو ہماری بات ماننا ہی پڑے گی ورنہ تم جانتے ہو، ہمیں کسی انسان کی دس بیس ہڈیاں توڑنے میں...... دس منٹ سے زیادہ نہیں لگتے۔''

''تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے...... ٹھیک ہے...... پر تم کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا...... یہاں سرحد پار سے آنے اور جانے والوں سے میرے کچھ معاملات طے ہیں، مجھے ان معاملات کو کسی اور جگہ منتقل کرنا ہوگا۔ کچھ روٹس تبدیل کرنا ہوں گے۔ کچھ نئے لین دین طے کرنا ہوں گے۔ اس میں کچھ وقت لگے گا۔ میں تمہیں تمہاری مرضی کی جگہ دے دوں گا۔ پر میرے بیٹے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو چھوڑ دو...... گھر جانے دو...... اپنے پاس رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ میں نے تمہارا مطالبہ مان لیا ہے۔''

''اور اگر تم مُکر گئے یا کوئی اور چکر چلانے میں لگ گئے پھر کیا ہوگا؟'' دوسری جانب سے سوال کیا گیا۔

''پھر اٹھا لینا اُسے...... وہ وہیں رہے گا لندن میں...... بھاگ تو نہیں سکتا۔ میں نے کچھ وقت مانگا ہے، انکار تو نہیں کیا ہے۔'' خان کا لہجہ چیخ رہا تھا۔

''بات تو ٹھیک ہے...... تم نے کوئی گڑبڑ کی تو پھر اٹھا لیں گے اور پھر تم سے پہلے بات نہیں کریں گے۔ اس کے ہاتھ پاؤں توڑنے کے بعد اطلاع دے دیں گے۔ اور ہاں، اسے چھوڑنے کے بعد بھی ہم اس کی ریکی کرتے رہیں گے۔ اس لیے اس کو سمجھا دینا کہ لندن سے نکلنے کی کوشش بھی نہ کرے۔ ورنہ کہاں سے گولی آئی...... اور کھوپڑی کے پار ہوگئی، پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''ہزار بار لعنت ہو خانہ خراب!'' خان نے غصے میں فون بند کیا تو اُدھر سے وہی زہریلی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے غصے میں فون پھینکا جسے بہرام نے کیچ کیا اور اندر لے گیا۔

☆☆☆

سب کے کہنے اور سمجھانے کے باوجود اس کے ہونٹوں پر جو 'ناں' آئی تھی۔ وہ 'ہاں' میں نہیں بدل سکی بلکہ اب تو ان میں سے کسی کے بھی اس موضوع پر بات کرنے سے وہ اشتعال میں آجاتی اور اسی اشتعال میں اس نے ایک دن اسکائپ پر ارسل سے رابطہ کیا۔

''ارسل کے بچے! یہ کیا مصیبت تم نے میرے سر ڈال دی ہے۔ ہر کوئی میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ آخر مسئلہ کیا ہے تمہارا؟''

''ہائیں...... میں نے کون سی مصیبت ڈال دی ہے تمہارے سر...... اور میں کیوں تمہارے پیچھے پڑوں گا...... نہ ہی میرا کوئی مسئلہ ہے۔''

''تو پھر یہ شادی شادی کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ سارے گھر والے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ ارسل سے شادی کر لو...... وہائے؟'' وہ چلائی تو ارسل ہنسا اور شرارت سے بولا۔

''اوہ...... شادی...... ارے بھئی! سب اتنا اصرار کر رہے ہیں تو مان لو ان کی بات...... آخر تمہارے اپنے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہیں اور انہیں مجھ سے اچھا لڑکا مل سکتا ہے بھلا تمہارے لیے۔''

''ارسل کے بچے! آئی ول کل یو...... دوست ہو...... بس دوست ہی رہو...... زبردستی کے شوہر بننے کی کوشش مت کرو۔'' وہ غصے سے چلائی تو ارسل کچھ چونکا۔

''کیا بات ہے نویرہ! اس میں غصے کی کیا بات ہے۔ کیا میں تمہارے لیے اتنا برا ہوں کہ تم مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتیں؟'' وہ سنجیدگی سے بولا تو اب نویرہ نے بھی اپنے غصے کو کنٹرول کیا اور سنجیدگی سے اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔

''تم بالکل بھی برے نہیں ہو ارسل! بلکہ تم ایک بہت اچھے انسان ہو اگر میری زندگی میں کوئی اور نہ ہوتا...... تو شاید تمہارے سوا میں کسی اور سے شادی کے متعلق سوچتی بھی نہیں...... مگر اب مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی اور کے لیے سوچتی ہوں...... اسی کے خواب دیکھتی ہوں...... اس کے علاوہ... مجھے دنیا میں کوئی اور نظر ہی نہیں آتا...... تم بھی نہیں۔''

اس کی بات سن کر ارسل کے دل سے ایک قیامت ٹکرائی۔ ایسی ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ اس کے شورِ بلاخیز نے اس کی سماعتوں میں حشر برپا کر دیا اور نہ جانے کب تک وہ اس حشر میں مبتلا رہتا اگر اسے نویرہ کی آواز سنائی نہ دیتی...... وہ بار بار اس کا نام لے کر آواز دے رہی تھی۔

ارسل نے اپنے جلتے تڑپتے...... اور اذیت کے مارے وجود پر...... سر توڑ کوششوں کے بعد قابو پایا، اپنے آپ کو کچھ سنبھالا۔

''ہاں...... ہاں نویرہ!''

''کیا ہوا ارسل! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''ہاں...... ہاں...... بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے بمشکل کہا۔

''لیکن...... تمہارے چہرے پر تکلیف کے آثار ہیں۔ پسینے پسینے ہو رہے ہو، کیا ہوا ہے؟'' وہ پریشان ہو کر بار بار اس سے پوچھ رہی تھی۔

''ارے کچھ نہیں یار! یہاں گرمی بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ لائٹ بھی جا چکی ہے۔ یہ لیپ ٹاپ بھی اگر چارجڈ نہ ہوتا تو بند ہو چکا ہوتا۔ میں ٹھیک ہوں...... یہ دیکھو......'' اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔ آخری الفاظ کہتے کہتے اپنا منہ کیمرے کے بالکل نزدیک کر دیا اور اس پر بادلِ ناخواستہ ایک مسکراہٹ بھی سجالی۔

''شکر ہے...... مجھے لگا کہ تمہاری طبیعت ایک دم بہت خراب ہو رہی ہے۔'' نویرہ نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... تو آج کل آپ کسی کے خواب دیکھ رہی ہیں اور ہر وقت کسی کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں، کیا میں اس خوش نصیب کا نام...... اور تاریخ جغرافیہ جان سکتا ہوں؟'' اس نے سوال کیا۔

''کیوں نہیں...... تم ہی تو میرے وہ دوست ہو جس سے میں سب کچھ شیئر کرنا چاہتی ہوں...... سب کچھ بتانا چاہتی ہوں...... 'اس کے' بارے میں۔ کیونکہ تمہارے علاوہ تو کوئی اور ہے نہیں...... جو اس کے بارے میں میری کوئی بات سن سکے...... ممی، پاپا تو بالکل بھی نہیں...... ہاں رامس ہے، لیکن وہ بھی اس سلسلے میں صرف نصیحتیں کرنے بیٹھ جاتا ہے جو مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔

''اب لے دے کر تم ہی رہ جاتے ہو کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم ہی ہو جو ہمیشہ سے میری الٹی سیدھی...... فضول حرکتوں کو نہ صرف فیور کرتے ہو بلکہ آخر تک میرا ساتھ بھی دیتے ہو...... اس وقت مجھے تمہاری بہت سخت ضرورت ہے ارسل!'' اس نے بڑی بے بسی سے ارسل کو پکارا۔

''بندہ حاضر ہے میم! کہیے کیا کرنا ہے؟'' وہ اپنے آپ پر پوری طرح قابو پا چکا تھا اور اب کافی حد تک نارمل دکھائی دے رہا تھا۔

''تمہیں کچھ نہیں کرنا...... صرف میری باتیں سننا ہیں۔ جو میں اس کے بارے میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں...... جانتے ہو آسمان کا تارا ہے وہ...... آئی مین...... ایک سپر اسٹار ہے...... اس کا ہر انداز...... ہر ادا...... منفرد اسٹائل...... سب کچھ میرے ذہن و دل پر...... پاگل پن بن کر سوار ہو چکا ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ اسے اپنے دل و دماغ سے نکال دوں...... لیکن یہ میرے اختیار میں نہیں رہا۔ اب وہ میرے دل میں...... دھڑکن بن کر دھڑکتا ہے...... میں کیسے اسے اپنے وجود سے الگ کر دوں جبکہ سب یہی چاہتے ہیں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''اچھا، تو کون ہیں وہ ذاتِ شریف؟ کیا میں جانتا ہوں اُسے؟''

''ارے تم کیا...... ساری دنیا جانتی ہے اُسے...... یو نو...... حسنات خان؟'' وہ بڑے محبوبی انداز میں مسکرائی۔

''نو...... حسنات خان کرکٹر...... قومی ٹیم کا کیپٹن! تم پاگل ہو؟ وہ جس مقام پر ہے اس وقت...... تم تو اس کی گرد کو بھی نہ پا سکو گی...... مایوسی اور محرومی کے دکھ اٹھاتی رہو گی

ہمیشہ۔ یہ کہاں دل لگا رہی ہو پاگل؟'' ارسل نے اُسے لتاڑا۔

''دیکھا، تم بھی رامس کی زبان بول رہے ہو۔ اسی کی طرح نصیحتیں کر رہے ہو، اب مجھے سوچنا پڑے گا کہ اس سلسلے میں کوئی بات اور اپنے خیالات میں تم سے بھی شیئر کروں یا نہ کروں۔'' وہ کچھ ناراضگی سے بولی۔

''تم جس شخص کے حوالے سے اس قدر جذباتی ہو کے سوچ رہی ہو، اس کا مقام، اس کا کیریئر...... اس کی شخصیت...... تم سے اتنی دور ہے تم اس تک کیسے پہنچو گی؟ سب یہی سوچ کر تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مشکل راستے پر تمہیں دکھوں سے نہ ٹکرانا پڑے۔ تم ہرٹ نہ ہو...... تمہیں تکلیفوں سے بچانے کے لیے سب تم کو نصیحتیں کرتے ہیں۔'' ارسل نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہاں، میں جانتی ہوں...... سب کچھ سمجھتی ہوں...... لیکن میں اس راستے پر بہت آگے تک آ چکی ہوں۔ اب واپسی میرے لیے ممکن نہیں ہے ارسل!''

''کیا تم کبھی اس سے ملی ہو؟'' ارسل نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔

''ہاں، دو تین بار...... بس مختصری ملاقات...... دو چار رسمی باتیں اور بس...... لیکن یقین کرو ارسل! یہی چند لمحے میری زندگی کا ماحصل ہیں۔'' اس نے بچگانہ سے جوش کے ساتھ جواب دیا۔

''کیا تم نے اپنی فیلنگز...... اپنے احساسات کے بارے میں اسے بتایا؟''

''نہیں، میں سمجھتی ہوں کہ محبت اس قدر طاقت ور جذبہ ہے کہ اس کو اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی...... یہ خود بخود عیاں ہو جاتا ہے اور ویسے بھی میں اظہار کر کے اپنے جذبات کو سستا یا گھٹیا نہیں کہلانا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ خود محسوس کرے کہ کوئی اس کی محبت میں پور پور ڈوبا...... اس کے عشق میں فنا ہونے کی قسم کھائے بیٹھا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا کبھی اسے میرے جذبات کی شدت کا احساس ہوگا۔ کبھی میرے جذبوں کی قدر کرے گا وہ؟'' اس نے ارسل سے سوال کر دیا تو وہ گڑبڑا گیا کہ کیا جواب دے۔

''شاید...... بشرطیکہ تمہارے یہ جذبات مستقل ہوں۔ اگر یہ محض وقتی جوش اور اُبال ہوا...... تو ہو سکتا ہے کہ انہیں پذیرائی ملنے سے قبل ہی یہ خود بخود دفنا ہو جائیں۔

''میرا مطلب ہے کہ سپر اسٹارز ٹائپ کے لوگ...... عام طور پر پبلک پراپرٹی کی طرح ہوتے ہیں۔ ہر شخص انہیں اپنا سمجھتا ہے اور وہ ہر شخص کو اپنا سمجھنے کی ایکٹنگ کرتے رہتے ہیں۔ ادھر ان کا زوال شروع ہوا...... عاشقوں کی بھیڑ چھٹ جاتی ہے اور پھر وہ اکیلے...... مایوس و دلبرداشتہ ہو کر گوشۂ گمنامی میں چلے جاتے ہیں۔ اس پر بھی ایک دن یہ وقت آئے گا۔ سب پر آتا ہے۔'' ارسل نے آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔

''بس...... یہی وقت...... یہی وقت ہوگا جب اس کے آس پاس کوئی نہیں ہوگا، سوائے میرے...... پھر اُسے ماننا پڑے گا کہ اس بھری دنیا میں...... صرف میں ہوں جو اس کی ذات سے عشق کرتی ہوں۔ اس کی شہرت یا دولت سے نہیں...... تب وہ میرا ہو جائے گا۔

میں اس وقت کا انتظار کروں گی ارسل! تم دیکھنا، یہ لمحہ میری زندگی میں ضرور آئے گا جو میری زندگی کا حاصل ہوگا۔''

''ابھی اس نے اپنا کیریئر شروع کیا ہے۔ وہ بھی اس قدر دھماکا خیز طریقے سے کہ راتوں رات وہ شہرت اور پذیرائی کے نصف النہار پر پہنچ گیا ہے۔ کب تک رہے گا؟ کون جانتا ہے؟ تم کب تک انتظار کرو گی وہ بہت دولت مند فیملی سے تعلق رکھتا ہے؟'' ارسل نے کہا۔

''جو بھی ہو۔ میں اس کا انتظار کروں گی اور اپنے آپ کو منواؤں گی۔ اسے بھی نہ کبھی ماننا پڑے گا کہ دنیا میں اگر کوئی ہستی ہے جو اس سے سچی اور کھری محبت کرتی ہے تو وہ میں ہوں...... صرف میں۔''

''یہ ایک طویل...... کٹھن...... اور تھکا دینے والا سفر ہوگا۔ تمہارا حوصلہ کتنا مضبوط ہے اور تم کس قدر ثابت قدمی سے اس سفر کی بے پناہ کٹھنائیوں کو جھیل سکتی ہو۔ اس میں اگر میری دعا سے کوئی بھی آسانی پیدا ہو سکتی ہو...... تو میری دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی...... آل دا بیسٹ۔'' ارسل کا حوصلہ شاید بالکل جواب دے چکا تھا۔ اس نے آخری کلک کر کے اسکائپ بند کر دیا۔ ایک جھٹکے سے لیپ ٹاپ کو بند کر کے پرے دھکیل دیا۔ اپنا سر تھام کر تکیوں پر اوندھا گیا۔ اس کے وجود میں زلزلے برپا تھے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنی بربادی پر دھاڑیں مار مار کر روئے۔ زور زور سے چیخے چلائے...... ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر برباد کر دے یا پھر پوری دنیا کو ہی آگ لگا دے۔

مگر وہ ایسا کچھ بھی نہ کر سکا۔ جذبات کی شدت کو

جان توڑ کوشش کے بعد کنٹرول کیا تو دماغ نے کسی حد تک کام کرنا شروع کیا۔
میرا انتخاب اگر وہ تھی تو ضروری تو نہیں کہ میں بھی اس کا انتخاب ہوتا۔ اس نے اپنے لیے کسی اور کو منتخب کرلیا تو اس میں وہ قصور وار کہاں ہوئی۔ کمزور تو میں ہوں جو اس کے نہ ملنے پر دیوانہ ہوا جارہا ہوں، اس کا حوصلہ تو دیکھو کہ اس نے ایسے راستے پر سفر شروع کیا ہے جس کے بعد منزل ہے یا نہیں اسے خود نہیں معلوم...... پھر بھی مضبوط ارادے کے ساتھ چل رہی ہے۔ محبت کی دنیا میں تو اس کا مقام...... مجھ سے کہیں زیادہ بلند ہے۔
وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ واش بیسن پر کھڑے ہو کر نہ جانے کتنی دیر منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتا رہا تب کہیں جا کر اس کے وجود میں بھڑکتی ہوئی آگ کی حدت میں کچھ کمی واقع ہوئی۔
اپنے آپ کو لاکھ بہلانے، پھسلانے اور تسلیاں دینے کے باوجود اس کے اندر کا موسم تبدیل نہیں ہو رہا تھا۔ بے چین و بے قرار پھرتا...... کمرے کا طول و عرض ناپتا رہا۔ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا...... کبھی دونوں ہاتھوں سے بال پکڑ کر صوفے پر گر پڑتا...... پھر اٹھ جاتا۔
تمام رات اسی طرح گزر گئی۔ موذن نے فجر کی اذان دی تو وہ چونک گیا پھر نہ جانے کیا سوچ کر اٹھا۔ وضو کیا اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دل نے یکلخت بے ایمانی کی کہ دعا میں اُسے مانگ لو...... مگر اس نے اپنے آپ کو جھڑکا...... اور اللہ سے اپنے دل کا صبر و سکون مانگا۔
''باری تعالیٰ! اگر وہ میری قسمت میں نہیں ہے تو میرے دل سے اس کی تمنا...... اس کی خواہش نکال دے، مجھے صبر و سکون عطا فرما۔''
وہ نہ جانے کب تک ہاتھ اٹھائے، آنکھیں بند کیے اسی دعا کو دہراتا رہا۔ نہ جانے کب تک آنسو بند آنکھوں سے بہہ بہہ کر اس کے چہرے کو بھگوتے رہے۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا کب صبح کی روشنی نمودار ہوئی اور سورج ابھر آیا۔ وہ باہر کی دنیا سے بے خبر...... اپنے اندر کی دنیا میں گم، نہ جانے ... کب تک اسی طرح بیٹھا رہتا۔ اگر اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا۔ اسے اپنے کاندھے پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا اور ایک نرم سی آواز سنائی دی۔
''ارسل!'' یہ اس کی امی تھیں جو نہ جانے کب اس کے کمرے میں آ کر...... اس کی جانماز کے قریب بیٹھ گئی تھیں اور اس کی اضطراری کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھیں۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو بند آنکھوں میں جمع کتنے سارے آنسو یکلخت چھلک کر گرے۔ جنہیں اس نے کمالِ ہوشیاری سے صاف کر کے چھپانے کی کوشش کی تو ثمینہ بیگم کے دل پر ایک چوٹ پڑی۔ انہوں نے بے تاب ہو کر بیٹے کا سر اپنے کاندھے سے لگالیا۔
''نہیں میری جان! تم اتنے کمزور نہیں ہو کہ ایک دکھ برداشت نہ کر سکو۔ حوصلہ رکھو شاید قدرت نے تمہارے لیے اس سے بہتر کا انتخاب کر رکھا ہو۔ اپنے آپ کو سنبھالو میرے بچے! ورنہ تمہاری ماں کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ چلو اٹھو، میرا بہادر بچہ۔ آؤ، باہر آؤ۔ میں چائے بنانے جارہی ہوں، ہم دونوں ماں بیٹا مل کر ناشتا کریں گے اور باتیں کریں گے۔ آجاؤ شاباش!''
وہ اسے تسلی دیتے ہوئے آہستگی سے اس کی پیٹھ تھپتھپاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں اور آزردگی کا احساس لیے کمرے سے باہر نکل گئیں۔
''امی! میرا دل نہیں چاہ رہا ناشتا کرنے کے لیے۔'' وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھائے اُن کے سامنے سر جھکائے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔
''میں جانتی ہوں، میرا بھی دل نہیں چاہ رہا ہے۔ ہم دونوں کو ہی خواہش نہیں ہے۔ چلو نہیں کھاتے کچھ...... ٹھیک ہے؟''
انہوں نے ہاتھ میں پکڑا سلائس واپس پلیٹ میں رکھ دیا تو اس نے مضطرب ہو کر بڑی بے چارگی سے دیکھا۔
''امی! آپ کے لیے کھانا ضروری ہے...... نہیں کھائیں گی تو آپ کا شوگر لیول گر جائے گا۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی، آپ کھالیں۔''
''تم نہیں سمجھ سکتے، اگر ایک ماں کا بیٹا اس کے سامنے بھوکا پیاسا اور پریشان بیٹھا ہو تو اس کے حلق سے نہ تو نوالہ اتر سکتا ہے اور نہ ہی پانی کا گھونٹ...... اس لیے نہ کہو مجھ سے کچھ بھی کھانے پینے کے لیے۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے جواب دیا تو وہ بے چین ہو گیا۔
''ٹھیک ہے امی! لائیے مجھے بھی دیجیے اور خود بھی کھائیے...... کبھی کبھی آپ کا ضدی پن تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔'' اس نے افسوس میں سر ہلاتے ہوئے ان کے ہاتھ سے مکھن لگا ہوا سلائس لے لیا تو انہوں نے جلدی سے چائے کی پیالی بھی اس کی طرف کھسکا دی۔

''تمہاری نویرہ سے بات ہوئی! اس نے تم سے کیا کہا؟ میرا مطلب ہے کیا کہہ کر انکار کیا اس نے؟'' ثمینہ نے بیٹے کی متورم آنکھیں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کچھ خاص وجہ نہیں بتائی۔ بس یہی کہا کہ میں تمہیں صرف اپنا دوست سمجھتی ہوں اور ہمیشہ یہی سمجھتی رہوں گی...... شادی کے بارے میں کبھی سوچا نہیں اور نہ ہی آئندہ اس بارے میں سوچوں گی۔'' اس نے آزردگی سے جواب دیا۔

''ارسل! تم کم از کم اسے اپنے جذبات سے آگاہ تو کرتے...... ممکن تھا کہ وہ اس بارے میں سوچتی۔'' انہوں نے امید جگانے کی کوشش کی۔

''نہیں امی! یہ تو میں مرتے دم تک نہیں کروں گا۔ شاید میرے جذبے ہی سچے نہیں ہیں کہ اسے احساس تک نہ ہوسکا۔ اب میں اس سے محبت کی بھیک مانگوں۔ یہ میری انا اور خودداری کو قتل کر دینے کے مترادف ہے...... نہیں...... کبھی نہیں......

اور امی! آپ کو بھی قسم ہے میری...... آپ بھی یہ بات نہ کبھی اس کے سامنے کریں گی اور نہ ہی کسی اور کے سامنے...... جہاں تک میرا سوال ہے میں نے بھی دفن کر دی اس کی محبت...... بہت گہرائی میں کہیں تدفین کر دی ہے اس کی...... اب بھی اس کا خیال مجھے چھو نہیں سکے گا۔ کبھی نہیں۔'' اس کے لہجے میں دکھ، بے بسی، غصہ اور جھنجلاہٹ سب کچھ محسوس ہو رہا تھا۔

''اگر ایسا ہے تو اتنے دکھی...... اتنے آزردہ اور اتنے پریشان کیوں ہو...... سب کچھ ختم ہو گیا تو تم ایک نارمل انسان کیوں نظر نہیں آتے۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا امی! مجھے تھوڑی مہلت...... تھوڑا وقت تو دیجیے......'' وہ ماں کو اطمینان دلانے کے لیے کہہ تو رہا تھا لیکن اسے خود بھی اندازہ تھا کہ یہ اتنا آسان نہ ہوگا اور ثمینہ نے بھی اس کے اندر سے پھوٹنے والے دکھوں اور اذیتوں کے نوحے سن لیے تھے۔

انہوں نے اٹھ کر بیٹے کے ماتھے پر بوسہ دیا اور تسلی کے لیے پیٹھ تھپکتی ہوئی برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔ وہ بھی اٹھ کر کمرے میں آ گیا پھر اس کی بے کلی و بے قراری بے چین کر رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کہ اسے سکون مل جائے۔ بہت دیر کمرے کا طول و عرض ناپتا رہا۔ آخر تنگ آ کر کپڑے بدلے، اپنی کتابیں اور نوٹس بیگ میں ڈالے اور یونیورسٹی چلا گیا۔

☆☆☆

وہ آرام کرسی پر بیٹھے آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ جھولنے کی رفتار ان کی گھٹتی بڑھتی سوچ اور جذبات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ کم یا زیادہ ہو رہی تھی۔ اتنے میں بہرام کی آمد ہوئی۔

''خان جی! ادھر سے سب کو ہٹا لیا ہے۔ کیمپ بھی ختم کر دیا ہے۔ سامان اور سب لوگ واپس آ گئے ہیں۔ باقی جو انتظامات آپ نے کہے تھے وہ بھی کر دیے ہیں...... آگے کیا حکم ہے؟''

''بس ابھی کچھ نہیں۔ صرف انتظار کرنا ہے ان خبیث لوگوں کے فون کا...... پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے؟''

''خان جی! وہ ہمارا علاقہ لے رہے ہیں۔ اس کے بدلے ہمیں کیا ملے گا؟ پھر ہمارا کاروبار ختم ہو گیا ہے۔ کیونکہ سرحد پار سے آنے والوں کی راہداری دینے سے ہماری اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی...... سامان آتا جاتا تھا بہت کچھ ملتا تھا ہمیں...... اب ہم کیا کریں گے؟''

''فکر مت کرو بہرام! اب ہم ان سے زیادہ وصول کریں گے۔ اگر ادھر انہوں نے رہنا ہے تو پیسا تو دینا پڑے گا۔ نہیں تو اتنی آسانی سے وہ یہاں کام نہیں کر پائیں گے۔ ہم ان کے لیے مشکلوں کے پہاڑ کھڑے کر دیں گے۔''

''چھوٹے خان اگر اُدھر ولایت میں نہ ہوتے...... تو ہمارے ہاتھ کھلے ہوتے...... پھر دیکھتے کہ یہ اِدھر کیسے گھستا...... نیست و نابود کر دینا تھا ان کو...... دیکھتے جاؤ، بہرام! حسنات ایک بار اِدھر آ جائے۔ پھر سبق سکھانا ہے ان کو...... اچھی طرح۔'' خان نے انتہائی سرد لہجے میں جواب دیا۔

☆☆☆

تقریباً مہینے بھر کے بعد آج وہ پھر اسکائپ پر اس کے سامنے تھی۔

''ارسل! پچھلے مہینے آسٹریلیا گئی تھی میں...... تم جانتے ہی ہوگے کہ کیوں؟'' اس نے مسکرا کر اس سے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''ہاں، جانتا ہوں...... وہاں ہماری ٹیم میچ کھیل رہی تھی۔ ہمارے ہاں میچ کی لائیو کوریج چل رہی تھی۔ میں نے اور امی نے تمہیں اسٹیڈیم میں ہلا گلا کرتے دیکھا تھا۔ کیمروں نے کئی بار تمہارے کلوز اپس دکھائے تھے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو نویرہ نے غور سے اس کی نظر

آنے والی ویڈیو کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے ارسل! تم کتنے کمزور اور نڈھال سے لگ رہے ہو، بیمار ہو کیا؟''

''بیمار تھا...... اب ٹھیک ہوں۔ پچھلے دنوں ٹائیفائڈ ہو گیا تھا شاید...... بخار نے کافی دن گھیرے رکھا۔ شاید اسی وجہ سے تمہیں ایسا محسوس ہو رہا ہے۔'' ارسل نے اس کی تسلی کے لیے ایک جھوٹی تفصیل پیش کی۔

''مائی گاڈ! تمہارا پیارا ملک...... پانی تک صاف نہیں ملتا پینے کے لیے...... ٹائیفائیڈ، پولیوٹڈ پانی پینے سے ہوتا ہے۔ پلیز! اب تم صرف منرل واٹر پیا کرو۔ کم از کم بیماری سے تو بچے رہو گے۔ کتنے کمزور ہو گئے ہو۔'' اس نے فکرمندی سے کہا تو ارسل مسکرایا۔

''اوکے میم! جو آپ کا حکم۔ میں خیال رکھوں گا۔ ویسے آج کل پتنگ کتنی بلندی پر اڑ رہی ہے میرا مطلب ہے...... آپ کی بات کہاں تک پہنچی ہے۔ آگے بڑھی...... یا آسٹریلیا کے بعد 'پاز' آ گیا ہے۔'' اس نے نویرہ کی دلچسپی کے لیے سوال کیا۔

''ہم م م م......'' وہ مسکرائی۔

''وہ رہتا تو یہیں ہے نا...... لندن میں...... جب بھی میچ نہ ہو تو وہ اپنے گھر پر ہی ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے اس سے ملنے کی کوشش کی لیکن اس کے پروٹوکول اور سیکیورٹی والوں نے ملنے ہی نہیں دیا۔ پھر میں نے اسے میسج بھیجا کہ میں اس کی این جی او کے حوالے سے اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس نے اگلے دن ہی بلوا لیا۔ 'ہیرڈز' کے فوڈ کورٹ میں ہماری ملاقات ہوئی۔ اوور آ کپ آف ٹی...... اس نے صرف پندرہ منٹ دیے تھے۔ میں نے اسے آفر کی...... کہ میں اس کی این جی او کے لیے فنڈ ریزنگ کرنا چاہتی ہوں۔''

''اس نے پوچھا نہیں...... کہ میری اس غریب سی این جی او پر...... آپ کی نظرِ عنایت کیوں؟'' ارسل نے لفظ چباتے ہوئے پوچھا۔

''پوچھا تھا تو جواب میں اس کی این جی او کے موٹو اور کام کی میں نے اتنی تعریف کی کہ بس...... میں نے کہا کہ میں اس کے کاز سے بے حد متاثر ہوں۔ اپنی خدمات ایک سوشل ورکر کے طور پر اس لیے پیش کرنا چاہتی ہوں کہ میری خواہش کے مطابق...... یہ کافی ایکٹو ہو کر کام کرے...... فنڈ ریزنگ ایونٹس سے اس کو اچھا فنانس ملے اور یہ اپنے پروجیکٹس بہتر طریقے پر چلا سکے۔ جانتے ہو ارسل! اس نے فوراً ہی میری بات مان لی اور مجھے باقاعدہ اس کی آنریری ممبرشپ بھی آفر کر دی۔'' وہ کھل کر مسکرائی۔

''اور تم نے دل و جان سے اس کی یہ آفر قبول کر لی؟'' ارسل نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

این جی او کے بارے میں کچھ دیر اور بات کر کے نویرہ نے اجازت لے لی۔ اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور غائب ہو گئی۔ اسکائپ بند ہو گیا اور وہ خالی خالی نظروں سے اسکرین دیکھتا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ بڑی دیر تک اپنے اندر ابھرنے والے منہ زور جذبوں سے لڑتا رہا۔ پھر اس بے چینی میں...... کشمکش میں وہ آخرکار خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ نماز کے بعد دعاؤں کا سلسلہ شروع ہوا تو دراز ہوتا ہی چلا گیا۔ وہ بند آنکھوں سے بہتے آنسوؤں میں اوپر والے سے اپنے لیے صبر و سکون مانگتا رہا۔ پھر اس کے شب و روز اسی طرح گزرنے لگے۔

ثمینہ نے بیٹے کی دل جوئی کرنے کی بڑی کوشش کی۔ کسی اور اچھی لڑکی سے شادی کرنے کا کہا تو اس کا بڑا سخت ردِعمل سامنے آیا۔ اس نے سختی سے منع کر دیا۔

''ٹھیک ہے پھر تم جلدی سے تیاری کر لو۔ ہم کینیڈا جا رہے ہیں۔ جاذل کی شادی کرنی ہے اور تم بھی وہیں کی کسی اچھی یونیورسٹی سے ماسٹرز کر لینا...... اس بارے میں جلد معلومات حاصل کر لو۔''

کچھ ہی عرصے میں اس کی گریجویشن مکمل ہو گئی اور وہ سول انجینئرنگ کی ڈگری لے کر...... ماں کے ساتھ کینیڈا چلا گیا۔ جاذل، ارسل کو دیکھ کر حیران ہوا۔

''کیا بات ہے ارسل! بہت تھکے تھکے اور کمزور لگ رہے ہو۔ کیا ہوا ہے؟'' اس نے بھائی کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں بھائی، پچھلے دنوں کچھ بیمار ہو گیا تھا۔ اس کے سبب آپ کو کمزور لگ رہا ہوں ورنہ اب میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے ٹالنے کے لیے کہا۔

''نہیں، تمہاری صحت بہت بگڑ گئی ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ چہرہ بھی زرد ہو رہا ہے۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟''

''بتایا نا بھائی! کافی بیمار ہو گیا تھا۔''

''لیکن بیماری اور کمزوری کے علاوہ...... مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تمہاری آنکھوں کا تاثر ہی بدل گیا ہے۔ تمہاری وہ شوخ اور زندگی سے بھرپور آنکھیں...... بجھ سی گئی ہیں...... کیوں؟ کیوں اتنا بدل گئے ہو یار۔'' جاذل

کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''ارے نہیں بھائی! ڈونٹ یو وری...... فٹ فاٹ ہوں میں بالکل...... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تھوڑا آرام کرنا چاہتا ہوں کمرا کہاں ہے؟'' وہ گھر پہنچ چکے تھے۔ جاذل نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔

☆☆☆

پچھلے دنوں ایشیز سیریز ختم ہوئی تھی اور وہ لندن واپس آ گیا۔ اس دن بہت دنوں کے بعد وہ بے فکری کی نیند لے کر اٹھا تھا۔ تازہ دم ہو کر ناشتے کے لیے ٹیبل پر آ کے بیٹھا تو غلام محمد نے جلدی سے جوس اس کے گلاس میں انڈیلا اور اخبار کھول کر سامنے رکھ دیا اور کھڑا رہا تو حسنات نے چونک کر اسے دیکھا تو اس کی نظروں میں سوال تھا۔

''کیا بات ہے؟ کچھ خاموش ہو، وطن یاد آ رہا ہے؟''

''نہیں صاب! دسمبر میں شان محمود آ جائے گا تو میں چلا جاؤں گا۔ سال کے سال گھر والوں سے مل آتا ہوں آپ کی مہربانی سے۔''

غلام محمد ان کا پشتینی ملازم تھا۔ حسنات جب پڑھنے کے لیے لندن آنے لگا تو باپ نے غلام محمد کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔

یہاں وہ کھانا بنانے، صفائی ستھرائی، کپڑے دھونے، استری کرنے کے علاوہ گروسری، فون، بلز اور ڈاک کا حساب رکھتا تھا۔ حسنات کے ساتھ ہمیشہ سے رہنے کے سبب...... جتنا زیادہ وہ حسنات کے بارے میں جانتا تھا، کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ حسنات کی زندگی اس کے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھی اور نویرہ نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ تب ہی اس نے غلام محمد سے رابطہ کیا تھا۔ دو چار ملاقاتوں میں ہی اس سے گہری جان پہچان بنالی۔ اب کسی حد تک ایک بے تکلفی بھی آ گئی تھی اس تعلق میں۔

''ہیلو جی ایم! کیسے ہو؟ آج میں مال گئی تھی۔ تمہارے لیے ایک چھوٹا سا گفٹ خریدا ہے۔ یونیورسٹی کے بعد آؤں گی، اوکے۔''

اس نے غلام محمد کو مختصر کر کے جی ایم بنا لیا تھا۔ ہر تھوڑے دنوں کے بعد کسی کافی شاپ میں گپ شپ...... کبھی چھوٹے موٹے تحفے...... اور پھر ایک بڑی خوب صورت، قیمتی اور گرم جیکٹ کے تحفے نے جی ایم کو بالکل ہی اس کا ممنونِ احسان کر دیا تھا۔ اس کے اس رویّے نے غلام محمد کو خود اس کی اپنی نظروں میں بڑا اہم بنا دیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی موجودگی میں اپنے آپ کو بڑا خوش محسوس کرتا تھا۔

اگرچہ اس نے حسنات خان کے بارے میں...... اس کی ذاتی زندگی سے متعلق کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس لڑکی میں جانے کیا ہنر تھا کہ وہ اس سے حسنات کے بارے میں بہت سی باتیں کر لیا کرتا تھا۔ نویرہ نے بھی بڑی ہوشیاری سے اس پر کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسے حسنات سے کوئی دلچسپی ہے بلکہ وہ ہمیشہ اپنی گفتگو کا فوکس اس کی سماجی تنظیم پر رکھتی تھی جو بقول اس کے بہت بڑے مقاصد کے لیے کام کر رہی تھی۔ حسنات کا ذکر صرف اتنا ہوتا تھا کہ اتنی اچھی سماجی تنظیم کو قائم کرنے کا سہرا بہرحال حسنات کو ہی باندھا جا سکتا تھا اور وہ اس کے ان جذبوں کو کھل کر کچھ اس طرح سراہتی کہ گفتگو کا محور حسنات کی ذات بن جاتی پھر جی ایم بولتا رہتا اور وہ ہتھیلی پر سر رکھے سنتی رہتی۔

''تو پھر کیا بات ہے غلام محمد؟'' حسنات نے دوبارہ اس سے پوچھا۔

''وہ...... صاب! وہ ایک لڑکی ہے جو آپ کی این جی او کے لیے بڑا کام کرتی ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے اگر آپ اجازت دیں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔ اگر وہ ہمارے لیے کام کرتی ہے تو ملنا تو پڑے گا۔ بلا لینا کسی دن...... ویسے نام کیا ہے اس کا؟''

''وہ نویرہ بی بی ہیں صاب! کئی مرتبہ کہہ چکی ہیں آپ سے ملنے کا...... اگر اجازت ہو تو بلا لوں...... باہر بیٹھی ہیں۔'' غلام محمد نے حسنات کو حیران کیا۔

''اتنی سردی اور برف باری میں...... باہر کہاں بیٹھی ہیں؟''

''صاب! وہ باہر سڑک پر جو بس اسٹاپ بنا ہوا ہے نا...... وہاں بیٹھی ہیں۔''

''او مائی گاڈ! جاؤ، بلاؤ اسے اندر...... بلکہ یہیں لے آؤ...... ناشتا میرے ساتھ ہی کرلے تو اسے گرما گرم کافی پلا دینا...... سردی میں ٹھٹھر رہی ہوگی۔''

حسنات نے اسے پہچان لیا۔ اس کے سرپھرے ہونے کی نشانیاں وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا اس لیے اسے کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی، اس کے صبح سے باہر بیٹھ کر انتظار کرنے پر۔

وہ ملاقات حسنات کے لیے خوشگوار اور نویرہ کے لیے زندگی کا نیا موڑ ثابت ہوئی۔ حسنات نے اسے این جی او کا ایک اہم عہدہ سونپ دیا۔

''میں آپ کو بہت زیادہ ایکٹو دیکھنا چاہتا ہوں...... کیونکہ جتنے زیادہ فنڈز جنریٹ ہوں گے اپنے وطن میں تعلیم پر اتنا ہی زیادہ کام ہوگا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔''

''پتا نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو حسنات نے اسے گھور کر دیکھا۔

''میرا مطلب ہے، مجھے نہیں معلوم کہ اپنے ملک میں تعلیم کے لیے کام کرنے کی کتنی ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب؟ اگر تمہیں اندازہ نہیں...... تو اتنی محنت کیوں کر رہی ہو اس کے لیے؟''

''آپ کی وجہ سے...... میرا مطلب ہے کہ اگر آپ ضرورت محسوس کر رہے ہیں تو ہوگی ضرورت۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''کیا؟ تم صرف اس لیے جنونیوں کی طرح کام کر رہی ہو...... کیونکہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے حیران ہو کر پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''او مائی گاڈ! اگر میں کچھ اور جھک مارنے لگ جاؤں...... تو تم اس میں بھی میرا ساتھ دو گی؟''

''یقیناً۔'' اس نے کافی کے کپ میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر میں پوچھوں کہ...... کیوں؟ کیوں کرو گی تم میرے لیے ایسا؟''

''سر! یہ دل کی بات ہے، ایک نہ ایک دن آپ کو بھی سمجھ میں آجائے گی۔'' اس نے کافی کا مگ خالی کر کے رکھا۔ پرس میں سے ایک چیک نکالا۔ ''یہ ایک بھاری بھرکم چیک ہے۔ آپ کی این جی او کے لیے...... یہ پیسے میں نے جمع کیے ہیں۔ اپنی ذاتی کوششوں سے...... آپ کے لیے...... میرا مطلب ہے آپ کی این جی او کے لیے۔'' اس نے مسکرا کر چیک اس کی طرف بڑھایا تو اس پر لکھی ہوئی رقم دیکھ کر حسنات کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''او مائی گاڈ! آئی کانٹ بلیو...... رئیلی یو آر اسپیشل...... ویری اسپیشل......'' اس نے تحسین آمیز انداز میں کہا تو ان الفاظ کے جادو نے نویرہ کے چہرے پر گلاب کھلا دیے۔ اس کے گال کانوں تک سرخ ہو گئے۔

وہ گھر پہنچی تو ممی کی آواز آئی۔

''نویرہ! اِدھر آؤ...... یہ سب کیا ہے؟'' انہوں نے ہاتھ میں کچھ بلز پکڑے ہوئے تھے۔

''کیا ہے ممی؟''

''یہ سارے کریڈٹ کارڈز کے بل ہیں...... تم نے اپنا سارا اکاؤنٹ خالی کر دیا ہے۔ اچھی خاصی رقم تھی تمہارے اکاؤنٹ میں۔ اب کچھ بھی نہیں ہے۔ ناٹ آ سنگل پینی...... کہاں خرچ کر دیے سب؟'' انہوں نے غصے میں چلّا کر پوچھا تو وہ سر جھکا کر جوتے کی نوک سے قالین رگڑنے لگی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے نویرہ! جواب دو...... کہاں خرچ کیے ہیں سارے پیسے؟'' ان کا پارا چڑھ رہا تھا۔

''میں نے چیریٹی میں دے دیے۔'' اس نے اسی طرح سر جھکائے آہستگی سے کہا تو سیماب غصے میں بھنا گئیں۔

''پاگل ہو گئی ہو کیا...... چیریٹی میں اتنے پیسے کون دیتا ہے...... وہاٹ دا ہیل اِز دس؟ کس کو دیے ہیں...... بتاؤ مجھے...... بتاؤ؟'' وہ چلائیں۔

اس نے حسنات کی این جی او کا نام لیا تو وہ اور بھڑک اٹھیں۔

''اس دن تم زبردستی ہمیں مجبور کر کے اس کے فنڈ ریزنگ ڈنر پر لے گئیں۔ زبردستی پانچ پانچ سو پونڈ کی بھاری رقم ہم تینوں سے دلوائی اور اب اپنے سارے پیسے بھی انہیں دے ڈالے، وہاٹ ربش؟'' وہ غصے میں اور نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں، وہ چپ چاپ سر جھکائے سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بستر میں گھس کر لیپ ٹاپ پر اسکائپ آن کیا۔ ارسل سے رابطہ ہوا تو سب کچھ اسے بتانے لگی۔

''ارسل! ممی نے آج مجھے بہت ڈانٹا۔ ممی کو جیسے ہی پتا چلا کہ میں نے اپنے سارے پیسے خرچ کر دیے ہیں تو انہوں نے وہ زبردست کلاس لی ہے میری کہ دن میں تارے دکھا دیے۔'' اس نے بسورتے ہوئے ارسل کو بتایا۔

''مامی نے ڈانٹا ہے۔ وہ تو ڈانٹتی ہی رہتی ہیں، تم ان کی ڈانٹ کا اتنا اثر کب سے لینے لگیں؟''

''میرے اکاؤنٹ میں میرے اپنے پیسے ہوتے ہیں۔ جیسے چاہوں خرچ کروں، کسی کو اس پر اعتراض کیوں ہو؟''

''وہ تمہاری ممی ہیں...... 'کسی' نہیں ہیں۔ وہ پوچھ سکتی ہیں۔ ویسے بائی دا وے...... کہاں خرچ کر دیے تم نے وہ پیسے؟''

''وہ...... وہ تو میں نے حسنات کی این جی او کو دے دیے۔'' اس نے مسکرا کر بتایا تو ارسل نے سر پیٹ لیا۔

''اسٹوپڈ! ابھی پچھلے دنوں تم نے ان کے کتنے سارے پیسے اسی چکر میں خرچ کروا دیے تھے۔ ابھی تو اس دھچکے کا غم بھی نہیں بھولا ہوگا انہیں کہ تم نے یہ نیا چاند چڑھا دیا...... غصہ تو آنا تھا...... او یار! ہاتھ ذرا ہولا رکھو ناں......''

ارسل نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ ہنسی۔

''تمہیں پتا ہے ارسل! آج میں نے ناشتا حسنات کے ساتھ کیا ہے، اس کے گھر پر۔''

''کیا؟ تم اس کے گھر بھی پہنچ گئیں۔ او مائی گاڈ! کیا تم جانتی نہیں ہو، لڑکیوں کے معاملے میں اس کی شہرت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''ارے سب بکواس ہے...... منفی پروپیگنڈا...... میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ایسا وہ بالکل بھی نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یعنی اس کے بارے میں دنیا جو کچھ کہہ رہی ہے...... وہ سب غلط...... اور تم اکیلی جو کچھ کہہ رہی ہو...... وہ صحیح...... یہ کیسے ہو سکتا ہے نویرہ! کہیں دھوکا نہ کھا جانا۔'' ارسل نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ارے نہیں یار! میری بات کا یقین کرو، وہ بہت...... بہت...... بہت ہی اچھا ہے۔ پتا ہے کل اُس نے این جی او آفس ہیڈز کی میٹنگ بلائی ہے جس میں مجھے باقاعدہ عہدہ دینے والا ہے...... آئی ایم سو ہیپی......'' اس نے بچکانا انداز میں دونوں آنکھیں بھینچتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا تو ارسل کو ایک ٹیس نے ستایا لیکن وہ جھیل گیا۔

''باقاعدہ عہدہ ملنے کا مطلب باقاعدہ کام...... اور کام کے لیے وقت دینا پڑے گا...... پڑھائی کا کیا ہوگا؟''

''ارے یار! کرلوں گی پڑھائی بھی...... مجھے کون سا پی ایچ ڈی کرنا ہے۔ اگلے سال میرا گریجویشن ہو جائے گا، کافی ہے۔''

''بیچلر ڈگری کافی ہے...... آگے ساری زندگی پڑی ہے۔ این جی او سے تمہیں کچھ ملنے والا تو ہے نہیں...... کیونکہ وہ تو دینے کی جگہ ہے...... سوچا ہے کہ آگے زندگی کیسے گزرے گی؟''

''کر تو رہی ہوں ابتدا...... حسنات کی این جی او کے معاملات دیکھوں گی...... ایڈمنسٹریشن میں ہوں گی تو گزارے کی بھی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی...... اور نہ بھی ہو تو...... میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں ہمیشہ اس کے نزدیک اس کے آس پاس رہوں گی اور یہ میری زندگی کے لیے کافی ہے...... مجھے اور کچھ چاہیے بھی نہیں۔'' اس نے بال جھٹکتے ہوئے کہا تو اس کے چہرے پر خوشی، اعتماد اور یقین تھا۔

ارسل اس کی طرف کچھ لمحوں تو دیکھتا رہا پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

''تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم نے ڈھلوانی راستے پر سفر کرنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کوئی کتنا ہی روکے تم رکنے والی نہیں ہو...... او کے...... تمہاری مرضی...... اوروں کا تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا...... تمہارا دوست بن کر...... اور کبھی بھی تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے تو ضرور رابطہ کرنا...... میں کبھی انکار نہیں کروں گا...... ٹھیک ہے؟''

ارسل نے اسے یقین دلایا تو اس نے خالص مغربی انداز میں ایک فلائنگ کِس اس کی طرف اچھالی اور گویا ہوئی۔

''مجھے پتا تھا ایک تم ہی میرے دوست ہو...... میرا بھلا چاہنے والے۔''

''میں دوست کب ہوں...... نہ ہی بھلا چاہنے والا۔ میں تو تمہارا دشمن نمبر ایک ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تباہی کے جس گڑھے میں تم چھلانگ لگانے جا رہی ہو...... آگے بڑھ کر پہلا دھکا میں ہی دوں۔ تم اس میں ضرور گرو...... بلکہ سر کے بل گرو۔'' اس نے زخمی مسکراہٹ سے کہا تو وہ 'ارسل کے بچے!' کہہ کر سائن آؤٹ ہو گئی۔

☆☆☆

ہر طرف مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف ایک آواز تھی جو لفظوں کی شکل میں قطرہ قطرہ اس کی سماعتوں سے گزر رہی تھی۔

امام صاحب کہہ رہے تھے۔

میں وہ صبرِ ضمیم ہوں جس نے...... بارِ امانت سر پہ لیا تھا۔

اللہ نے پکارا...... ہے کوئی جو میری ایک امانت کا بوجھ اٹھائے۔

یہ سن کر سمندر کی سانسیں ٹوٹنے لگیں...... پہاڑ ہیبت سے لرزنے لگے۔ پوری کائنات پر کپکپی طاری ہو گئی۔ کسی کو اتنی طاقت اور مجال نہیں تھی کہ وہ یہ بوجھ اٹھاتا...... پھر پھر اللہ نے یہ امانت انسان کو سونپ دی اور انسان اس کو اٹھائے ہوئے مضطرب اور سرگرداں ہے اور یہ کائنات کا سب سے بڑا صبر ہے۔

امانت کیا تھی بھلا؟ وہ امانت جسے اٹھانے سے سب عاجز تھے...... وہ دراصل اللہ کی تمام صفات کا پرتو تھا۔ رحم،

کرم، قہر و جبر...... پوری 99 صفات کا عکس...... سو اللہ کی عطا کردہ اس امانت داری کو اس کی رضا کی خاطر خوش اسلوبی سے ادا کرنا ہی دراصل سب سے بڑا صبر ہے۔ زندگی میں جو کچھ ہے...... فقط اسی کی جانب سے ہے۔ خواہ آپ چاہیں...... یا نہ چاہیں...... ہر ہر قدم آپ کے اس صبر کو آزمایا جائے گا۔ کبھی کچھ دے کر...... کبھی کچھ لے کر...... آپ نے صبر کیا...... تو درجات بہت بلند ہیں...... شکوہ کر بیٹھے...... تو نہ دنیا کے رہے...... نہ دین کے...... اس لیے......"

امام صاحب کا ایک ایک لفظ اس کے کانوں سے ہوتا ہوا سیدھا دل پر اتر رہا تھا۔ ان الفاظ کی روشنی میں وہ اپنا محاسبہ بھی کر رہا تھا۔ جمعے کی نماز کے لیے وہ یونیورسٹی کے ایک کمرے میں بنائی گئی مسجد میں آتا تھا۔ پچاس ساٹھ مسلم طلبہ بھی ہوتے تھے جن کا تعلق مختلف ممالک سے تھا۔ تقریر ختم ہوئی تو نمازی باہر نکلنے لگے۔ وہ اپنی ذات میں گم جانے کن خیالوں میں کھویا...... وہیں بیٹھا رہا۔

"ارسل! چلنا نہیں ہے...... تین بجے کلاس ہے۔" یہ اس کا کلاس میٹ تھا۔ عاطر اوصاف کا تعلق لبنان سے تھا۔ وہ ایک اچھا لڑکا تھا۔ سنجیدہ، پُرخلوص اور مذہبی رجحان رکھنے والا...... البرٹا یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے بعد یہ پہلا لڑکا تھا جو ارسل کا دوست بنا تھا۔

اس کا ایک گروپ تھا جو مختلف مذہبی پروگرام کرتا رہتا تھا اور ان میں سب مسلم لڑکوں کو مدعو کرتا تھا۔ ارسل کو بھی کہا...... لیکن ارسل کا مسئلہ الگ تھا۔ وہ نماز اپنے کمرے میں ہی ادا کرتا تھا کیونکہ نماز کے بعد جو کچھ اپنے اللہ سے مانگنا ہوتا تھا، وہ تڑپ تڑپ کر...... گڑگڑا کر مانگتا تھا...... آنسوؤں اور آہوں کے نذرانوں کے ساتھ...... اور ان معاملات کو وہ صرف اپنے اور اللہ کے درمیان رکھنا چاہتا تھا، کسی اور کو اس کی بھنک بھی پڑے...... یہ اسے منظور نہیں تھا۔

عاطر نے کئی بار اُسے اپنے حلقے میں شامل ہونے کے لیے کہا، تو اس کا دل رکھنے کے لیے وہ کبھی کبھار اس کے ساتھ درس میں بھی چلا جاتا تھا۔

کمرے میں داخل ہوا تو فون کی گھنٹی بجی اور امی سے یہ اطلاع ملی کہ جاذل بھائی ایک بیٹے کے باپ بن گئے ہیں۔

"اووہ! آپ کو بہت مبارک ہو امی! آپ دادی بن گئیں۔ اتنی جلدی اتنا وقت گزر گیا کہ جاذل بھائی ماشاء اللہ بیٹے کے باپ بن گئے۔ ایسا لگتا ہے ابھی کل ہی تو ان کی شادی ہوئی تھی۔"

"ہاں بیٹے! وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے لیکن مجھے تمہاری بہت یاد آتی ہے۔ تمہارا کتنا کورس باقی رہ گیا ہے؟"

"بس امی! آخری سمسٹر ہے۔ اس میں زیادہ تر فیلڈ ورک ہے۔ تھیسس جمع کروا کر فرصت۔"

فون بند کر کے وہ تھکے تھکے انداز میں بستر پر گر پڑا۔ پھر یاد آیا کہ آج تھیسس کا عنوان فائنل کرنا ہے اور اسی سلسلے میں اپنے ٹیچر سے گفتگو کرنی ہے سو وہ آرام کا ارادہ ترک کر کے اٹھ بیٹھا۔

"تم نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ اس کو میں نے کافی کھنگالا ہے...... میرا خیال ہے۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ سول انجینئرنگ کے کسی بھی طالب علم نے...... ابھی تک اس کے لیے اپروچ نہیں کی ہے۔ تمہارا یہ آئیڈیا...... کہ قدیم اور تاریخی عمارتوں کو...... ان کی ظاہری شکل و صورت تبدیل کیے بغیر کس طرح جدید سہولتوں سے آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک منفرد خیال ہے۔ یہ سول انجینئرنگ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ تم مجھے ضروری کاغذات......

اور اس تھیسس کے بنیادی خیال کی سمری بنا کر دو...... میں اپروول دے دوں گا۔"

مسٹر کورٹنی میتھیوز نے اپنی گہری نیلی آنکھوں میں تحسین کا تاثر اجاگر کرتے ہوئے کہا تو ارسل خوش ہو گیا۔

"تھینکس مسٹر میتھیوز! یہ میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ بس ایک مشکل ہو گی...... کہ پریکٹیکل کے لیے پتا نہیں مجھے کوئی عمارت مل سکے گی یا نہیں۔" ارسل نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی مشکل سے بھی آگاہ کیا۔

"میں نے اس بارے میں سوچا ہے۔ یہاں سے کچھ دور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ نیو ہیمپشائر...... وہاں ایک بہت پرانا چرچ ہے جس کی تعمیر شاید اٹھارویں صدی کی ہے۔ تم اگر وہاں کام کرنا چاہو...... تو چلے جانا...... مجھ سے ایک لیٹر لے جانا...... جو وہاں کی سٹی گورنمنٹ سے اجازت لینے میں تمہاری مدد کرے گا اور اگر میئر اجازت نہ دے...... تو بتانا مجھے...... اتفاق سے میرا چھوٹا بھائی وہاں کا شیرف ہے۔ ہم اس کے ذریعے اجازت لے لیں گے۔" مسٹر میتھیوز نے آنکھ دباتے ہوئے شرارتی لہجے میں کہا تو ارسل کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی پھر وہ تھیسس کی تیاری میں اتنا مصروف ہو گیا کہ امی سے ملنے بھی نہ جا سکا...... وہ فون پر شکایت کرتیں تو انہیں تسلی دے کر بہلا دیتا کہ بہت مصروف ہوں...... کام ختم ہو جائے...... تو پھر آؤں گا۔

پھر ایک دن اس کی کال آئی۔

"ہیلو ارسل! کہاں ہوتے ہو؟ کسی وقت آن لائن نظر ہی نہیں آتے...... اس لیے مجبوراً فون استعمال کرنا پڑتا ہے۔"

"میں تمہاری طرح فارغ تو ہوں نہیں...... تھیسس پر بے حد مصروف ہوں...... کمپیوٹر کھولنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔"

"ارسل کے بچے! ابھی فوراً اسکائپ پر آؤ...... مجھے تم سے بہت سی اور ضروری باتیں کرنا ہیں۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ فون کے لمبے بل دے سکوں...... آج کل مالی حالات بے حد عبرت ناک چل رہے ہیں' چلو شاباش! فوراً آؤ......" اس نے کہا تو ارسل کو اس کی بات ماننا ہی پڑی۔ اگلے ہی لمحے اسکرین پر اس کا وہی ہنستا مسکراتا شاداب چہرہ نظر آیا۔ پیچھے اس کے بیڈروم کی کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ اور باہر گرتے والی برف نظر آ رہی تھی۔

"اوووہ...... برف باری ہو رہی ہے؟"

"کتنا رومینٹک موسم ہے ناں......؟" وہ مسکرائی۔

"رومینٹک! یہ رومینٹک موسم ہے؟ اچھا خاصا روتو موسم ہے۔ جیسے کوئی ہلکے ہلکے رو رہا ہو اور قطرہ قطرہ اس کے آنسو گر رہے ہوں۔"

"ارسل کے بچے! ایسا موسم تو لگتا ہے تمہارے چہرے پر آ کر مستقل ٹھہر گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ پہلے جیسے بالکل نہیں رہے، خیر! میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ مجھے اس کی طرف سے ایک ٹاسک ملا ہے۔ ٹاسک یہ ہے کہ مجھے خفیہ طریقے سے اس کو اپنے ملک پہنچانا ہے۔ ایسے کہ کسی کو بھی پتا نہ لگ سکے کہ وہ گیا کہاں؟" اس نے بھیدوں بھرے لہجے میں کہا تو ارسل چونک پڑا۔

"اچھا...... اور یہ ٹاسک تمہیں دیا کس نے ہے؟"

"جی ایم نے۔" اس کا کہنا ہے کہ آج کل حسنات کی جان کو بڑا خطرہ ہے۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر فوری طور پر اسے یہاں سے نکالا نہ گیا تو اسے مارا بھی جا سکتا ہے۔"

"تو وہ پولیس کو اطلاع دے...... وہ خود نمٹ لیں گے اُن لوگوں سے۔"

"نہیں نا...... پولیس کو بھی پتا نہیں لگنے دینا ہے...... سنا ہے پولیس میں بھی ان کے مخبر ہیں۔"

"اووہ...... جو کام پولیس بھی نہیں کر سکتی...... وہ تم کرو گی۔ جیمز بانڈ 007 کی چچی...... تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ تم کتنے خطرناک چکر میں پڑنے جا رہی ہو۔ پولیس کو نہ بتانے کا مطلب سمجھتی ہو...... وہ تمہارا دم دار ستارہ کسی جرم میں ملوث ہے...... اور قانون کی گرفت میں آنے سے پہلے پہلے...... وہ یہاں سے نکل بھاگنا چاہتا ہے...... وہ تو پکڑا ہی جائے گا۔ ساتھ تم بھی اعانتِ جرم میں دھر لی جاؤ گی...... کہیں ایسا نہ ہو کہ آئندہ میری تم سے اسکائپ پر بات براہِ راست پولیس لاک اپ سے ہو۔" ارسل نے اسے ڈرانے کی کوشش کی لیکن وہ نویرہ ہی کیا جو ڈر جائے۔

"ارسل کے بچے! منہ اچھا نہ ہو تو بندہ بات تو اچھی کر لے۔ جاؤ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔" اس نے غصے میں آ کر رابطہ ختم کر دیا اور ارسل سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

صبح کے سات بجے تھے۔ لندن کے آسمان پر گہرے بادل ٹھہرے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش کا سلسلہ رات سے جاری تھا اور ابھی بادلوں کی دبیز تہ بتا رہی تھی کہ اگلے دو تین دن تک موسم ایسا ہی رہے گا۔ ملگجے اجالے میں ایک مشہور لانڈرومیٹ کی ڈلیوری وین اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کی پچھلی گلی میں آ کر رکی۔ وین پر لانڈرومیٹ کا نام اور اس کا

مونوگرام سرخ اور نارنجی شوخ رنگوں میں چھپا ہوا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر ایک لڑکی انہی رنگوں کی پی کیپ پہنے بیٹھی تھی۔ اتنے میں پہلی منزل کے ایک اپارٹمنٹ کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک عمر دار سانولی رنگت کا ایک آدمی کپڑے کا ایک تھیلا اٹھائے ہوئے برآمد ہوا۔ اس نے گھسی ہوئی جینز کی پینٹ اور ایک بوسیدہ سا سرمئی سویٹر پہنا ہوا تھا۔ پیروں میں بدرنگ جوتے اور سر پر میلی سی ٹوپی پہنے ہوئے وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا ہوا آیا۔ کپڑوں کا تھیلا اس نے وین میں پیچھے ڈالا۔ اور اپنی ٹوپی درست کرتے ہوئے آگے آکر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وین چل پڑی۔ لڑکی نے مونوگرام والی نارنجی ٹوپی اس کی طرف بڑھائی اور اس نے بغیر کوئی سوال کیے اپنی ٹوپی اتار کر وہ پہن لی۔ وین مناسب رفتار سے سفر کرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔

لانڈرومیٹ کی پارکنگ میں وین جا کر رک گئی۔ دونوں نے اپنی ٹوپیاں وین میں ہی چھوڑ دیں اور باہر نکل آئے۔ اب وہ دونوں ایک مختلف اور مناسب لباس میں تھے اور حلیے سے کسی بھی طرح وہ کسی لانڈرومیٹ کے ورکرز نظر نہیں آرہے تھے۔ پارکنگ میں ہی تھوڑا آگے جا کر وہ ایک دوسری گاڑی میں بیٹھے اور روانہ ہوگئے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک فیری میں سفر کر رہے تھے۔ اپنی کار سمیت...... دونوں الگ الگ اور ایک دوسرے سے اجنبی بنے سیٹوں پر بیٹھے...... کھڑکی سے باہر دور دور تک پھیلے پانی کو دیکھتے رہے۔ کچھ گھنٹوں کے بعد فیری نے انہیں فرانس کے ساحلی شہر پہنچا دیا۔ اب انہیں اپنی کار میں پیرس جانا تھا۔

ڈھلتے دن میں پیڑوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ شانزے لیزے پر سڑک کے کنارے بنے چھوٹے چھوٹے ریستوران اپنی سرگرمیاں شروع کر رہے تھے۔ کچھ لڑکے اور لڑکیاں ٹیبل اور کرسیاں فٹ پاتھوں پر لگا رہے تھے۔ اِکا دُکا لوگ ان ٹیبلو پر بیٹھ کر چائے کافی یا اپنا کوئی پسندیدہ مشروب پیتے ہوئے دور نظر آنے والے ایفل ٹاور کو دیکھ رہے تھے۔

وہ بھی آکر ایک ٹیبل پر الگ تھلگ گوشے میں بیٹھ گیا۔ آدھی آستین کی نیلی ٹی شرٹ پر سیاہ بغیر آستین کی جیکٹ پہنے وہ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے سڑک پر سے گزرنے والی اِکا دُکا گاڑیوں کو دیکھتا رہا۔ آدھی آستینوں میں اس کے صحت مند جسم کے مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں نمایاں تھیں۔ کبھی کبھی وہ کلائی پر بندھی گھڑی پر بھی ایک نظر ڈال لیتا اور پھر سڑک پر دیکھنے لگتا۔ آخر کار اس کی نظروں نے اس گاڑی کو دیکھ لیا جو خراماں خراماں اسی طرف بڑھی آرہی تھی۔ اس نے آخری سپ لے کر کافی کا مگ واپس رکھا اور کچھ رقم اس کے نیچے دبا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گاڑی کی طرف ایک غیر محسوس سا اشارہ کرتا ہوا وہ ایک جانب چل پڑا۔

وہ نزدیک ہی واقع ایک چھوٹے سے ہوٹل کی لابی میں ملے۔ لیکن کوئی بات کیے بغیر وہ آدمی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر رہائشی کمروں کی جانب چلا گیا جبکہ وہ دونوں کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔

''ہماری ریزرویشن تھی۔'' آدمی نے ریسپشنسٹ کو حوالہ دے کر بتایا۔

''جی ہاں، مسٹر اینڈ مسز رچی رابنسن! فرسٹ فلور...... روم نمبر 35۔'' ریسپشنسٹ نے اسی نمبر کی چابی ان کے حوالے کر دی۔ وہ بھی چابیاں لے کر اوپر سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔

اس پھولی ہوئی ناک، موٹی موٹی بھوؤں اور آنکھوں کے کنارے پر ہلکی جھریوں کے ساتھ...... آپ کو پہچاننا ناممکن ہے صاب!'' نیلی ٹی شرٹ والا کمرے کی پچھلی بالکونی میں کھڑا ان سے کہہ رہا تھا۔

''حالانکہ مجھے یہ حلیہ بدلنے سے بہت اذیت ہو رہی ہے۔ میری جلد سے جلد اس مصیبت سے جان چھڑاؤ۔''

''فکر نہ کریں صاب! بس کچھ ہی وقت کی بات ہے۔ رات تین بجے آپ کی فلائٹ ہے۔ آٹھ گھنٹے بعد آپ اپنے ملک میں ہوں گے۔ ویسے بڑی ہمت کی آپ نے...... میں اندر ہی اندر تھوڑا ڈر رہا تھا آپ کے لیے۔''

''یہ میری ہمت نہیں ہے۔ ساری ہمت اور کوشش ان کی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتیں...... تو میں وہاں سے کبھی نکل نہیں پاتا۔''

اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا تو وہ مسکرائی۔ اس مسکراہٹ نے اس کے گالوں میں لگے اسپرنگس کو یکلخت کھینچ دیا جس سے اس کا دہانہ چر سا گیا۔ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں اذیت کا تاثر ابھرا اور معدوم ہوگیا۔ اس نے جلدی سے اپنا منہ بند کر لیا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں صاب! ہم نے ان کے بارے میں سب کچھ سنا...... بڑی جی دار بی بی ہیں یہ...... غلام محمد نے تو ان کی تعریف میں زمین آسمان ملا دیا ہے۔ اچھا صاب! آپ لوگ تھوڑا آرام کرلیں۔ رات آٹھ بجے ڈنر کر لیجیے گا۔ دس بجے ہوٹل سے باہر آجائیے...... رب نواز ٹیکسی لے کر کھڑا ہوگا۔ اس میں

بیٹھ جائیں۔ راستے میں ایک جگہ رک کر آپ کے کچھ کاغذات بنیں گے۔ آپ کے فوٹو لے کر لگائے جائیں گے اور پھر سیدھے ائرپورٹ۔"

جہاز ٹارمک سے نکلا۔ رن وے پر آیا۔ ٹیکسی کرتا ہوا آگے بڑھا اور تیزی سے دوڑتا ہوا فضا میں بلند ہوگیا۔ پرواز ہموار ہوتے ہی سیٹ بیلٹ باندھنے والے سائنز بجھ گئے۔ انہوں نے بھی اپنی سیٹ بیلٹ کھولیں اور پشت گاہ سے سر لگا کر لمبی سانس لی۔ کھڑکی سے باہر نیچے زمین پر پیرس شہر کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ایک جانب ایفل ٹاور تیزی سے پیچھے کی جانب جاتا دکھائی دیا اور جہاز بادلوں میں داخل ہو کر...... اوپر نکل آیا۔ اب ہر طرف اندھیرا تھا۔ گہرا... اندھیرا...... لیکن جہاز کی ساری روشنیاں جل رہی تھیں۔ قومی ائرلائن کا جہاز تھا اس لیے زیادہ تر مسافر بھی دیسی ہی تھے۔

ان دونوں کے احساسات بھی الگ الگ تھے۔ ایک اپنوں میں جانے اور تلخیٔ ایام کو پیچھے چھوڑ جانے پر خوش اور مطمئن تھا تو دوسری اپنوں کو اور اپنوں سے جڑی خوشیوں کو چھوڑ کر اجنبیوں میں جانے پر آزردہ تھی۔ ایک کے لیے مستقبل خوش کن اور محفوظ تھا اور دوسری کے لیے مستقبل اندیشوں سے بھرا اور مخدوش تھا لیکن ایک امید بہرحال اس کے ساتھ تھی۔

☆☆☆

"اب آگے کیا پروگرام ہے تمہارا؟" عاطر اوصاف اس سے پوچھ رہا تھا۔

ان کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ سب تھیسس بھی جمع کروا چکے تھے۔ کچھ عرصے بعد ڈگری بھی مل جانی تھی۔ سب اپنے اپنے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ساتھ ہی جاب کی تلاش بھی شروع کر دی تھی۔

"ہممم...... جاب کی تلاش کر رہا ہوں۔ مل جائے تو فوری طور پر جوائن کر لوں گا۔ میرے لیے بہت ضروری ہے۔" ارسل نے جواب دیا۔

"گھر نہیں جاؤ گے؟" عاطر نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اووو...... او کے۔ پھر تمہارے لیے ایک آفر ہے۔ یہاں کینیڈا میں تو نہیں...... امریکا میں ایک اچھی جاب ہے۔ میرے کچھ جاننے والے ہیں انہوں نے مجھے یہ آفر بھجوائی ہے۔ لیکن میرا فی الحال ارادہ نہیں ہے۔ میں پہلے اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ بہت عرصہ ہوگیا ہے۔ کچھ وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ پھر دیکھوں گا...... اس لیے تم اگر چاہو تو یہ آفر قبول کر سکتے ہو...... جاب اچھی ہے۔ پیسے بہت اچھے ملیں گے۔" عاطر نے تفصیل بتا کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے بلا تامل اثبات میں سر ہلا دیا۔

"او کے...... میں اپنے دوست سے بات کرتا ہوں...... تم تیاری کر لو۔" عاطر اس کا کاندھا تھپکتا ہوا اٹھا اور چلا گیا۔ ارسل گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اٹھایا تو امی کا فون تھا۔

"ارسل! تم کہاں ہو؟ کتنی دفعہ فون کر چکی ہوں۔ تم سے رابطہ ہی نہیں ہوتا۔ آخر کر کیا رہے ہو؟ گھر بھی نہیں آئے اب تک آخر مسئلہ کیا ہے؟" وہ بولتے بولتے روہانسی ہو گئیں۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے امی! دراصل بات یہ ہے کہ مجھے گھر آنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ یونیورسٹی میں ہی تھا کہ ایک اچھی جاب کی آفر ہوگئی۔ اسے فوری طور پر قبول کرنا تھا یا پھر انکار...... جاب اتنی اچھی تھی کہ میں نے قبول کر لی۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو ثمینہ بے تاب سی ہو گئیں۔

"کیا مطلب ہے...... جاب کر لی تو اب تو چھٹی ملنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ کم از کم 1 سال بعد امکان ہوگا...... ارسل! چند روز کے لیے...... آجاتے بیٹا میری تو آنکھیں ترس گئیں۔"

"آؤں گا امی! جلدی آؤں گا بلکہ ایسا کریں۔ آپ آجائیں یہاں میرے پاس۔ میں نے اپارٹمنٹ لے رکھا ہے۔ دونوں ماں بیٹا آرام سے رہیں گے۔ اب مجھے بتائیں، کب آپ کے لیے ٹکٹ بھجوا دوں۔"

"ابھی تو نہیں آسکتی۔ جاذل کے بیٹے کی طبیعت تھوڑی خراب ہے۔ ٹھیک ہو جائے تو پھر آجاؤں گی۔ جاب کہاں ملی ہے؟"

"ڈیٹرائٹ...... یو ایس میں۔" ارسل نے ہولے سے بتایا تو وہ چیخ پڑیں۔

"امریکا میں...... ملک ہی چھوڑ دیا تم نے۔"

"ڈیٹرائٹ کون سا دور ہے امی! آپ کے ونڈسر سے تو صرف پینتالیس پچاس منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ بس برج ہی تو کراس کرنا پڑتا ہے۔"

"افوہ ارسل! تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟" وہ پریشانی سے بولیں۔

"کچھ نہیں امی! آپ فکر کرنے کے بجائے تیاری کریں، میں انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے بات ختم کر دی۔

☆☆☆

اسے اپنے چہرے پر شدید حدت اور گال پر سوئیاں چبھنے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں نمی چھپائے، سر جھکائے ان کے سامنے کھڑا، ان کی گھن گرج اور جاہ و جلال کے طوفان کا بے بسی سے سامنا کر رہا تھا۔

وہ حویلی میں داخل ہو کر جیسے ہی ان کے مدمقابل ہوا تو السلام علیکم بابا کہہ کر ان کی جانب بڑھا۔ اور جواب میں جو طوفانی زناٹے دار تھپڑ کھایا۔ اس نے اندر تک اسے ہلا کر رکھ دیا۔

''بابا کی خبیث اولاد! کتنا نام روشن کر کے آیا ہے باپ دادا کا...... تیرا استقبال تو شایانِ شان ہونا چاہیے۔ منگوائے ہیں میں نے جوتوں کے ہار تیرے لیے...... نامعقول، خدائی خوار! تیرے جیسی اولاد سے تو بہتر تھا کہ میں بے اولاد ہی رہتا۔''

''بہرام خان!'' وہ زور سے دہاڑے۔ ''اس کو میرے سامنے سے گم کرو۔ نہیں تو میں اس کو گولی مار دوں گا۔ لے جاؤ اِس خبیث کو...... میری نظروں سے دور۔'' انہوں نے غصے میں ہاتھ ہلایا تو بہرام خان نے تیزی سے آگے بڑھ کر حسنات کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی جانب لے گیا۔

اس کے ساتھ آنے والے لوگ اور کچھ حویلی کے ملازمین وہیں سر جھکا کر کھڑے شاید خان جی کے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ وہ بھی چپ چاپ کھڑی انتظار کر رہی تھی۔

کچھ دیر غصے میں ٹہلنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ہم تمہارے شکر گزار ہیں بیٹی! کہ تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہمارے بیٹے کو یہاں تک پہنچانے میں ہماری مدد کی۔ تم ہماری معزز مہمان ہو۔''

''رستم خان! بی بی کو مہمان خانے میں لے جاؤ اور ان کا بہت اچھی طرح خیال رکھو۔''

اس طرح وہ مہمان خانے میں خانہ نشین ہو گئی لیکن کب تک...... پھر اس کے بے حد اصرار پر حسنات سے اس کی ملاقات کروائی گئی۔ ''میں یہاں کب تک اس طرح بیکار پڑی رہوں گی؟'' اس نے سوال کیا۔

''واپس اپنے گھر جانا چاہتی ہو؟'' حسنات نے پوچھا۔

''واپس؟ کیا میری واپسی ہو سکتی ہے؟ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اب میں انگلینڈ میں قدم بھی نہیں رکھ سکتی۔ غیر قانونی طور پر وہاں سے نکلنے کے بعد...... وہاں کی پولیس میرے انتظار میں ہتھکڑیاں لیے گھوم رہی ہوگی اور وہ؟ جن کے چنگل سے تمہیں نکال کر بھاگی ہوں۔ انہوں نے تو نہ جانے کتنی گولیوں پر میرا نام لکھ رکھا ہوگا۔ وہاں قدم رکھتے ہی چھلنی کر دی جاؤں گی۔ کیا تم یہی چاہتے ہو؟''

''نہیں، میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گا۔ بہتر ہے پھر تم یہیں رہو...... ہماری این جی او کا بہت کام ہے۔ تم اِسے سنبھالو اور پھیلاؤ، شہر شہر پروجیکٹس بناؤ اور انہیں چلانے کا بندوبست کرو۔ ایک مقصد کے لیے کام کرو گی تو تمہارا وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔''

''ٹھیک ہے جیسا تم کہو......'' اس نے مسکرا کر حسنات کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں قربان ہو جانے کا احساس ہلکورے لے رہا تھا۔ حسنات نے اسے محسوس کیا اور ہلکے سے مسکرا کر اٹھ گیا۔

بہت عرصے کے بعد اس نے ارسل سے اسکائپ پر رابطہ کیا۔

''ہیلو ڈوڈ! کہاں ہو آج کل؟ اتنے مصروف ہو کہ کبھی بھولے سے فون بھی نہیں کیا مجھے...... بہت بے مروت ہو گئے ہو۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''ہاں، نئی جاب ہے اس لیے محنت کرنا پڑ رہی ہے۔ تم سناؤ...... تمہارے ٹاسک کا کیا ہوا؟'' ارسل نے بے دلی سے پوچھا۔

''Successful...... یعنی کہ کامیاب......'' اس نے مسکراتے ہوئے انگوٹھا اٹھا کر کہا تو ارسل حیران ہو گیا۔

''کیا؟ کیا مطلب ہے؟ یعنی تم اُسے وہاں سے نکال کر لے گئی ہو؟ اور اب تم اپنے ملک میں ہو؟''

''یس!''

''لیکن کیسے؟'' اس نے سوال کیا۔

''بالکل جاسوسی فلموں والی سچویشنز سے گزر کر...... جان ہتھیلی پر رکھ کر...... نہ جانے کن ملکوں اور کن کن راستوں سے گزر کر...... بھیس بدل کر...... لیکن آخر کار میں نے اُسے اس کی حویلی پہنچا دیا۔ سو......؟'' اس نے بچکانا انداز میں انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر ہنستے ہوئے کہا تو ارسل نے سر پکڑ لیا۔

''او مائی گاڈ! میں تمہارے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سچ ہے تم پاگل نہیں...... جنونی ہو...... تمہارے گھر والوں کو خبر ہے؟''

''نہیں، انہوں نے تو مجھ سے تعلق ہی توڑ لیا تھا۔ کوئی مجھ سے بات تک کرنے کا روادار نہیں تھا۔ تو انہیں کیا فرق

پڑتا ہے کہ میں کہاں ہوں۔ کس حال میں ہوں؟'' اس نے آزردگی سے کہا۔

''وہ تعلق کیوں توڑ لیا انہوں نے؟''

''وہ...... وہ دراصل...... مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ مجھے دے نہیں رہے تھے۔ تو میں نے پاپا سے کہا کہ...... ان کے اسٹیٹس میں میرا جو حصہ ہے وہ مجھے دے دیں...... اس پر وہ سب مجھ سے ناراض ہوگئے۔ لیکن پاپا نے حساب کر کے مجھے میرا حصہ دے دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اب ان سب کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''او مائی گاڈ! یہ تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟ کیا ضرورت پڑ گئی تھی تمہیں اتنے زیادہ پیسوں کی؟'' ارسل نے غصے سے پوچھا۔

''تم جانتے ہو۔'' اس نے آہستہ سے کہا تو ارسل کا بھی دماغ گھوم گیا۔

''وہ بھی اس کی این جی او کو دے ڈالا؟'' اس نے اثبات میں سر ہلایا تو ارسل نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''ارسل پلیز! دیکھو تم مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ ایک تم ہی تو بچے ہو۔ جسے میں اپنا کہہ سکتی ہوں۔ تم بھی ناراض ہو گئے دوسروں کی طرح تو میں تو بالکل تنہا رہ جاؤں گی دنیا میں...... ارسل پلیز!'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔ ارسل نے گہرا سانس لے کر اپنے اوپر قابو پایا۔

''او کے! اب کیا کرو گی؟ کہاں ہو؟''

پھر وہ سب کچھ اسے بتاتی رہی جسے وہ تحمل اور خاموشی سے سنتا رہا۔

☆☆☆

''اُف! کس قدر کباڑ خانہ بنایا ہوا ہے پورے گھر کو اس لڑکے نے۔'' وہ بستر کی چادر تبدیل کرتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔ آج انہیں ارسل کے پاس آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ وہ آفس گیا ہوا تھا اور جلدی آنے کا کہہ گیا تھا پھر ویک اینڈ شروع ہو رہا تھا تو اس نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں شہر دکھانے کے لیے لے جائے گا۔

اس طرح چار پانچ روز میں ہی انہیں ارسل کی مصروفیات کا اندازہ ہو گیا۔ اب تک اس کا دل بجھا ہوا تھا۔ ہنستا مسکراتا شاذ و نادر ہی ہو تا زیادہ وقت وہ اپنے کام میں مصروف رہتا۔ شام کو آتا تو دونوں ماں بیٹا مل کر کھانا کھاتے اور عشا کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے نیچے والے فلور پر رہنے والے کچھ مسلم لڑکوں کے ساتھ درس سنتا تھا پھر آ کر تھوڑی بہت دیر اُن سے باتیں کرتا اور سو جاتا...... اس نے چھوٹی سی داڑھی بھی رکھ لی تھی جو اس کے چہرے کو اور خوب صورت بنا رہی تھی۔ رات کو وہ جاتا تو اکثر بالکنی سے اسے جاتا دیکھتی رہتیں۔ سامنے ہی وہ فلیٹ ایک فلور نیچے نظر آتا تھا جہاں چند اور لڑکے بھی آتے جاتے نظر آتے تھے۔

تقریباً ایک ماہ ہو رہا تھا انہیں آئے ہوئے۔ اب وہ واپسی کے لیے کہہ رہی تھیں اور وہ اصرار کر کے انہیں روک رہا تھا۔

اس دن وہ ناشتا کر کے آفس کے لیے نکلا تو وہ خدا حافظ کہہ کر گھر کے کام میں لگ گئیں۔ نہ جانے کب تک مصروف رہیں کہ انہیں کچھ شور سا سنائی دیا۔ جہاں ہر وقت سناٹا طاری رہتا ہو وہاں اس قسم کا شور ان کے تجسس کو جگا گیا۔ وہ باہر نکلیں۔ بالکنی سے ان کی نظر...... ایک فلور نیچے اسی فلیٹ پر پڑی۔ جہاں ارسل کے دوست جمع ہوتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ چار پانچ پولیس والے فلیٹ سے چند لڑکوں کو دھکے دے کر نکال کر باہر لا رہے تھے۔ نیچے کمپاؤنڈ میں پولیس کاریں کھڑی تھیں۔ ان کی لال نیلی روشنیاں گھوم رہی تھیں اور پولیس والے ان لڑکوں کو گھیرے میں لے کر کاروں کی طرف لے جا رہے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' انہوں نے ہولتے ہوئے اس گوری بڑھیا سے پوچھا جو اپنی بالکنی میں لٹکی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔

''یہ مسلم دہشت گرد ہیں۔ اس فلیٹ میں چھپ کر دہشت گردی کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ پولیس نے چھاپا مار کر انہیں پکڑا ہے۔'' بڑھیا کے اس بیان کو سن کر ان کا تو دل حلق میں آ گیا اور پیٹ میں جیسے تتلیاں پھڑ پھڑانے لگیں۔ وہ واپس آئیں اور تیزی سے جاذل کا نمبر گھمایا۔

''جاذل! بیٹا جیسے بھی ہو...... جلد سے جلد میرے اور ارسل کے لیے...... اپنی قومی ائرلائن یا جس ائرلائن میں بھی ہم دونوں کے لیے سیٹیں ملیں، بکنگ کروا دو...... آج ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ سُن رہے ہو نا۔ آج ہی رات تک کی کسی فلائٹ میں...... ہم دونوں ابھی نکل رہے ہیں۔'' انہوں نے گھبراہٹ میں جلدی جلدی جاذل کو بتایا۔

''امی! کیا کہہ رہی ہیں؟ خیریت تو ہے؟'' وہ بھی گھبرا گیا تھا۔

''بس بیٹا! ابھی تک تو خیریت ہے...... لیکن اب نہیں رہے گی۔ اس لیے میں ارسل کو لے کر ابھی نکل رہی ہوں۔ تمہیں میں نے جو کہا ہے اس پر جلد سے جلد عمل کرو۔ سارے کام چھوڑ کر...... ہمیں ابھی نکلنا ہے اپنے ملک پہنچنا

ہے۔''

''لیکن امی! کچھ بتایئے تو سہی۔''

''وہیں آکر بتاؤں گی...... ابھی کچھ بتا نہیں سکتی۔''

انہوں نے فون بند کیا۔ جلدی جلدی چند ضروری چیزیں سمیٹ کر بیگ میں ڈالیں اور شولڈر پر ڈال لیا۔ پھر انہوں نے ارسل کو فون کیا۔

''ارسل! میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ میں نے اکیلے اسپتال جانے کی کوشش کی لیکن اتنا چل نہیں پا رہی ہوں۔ تم...... تم فوراً آجاؤ...... میں کونسٹی اسپتال کے باہر فٹ پاتھ پر بیٹھی ہوں، پلیز۔'' انہوں نے کچھ کراہ کر کہا تو ارسل پریشان ہو کر فوراً ہی ان کے پاس پہنچ گیا۔ انہیں گاڑی میں بٹھا کر اسپتال کا رخ کرنے لگا تھا کہ انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

''ارسل بیٹا! ہم اسپتال نہیں، ابھی اور اسی وقت جاذل کے پاس جا رہے ہیں۔ اسی طرف گاڑی موڑلو۔''

''لیکن امی! آپ کی طبیعت......''

''میں ٹھیک ہوں...... مجھے کچھ نہیں ہوا...... بس ہمیں فوراً جاذل کے پاس جانا ہے۔ چلو...... جلدی کرو۔''

''امی! میرا پاسپورٹ اور دیگر چیزیں......؟''

وہ سب میں اٹھا لائی ہوں۔ تمہاری جتنی ضروری چیزیں ہیں، میں نے سب اٹھا کر رکھ لی ہیں۔ ان کی فکر مت کرو۔ چلو، جلدی نکلو۔''

ارسل نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور ڈرائیونگ پر توجہ دینے کا اشارہ کیا اور خاموشی سے سیٹ بیلٹ باندھنے لگیں۔

ارسل نے الجھے ہوئے انداز میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی کا رخ ہائی وے کی طرف موڑ لیا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہی وہ جاذل کے گھر میں بیٹھے تھے۔

''امی! مسئلہ کیا ہے؟ کچھ بتائیں تو سہی۔'' وہ دونوں حیران اور پریشان ماں کے خاموش اور ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھ رہے تھے پھر وہ انہیں سب کچھ بتاتی چلی گئیں ساری تفصیل بتانے کے بعد انہوں نے جاذل سے اپنی روانگی کے بارے میں پوچھا۔

''ہمیں کب جانا ہے جاذل؟''

''امی! رات بارہ بجے ٹورنٹو سے فلائٹ ہے اب آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ کھانا کھا کر نکلتے ہیں۔ تین چار گھنٹے میں ٹورنٹو پہنچ جائیں گے۔''

''لیکن میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا ہے امی کہ پولیس مجھے پکڑ کر لے جائے کوئی دہشت گردی، یا کوئی غیر قانونی حرکت...... پھر میں کیوں بھاگوں، اس طرح تو میں بلاوجہ مشکوک ہو جاؤں گا پھر میرا کیریئر ابھی شروع ہوا ہے......''

''بس کرو ارسل! کیا وہ لڑکے جو پکڑے گئے ہیں، دہشت گرد تھے۔ انہوں نے کی تھی کوئی دہشت گردی...... بتاؤ، نہیں نا لیکن پکڑ لیا گیا انہیں۔ اب انہیں ٹارچر کریں گے اور ان سب کے نام معلوم کریں گے جو ان کے ساتھ ہیں یا ان سے ملتے جلتے ہیں۔ تم بچ سکو گے کیا؟ کبھی نہیں...... رہا سوال کیریئر کا تو تمہارے لیے کام ساری دنیا میں ہے۔ اب کوئی بحث نہیں اور ہاں یہ داڑھی بھی صاف کر دو اپنی وہاں جا کے پھر رکھ لینا۔'' انہوں نے بات ختم کر دی۔

پھر وہ جاذل کی گاڑی میں ٹورنٹو روانہ ہو گئے۔ سارے راستے ان کی بے چین نظریں باہر ہر طرف نگراں رہیں۔ کہیں کوئی گاڑی ان کے پیچھے تو نہیں آرہی ہے۔ وہ غیر ارادی طور پر ایسی کوششیں کرتی رہیں کہ ارسل کو باہر سے دیکھا نہ جا سکے۔ وہ آگے جاذل کے ساتھ بیٹھی تھیں اور ارسل کو بار بار کہتی رہیں۔

''ارسل! تم تھک گئے ہو بیٹے! سیٹ پر آرام سے لیٹ جاؤ اور تھوڑی دیر سو جاؤ...... ارسل! دھوپ آرہی ہے اپنی سائیڈ پر سن اسکرین لگا لو...... یہ بڑے والے سن گلاسز لگالو۔'' وغیرہ وغیرہ۔

وہ دونوں ان کی بے چینی اور بے قراری کو سمجھ رہے تھے۔

ائرپورٹ پر بھی وہ اسی کوشش میں رہیں کہ جلد از جلد بورڈنگ مل جائے۔ لاؤنج میں بیٹھے وہ انتظار کر رہے تھے تو انہوں نے اخبار ارسل کو دیا۔

''ارسل! یہ اخبار پڑھتے رہو۔ یہ تمہارے چہرے کے سامنے پھیلا رہے تو اچھا ہے۔''

''امی! کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔ وہ امریکا تھا، یہ کینیڈا ہے، یہاں کچھ نہیں ہوگا۔''

''وہاں سے یہاں کی پولیس کو معلومات بھیجنے میں کیا دیر لگتی ہے اور اگر انہوں نے مطلوب شخص کی معلومات بھیج دیں تو پولیس سب سے پہلے ایگزٹ کے راستوں کو بند کرتی ہے۔ بس دعا کرو کہ تمہارے ان دوستوں کو اللہ قوتِ برداشت دے وہ ان کے ٹارچر کے سامنے ٹھہر جائیں...... کم از کم اتنا کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔'' وہ پریشانی میں زیرِ لب دعائیں پڑھتی رہیں۔ انہیں وہ وقت لمحوں کا نہیں...... صدیوں کا انتظار لگ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے بورڈنگ شروع ہوئی۔ جیسے ہی مسافروں کو جہاز میں جانے کے لیے پکارا گیا۔ وہ بوکھلائی ہوئی حالت میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ارسل نے آہستگی سے ان کو شانوں سے تھام کر تسلی دی پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ ٹنل میں سے گزر کر جہاز میں پہنچ گئے کچھ ہی دیر میں جہاز نے اڑان بھری اور فضا میں پہنچ کر ہموار ہوا تو روشنیاں جل اٹھیں اور سب سیٹ بیلٹس کھول کر آرام سے بیٹھے تو ثمینہ بیگم کی آنکھوں سے شکر کے آنسو جاری ہو گئے۔

☆☆☆

خوش آمدید...... خوش آمدید...... شہباز! کیا حال ہے تمہارا؟'' خاقان شاہ نے اپنے دیرینہ دوست سے معانقہ کرتے ہوئے اس کا حال پوچھا تو دوست نے بھی خوش دلی سے انہیں گلے لگایا اور اپنے ساتھیوں سے تعارف کروایا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے۔

''بس...... تم پانچ لوگ! کیا کافی ہو گے؟'' شاہ جی نے سوال کیا۔

''فکر نہ کرو...... اور بہت ہیں...... وقفے وقفے کے بعد سامان کے ساتھ پہنچیں گے۔ سب کا ایک ساتھ آنا ٹھیک نہیں تھا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے...... پھر تیاری تو پوری ہے ناں؟'' شاہ جی نے کچھ بے چینی سے پوچھا۔

''ارے یار! فکر کیوں کرتے ہو...... تیاری تو پوری ہے لیکن یہاں کیا صورت حال ہے' اس کا جائزہ لے کر اسٹریٹجی بنانا ہوگی۔''

وہ سب باتیں کرتے ہوئے باغ کے اس حصے کی طرف بڑھتے رہے جہاں چائے کے لوازمات سرو کیے جا رہے تھے۔

''میں نے ان تک بات پہنچا دی ہے کہ میرے کچھ شکاری دوست آئے ہیں۔ ہم سب دو تین دن جنگل میں شکار کھیلیں گے...... اس لیے وہ اپنی حدود میں رہیں اور ان کی وجہ سے میرے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے...... تو ہم چلیں گے شکار کے بہانے...... تم لوگ جنگل کے اس حصے کا اچھی طرح جائزہ لے لینا پھر سوچ لینا کہ کیا کرنا ہے۔'' خاقان نے ان سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''مسئلہ کچھ نہیں ہے خاقان شاہ! ان کو سبق سکھانا ہمارے لیے کوئی مشکل نہیں ہے بس تمہارے بیٹے کی وجہ سے بہت سوچ سمجھ کر اس طرف قدم بڑھانے پڑیں گے۔ تم نے لندن میں بیٹے کی سیکیورٹی کا مناسب بندوبست تو کر لیا ہے نا؟'' شہباز نے پوچھا۔

''ہا آ آں!! اس کی فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے، اس کو میں نے وہاں سے نکلوا لیا ہے وہ آ گیا ہے ادھر۔''

''کیا؟ وہ اپنے گھر آ گیا؟ پر انہوں نے اسے نکلنے کیسے دیا؟ یہاں کیسے پہنچ گیا؟'' شہباز نے حیرت کا اظہار کیا۔

''بس یار! وہ ایک سر پھری لڑکی ہے اس نے اس کو وہاں سے نکالا پھر آگے میرے آدمیوں نے اس کی مدد کی۔ وہ آ گیا ہے یہاں...... تب ہی تو میں نے تم کو بلوایا ہے کہ اب میرے اوپر کوئی دباؤ نہیں، یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے...... تم بالکل آزادی سے کام کرو، نیست و نابود کر دو ان بدبختوں کو......''

''اوہ...... تو یہ بات ہے...... گڈ! اب تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ڈال دیتے ہیں دھمال...... تم کیا چاہتے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں تو چاہتا ہوں کہ یہ یہاں سے دفان ہو جائیں۔ پر یہ بھی معلوم ہے کہ وہ آسانی سے یہ جگہ چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ جانے کیا کام کر رہے ہیں۔ میرے آدمیوں نے رپورٹ دی ہے کہ ادھر دن رات مشینیں چلتی رہتی ہیں بھاری والی......'' شاہ جی نے بیزاری سے کہا۔

''بھاری مشینیں! اس کا مطلب ہے کچھ تعمیراتی کام ہو رہا ہے۔ کیا بنا رہے ہیں یہ لوگ؟''

''پتا نہیں...... خدائی خوار کوئی قلعہ بنانا چاہتے ہیں ادھر...... کہ کوئی محل تعمیر کر رہے ہیں...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''تم سے بات تو ہوئی ہو گی...... کیا بتایا اس بارے میں؟''

''ہاں...... بات ہوئی تھی۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ ہمارے لوگ سرحد کے ادھر...... کبھی ادھر آتے جاتے رہتے ہیں...... لمبے راستوں پر اگر موسم خراب ہوتا ہے تو انہیں بہت پریشانی ہوتی ہے تو جنگل کے اس حصے میں ان کے ٹھہرنے کا بندوبست کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی کاٹیج بنانا چاہ رہے ہیں۔''

''تم نے ایسی کوئی آفر نہیں کی...... کہ تم خود کوئی ایسی پناہ گاہ بنوا دیتے...... جہاں مسافر عارضی طور پر ٹھہر جایا کریں...... آخر زمین اور علاقہ تو تمہارا ہی ہے...... اور ویسے بھی وہ کون سے عام مسافر ہیں...... سب بدمعاش،

اسمگلر......"

"تمہارا کیا خیال ہے میں نے ایسی کوشش نہیں کی ہو گی۔ اس خانہ خراب کو میں نے کہا کہ تم بولو تو میں فائیو اسٹار ہوٹل بنوا دیتا ہوں ادھر...... پر وہ نہیں مانتے...... ان کو جو کچھ بنوانا ہے، وہ خود بنانا چاہتے ہیں۔"

"ہم م م م م...... تم نے کچھ پتا کروایا...... ادھر ہو کیا رہا ہے؟"

"میرے دو آدمی ادھر مزدور بن کر کام کر رہے ہیں۔ ان سے رپورٹ ملتی رہتی ہے، ایک بڑا حصہ صاف کروا کے انہوں نے ادھر کھدائی کروائی ہے۔ پھر بہت بڑے بڑے ہال تعمیر کروائے ہیں۔ بہت مضبوط...... عجیب طرح کی چھت ڈلوائی ہے۔ وہ میرے مزدوروں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اب سنا ہے اس چھت پر دوبارہ جنگل اگا دیا ہے...... جھاڑیاں، گھاس، درخت وغیرہ۔"

"اوووہ...... کیموفلاج...... کچھ زیادہ ہی مشکوک معاملات ہیں...... خیر، دیکھتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو ابھی ہم شکار کے بہانے اس طرف جاتے ہیں۔ میں ان کی ریکی کرواتا ہوں۔ پھر اوپر بات کر کے اجازت لے لیتا ہوں۔ پھر پلان کریں گے کہ کرنا کیا ہے؟

"تم فکر نہ کرو...... اب اس معاملے کو صرف میں نہیں بلکہ ہمارا محکمہ دیکھے گا انشاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ بیٹا نظر نہیں آیا تمہارا...... کہاں ہے؟" شہباز نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"اس کو میں نے حویلی کے اندر رہنے کا پابند کیا ہے اور سب کو سختی سے منع کر دیا ہے کہ باہر کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ وہ یہاں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ پھر کوئی بے وقوفی کرے اور اس کا خمیازہ ہم سب بھگتیں۔"

رستم نے گھوڑے تیار کر دیے تھے۔ وہ سب شکاریوں والے حلیوں میں...... شکار کے لیے ضروری ہتھیاروں سے لیس ہو کر گھوڑوں پر بیٹھے اور جنگل کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

آج چھٹی کا دن تھا اس لیے وہ گھر پر تھا۔ پچھلے دنوں وہ خاصی خواری اٹھانے کے بعد ایک بڑی کنسٹرکشن کمپنی میں جاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ شہر کے سب سے بڑے اور کامیاب بلڈرز کا ایک گروپ تھا جس کے شہر میں کئی ایک میگا پروجیکٹس کام کر رہے تھے۔ ورنہ سال بھر پہلے اس کی امی جس افراتفری میں اسے امریکا اور پھر کینیڈا سے واپس لے کر آئی تھیں۔ وہ کچھ حواس باختہ سا ہو گیا تھا کہ اب کیا کرے؟

"تمہیں جو کچھ کرنا ہے یہیں اپنے ملک میں رہ کر ہی کرنا ہے۔ کہیں باہر جانے کا سوچنا بھی نہیں۔ میں تمہیں کبھی اجازت نہیں دوں گی۔" اس کی امی نے صاف لفظوں میں اس سے ایک نہیں کئی بار کہا تو وہ بھی مجبور ہو گیا پھر بہت عرصے کی تلاش کے بعد اسے کوئی ڈھنگ کی جاب ملی تھی اور اب وہ خاصا پُرسکون تھا۔

لیکن شاید خود اسے اپنی پُرسکون کیفیت زیادہ پسند نہیں تھی۔ سو اسے منتشر کرنے کے لیے آج پھر اس نے پرانی یادوں کی پٹاری کھول لی تھی۔ وہی دشمنِ جاں پھر اس کے سامنے تھی، ہر ہر رنگ اور ادا میں وہ اسے نظر آ رہی تھی اور وہ دل میں ابھرتے مایوس جذبوں کے باوجود ان پرانی تصویروں کو دیکھے جا رہا تھا۔ سال بھر سے زیادہ ہی ہو گیا تھا اس سے رابطہ ہوئے...... نہ اس نے کوئی فون کیا۔ نہ ہی اسکائپ پر نظر آئی۔

پتا نہیں کیا کر رہی ہے بے وقوف! کوئی خیر خبر ہی نہیں دی۔ چلو آج اس کو ایک میل تو بھیج ہی دوں۔ شاید جواب آ جائے۔ ارسل نے سوچتے ہوئے لیپ ٹاپ اپنی طرف کھسکایا ہی تھا کہ اسکائپ پر اس کی کال آ گئی۔ وہ حیران ہو گیا کہ اتنے عرصے کے بعد آج ہی میں نے اسے اتنی شدت سے یاد کیا اور آج ہی اسے بھی میری یاد آ گئی۔

"ہائے ہینڈسم! آج تو بہت اچھے لگ رہے ہو...... کیا بات ہے؟" اس نے شوخ لہجے میں بات شروع کی تو وہ اسے گھورتا رہا گیا۔ "کہاں تھیں اتنے دنوں سے...... کتنے عرصے کے بعد میری یاد آئی تمہیں...... پتا نہیں کن ہواؤں میں...... کہاں کہاں اڑتی پھر رہی ہو۔"

وہ زور سے ہنسی۔

"خوابوں کی دنیا میں...... تمہیں پتا ہے ارسل! آج کل میں اس کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوں۔ مختلف شہروں میں ہم اپنے آفس بنا رہے ہیں اور کیا کرنا ہے؟ کہاں کرنا ہے؟ کیسے کرنا ہے؟ یہ سب اختیار اس نے صرف اور صرف مجھے دے دیا ہے۔ آج کل ہم لوگ پشاور میں ہیں اور دو تین دن میں تمہارے شہر میں آ رہے ہیں۔ میں تم سے ملنے ضرور آؤں گی۔" اس نے اطلاع دی تو اس کی آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔

"بھئی میرے پاس تو ٹائم نہیں ہے سوری، میں تو شاید ہی مل پاؤں تم سے...... ویسے بھی تمہارے ساتھ جو دُم

چھلا ہے...... وہ مجھے کچھ زیادہ پسند بھی نہیں ہے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا تو وہ زور سے چلائی۔

''ارسل کے بچے! اس سے ملنے کے لیے تو لوگ گھنٹوں گھنٹوں انتظار کرتے ہیں تم اگر اس سے مل پائے، تو یہ تمہارے لیے اعزاز ہوگا سمجھے۔''

''نہیں بھئی، مجھے تو معاف ہی رکھو اس اعزاز سے...... مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''تم کچھ بھی بک بک کرتے رہو...... میں تو تم سے ملنے ضرور آؤں گی اور آکر تمہارا حشر نشر کروں گی...... اچھی طرح۔''

''ہاں تو تم آؤ...... ملو، اس سے کب انکار کیا ہے بلکہ خوشی ہوگی...... مجھے بھی...... امی کو بھی۔''

''اوکے...... ملتے ہیں...... دو تین دن میں۔''

یہ کہہ کر اس نے اسکائپ بند کر دیا۔ اور ارسل سوچتا رہ گیا کہ اگر وہ آگئی تو اسے صبر کا کتنا بڑا امتحان دینا پڑے گا۔

پھر وہ آگئی۔ شام کو بیل بجی۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ بالکل سامنے کھڑی تھی۔ سیاہ ملبوس میں وہ چاند کی طرح روشن تھی۔ وہ اسے بے خودی میں دیکھتا ہی رہ گیا۔

''ارسل کے بچے! کیا اندر نہیں آنے دو گے۔ دروازہ روک کر کھڑے ہوئے ہو۔'' وہ اسے دھکا دیتی ہوئی اندر آگئی۔

پھر وہ بڑی دیر تک بیٹھی ان سے باتیں کرتی رہی۔ ثمینہ بیگم کو بھتیجی پر بہت غصہ آرہا تھا۔ انہیں اس کا یہاں آنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

''ہونہہ! آگئی پھر میرے بچے کو مضطرب کرنے کے لیے...... مجھے پہلے پتا ہوتا...... تو آنے سے ہی منع کر دیتی۔'' وہ بڑبڑاتی رہیں پھر کھانا کھا کر وہ نماز کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں آگئیں۔

''ارسل! مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔ ورنہ میں تم سے نہ کہتی۔'' اس نے اپنے شولڈر بیگ سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالا اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

''بتاؤ تو بھلا...... یہ کیا ہے؟'' اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔

''کوئی بٹن جیسی چیز لگ رہی ہے۔'' ارسل نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک...... یہ بٹن ہی ہے۔ لیکن یہ کوئی عام بٹن نہیں ہے۔ جانتے ہو کس کا ہے؟''

''اسی نواب زادے کا ہوگا جب ہی تم نے اس قدر سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ تو دھات کا معمولی سا بٹن ہے۔ لنڈا بازار میں اس جیسے پانچ روپے کے دس مل جائیں گے۔'' ارسل نے جلے دل سے کہا۔

''تم نے ٹھیک کہا۔ یہ اسی دشمنِ جاں کا ہے اور اس کی قدر و قیمت صرف میں جانتی ہوں۔ اس پر ان کی اسٹیٹ کا مخصوص مونوگرام بنا ہوا ہے۔''

''تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ اس نے تمہاری کسی سروس سے خوش ہو کر غالباً ٹپ کے طور پر دیا ہوگا۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''نہیں...... یہ مجھے قسمت سے ملا ہے۔ پشاور میں ہمارے آفس کی افتتاحی تقریب تھی۔ میں بہت مصروف تھی، جلدی جلدی میں اس کے قریب سے گزرتے ہوئے، نہ جانے کس طرح میرے بال اس کے کوٹ میں لگے بٹنوں میں الجھ گئے اور ایسے الجھے کہ آسانی سے نکلے نہیں۔ میں نے بھی کوشش کی اور اس نے بھی...... لیکن بال نہیں نکل سکے۔ تو میں نے زور سے جھٹکا دے کر بالوں کو نکالنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں میرے بہت سارے بالوں کے ساتھ ساتھ...... اس کے کوٹ سے یہ بٹن بھی نکل گیا۔ میں تو اس کے اس قدر قریب ہونے سے پہلے ہی حواس باختہ ہو رہی تھی۔ پھر یہ بٹن اس کے کوٹ سے نکل گیا تو میں اور بھی بوکھلا گئی۔ میں نے سوری کہا تو وہ آہستہ سے ہنسا اور بولا۔

''پوچھا جو میں نے بدلی سے چاند نکلتا ہے کس طرح

زلفوں کو اس نے زور سے جھٹکا دیا، کہ یوں

آج تو آپ نے براہِ راست دل کو نشانہ بنایا ہے۔ یہ لیجیے...... ہمارا یہ دل آپ کے حوالے ہوا'' یہ کہہ کر اس نے یہ بٹن میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اب تم ہی بتاؤ ارسل! میں اسے بٹن کیسے سمجھوں؟ اس نے تو دل کہہ کر دیا ہے۔'' وہ خواب انگیز لہجے میں بول رہی تھی اور ارسل کا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ کافی دیر تک دونوں خاموش کیفیات میں مبتلا رہے پھر اچانک اسے ہی کچھ ہوش آیا۔

''ارسل! پلیز میرا یہ کام کردو...... ایک گولڈ کا بریسلیٹ مجھے بنوا دو...... جس کے بیچ میں یہ بٹن جڑا ہوا ہو۔'' اس نے التجا کی۔

''وہاٹ! پاگل ہوگئی ہو...... ایک معمولی سا بٹن گولڈ میں لگوا رہی ہو۔'' وہ چلایا۔

"پلیز ارسل! یہ میرے لیے دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے۔ میں اسے بریسلیٹ کی شکل میں ہر وقت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہوں۔ میرے پاس بالکل وقت نہیں۔ ورنہ میں تمہیں بالکل زحمت نہ دیتی...... پلیز، پلیز۔" اس نے ایک لفافے میں بٹن ڈالتے ہوئے زبردستی وہ لفافہ ارسل کے ہاتھ میں دے دیا۔ ارسل کو اس لفافے میں کچھ نوٹوں کی جھلک بھی نظر آئی تھی پھر اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتا، وہ دیر کا کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

ارسل بلتے ہوئے دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔

اگلے پندرہ بیس دنوں میں اس نے ایسا ہی بریسلیٹ بنوا کر اس کے بھیجے ہوئے پتے پر کوریئر کے ذریعے بھیج دیا۔

ایک مرتبہ پھر وہ اسکائپ پر آگئی۔ کلائی پر پہنا ہوا بریسلیٹ اس کو دکھاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرتی رہی اور پھر ان کے درمیان رابطے میں ایک لمبا وقفہ آگیا۔ یہ وقفہ بڑھتا چلا گیا۔ دن، مہینے، یہاں تک کہ سال گزر گیا۔ نہ وہ اسکائپ پر کبھی نظر آئی۔ نہ کوئی ای میل کی۔ فون نمبر اس کا ارسل کے پاس تھا ہی نہیں۔ ارسل نے کافی تلاش کے بعد اس کی این جی او کے دفاتر اور ہیڈ کوارٹر کا پتا لگایا۔ وہاں فون کیے مگر اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ نہ جانے کہاں گم ہوگئی تھی۔ اس نے جو دنیا بسائی تھی اس میں شاید حسنات کے علاوہ کسی اور کی گنجائش تھی ہی نہیں۔ یقیناً اس کے ساتھ وہ بہت خوش ہو شاید شادی بھی کر لی ہو، خاموشی سے...... یہ سوچ کر اس کے دل میں کچھ ٹوٹ سا گیا۔ اس نے خود اپنے آپ کو ملامت کی۔

"جب اسے میری اتنی سی بھی پروا نہیں ہے تو میں کیوں اس قدر بے چین ہوں۔ بھاڑ میں جائے وہ...... اور اس کا حسنات۔ میں کیوں اس کے بارے میں سوچوں......" اس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو کام میں مصروف کر لیا۔

☆☆☆

گھنا جنگل رات کی تاریکی میں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ آج موسم ابر آلود ہونے کے سبب تاریکی اور گہری ہوگئی تھی اور درختوں سے گزرنے والی سنسناتی ہوا، ایک وحشت ناک شور بپا کر رہی تھی۔ ایسے ماحول میں وہ سیاہ چست لباس والوں کے تین گروہ...... اس چوبی کاٹیج کی جانب آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے تین رخ سے اسے گھیرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ تازہ ترین ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ جدید ٹیکنالوجی کے مختلف آلات سے بھی لیس تھے۔

فوج کے خفیہ ونگ سے تعلق رکھنے والے یہ کمانڈوز اعلیٰ تربیت یافتہ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جدید ترین ٹیکنالوجی پر مشتمل حفاظتی حصار کو کس طرح توڑ کر اپنے ٹارگٹ پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے حملے، لڑائی اور دشمن کو زیر کرنے کی بہترین حکمتِ عملی ترتیب دی تھی۔

اس وقت وہ سب زمین سے چمٹ کر اپنی اپنی جگہوں پر دبکے ہوئے تھے۔ انہیں اپنے کمانڈر کی ہدایت کا انتظار تھا۔ شدید سردی بھی ان کے ارادوں کو جنبش نہیں دے پائی تھی۔ تھوڑے ہی لمحوں میں ان کے کانوں میں لگے ہوئے ہیڈ فونز پر زندگی جاگی...... اور ان سب کو یہ پیغام موصول ہوا۔ "ہیلو! جیمرز نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ تمام مواصلاتی رابطے منقطع...... اندھیرے میں جسم کی حرارت کے ذریعے کسی کی موجودگی کا پتا چلانے والے آلات بیکار ہو چکے ہیں۔ تینوں گروپس کے کمانڈرز کے لیے احکامات ہیں کہ وہ پانچ منٹ کے اندر اندر اپنے ٹارگٹ کے قریب ترین پہنچ جائیں۔"

پانچ منٹ بعد ہی اگلا حکم آیا اور انہوں نے کھڑکیوں کی درازوں اور دروازوں کے نیچے جھریوں سے بے ہوش کر دینے والی گیس کاٹیج میں داخل کی۔ ایک سے تیس تک گنتی کرنے کے بعد وہ دروازے توڑتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔

چوبی کاٹیج چار کمروں پر مشتمل تھی۔ ایک اضافی حصہ کچن اور باتھ رومز پر مشتمل تھا۔ دو کمروں میں کچھ لوگ موجود تھے جو سو رہے تھے اور گیس کے سبب ان کی نیند بے ہوشی میں بدل چکی تھی۔ پورے کاٹیج اور ایک ایک کمرے کی تلاشی لی گئی لیکن چند بے ہوش لوگوں کے سوا وہاں کوئی اور نہیں تھا۔

اب انہیں کسی خاص چیز کی تلاش تھی جو انہیں اشارہ دے سکتی کہ یہاں آس پاس کچھ مشکوک ہے۔ کیونکہ محض اتنی سی جگہ پر قبضہ کرنے کے لیے اس قدر مارا ماری کرنا، کچھ جواز نہیں بنتا تھا۔

"ایک ایک دیوار...... کونا...... چھت اور فرش ایک ایک انچ چیک کر ڈالو...... کہیں نہ کہیں کچھ ضرور ملے گا۔" سب کے کانوں پر لگے ہیڈ فونز پر ان کے کمانڈر کی آواز گونجی۔

"یہاں کہیں خفیہ کیمرے ضرور لگے ہوں گے جن کی مدد سے ہمیں کہیں دیکھا جا رہا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بے خبری میں مارے جائیں۔" ایک جوان نے اپنے ساتھی سے سرگوشی میں کہا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایمائے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اسی اثنا میں دیوار گیر الماری میں موجود ایک خفیہ بٹن دریافت ہوا۔ سب ہوشیار ہو گئے۔ بٹن دبایا گیا تو الماری کے اندرونی جانب ایک دروازہ آہستہ سے سلائڈ ہو کر ایک جانب ہو گیا۔ وہ سب پوزیشنز لے کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ شاید دروازے سے کسی کے باہر آنے کے خطرے کے پیشِ نظر...... کچھ لمحے انتظار کے بعد انہوں نے قدم بڑھائے۔ دروازے سے اندر جھانکا تو حیران کن منظر ان کا منتظر تھا۔

بڑا سا ایک ہال تھا جو ورکشاپ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت کا سبب وہ چھوٹے چھوٹے جہاز تھے جنہیں آج کی دنیا ''ڈرون'' کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن بہرحال اس دور افتادہ جگہ پر اس طرح کیموفلاج کر کے چھپائے گئے یہ ڈرونز...... ظاہر ہے کہ کسی خاص مقصد کے لیے ہی رکھے گئے ہوں گے اور یہ مقصد ہمارے ہاں تباہی پھیلانے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

''ان کو کنٹرول کرنے کے لیے یہیں کہیں کنٹرول روم بھی ہو گا۔ اسے بھی تلاش کرو...... کوئیک......'' کمانڈر نے کاشن دیا۔

جلدی ہی انہیں وہ کنٹرول روم بھی مل گیا۔ اس چھوٹے سے زیرِ زمین کمرے میں تین چار کمپیوٹرز، کچھ جوائے اسٹک اور کچھ اضافی پینلز کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

''اوکے! اب جلدی اپنا کام ختم کرو۔ ٹائم آدھے گھنٹے سے کم رکھنا ہے۔'' کمانڈر کے احکامات ان کے ہیڈ فونز میں گونجے اور پھر وہ کمانڈر اِدھر اُدھر کچھ ضروری کالیں کرتا رہا اور اس کے ساتھیوں نے اپنا کام ختم کر لیا۔

☆☆☆

دور دور تک پھیلے صحرا میں سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔ کہیں کہیں کیکر کے درختوں سے گزرنے والے گرم ہوا کے جھونکے ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کر کے ریگستان کی وسعتوں میں کہیں گم ہو جاتے۔ چھوٹی بڑی خاردار جھاڑیاں ریتیلے ٹیلوں کی گود میں بیٹھے سرمئی خرگوش لگ رہے تھے۔

ایسے ماحول میں اس خانقاہ کے اندر نیم تاریکی اور روح کے اندر تک اترتی ایک خوشگوار خنکی کا احساس بڑا روح افزا تھا۔ نزدیکی چھوٹے شہر میں قدیم عمارتوں کا ایک بڑا سلسلہ تھا۔ وہ وہاں اپنے کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ دن بھر ان قدیم عمارتوں کو چھانتا رہتا۔ جہاں آبادی کیڑے مکوڑوں کی طرح ان کی قدیمی شان و شوکت کو کھاتی چلی جا رہی تھی۔ گلیاں، جو کبھی اینٹوں سے پختہ رہی ہوں گی، اب دھول اڑا رہی تھیں اور ان میں انسانوں کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے چوپائے اور چرچوں کر کے چلنے والی گاڑیوں کا شور، کوڑے کے ڈھیر، گندے پانی کے بہتے دھارے...... چیخ پکار، شور ہنگامہ۔

اس دن وہ ان سب چیزوں سے بیزار سکون کی تلاش میں اس مختصر سی مسجد میں جا بیٹھا جہاں نسبتاً خاموشی اور سکون تھا، اس کے اندر جو بے سکونی اور بے قراری ہر لمحہ اسے توڑتی رہتی تھی، باہر کے ناپسندیدہ ہنگامے نے اس کی شدت کو اور بڑھا دیا تھا۔

''بہت بے سکون ہو۔'' ایک مدھم سی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ وہ گدڑی پوش اس نیم تاریک ماحول کا حصہ لگ رہا تھا۔ ارسل نے ایک نگاہ ڈالی اور دوبارہ اپنے اندر ڈوب گیا۔

''وہ اب نہیں ملے گی...... جستجو بیکار ہے۔'' فقیر نے صدا بلند کی تو وہ چونک گیا۔ اٹھ کر فقیر کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

''اگر اسے نہیں ملنا...... تو مجھے صبر کیوں نہیں آتا۔'' اس کے لہجے میں نمی تھی۔

''صبر! مانگتا رہ اس اوپر والے سے۔ کبھی نہ کبھی آ ہی جائے گا صبر بھی۔'' فقیر نے صدا لگائی اور اٹھ کر باہر کی طرف چل دیا۔ وہ وہیں بیٹھا اپنے آپ میں گم ہو گیا۔ شہر سے دور ویرانے میں یہ خانقاہ اور مسجد اپنے خاموش اور پاکیزہ ماحول کے سبب اسے بہت سکون دے رہی تھی۔

کسی بڑے آدمی نے اس شہر کی قدیم اور متروک حویلی کو خریدا تھا۔ گزرے وقتوں میں وہ بھی بڑی شان و شوکت والی رہی ہو گی جس کے آثار اب بھی اس میں نظر آتے تھے۔ ارسل کو یہی پروجیکٹ ملا تھا کہ اس حویلی کو جدید سہولتوں کے ساتھ آراستہ کرنے کے باوجود...... اس کی پرانی ہیئت اور شان و شوکت بھی بحال کر دی جائے۔ وہ اپنے عملے کے ساتھ تندہی سے اس کام میں لگا ہوا تھا اور ان کی شب و روز محنت کے سبب اب اس کے بہترین خدوخال اُبھرنا شروع ہو چکے تھے۔

اس دن بھی وہ سب کام پر لگے ہوئے تھے کہ دو لینڈ کروزر وہاں آ کر رکیں۔ اس حویلی کا مالک، ایک معروف سیاست داں، اپنے چند دوسرے سیاست داں دوستوں کے ساتھ پورے پروٹوکول کے ساتھ آیا تھا۔ ارسل نے باہر آ کر ان کا استقبال کیا۔

''بابا! اب تو اس کھنڈر کی کچھ شکل نکل آئی ہے۔ لگ رہا ہے کہ یہ رہنے کے لیے ایک اچھی حویلی بن جائے گی۔'' سیاست داں نے باہر سے ہی سرسری سا جائزہ لیتے ہوئے

اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”جی سر! بس فنشنگ کا کام شروع کروا دیا ہے۔ آیئے اندر تشریف لایئے۔“ ارسل نے ان سب کو اندر سے حویلی کا دورہ کروایا اور اس کے کام کی انہوں نے تعریف کی۔

”سائیں! کام بہت اچھا ہے۔ حویلی پرانی ہونے کے باوجود بالکل نئی لگ رہی ہے۔ آپ کا کام ادھر ختم ہو جائے تو ان لوگوں کو میری طرف بھیج دو۔ مجھے لگتا ہے کہ میری حویلی کو بھی یہ لوگ...... میری مرضی کے مطابق بنا دیں گے۔ان کے ساتھ آئے ہوئے ایک دوسرے سیاست داں نے اپنے میزبان سے فرمائش کی۔

”حاضر سائیں! تم نے سنا بابا! ابھی ادھر سے کام ختم ہو جائے تو تم کو خاقان شاہ جی کی حویلی پر کام کرنا ہے۔“ اس نے ارسل کو حکم دیا۔

”جی سر!“ ارسل نے آمادگی ظاہر کر دی۔ ویسے بھی یہاں صرف چند دنوں کا کام اور باقی رہ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک ہیبت ناک، کان پھاڑ دینے والا دھما کا تھا اور پھر دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ جنگل کا اندرونی حصہ تھا جہاں ایک چوبی کاٹیج بنا ہوا تھا اور ان پے در پے دھماکوں نے اس کے پرخچے اڑا دیے تھے اور اب اس جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔

حویلی اور اطراف سے لوگ اس طرف دوڑ پڑے تھے۔حویلی کی جانب سے گھوڑوں پر ہتھیار بند لوگوں کی ایک بڑی تعداد فوری طور پر وہاں پہنچ گئی تھی۔ لوگوں نے کوششیں کیں کہ قریبی جھرنوں سے پانی لا کر اس آگ پر ڈالیں اور بجھانے کی کوشش کریں لیکن اس میں اتنی شدت تھی کہ یہ کوشش کامیاب ہونے کا موہوم سا امکان بھی نہیں تھا لہٰذا اسے ترک کر دیا گیا۔ سب دور کھڑے اسے جلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ خدشہ تھا کہ کہیں جنگل میں ہی آگ نہ لگ جائے۔

”خان جی! شہباز صاحب کو خبر کروں؟“ رستم نے سیلائٹ فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”اسے خبر ہے۔“ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں بھاری ٹرکوں کی آواز سنائی دی۔ رستم کو وادی کی چوکی والے محافظوں نے اطلاع دی کہ فوج کے کئی ٹرک وادی میں داخل ہو رہے ہیں۔ اسی دوران ایک ہیلی کاپٹر بھی فضا میں پرواز کرتا ہوا آیا اور ایک چکر لگا کر واپس چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹرک اس جگہ پہنچ گئے۔

زبان یارِ من

میاں میر ٹیلی وژن کے ایک چینل پر خوب صورت خواتین کو حیدر آبادی زبان میں اعلان کرتے یا خبریں سناتے، سنتے تو ان کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ لوگاں دکاناں بند کر کے بھاگتے بیٹھے یا سائنس داناں بولتے رہتے برتناں دھونا دیماغ کے لیے اچھا ہوتا جیسے جملے سن سن کر ان کا اشتیاق بڑھتا رہا۔ آخر کار وہ لکھنؤ سے ٹکٹ کٹا کر سیدھے حیدر آباد دکن جا پہنچے۔ وہاں کے چار مینار کا انہوں نے بہت ذکر سنا ہوا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آئے اور ایک راہ گیر سے پوچھا۔ ”قبلہ! کیا یہ سڑک چار مینار جاتی ہے؟“ اس نے ہاؤ کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میاں میر کچھ نہ سمجھے، الجھ گئے۔ انہوں نے وہی سوال کئی راہ چلتے لوگوں سے پوچھا۔ ہر شخص ہاؤ کہتا اور لپک کر آگے نکل جاتا۔ وہ پریشان رہ جاتے۔

ڈیڑھ دو فرلانگ کے بعد انہیں ایک سوٹ بوٹ والا شخص نظر آیا۔ میاں نے للچا کر اس سے وہی سوال کیا۔

”جی ہاں! یہ سڑک چار مینار جاتی ہے۔“ اس نے شائستگی سے جواب دے کر ان کا دل خوش کر دیا۔

”میں بیسیوں لوگوں سے پوچھ چکا مگر ہر ایک ہاؤ کہہ کر ٹالتا رہا۔ یہ کیا معما ہے؟“ میاں نے اس مرد شریف سے پوچھا۔

”جتنے جاہل اور ان پڑھ لوگ ہیں وہ ہاں کے بجائے ہاؤ کہتے ہیں۔ ہم لوگاں پردیسیوں کو پریشان نہیں کرتے۔“

”واللہ! آپ نے طبیعت خوش کر دی۔ اس کا مطلب ہوا کہ آپ پڑھے لکھے ہیں!“ میاں میر کھل اٹھے۔

”ہاؤ!“ جواب بے ساختہ تھا۔

کراچی سے عروج کا تجزیہ

جوانوں نے اتر اتر کر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ کمانڈوز کے دو تین گروپ جائے وقوع کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ افسروں نے خاقان شاہ سے ملاقات کی اور وہاں سے تمام لوگوں کو واپس جانے کا حکم دیا۔ اب وہ علاقہ مکمل طور پر فوج

کے حوالے تھا۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ حویلی کے باغ میں پیڑوں کے سائے لمبے ہورہے تھے۔ شہباز چند دوسرے فوجی افسران کے ساتھ شام کی چائے پر مدعو تھے۔

''شاہ جی! انہوں نے پھر آپ سے رابطہ تو نہیں کیا؟'' ایک نے پوچھا۔

''آیا تھا ایک فون...... کہہ رہا تھا ابھی معرکہ تم نے جیت لیا ہے لیکن ہم بھی یہیں ہیں تم بھی یہیں ہو......اب ہم براہِ راست فوج سے اپنے معاملات طے کریں گے۔ اب تمہاری اتنی حیثیت نہیں رہی کہ ہم تم سے بات کریں۔ اس لیے فی الحال خدا حافظ۔ پھر ملیں گے۔''

''چلو، خس کم جہاں پاک...... بے فکر ہو جاؤ خان!'' کرنل شہباز نے خوش ہو کر کہا لیکن خاقان شاہ کے چہرے پر ایک گمبھیر سی خاموشی طاری تھی۔

''کیا بات ہے؟ اب بھی کوئی فکر کی بات ہے کیا؟'' کرنل نے پوچھا۔

''ہم م م م...... پہلے یہ سارا علاقہ میرا تھا۔ بلاشرکت غیرے...... پوری وادی میری جاگیر تھی۔ پہلے ان منحوسوں نے اپنی نحوست کے پنجے ادھر گاڑے...... ان کی وجہ سے فوج کو ادھر آنا پڑا......اب میرے ہاتھ میں تو نہیں رہا نہ میرا علاقہ۔''

''علاقہ تو تمہارا ہی ہے۔ فوج تو ان جیسے بدمعاشوں سے تمہیں تحفظ دینے کے لیے یہاں آئی ہے۔ اگر فوج یہاں سے چلی گئی تو وہ پھر آجائیں گے، تم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔''

''ہم م م م......'' وہ خاموشی سے ان کو دیکھتے رہے۔

پھر سورج غروب ہونے لگا تھا تو وہ سب چائے پی کر وہاں سے رخصت ہوگئے۔

''رستم! حسنات کدھر ہے؟'' انہوں نے بیٹے کے متعلق استفسار کیا۔

''جی خان جی! وہ اسلام آباد گئے ہیں۔ وہی اپنی این جی او کے کام کے سلسلے میں۔ میں نے چار گارڈ ان کے ساتھ کردیے ہیں۔'' رستم نے اطلاع دی۔

''اب اتنی سیکیورٹی کی ضرورت نہیں...... وہ خبیث تو جہنم رسید ہوگئے۔ جن کی وجہ سے خطرہ تھا۔ یہ کن فضول کاموں میں لگ گیا ہے۔ اس کو بولو، اگلے الیکشن میں اس کو کھڑا کرنے والا ہوں میں...... اس کی تیاری کرے، یہاں آنے کے بعد چار سال ضائع کردیے ہیں اس نے۔ یہ کیا این جی او ہے؟ کیا فائدہ ہے اس کا؟ وقت ضائع کرنے کے بجائے، کچھ کام کرے...... الیکشن کی تیاری کرے، سمجھاؤ اس کو۔''

''جی خان جی...... وہ حویلی کے کام کے لیے آپ نے جس کمپنی کو بلوایا تھا، اس کے لوگ آگئے ہیں۔ حویلی کا نقشہ بنوا کر میں نے انہیں دے دیا ہے۔ آپ نے کچھ خاص کام کروانا ہے تو حکم کریں۔'' رستم نے اطلاع دی۔

''صرف ایک کام...... مہمان خانہ گیٹ کے پاس بنواؤ...... اور ادھر کا مہمان خانہ بیچ کی دیوار توڑ کر حویلی میں شامل کرواؤ۔''

''جی خان جی!''

☆☆☆

حویلی کے وسیع و عریض کھلے حصے میں داخلی بڑے گیٹ سے ہٹ کر تین چھولداریاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں فولڈنگ پلنگ، کرسیاں اور ٹیبل لگے ہوئے تھے۔

وہ تینوں مختصر سی ٹیبل پر حویلی کا نقشہ بچھائے، اس میں ہونے والے تعمیراتی کام کی تفصیلات طے کررہے تھے پھر نئے تعمیر ہونے والے مہمان خانے کا نقشہ سامنے آگیا۔

''یار! یہ تو مکمل ہوگیا ہے۔ کل سے ہم ڈی مارکیشن کر کے کھدائی شروع کروادیتے ہیں۔'' ارسل نے کہا۔

''ٹھیک ہے سر! لیبر کل بلوالی ہے میں نے...... صبح صبح ڈی مارکیشن کروا کے...... کام شروع کروادوں گا۔'' اس کے جونیئر ساتھی نے جواب دیا۔

پھر وہ کام سمیٹ کر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اس کے تھکے ہوئے ساتھی تو فوراً ہی نیند کی وادیوں میں اُتر گئے۔ لیکن وہ خود ایک عجب سی بے چینی میں مبتلا تھا۔ اس بے چینی نے اس کی نیند اڑا رکھی تھی۔ کچھ دیر کروٹیں بدل بدل کر جب وہ بیزار ہوگیا تو اٹھ کھڑا ہوا اور چھولداری سے باہر نکل آیا۔

چاندنی رات میں دور حویلی کے دیوار و در اسرار میں لپٹے نظر آرہے تھے۔ چاروں طرف پھیلا لق و دق ویرانہ رات کے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ حویلی کا بڑا داخلی دروازہ بند تھا، اس کے بھاری گیٹ کے دوسری جانب حفاظتی عملہ موجود ہوگا لیکن اندر سے ان کی موجودگی کا کوئی ثبوت نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ ٹہلتا ہوا اس حصے پر چلا رہا جہاں نئے مہمان خانے کی تعمیر ہونا تھی۔ بڑا عجیب احساس اس کو گھیر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے پیروں کے نیچے...... زندگی ہلکورے لے رہی ہے۔ وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود وہاں ٹہلتا رہا کبھی نادیدہ خوف اسے چھوتا...... اور کبھی کسی مہیب گڑھے میں گرنے کا ڈر اسے چونکا دیتا۔ آخر تھک کر وہ واپس اپنے فولڈنگ پلنگ پر جا کر لیٹ گیا اور پتا نہیں کب اسے نیند آگئی۔

اگلے دن وہاں کام شروع ہو گیا۔ کھدائی جاری تھی۔ مزدوروں کے کدال پھاوڑے چلنے کی آوازیں آرہی تھیں سپروائزر ان کے ساتھ مصروف تھے۔ ارسل صبح سے وہیں موجود تھا۔ دوپہر میں لنچ کے بعد وہ سب تو دوبارہ کام پر چلے گئے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گیا اور شاید آنکھ بھی لگ گئی۔ غنودگی کی کیفیت میں اسے محسوس ہوا کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ آنکھیں کھولیں تو اس کا سپروائزر حواس باختہ چہرے کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔

''سر! اٹھیے...... جلدی چلیے...... آپ کو کچھ دکھانا ہے۔''

وہ بغیر کوئی سوال کیے اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ کھدائی کے مقام پر مٹی کے ڈھیر پر مزدور جمع تھے۔ اور کھودے ہوئے گڑھے میں جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر سب نے ہٹ کر اسے آنے کے لیے راستہ دیا۔

''کیا ہوا سرور؟'' اس نے اپنے سپروائزر سے پوچھا۔

''سر! اندر ایک انسانی ڈھانچا ہے۔''

''کیا؟ انسانی ڈھانچا؟ کہاں ہے؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

سپروائزر نے انگلی سے گڑھے کی جانب اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ کر غور سے اندر دیکھنے لگا۔ وہاں کچھ ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔

''یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ انسانی ڈھانچا ہے؟ ہو سکتا ہے کسی جانور کی ہڈیاں ہوں۔'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں صیب! ہم کو پہچان ہے۔ یہ انسان کی...... بلکہ کسی عورت کی ہڈیاں ہیں۔'' ایک مزدور نے جواب دیا۔

''اوہ! اچھا دیکھو، احتیاط سے زمین کھودو۔ نہ جانے بے چاری کون ہے۔ اس کی ہڈیوں کو پورے احترام سے کسی قبرستان میں دفن کروا دیتے ہیں۔'' ارسل نے بھاری سے لہجے میں کہا اور وہاں سے ہٹ کر ایک جگہ کھڑا ہو کر مزدوروں کو احتیاط سے کھدائی کرتے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر میں مزدور گڑھے سے باہر نکل آئے۔

سپروائزر نے اشارے سے ارسل کو بلایا اور گڑھے میں دیکھنے کا اشارہ کیا۔ ہڈیوں پر سے مٹی ہٹا دی گئی تھی اور ایک مکمل انسانی پنجر نظر آرہا تھا۔ اس نے گہری نظروں سے اس پنجر کا جائزہ لیا اور پھر اچانک چونک اٹھا۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا اور پھر تیزی سے گڑھے میں اتر گیا۔

پنجر کے سیدھے ہاتھ کی ہڈی میں...... کوئی چوڑی یا کنگن نظر آرہا تھا۔ اس نے جھک کر وہ کنگن دیکھنا چاہا۔ چھوا ہی تھا کہ وہ اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ لرزا اور آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ وہ بار بار سر جھٹک جھٹک کر اس کنگن کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہر مرتبہ اسے وہی نظر آرہا تھا جس کو وہ کسی صورت دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک بریسلیٹ تھا جس کے وسط میں کوئی نگینہ نہیں...... بلکہ ایک بٹن نظر آرہا تھا اور اس بٹن پر ایک مخصوص مونوگرام تھا جسے وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ کیونکہ یہ بریسلیٹ خود اسی نے بنوا کر اس بدنصیب کو بھجوایا تھا جو نہ جانے کب سے اس...... بے نام و نشان قبر میں دفن تھی۔

وہ کنگن ہاتھ میں لیے...... آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو جھٹک جھٹک کر گرانے کی کوشش میں بری طرح لرز رہا تھا۔ اسے پکارے جانے کی آوازیں سنائی تو دے رہی تھیں لیکن وہ وہاں سے اٹھنے میں اپنے آپ کو بے بس پا رہا تھا۔

پھر نہ جانے کس نے اسے کس طرح گڑھے سے نکال کر چھولداری میں لگے پلنگ پر لٹایا۔ وہ بڑی دیر تک خاموش لیٹا اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اپنے بکھرتے وجود کو سنبھالنے میں اسے کافی وقت لگا لیکن آخر کار ہمت اور حوصلہ جمع کر کے...... وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ واپس کھدائی والی جگہ پر پہنچا۔ اس ڈھانچے والی جگہ کو چھوڑ کر مزدور اب دوسری جگہ کھدائی کر رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر سپروائزر اس کے پاس آیا۔

''سر! اب کیا حال ہے آپ کا؟ کچھ بہتر محسوس کر رہے ہیں آپ؟'' ارسل نے اثبات میں سر ہلایا اور اداس نظروں سے گڑھے میں نظر آنے والی ہڈیوں کو دیکھتا رہا۔

''سر! وہ شہروز خان کہہ رہا تھا کہ اس ڈھانچے کی کھوپڑی میں گولی کا سوراخ ہے۔ اسے گولی ماری گئی ہے۔'' سرور نے اطلاع دی تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''گولی ماری گئی ہے؟'' وہ زیر لب شاید اپنے آپ سے ہی سوال کر رہا تھا لیکن سرور نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

اس نے مٹی میں لتھڑا ہوا وہ کنگن اس کے سامنے ٹیبل پر پٹخ دیا۔

''پہچانتے ہو اسے؟''

''یہ...... یہ کیا ہے؟''

''میں جانتا تھا...... تم یہی کہو گے...... اس کنگن اور کنگن والی...... دونوں کو پہچاننے سے صاف انکار کر دو گے۔ اس میں جڑے بٹن کو غور سے دیکھو اور پھر میرے

سوال کا جواب دو۔'' ارسل کے لہجے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔

اس نے ٹیبل پر پڑے اس کنگن کو غور سے دیکھا۔ پھر ارسل کی طرف دیکھا اور خاموش ہوگیا۔

''دیکھو حسنات خان! میں جانتا ہوں۔ تمہارے جیسے لوگوں کا یہ مشغلہ ہے۔ تمہاری حویلیوں میں اس جیسے نہ جانے کتنے مظلوم دفن ہوں گے۔ لیکن اس کو تم نے کیوں مارا؟ یہ تو تمہاری محبت میں ساری دنیا چھوڑ کر...... تمہارے پاس آگئی تھی۔ سب کچھ لٹا دیا تھا اس نے تمہارے اوپر...... پھر کیوں؟''

حسنات یہ سن کر بھی خاموش بیٹھا رہا۔ وہ کچھ نہیں بولا تو ارسل کا لہجہ بدل گیا۔

''ہم م م م...... تو تم نہیں بتاؤ گے۔ حسنات! تمہیں بتانا ہی پڑے گا ورنہ تمہیں بہت بھاری پڑ جائے گا۔ میں اس کی ساری کہانی جانتا ہوں اور یہ ساری کہانی میں نے محفوظ کر کے کہیں بھجوا دی ہے۔ مع ان تصویری ثبوتوں کے اب اگر تم یہ سوچ رہے کہ مجھے بھی گولی مار کر اسی حویلی میں کہیں زمین میں گاڑ دو گے۔ اس کی طرح...... تو میں تمہیں بتا دوں کہ تم ایسا نہیں کرسکو گے۔ وہ کہانی عام ہوجائے گی۔ سارے اخبار اور سب ٹی وی چینلز اس کی بریکنگ نیوز چلائیں گے اور میرا خیال ہے کہ مشہور سیاسی رہنما خاقان شاہ کا بیٹا...... جو مستقبل میں وزیر بننے کے خواب دیکھ رہا ہے اوندھے منہ گر جائے گا، کیا یہ منظور ہے؟''

''یہ سب دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ کیا ہوا تھا۔'' حسنات نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں۔ اس نے میرے لیے سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ میں اس کے جذبات کی قدر کرتا تھا جس حد تک ممکن تھا، میں نے اس کے ساتھ احترام اور محبت کا رشتہ نبھانے کی کوشش کی۔''

''یعنی...... تم یہ کہنا چاہ رہے ہو...... کہ تم نے بھی اس سے محبت کرنے کی کوشش کی...... اور اس محبت میں اسے گولی ماردی۔''

''میں نے اسے گولی نہیں ماری...... اس نے خود اپنے آپ کو گولی مار کر...... خودکشی کرلی۔'' حسنات نے وضاحت کی۔

''اور اس حد تک جانے پر تو اسے تم نے ہی مجبور کیا نا۔'' ارسل نے دانت جما کر کہا۔

''میں کیا کرتا یار! وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی اور تم جانتے ہو...... ہمارے یہاں خاندان میں شادیاں ہوتی ہیں۔ بابا جان کی بھتیجی سے میری نسبت بچپن سے طے تھی۔ وہ بھی آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی اور میرے باپ سے کہیں زیادہ دولت مند اور اونچے باپ کی اولاد ہے۔

''پھر بھی...... پھر بھی میں نے بابا سے بات کی اس کے بارے میں...... اس کے جواب میں انہوں نے اگلے ہفتے ہی میری شادی اپنی بھتیجی سے طے کردی...... میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔'' حسنات نے بےبسی سے کہا۔

''کیا وہ یہ بات جانتی تھی؟'' ارسل نے سوال کیا۔

''ہاں، ہر طرف خبر پھیلی...... تو اسے بھی معلوم ہوگیا۔ اس نے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ میں نے بےبسی کا اظہار کیا تو وہ چراغ پا ہوگئی اور بضد ہوئی کہ وہ خود حویلی کے اندر جاکر...... سب کو بتائے گی کہ کس طرح میری خاطر وہ برباد ہوئی ہے اور اب اس کا حق بنتا ہے کہ میں اس سے شادی کروں۔ وہ زور زور سے چیخ چلا رہی تھی۔ حویلی کے اندر جانے کی ضد کررہی تھی۔ میں اسے روکنے کی کوشش کررہا تھا پھر...... پھر نہ جانے کیسے...... میرا...... میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ اس کا ہسٹریا توڑنے کے لیے...... میں نے اسے تھپڑ مار دیا۔'' حسنات نے اٹک اٹک کر بتایا۔

''تم نے...... اسے تھپڑ مار دیا؟ پھر وہ خاموش ہوگئی؟'' ارسل نے پوچھا۔

ہاں...... اس نے حیران آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اپنے گال پر ہاتھ رکھے دوڑتی ہوئی مہمان خانے کے کمرے کے اندر چلی گئی۔ دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ میں بھی دوڑ کر گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ اسے پکارا۔ لیکن میری پکار کے جواب میں...... اندر سے گولی چلنے کی آواز آئی...... اور خاموشی چھا گئی۔''

ان کے درمیان بھی لمحوں تک سناٹا چھا گیا۔

''بابا کا کہنا تھا کہ ہمارا سیاسی کیریئر...... اس اسکینڈل سے داغ دار ہوجائے گا۔ لہٰذا انہوں نے رستم کو حکم دیا کہ اس کی لاش کو رات کی خاموشی اور اندھیرے میں...... حویلی کے کسی گوشے میں دفن کردو۔ یہ مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ رستم نے اسے کہاں دفن کروایا تھا۔'' حسنات کے لہجے میں اداسی تھی۔

''میں نے اسے کتنا سمجھایا تھا، کتنا سمجھایا...... کہ سراب کے پیچھے مت دوڑو...... لیکن وہ تمہارے لیے دیوانی تھی ایک نہیں سنی...... اور تمہارے پیچھے دوڑتے دوڑتے گڑھے میں گری اور دفن ہوگئی۔ مجھے بھی زندہ درگور کرگئی۔'' ارسل خاموشی سے مڑا اور بھاری بھاری قدم رکھتا صرف حسنات کے کمرے سے نہیں بلکہ اس حویلی سے بھی باہر نکل گیا۔

تجدیدِ عہد

تنویر ریاض

وعدوں کے بغیر زندگی کا حسن ماند پڑ جاتا ہے... ان وعدوں کو نبھانا ہی اصل مقصدِ حیات ہوتا ہے... محاذِ جنگ پر آنکھوں ہی آنکھوں میں وعدوں کی زنجیر میں جکڑ جانے والے دوستوں کی حیرت انگیز کہانی... انتظار کی طویل گھڑیوں کے بعد وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے... وقت نے وعدوں کی راسیں ان کے ہاتھوں میں دے دی تھیں۔

جنگوں کی ہولناکی اور تباہی کے تغیرات..... انسانی ذہن اور جسم کو جکڑ دینے والی تحریر

میں اپنے خوابوں میں دس ہزار مرتبہ اس پرانی کچی سڑک پر چلتا رہا ہوں۔ جب میں ٹیکساس میں بنیادی تربیت لے رہا تھا۔ اس کے بعد افغانستان میں جہاں مجھے زیرِ تعمیر عمارتوں، بنکرز، پلوں اور ہیلی پیڈز پر محافظ کے فرائض انجام دینا پڑ رہے تھے۔ میں گھنٹوں یہ خواب دیکھتا رہتا تھا کہ اپنے گھر کو جانے والی اس بند سڑک پر چل رہا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں کبھی وہاں نہیں پہنچ سکوں گا۔ میرے والدین وہاں سے جا چکے ہیں اور ہمارا پرانا کاٹیج بھی نہیں

رہا۔ میرے ایک دوست نے کچھ عرصہ قبل مجھے ایک پوسٹ کارڈ بھیجا تھا جس میں لکھا تھا کہ شرپسندوں نے اسے آگ لگادی ہے اور اب وہاں کچھ نہیں بچا۔

میرے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ کیبن برسوں سے بند پڑا ہوا تھا۔ جنگل کی کٹائی کے دوران ہونے والے ایک جھگڑے کے بعد انہوں نے میرے باپ کو قتل کر دیا اور ہم شہر چلے گئے۔ ماں کا کہنا تھا کہ وہ اپنی ملازمت کی جگہ سے قریب رہنا چاہتی ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایسی جگہ رہنا برداشت کرسکتی تھی جہاں ہم سب خطرے میں تھے۔ میرے باپ کی موت کے بعد سب کچھ بدل گیا تھا۔ سب سے زیادہ ماں کی زندگی میں تبدیلی آئی تھی۔

اور اب جبکہ بالآخر میں کئی برسوں کے بعد اپنے گھر کی طرف جارہا تھا تو مجھے لگا کہ میرا خواب پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ اردگرد پھیلے ہوئے جنگلات بہت خوب صورت تھے۔ بالکل کسی نظم کی طرح مربوط اور گہرے لیکن پرانی سڑک میرے تصور سے مختلف تھی۔ یہ دراصل شمالی مشی گن کے جنگل کے درمیان سے گزرنے والا راستہ تھا جس پر شکاری اپنے شکار کا پیچھا کیا کرتے تھے۔

میں نے ہمیشہ اپنے خوابوں میں اس سڑک پر تنہا سفر کیا تھا لیکن اب میں اکیلا نہیں تھا۔ کوئی میرا پیچھا کررہا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ میرے اعصاب پر ابھی تک جنگ کی گھبراہٹ سوار ہے۔ میں کئی مرتبہ مشکل حالات سے گزر چکا تھا لیکن یہ کوئی وسوسہ نہیں تھا۔ کوئی یقیناً میرا پیچھا کررہا تھا۔ اگر میں ان جنگلوں میں نہ پلا بڑھا ہوتا تو شاید اسے نظرانداز کردیتا کیونکہ مجھے اس کی کبھی کبھی جھلک نظر آرہی تھی۔ اس کے پاس رائفل بھی تھی۔

میری چھٹی حس نے مجھے رکنے پر مجبور کردیا پھر مجھ سے بیس گز کے فاصلے پر ایک بڑا سا سیاہ رنگ کا کتا نظر آیا گوکہ اندھیرا ہوجانے سے وہ مجھے صاف نظر نہیں آرہا تھا لیکن وہ مجھے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔

''رنگو۔'' میں نے بے اختیار اسے پکارا۔

اس نے غرانا بند کردیا اور مجھے تجسس بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

''رنگو، میرے دوست، یہاں آؤ۔''

وہ میری طرف دم ہلاتے ہوئے بڑھنے لگا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میں بھی مرچکا ہوں اور یہ میرا بھوت ہے جو زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوکر اس سڑک پر جارہا ہے کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ میرا رنگو نہیں ہوسکتا۔ اسے تو ایک وحشی ریچھ نے حملہ کرکے چیر پھاڑ دیا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف دس سال تھی اور میں نے خود اسے اپنے ہاتھوں سے زمین میں دفن کیا تھا۔

میرے عقب میں آنے والا لڑکا بھی بھوت نہیں تھا۔ اس کے بال سرخ، کان لمبے اور چہرے پر چھائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ فلالین کی قمیص کا رنگ اڑ چکا تھا اور اس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی رائفل تھی۔

''یہ کسی کی ذاتی زمین ہے مسٹر۔ تم یہاں کیا کررہے ہو؟''

''کچھ نہیں، بس یہاں سے گزر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''کبھی میں یہاں رہا کرتا تھا۔''

''میں تمہیں نہیں جانتا۔''

''یہ کئی سال پرانی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اس وقت یہاں نہیں آئے تھے۔''

''میں دیکھنے میں جیسا نظر آتا ہوں، اس سے کہیں زیادہ بڑا ہوں، تم کون ہو؟''

''میرا نام جیک لارنس ہے۔ اگلے موڑ کے قریب ہمارا کاٹیج ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا اور پلا بڑھا۔''

''اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔ یہ سڑک آگے جاکر بند ہوجاتی ہے۔''

''کچھ عرصہ قبل اس مکان کو آگ لگادی گئی تھی۔ اس وقت میں یہاں نہیں تھا۔ صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کچھ باقی بچا ہے یا نہیں۔''

''ہاں، ایک چمنی اب بھی باقی ہے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا۔ ''اور پورچ کا کچھ حصہ۔''

''اگر میں ایک نظر دیکھ لوں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔''

''یہ میری زمین نہیں ہے۔ میں صرف آنے جانے والوں پر نظر رکھتا ہوں۔ ویسے بھی یہاں کوئی نہیں آتا، چلو رنگو۔''

کتا اس کے پیچھے دم ہلاتا ہوا چل دیا۔ میں نے اسے آواز دے کر پوچھا۔ ''تم نے اپنے کتے کا نام رنگو کیوں رکھا؟''

''یہ نام ایک درخت پر کھدا ہوا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تمہارے پرانے گھر کے ساتھ۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے ہی رنگو کو دفن کرنے کے بعد یہ نام کندہ کیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس تباہ شدہ کاٹیج کو

دیکھنے کے بعد اپنی کرائے کی جیپ میں بیٹھ کر واپس آجاؤں گا اور شہر کے کسی موٹیل میں قیام کروں گا۔ لیکن سورج غروب ہو رہا تھا اور اتنے عرصے تک اس جگہ کو خوابوں میں دیکھنے کے بعد اتنی جلدی جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے وہیں عارضی کیمپ لگانے کا فیصلہ کیا۔ پورچ میں کچھ لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ جلائی اور رات گزارنے بیٹھ گیا گو کہ وہاں کا فرش ناہموار تھا لیکن میں ٹرکوں، ٹینکوں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر لیٹ چکا تھا۔ سپاہی کسی بھی جگہ سو سکتے ہیں۔

کچھ دیر بعد مجھے نیند آگئی اور میں نے ایک بار پھر وہی خواب دیکھا کہ اس بند سڑک پر جا رہا ہوں اور میرا رنگو اچانک ہی میرے سامنے آجاتا ہے اور دُم ہلا کر مجھے ہیلو کہتا ہے۔ گویا میں اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور میں اپنی عادت کے مطابق چوکنا ہو کر بیٹھ گیا لیکن یہ جگہ بالکل محفوظ تھی۔ ان پہاڑیوں میں طالبان تھے اور نہ ہی قبائلی جہادی مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میرے جلے ہوئے کاٹیج کے اردگرد کی جگہ بالکل صاف تھی اور میں اتنا ہی محفوظ تھا جتنا کہ کسی چرچ میں ہو سکتا ہوں۔

بہرحال میں نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس صاف قطعۂ زمین سے ستر گز کے فاصلے پر جنگل شروع ہوتا تھا۔ اس میں داخل ہوتے ہی پہلے جھاڑیاں آتی ہیں پھر بید مجنوں، چنار اور صنوبر کے درخت شروع ہو جاتے تھے۔ اس جنگل کا اختتام مشی گن جھیل پر ہوتا تھا۔ یہ نظارہ میرے خواب سے بھی زیادہ دلکش تھا۔ لیکن نوجوانی میں یہ سب چیزیں مجھے پسند نہیں تھیں۔ شاید اس کی وجہ غربت ہو۔ میں نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ڈیڈی لکڑہارے تھے جبکہ ماں شہر میں کام کرتی تھی لیکن وہ دونوں یہاں خوش تھے۔ اس کی وجہ میں کبھی نہیں سمجھ سکا۔ غریب لکڑہارے اپنا خون پسینا بہا کر بہت کم اُجرت حاصل کرتے تھے تاکہ اپنے کنبے کا پیٹ پال سکیں۔ ان کی کوئی خواہشات نہیں تھیں اور نہ ہی ان میں اتنی سمجھ بوجھ تھی کہ وہ بہتر زندگی گزارنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کر سکیں لیکن میں اٹھارہ سال کی عمر میں بہت کچھ جان گیا تھا۔

مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے پیسے کی کتنی اہمیت ہے۔ پیسوں سے صرف چیزیں ہی نہیں لوگوں کو بھی خریدا جا سکتا ہے۔ کیونکہ لکڑہارے کے گھر پیدا ہوا تھا اس لیے میں نے بہت سی چیزوں میں مہارت حاصل کر لی۔ میں شکار کر سکتا تھا۔ میرا نشانہ بہت اچھا تھا اور تیز دوڑ سکتا تھا۔ میں نے بارہ سال کی عمر سے ہی تعمیراتی کام شروع کر دیا تھا۔

امریکی فوج میں بھرتی ہو رہی تھی اور وہ کم سے کم اُجرت سے کہیں زیادہ تنخواہ دے رہے تھے لہٰذا میں نے اپنے بہترین دوست کے ساتھ فوج میں شمولیت اختیار کر لی اور ہماری کمپنی کو تعمیرِ نو کے لیے افغانستان بھیج دیا گیا جہاں مقامی لوگ سب کچھ برباد کرنے پر تُلے ہوئے تھے اور ہم بھی ان کے حملوں کی زد میں تھے۔ اس کے باوجود میں کام کرتا رہا جس میں مجھے مہارت حاصل تھی۔

میں نے ان تلخ یادوں کو ذہن سے جھٹکا اور آگے بڑھنے لگا۔ اچانک میری نظر صنوبر کے درخت پر لگے ہوئے ایک کاغذی بورڈ پر گئی جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''ذاتی ملکیت۔ مخل ہونا منع ہے۔ ایس اے وی لینڈ مینجمنٹ۔''

چالیس گز کے فاصلے پر ایسا ہی ایک دوسرا بورڈ نظر آیا پھر میں نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اس طرح کے کئی بورڈ دیکھے جو میرے لیے حیران کن تھے کیونکہ یہ جگہ ڈیڈی کو ان کے دادا سے ورثے میں ملی تھی گو کہ مجھے اپنی ماں کی وصیت کے بارے میں مکمل معلومات نہیں تھیں لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ یہ اب میری ملکیت تھی۔ میں نے کیمپ فائر کی راکھ سمیٹی اور جیپ میں بیٹھ کر شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔

میرے بچپن میں وال ہالا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن اب یہ کافی پھیل گیا ہے اور یہاں دولت کی ریل پیل نظر آتی ہے۔ نوجوان تاجر ہر چیز خرید رہے ہیں۔ جھیل کو جانے والی سڑک کے کنارے بڑے بڑے چین اسٹور کھل گئے ہیں جبکہ پہاڑیوں پر مکانات تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ نوجوانی کے دنوں میں آخری بار اولڈ ٹاؤن میں ٹھہرا تھا۔ یہ ایک تاریخی علاقہ ہے جس کے کچھ حصے اصلی شکل میں ہیں اور کچھ کو جدید بنا دیا گیا ہے۔ اس کے مرکز میں جیوری ان واقع ہے جو پہلی جنگِ عظیم میں بنایا گیا تھا۔ یہاں پولیس والے، وکیل، صحافی اور گپ شپ کے شوقین مقامی لوگ نظر آتے ہیں۔

میں کونے کی میز پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں دروازے پر اور پشت دیوار کی جانب تھی۔ مجھے بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ یہاں کوئی جان پہچان والا مل جائے گا لیکن ایک آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''جیک!''

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ خاکی وردی میں ملبوس ایک طویل قامت عورت مجھے گھور رہی تھی۔ اس کی شکل جانی پہچانی تھی لیکن میں اسے پہچان نہیں پایا۔

''تم جیک لارنس ہی ہو نا؟''

''ہاں میڈم۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ......''

''مارگریٹ کازمارک۔'' اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اچھا تو تم چیف کازمارک کی بیوی ہو۔'' میں نے کہا۔

''دراصل اب میں ہی چیف کازمارک ہوں۔'' اس نے اپنے بلاؤز پر لگے ہوئے بیج کی طرف اشارہ کیا۔ والٹ کو گزشتہ برس دل کا دورہ پڑا تھا۔ لہٰذا سٹی کونسل نے کہا کہ میں اس کے عہدے کی بقیہ مدت پوری کروں۔ تمہیں یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔ جب تم اپنی ماں کی تدفین پر نہیں آئے تو میں نے سوچا کہ شاید تم بھی......''

''مر گیا ہوں۔''

''جو شخص اپنی ماں کی تدفین پر نہ آئے، اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔''

''ہم محاذِ جنگ پر تھے اور اس کام کو مکمل کیے بغیر میں واپس نہیں آسکتا تھا۔''

''میں نے سنا ہے کہ تم فوج سے نکل جانے کے بعد بھی جنگ میں مصروف رہے۔ کوئی شخص ایسا کیوں کرے گا؟''

''اس کام کے سی آئی اے، فوج سے پانچ گنا زیادہ تنخواہ دیتی ہے۔''

''تمہارا دوست برائن بیلر چند ماہ قبل گھر آیا ہے اور اپنی بہن کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بہت برے حال میں ہے۔''

میں نے نظریں چرالیں اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''کیا تمہیں معلوم نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس واقعے کے بعد میں اور وہ الگ ہو گئے تھے۔ پھر میں نے اسے نہیں دیکھا۔''

''کیونکہ تم نے اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بس ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

''برائن ایک مہینے تک اسپتال میں رہا پھر اسے گھر بھیج دیا گیا۔'' وہ مجھ پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''نرسوں کا کہنا تھا کہ بعض اوقات وہ سوتے میں بڑبڑاتا تھا اور تمہاری خوشامد کرتا تھا کہ اسے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ وہ تمہیں بددعا بھی دیا کرتا تھا۔ آخر وہاں ہوا کیا تھا جیک؟''

''وہاں ہر روز کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا۔ اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ پشاور سے پیرس تک آدھی دنیا اس جنگ کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ شاید تم نے بھی ٹی وی پر یہ مناظر دیکھے ہوں۔''

''برائن کا کہنا ہے کہ تم کسی تندخو وار لارڈ کے لیے کام کر رہے تھے؟''

''اس کا نام عمر خالد تھا اور وہ میرا دوست ہی نہیں بلکہ ہمارا اتحادی بھی تھا۔ اب جبکہ وہ اپنے خاندان سمیت قتل ہو چکا ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں درست لہجہ اختیار کرنا چاہیے۔''

''وہاں جو کچھ ہوا، اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے صرف برائن کا افسوس ہے۔ میں تمہارے لیے بھی فکرمند تھی۔ اب تم کس کے لیے کام کر رہے ہو؟''

''میں ملازمت تلاش کر رہا ہوں لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''اس قصبے میں بہت سے نئے لوگ آگئے ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جن پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں تم بھی تو ان میں شامل نہیں ہو۔''

''میں نیا چہرہ نہیں ہوں۔''

''لیکن اب یہاں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ پھر کیا لینے آئے ہو؟''

''اپنے آبائی شہر میں آنے سے کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے؟''

''تم بچپن سے لے کر آج تک خود ایک مسئلہ رہے ہو جیک۔ یہاں کرائے کے سپاہیوں کے لیے کوئی کام نہیں ہے۔ تم وہیں واپس چلے جاؤ یا کوئی نیا محاذ تلاش کرلو جو یہاں سے بہت دور ہو۔''

''میں صرف وقت گزارنے آیا ہوں چیف۔''

''یہ جان کر خوشی ہوئی کیونکہ یہاں امن قائم رکھنا میرے فرائض میں شامل ہے۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اپنا قیام مختصر کرو اور کسی ایسی جگہ جانے کی کوشش مت کرنا جہاں تمہارا استقبال کرنے والا کوئی نہ ہو۔''

''میں گزشتہ شب اپنے والدین کا مکان دیکھنے گیا تھا۔ وہاں ایسے پوسٹر لگے ہوئے ہیں جن میں وہاں سے گزرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔''

''اس سے تو یہی لگتا ہے کہ تم مداخلتِ بے جا کے مرتکب ہوئے ہو۔''

''وہ میری اپنی جائداد ہے۔''

"حالیہ دنوں میں بہت سی جائدادوں کی خرید و فروخت ہوئی ہے اور زیادہ تر سودے تمہارے دوست ڈینی فروگیٹ کے ذریعے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ جانتا ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس سے پوچھ لوں گا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

☆☆☆

سب سے پہلے برائن سے ملنا ضروری تھا تاکہ اپنی پوزیشن کی وضاحت کرسکوں۔ چیف نے بتایا تھا کہ وہ اپنی بہن پیگی کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ وال ہالا نیوز میں رپورٹر تھی۔ اس کا دفتر زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے اس کا نام استقبالیہ ڈیسک کی ڈائریکٹری میں دیکھا اور تیسری منزل پر چلا گیا۔ وہ ایک بڑے ہال میں آدھے درجن ساتھیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور اپنی جگہ پر ساکت ہو گئی۔ جیسے میری آمد اس کے لیے حیرانی کا باعث ہو۔

میں اس کے محسوسات سمجھ سکتا تھا۔ دس سال میں وہ بہت بدل گئی تھی۔ میں نے اسے اس وقت دیکھا تھا جب وہ کالج کی تعلیم مکمل کر کے فارغ ہوئی تھی۔ اس کی فلالین کی قمیص کا رنگ اڑ چکا تھا اور جینز گھٹنوں پر سے پھٹی ہوئی تھی لیکن اب وہ بزنس سوٹ اور سیاہ شوز پہنے ہوئے تھی اور دیکھنے میں ٹھنڈی، اہل اور کامیاب نظر آرہی تھی۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے اٹھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے ہیلو کہتا۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پر جڑ دیا۔ اس کی ضرب اتنی شدید تھی کہ میرا سر آدھا گھوم گیا اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔

سب لوگ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم اپنی شکل لے کر یہاں آسکتے ہو۔"

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے دوسرا تھپڑ مارتی۔ میں نے کہا۔ "ایک تھپڑ تو میں نے برداشت کرلیا لیکن دوسرے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیا ہم کہیں کسی جگہ تنہائی میں بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں؟"

اس نے کچھ کہے بغیر تائید میں سر ہلا دیا۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کررہی ہے۔ وہ میرے ساتھ ایک چھوٹے سے اسنیک بار میں گئی۔ وہاں چھوٹی چھوٹی میزیں لگی ہوئی تھیں لیکن ہم میں سے کوئی نہیں بیٹھا۔ اس نے اپنا چہرہ میری طرف کیا تو میں نے کہا۔

"برائن کیسا ہے؟"

"تم اس کی پروا کیوں کررہے ہو؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ اس کا خیال رکھو گے اور وہ زخموں سے چور یہاں آیا، اب تم کئی مہینوں بعد منہ اٹھائے چلے آرہے ہو۔ تمہارے جسم پر کوئی خراش تک نہیں ہے۔ میرے بھائی کے ساتھ کیا ہوا تھا جیک؟"

"برائن کیا کہتا ہے؟"

"اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا لیکن وہ نیند میں بڑبڑاتا رہتا ہے اور تم سے التجا کرتا ہے کہ اسے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ یہ کہاں کا واقعہ ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس بارے میں سوچنے لگا۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تم اسے چھوڑ کر آگئے تھے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "یہ سچ ہے۔"

"مرنے کے لیے؟"

"مجھے اس سے بات کرنا ہے۔"

"وہ کئی مہینوں سے گھر میں ہے لیکن تم نے ایک مرتبہ بھی اس کی خیریت نہیں پوچھی۔"

"میں کمپنی کے کام سے سفر میں تھا۔"

"کیا یہ کام تمہارے بہترین دوست کی خیریت دریافت کرنے سے زیادہ اہم تھا؟"

"ایسی بات نہیں ہے پیگی۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ تم سے نہیں ملنا چاہتا۔"

"اسے ناراض ہونے کا حق ہے۔ ایک دفعہ ہم بات کرلیں۔ اس کے بعد بھی اگر وہ مجھے مکا مارنا چاہے......"

"مکا مارنا چاہے۔" وہ طنز کرتے ہوئے بولی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو جیک، تمہیں واقعی اس سے بات کرلینا چاہیے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اس کے پاس لے چلتی ہوں۔"

اس کا گھر اسپتال کی شکل میں تبدیل ہوگیا تھا، لیونگ روم میں ایک بیڈ کے علاوہ کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ وہاں صرف طبی آلات، آکسیجن سلنڈر، سانس لینے کی مشین اور چند دوسری مشینیں تھیں جن کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ سارا اہتمام صرف ایک مریض کے لیے تھا۔ برائن بیلر ایک موٹر سے چلنے والی وہیل چیئر میں بندھا ہوا تھا اور اس کے جسم کے گرد تار لپٹے ہوئے تھے۔ وہ تقریباً آدھا رہ گیا تھا۔ اس کے جسم کا بایاں حصہ الگ ہوچکا تھا۔ اور یہ

نقصان اتنا سنگین تھا کہ مجھے اس کے زندہ رہنے پر حیرت ہو رہی تھی، اگر اسے زندہ کہا جائے۔

اس کا بایاں بازو اور ٹانگ ضائع ہو چکی تھی اور چہرے کا بایاں حصہ بُری طرح مسخ ہو چکا تھا۔ جبڑے کے کونے میں ایک شفاف ٹیوب لٹکی ہوئی تھی۔ اس کا منڈا ہوا سر سکڑ کر اس کے لڑکپن کے جیسا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ موت کے دہانے پر بیٹھا ہے اور اگلی دھڑکن کے ساتھ ہی وہ قبر کی تاریکی میں اُتر جائے گا۔

میں نے اپنی زندگی میں کئی دہشت ناک مناظر دیکھے ہیں اور خود بھی ان کا حصہ رہا ہوں لیکن برائن کو اس حال میں دیکھنا میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں نے ایک جھرجھری لی اور پیچھے ہٹنے لگا لیکن اس نے آنکھ کے اشارے سے مجھے روک لیا۔ اس حالت میں بھی اس کی آنکھوں میں زندگی کی حرارت موجود تھی۔ میں نے ان میں غصے کی جھلک دیکھی۔ میں بے اختیار ہو کر اس کی طرف بڑھا۔

''اسے ہاتھ مت لگانا۔'' پیگی نے تیز آواز میں کہا تو میں اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔

''یہ کچھ بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ اس کا اعصابی نظام برائے نام کام کر رہا ہے۔ اگر تم زخمی بھی کر دو تو اسے پتا نہیں چلے گا۔ بس یہ اپنے دائیں ہاتھ کو معمولی سی حرکت دے سکتا ہے۔''

''کیا یہ بات کر سکتا ہے؟''

''میں تھوڑا بہت بول سکتا ہوں۔'' برائن نے کھانستے ہوئے کہا۔ ''بس مجھ سے گانے کے لیے مت کہنا۔''

''اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' میں نے اس کی کرسی کے پاس جھکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تم گاتے ہو۔''

''مجھے وہ دن یاد ہیں جب میں سمجھتا تھا کہ ہم دوست ہیں۔ پھر کیا ہوا جیک؟ اگر میں نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔ تم اچانک ہی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے، اپنا وعدہ توڑ دیا۔''

''میں سمجھا کہ تم مر چکے ہو۔''

''نہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے میری آنکھیں دیکھی تھیں اور جانتے تھے کہ میں اس وقت تک زندہ تھا۔''

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ کہہ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ سچ تھا۔

''تم نے تو یہ دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ میں کس حال میں ہوں۔ اس کے بجائے تم ایک پاگل کتے کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے اور مجھے اس حال میں چھوڑ دیا۔''

میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے یہاں آ کر غلطی کی۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔''

''نہیں، جب تک ہم سب باتیں صاف نہیں کر لیتے۔ تم نے کیوں ہمیں دھوکا دیا۔ ایسا کیا ہو گیا تھا؟''

''ہم پر گھات لگا کر حملہ کیا گیا تھا۔ کیا تمہیں وہ یاد ہے؟''

''صرف اتنا یاد ہے کہ ایک دھماکا ہوا تھا پھر میں خندق میں گر گیا اور میری نظریں تمہیں ڈھونڈتی رہیں۔''

''میرے ٹرک کے نزدیک بھی ایک گولہ گرا تھا۔ ہم تینوں خندق میں چلے گئے لیکن دوسرا گولہ براہِ راست ہم پر آن کر گرا اور......''

میں لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو کر وہ منظر یاد کرنے لگا۔ میرے دوست کا آدھا دھڑ اڑ چکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں صدمہ اور خوف کی کیفیت دیکھی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس پر کیا گزری ہے پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ہماری نظریں ملیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا توقع کر رہا ہے۔ وہ جو ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی ایک بھائی کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔

برائن اب مجھے گھور رہا تھا۔ ''تم نے ایک جست لگائی۔ ٹرک میں سوار ہوئے اور ہمیں چھوڑ کر چل دیے۔''

''جہادی ٹرک کو نشانہ بنا رہے تھے۔ میں اسے سڑک پر لے گیا تاکہ وہ میرا تعاقب کریں یہ ترکیب کامیاب رہی اور وہ تم لوگوں کو چھوڑ کر میرے پیچھے چلے آئے۔''

''لیکن تم پھر بھی واپس نہیں آئے۔'' برائن نے کہا۔

''انہوں نے دس میل تک میرا پیچھا کیا۔ وہ پانچ آدمی ایک پک اپ میں سوار تھے اور اے کے رائفلوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔ میں ان کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور نہ ہی پلٹ کر فائر کر سکتا تھا۔ خالد کے کمپاؤنڈ سے ایک میل دور ایک تنگ موڑ پر انہوں نے مجھے گھیر لیا اور ہم سب پہاڑی سے نیچے گر گئے۔ میں خوش قسمت تھا کہ زندہ بچ گیا لیکن جہادی کپڑے کی گڑیوں کی طرح گہری کھائی میں گرتے چلے گئے۔ ٹرک میں بھی آگ لگ گئی تھی لہٰذا میں نے ایک ہتھیار اٹھایا اور خالد کے ٹھکانے کی طرف چل دیا۔'' یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی اور میں رونے لگا۔

''پھر کیا ہوا؟'' برائن نے پوچھا۔

''اس کے گھر پر حملہ ہو چکا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ایک درجن طالبان نے ایک دن پہلے اس کے گھر کو تباہ کر دیا تھا۔ بالآخر خالد نے ایک پن کھینچی اور سب کچھ ختم ہو گیا۔''

''اوہ میرے خدا۔'' برائن نے کہا۔

پیگی ہمیں اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے ہم سواحلی زبان بول رہے ہیں۔

''خالد کے گھر میں بوبی ٹریپ لگا ہوا تھا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''برائن اور میں نے اس کی تعمیر میں مدد دی تھی اور ہم نے ہی اسے نصب کیا تھا۔ اگر اسے غلط کمبی نیشن کے ساتھ کھولا جائے تو اس سے اعصابی گیس خارج ہوتی ہے اور پہلے سانس میں ہی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خالد، حملہ آور یہاں تک کہ کتے بھی مر گئے۔ پورے گھر میں گیس بھر گئی تھی۔''

''اور اس کے بچوں کا کیا ہوا؟'' پیگی نے پوچھا۔

''وہ اس کی گود میں تھے۔ وہ بھی ساتھ ہی چلے گئے۔''

''اس آدمی نے اپنے بچوں کو مار ڈالا؟''

''اگر وہ بچ بھی جاتے تو کیا ہوتا۔ دشمن ان کی گردنیں اڑا دیتے۔''

''یا انہیں کسی خندق میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔'' برائن نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے یونٹ میں فون کیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے بتایا کہ تمہارا علاج ہو رہا ہے اور مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ جب میں واپس آیا تو تم اسپتال جا چکے تھے۔ جانتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں اس صورت حال سے بہتر طور پر نمٹ سکتا تھا۔''

''اس بات کو کئی مہینے ہو گئے۔'' پیگی بولی۔

''انہوں نے مجھ سے خالد کی لاش فرانس لے جانے کے لیے کہا۔ اس کی فیملی وہاں جلاوطنی کی زندگی گزار رہی تھی۔ میں برائن کے پیچھے جانے کی خاطر انکار بھی کر سکتا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں بھی فرانس جانے میں خوش تھا۔''

''خوش؟'' پیگی حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''اپنے بہترین دوست کی موت دیکھ کر میں وہاں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ ورنہ میرا انجام بھی اس سے مختلف نہ ہوتا۔'' میں نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں خالد اور اس کے بچوں کی لاشیں لے کر فیملی کے پاس یورپ چلا گیا لیکن انہوں نے تدفین کرنے کے بجائے ان لاشوں کو سرد خانے میں رکھوا دیا تاکہ مناسب وقت آنے پر اپنے وطن میں جا کر سپردِ خاک کر سکیں۔ اس کے بعد میں وہیں رک گیا۔ میری اپنی حالت بہت خراب تھی۔ میں بیس منٹ سے زیادہ سو نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنے آپ کو اعتدال پر لانے میں دو مہینے لگ گئے۔''

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ برائن کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ پیگی نے مجھے اشارہ کیا اور میں اس کے پیچھے چلتا ہوا کچن میں چلا گیا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو جیک؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنے دوست سے ملنے۔ یہ دیکھنے کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔'' مجھے اپنے الفاظ کھوکھلے لگ رہے تھے۔

''تمہیں بہت دیر ہو گئی۔ برائن شاید چھ منٹ، چھ مہینے یا چھ سال زندہ رہ سکے۔ ڈاکٹر اس بارے میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ دھماکے سے اس کا آدھا جسم ضائع ہو گیا لیکن تم نے جو کچھ کیا۔ وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ تم اسے مرنے کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ شاید وہ تمہیں معاف کر دے لیکن میں کبھی نہیں کروں گی۔''

''میں بھی خود کو معاف نہیں کر سکتا۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''میں کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔ اگر پیسوں کی ضرورت ہو......؟''

''پیسے؟'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''تم سمجھتے ہو کہ پیسوں سے اس کا مداوا ہو سکتا ہے۔ ہمیں تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ تم پیرس، کابل یا کہیں بھی چلے جاؤ لیکن ہمیں تنہا چھوڑ دو۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

''کیا؟''

''میں نہیں جا سکتا جب تک برائن خود مجھ سے نہ کہے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''برائن مجھ سے اس لیے ناراض نہیں کہ میں نے اسے دھوکا دیا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اسے اس حال میں زندہ کیوں چھوڑ دیا۔''

وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اُتر آیا۔ بالآخر وہ سمجھ گئی کہ میں وال ہالا کیوں آیا تھا تاکہ اپنے دوست سے کیا ہوا آخری وعدہ پورا کر سکوں اور اسے اس اذیت ناک زندگی سے نجات مل جائے۔ اگر وہ بھی چاہتا ہے۔

میں پیدل چلتا ہوا پرانے شہر آ گیا لیکن اپنی جیپ تک نہیں گیا۔ پہلے مجھے کچھ ذاتی کام نمٹانے تھے۔ میری نظر ایک ڈرگ اسٹور کے اوپر لگے ہوئے بورڈ پر گئی۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''ڈینیئل فروگیٹ اینڈ سنز اٹارنی ایٹ لانی'' فروگ نے کالج سے نکلتے ہی اپنے باپ کے ساتھ پریکٹس شروع کر دی تھی۔ مجھے یہ جان کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ وہ ابھی تک یہ دفتر سنبھالے ہوئے تھا۔

میں بیک وقت دو دو سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ سفید قمیص اور لال ٹائی لگائے کمرے کے وسط میں ایک پرانی سی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کرسی سے اٹھا اور بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔ ''اوہ جیک لارنس تم؟''

''ایک دوست سے مل کر خوشی ہو رہی ہے۔'' میں پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ اس شہر میں میرا کوئی دوست باقی ہے یا نہیں۔''

''کم از کم ایک تو ضرور ہے۔'' فروگ اپنی میز کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن نئے چہرے بھی دیکھنے کو ملیں گے۔''

''میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید تم بھی چلے گئے ہو گے کیونکہ تم ہمیشہ جانے کی بات کیا کرتے تھے؟''

''لیکن برائن اور تم نے مجھے پیچھے چھوڑ دیا اور دنیا دیکھنے چلے گئے۔ تمہارا سفر کیسا رہا؟''

''بہت کچھ دیکھ چکا ہوں۔ تم اپنی سناؤ۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ میری شادی ختم ہو گئی۔''

''نہیں، کیا ہوا تھا؟''

''کیرول مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے بارے میں آخری اطلاع یہ تھی کہ وہ تاؤس میں کسی یوگا انسٹرکٹر کے ساتھ رہ رہی ہے۔''

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔'' میں نے کہا۔

''ایسا ہوتا ہے۔ آج کل یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''تم پیرس چلے گئے تھے پھر واپس کیوں آ گئے؟''

''میرا وہاں دل نہیں لگا۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتی تھی اور میں باہر ٹہلنے نکل جاتا تھا پھر ایک رات میری آنکھ کھلی تو محسوس ہوا کہ کوئی بلا رہا ہے۔ مجھے گھر جانا چاہیے۔ اگر اب بھی میرا کوئی گھر ہے۔''

''وال ہالا ہمیشہ تمہارا......''

''میرا مطلب اپنے گھر سے ہے۔ میں وہاں گیا تھا لیکن وہاں ''داخل ہونا منع ہے'' کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔''

''چند ماہ قبل مجھے اس کی ایک اچھی پیشکش ہوئی تھی۔ تمہیں اس کی معقول قیمت مل گئی۔''

''میں نے تم سے یہ کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔''

''ہاں، تم نے کچھ نہیں کہا لیکن چار سال قبل تم نے مجھے مختار نامہ دیا تھا کہ میں تمہاری ماں کی جائداد کو سنبھال لوں کیونکہ میں نے تمہارے بارے میں ایک عرصے سے نہیں سنا اور یہ ایک اچھی پیشکش تھی۔ ہمیں مارکیٹ سے تین گنا زیادہ قیمت مل رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم خوش ہو گے کہ اس سے نجات مل گئی کیونکہ ایک زمانے میں تو تم وہاں جا بھی نہیں سکتے تھے۔''

اس کی یہ بات صحیح لیکن باقی غلط تھیں۔ جنگ کے دنوں میں میرا کئی لوگوں سے واسطہ پڑا تھا اور مجھے بھی یقین نہیں آیا کہ وہ سچ بول رہے ہیں اور مجھے اس کا پتا چل جاتا تھا۔ فروگ کی وضاحت سننے کے دوران ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میرا پرانا دوست جھوٹ بول رہا ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ کیوں؟

''وہ جگہ کس نے خریدی فروگ؟''

''شہر میں ایک نیا بندہ آیا ہے فل ساوارس۔ اس نے بفیلو کاؤنٹی میں گیم رینج کا انتظام سنبھال لیا ہے اور وہ اسے وسعت دینا چاہتا ہے تاکہ وہاں مزید جانور اور پرندے لائے جا سکیں۔ وہ کاؤنٹی کے اردگرد کافی زمینیں خرید رہا ہے۔ یہ ایک اچھی پیشکش تھی اور میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی۔''

''کتنی اچھی پیشکش تھی؟''

''اس وقت مجھے یاد نہیں لیکن یقیناً مارکیٹ کی قیمت سے......''

''ٹھیک ہے اگر اس نے اتنی زیادہ قیمت دی ہے تو منافع کے ساتھ واپس لوٹانے پر اسے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اسے دس فیصد منافع کی پیشکش کر کے وہ جگہ واپس لے لو۔''

''بہت دیر ہو چکی ہے جیک۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''ہم نے پہلے ہی ایک پیکیج تیار کر لیا تھا جو ایک ہولڈنگ کمپنی کو منتقل ہو چکا ہے۔''

''ہم سے کیا مراد ہے۔ تم اس کے ساتھ کام کر رہے ہو اور اس شخص نے یہ جگہ اپنے لیے نہیں خریدی۔ اپنے گیم رینج کو وسعت دینے کے لیے؟''

فروگ نے نظریں پھیر لیں۔ وہ وضاحت کرنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے جھوٹ بولنا نہیں آتا تھا۔ شاید اسے پریکٹس نہیں تھی۔

میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ ہم اچھے دوست تھے۔''

''ہم اب بھی اچھے دوست ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تم اس پورے عرصے میں واپس نہیں آئے اور توقع کرتے ہو......''

''کہ ہم اب بھی اچھے دوست ہیں۔'' میں نے اس

کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن رک گیا۔ ''ٹھیک ہے، میں اسے تمہارے لیے آسان بنا دیتا ہوں۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ ساوارس نے تمہیں کیا دیا۔ میں اس سودے سے مطمئن نہیں ہوں اور اپنی زمین واپس لینا چاہتا ہوں۔ اسے بتا دو کہ تم سے غلطی ہو گئی۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ اس سے کیا کہتے ہو لیکن میری زمین واپس دلا دو۔''

''دفع کرو جیک، تم نہیں سمجھتے۔ ساوارس ایسا شخص نہیں ہے جس سے میں یہ بات کہہ سکوں۔ اس کے پاس کچھ ایسے خطرناک لوگ ہیں جو اس کے لیے کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی زمینیں بیچنے سے ہچکچا رہے تھے لیکن ان لوگوں نے انہیں اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ تم اس بے کار چالیس ایکڑ زمین کے لیے اپنے آپ کو مشکل میں مت ڈالو۔ میں تمہارے لیے کوئی بہتر جگہ تلاش کرتا ہوں۔ جھیل کنارے ساحل پر یا......''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''فروگ! میں ایسی جگہوں پر گیا ہوں جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ میں جھونپڑوں اور پیرس کے ہوٹلوں میں رہا ہوں لیکن مجھے کہیں بھی نیند نہیں آئی۔ مجھے اپنی جگہ واپس چاہیے۔''

''جیک! میں یہ نہیں کر سکتا۔ میرا آدھے سے زیادہ کاروبار اس کے ساتھ ہے۔ میں اس کے مقابلے پر نہیں آسکتا۔''

''کیا تم اس سے ڈرتے ہو؟''

''ہاں، تم نہیں جانتے کہ وہ کس قسم کا شخص ہے۔''

''پھر تو مجھے خود ہی اس سے ملنا پڑے گا۔ میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں۔''

اس نے مجھے پتا سمجھا دیا اور دروازے تک چھوڑنے آیا۔ ''جیک پلیز! رہنے دو۔ میں کوئی راستہ تلاش کرتا ہوں۔''

''میں خود دیکھ لوں گا۔ مشکلات میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ کبھی ذاتی معاملہ نہیں رہا۔ بلکہ صرف ایک کاروبار تھا۔ ہم اب بھی دوست ہیں۔''

میں تیز رفتاری سے گاڑی بھگاتا ہوا بفیلو کاؤنٹی گیم رینج پہنچا۔ وہ تین منزلہ مکان ایک قلعہ کے مانند تھا۔ اس کے پورچ میں تقریباً ایک درجن لگژری گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے کرائے کی جیپ ان کے برابر کھڑی کی اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہ ایک کلب ہاؤس تھا جس کا رقبہ باسکٹ بال کورٹ جتنا تھا۔ ایک دیوار پر ساٹھ انچ اسکرین کے کئی ٹی وی لگے ہوئے تھے۔ اور ان پر بیس بال، فٹ بال، گھڑ دوڑ اور سوسر کے مقابلے چل رہے تھے۔ مرکزی ہال میں سگار کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ایک کونے میں رکھی ہوئی میز پر نصف درجن افراد پوکر کھیل رہے تھے۔ ان میں سے چند ایک نے مجھے سرسری طور پر دیکھا اور میرا جائزہ لینے لگے۔ میں نے انہیں پہچان لیا یہ کرائے کے بدمعاش تھے جو پیسوں کے عوض کسی کے لیے بھی لڑ سکتے تھے۔

''تمہیں کچھ چاہیے؟'' ایک داڑھی والے نے مجھ سے پوچھا۔

''میں فل ساوارس کو ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''مسٹر ساوارس کا دفتر آگے ہے۔ سیدھے چلے جاؤ لیکن اگر تم کام کی تلاش میں آئے ہو......''

میں نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی اور دروازے پر دستک دیے بغیر اس کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ اسے بالکل ہالی وڈ کے انداز میں سجایا گیا تھا۔ فرش اور دیواروں پر صنوبر کی لکڑی لگی ہوئی تھی اور دونوں دیواروں پر بڑے بڑے ریک میں قیمتی ہتھیار ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے، ساوارس اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے خاکی جیکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔

''تم یقیناً جیک لارنس ہو۔'' اس نے دس انچ کی ٹیبلیٹ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''میرے وکیل ڈین فروگیٹ نے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ وہ تمہارا بھی دوست ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ''اس نے مجھ سے التجا کی ہے کہ تمہاری مدد کروں اور یقین دلایا ہے کہ تم کوئی مشکل نہیں کھڑی کرو گے۔''

''بالکل نہیں، میں سودا کرنے آیا ہوں۔''

''تم مجھے کاروباری شخص نہیں لگتے بلکہ بے روزگار لگ رہے ہو۔''

''ہاں لیکن میں اس لیے یہاں نہیں آیا۔''

''فروگ نے مجھے بتایا ہے کہ اس جائداد کے بارے میں کوئی الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے خوش اسلوبی سے حل کر لیا جائے۔ اس میں کیا مسئلہ ہے؟''

''کچھ خاص نہیں۔ فروگ نے غلطی سے یہ زمین تمہارے ہاتھ فروخت کر دی۔ میں اسے واپس لینا چاہتا ہوں۔''

''میں نے اس کی معقول قیمت ادا کی تھی۔''

”میں دس فیصد منافع کے ساتھ واپس کرنے کے لیے تیار ہوں۔“
”تاکہ اسے تم تین گنا قیمت پر دوبارہ فروخت کرسکو۔“
”یہ زمین برائے فروخت نہیں ہے بلکہ کبھی نہیں تھی۔“
”میں نے وہ جگہ دیکھی ہے، وہ خالی زمین کا ٹکڑا ہے۔ تمہارے لیے وہ اتنی خاص کیسے ہوگئی؟“
”وہاں میرا اکتا دفن ہے۔“
”کیا تم مجھ سے مذاق کررہے ہو؟“
”اگر تم چاہو تو اس کی نشانی دکھا سکتا ہوں۔“
”اگر تم کوئی مشکل کھڑی کرنا چاہتے ہو تو صحیح جگہ پر آئے ہو۔ مجھے صرف ایک لفظ کہنے کی دیر ہے اور دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے میرے آدمی تمہیں اٹھا کر لے جائیں گے۔“
میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ میری نظر اس کی میز کے پیچھے لگے ہوئے کنگ سائز کمپیوٹر اسکرین پر گئی اور میں سمجھ گیا کہ یہ کیا ہے۔ اس نے مجھے اسکرین کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا تو فوراً ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اسے بند کردیا۔
”واؤ۔“ میں نے دفتر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ گیم ریج بھی کسی فراڈ اسکیم کا حصہ ہے۔“
”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“
”میں نے اسکرین پر ویل کاؤنٹی کا نقشہ دیکھا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ جھیل کے ساحل سے اوٹسیکو لائن تک اور اسے بلاکس میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں صرف تمہاری زمین نہیں بلکہ پوری کاؤنٹی آجاتی ہے۔“
”تم نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہو۔“
”اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے کام کی نوعیت ایسی ہے جس میں ہر روز مختلف نقشے دیکھتا اور بڑے غور سے دیکھتا ہوں کیونکہ معمولی سی غلطی کسی بڑے نقصان کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے اور جو کچھ میں نے تمہاری دیوار پر دیکھا اس سے تو یہی لگتا ہے کہ شاید تم اسی کاؤنٹی میں مار دیے جاؤ گے۔ ممکن ہے کہ میں ہی یہ کام کروں۔“
اب اس کی توجہ پوری طرح میری جانب تھی۔
”تمہارے نقشے پر زمین چھ سو ایکڑ کے ٹکڑوں میں تقسیم کی گئی ہے اور اس میں سے آدھے درجن حصے سرکاری زمین کے ہیں جسے نہ خریدا جاسکتا ہے اور نہ ہی فروخت کیا جاسکتا ہے۔“
اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا۔

”سوائے معدنی حقوق کے۔“ میں نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ ”جو ہمیشہ ٹکڑوں میں فروخت کیے جاتے ہیں اور تم یہی کچھ خرید رہے ہو۔ ان میں تیل کے کنوؤں کی کھدائی، سونے اور یورینیم کی کانیں اور خدا جانے کیا کچھ شامل ہے۔“
وہ حیرت سے مجھے دیکھتا رہا پھر کندھے اچکائے اور اپنی کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔
”فروگیٹ نے کہا تھا کہ تم بہت ہوشیار ہو۔ مجھے تمہاری بات سن لینی چاہیے۔ ٹھیک ہے تم نے اپنا نکتہ بیان کردیا۔ اب بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ کوئی ملازمت؟ میں اس کا بھی بندوبست کرسکتا ہوں، کتنی تنخواہ میں تمہارا گزارہ ہو جائے گا؟“
میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔
”تم میدان جنگ سے آئے ہو اور تمہاری حالت برابر میں بیٹھے ہوئے پوکر کے کھلاڑیوں جیسی ہے لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ مجھے پریشان کرسکو گے تو ایک بار پھر سوچ لو۔ تم جیسے لوگوں کو ہمیشہ پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے بھی تم جیسے آدمی کی ضرورت ہے۔“
”میں تو ایک تعمیراتی مزدور ہوں۔ تمہارے کس کام آسکتا ہوں؟“
”میں جن لوگوں کے لیے کام کرتا ہوں۔ انہوں نے مجھے معدنی حقوق خریدنے کے لیے یہاں بھیجا ہے۔ زیادہ تر زمینوں کے مالک اپنے حقوق، زمینیں یا دونوں بیچنے پر تیار ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے تمام حقوق ایک پیکیج کی شکل میں دینے ہیں جبکہ کچھ مقامی لوگ اپنی زمینیں بیچنے پر تیار نہیں ہیں۔ اس سے پہلے کہ قیمتیں بڑھ جائیں۔ میں انہیں خریدنا چاہتا ہوں۔ اس لیے ہمیں ان لوگوں کو قابو کرنے کی ضرورت ہے۔ فروگیٹ نے مجھے بتایا ہے کہ تم اسی علاقے میں پلے بڑھے ہو اور مقامی لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو۔ ہمیں ان لوگوں کے لیے ایک مثال قائم کرنے کی ضرورت ہے۔“
اس نے میز پر سے کچھ کاغذات اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ان لوگوں کی فہرست ہے جنہوں نے اپنی زمینیں بیچنے سے انکار کردیا ہے۔ ان میں سے تم نے کسی ایک کو نشانہ بنانا ہے تاکہ دوسرے عبرت حاصل کرسکیں۔“
”تم انہیں کس قسم کی سزا دینا چاہتے ہو؟“
”اب تک ہم نے چھوٹے موٹے ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں۔ مثلاً کسی کے کھیت کو آگ لگادی، گاڑی کے بریک

فیل کردیے وغیرہ وغیرہ لیکن وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور مجھے جلد از جلد یہ کام کرنا ہے اگر ان میں سے کسی ایک کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تو باقی سب سیدھے ہو جائیں گے۔ مجھے امید نہیں کہ تم اپنے ہاتھ گندے کرو گے۔ صرف کوئی ایک نام بتاؤ۔ میرے لڑکے اسے دیکھ لیں گے۔''

''کیا تم واقعی سنجیدہ ہو۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی کو مروا بھی سکتے ہو۔ تمہیں اس سے کیا حاصل ہوگا؟''

''فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کوئی نہیں جانتا کہ زمین کے نیچے کیا ہے۔ مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ جن لوگوں نے مجھے یہ حقوق حاصل کرنے کے لیے بھیجا ہے جب میں یہ ان کے حوالے کروں گا تو ہمیں بہت سا پیسا ملے گا تمہارے تصور سے بھی کہیں زیادہ......''

میرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بولا۔ ''کیا میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟''

''کچھ ایسا ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں نے کبھی پیسوں کا خواب نہیں دیکھا۔ میرے خوابوں میں ہمیشہ وہ جگہ آتی ہے جو فروگ نے تمہارے ہاتھ فروخت کر دی۔ تم جو زمین خرید رہے ہو وہ گریٹ لیکس کے قلب میں ہے۔ ذرا سی غلطی سے چرنوبل یا لوکینال جیسا حادثہ ہو سکتا ہے۔ تم آدھے ملک کو زہر آلود کر دو گے۔ صرف پیسوں کے لیے۔''

''میرا خیال ہے کہ فروگ نے تمہارے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔'' وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس نے کہا تھا کہ تم بہت ہوشیار ہو۔''

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں سختی ابھر آئی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے جلد بازی میں کچھ زیادہ ہی بول دیا۔ اب اس کے ایک اشارے پر غنڈے کمرے میں آ سکتے تھے لیکن اس نے ان کا انتظار کرنے کے بجائے خود ہی میز کی دراز کھولی اور ہتھیار ٹٹولنے لگا۔ میں فوراً اس کی طرف لپکا اور دراز بند کر دی۔ اس کا ہاتھ اندر ہی پھنس گیا۔

اس نے چلانا شروع کیا ہی تھا کہ میں نے دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ لگ رہا تھا کہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔

''ایک لفظ زبان سے مت نکالنا۔ ورنہ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔'' اس نے سر ہلایا تو میں نے دراز کھول دی اور اس نے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا۔ وہ اپنی زخمی ہتھیلی کو سہلا رہا تھا۔ میں نے دراز سے اس کا ہتھیار نکال لیا۔ وہ ایک جرمن لوگر تھا۔ میں نے جیسے ہی اس کا چیمبر چیک کرنے کے لیے کھولا۔ وہ جام ہو گیا۔ اسی دوران ایک غنڈا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایم سولہ رائفل تھی۔

''اسے مار ڈالو۔'' ساواریس ہانپتے ہوئے بولا لیکن گن مین کو ہچکچاہٹ ہو رہی تھی کیونکہ اس کی رائفل آٹومیٹک تھی اور ساواریس بھی اس کی زد میں تھا اگر وہ فائر کرتا تو ہم دونوں ہی ختم ہو جاتے۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے سنگل فائر میں تبدیل کرتا، میں اپنا ریوالور کلیئر کر چکا تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ہی فائر کیا۔ میں نے اپنے کندھے پر ہتھوڑے کی ضرب محسوس کی اور فرش پر گر گیا۔ میں نے گھٹنوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی اور کامیاب ہو گیا۔

گن مین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں جب اس نے اپنے سینے سے خون بہتا ہوا دیکھا۔ گولی اس کے دل سے تین انچ نیچے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ سے رائفل گر گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر گیا۔ میں فوراً ہی میز کے پیچھے چھپ گیا کیونکہ دو مزید گن مین اندر داخل ہوئے اور بدحواسی میں فائرنگ کرنے لگے۔ ان کے پاس بھی آٹومیٹک رائفلیں تھیں ساواریس ان کی زد میں آ گیا اور نصف درجن گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ وہ پیچھے کی جانب لڑکھڑایا اور اس نے دیوار پر لگی اسکرین کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس کے وزن کی وجہ سے اسکرین اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور اس پر آن گری۔

میں میز کے پیچھے اوندھا پڑا ہوا تھا اور مجھے صرف ان دونوں کے ٹخنے نظر آ رہے تھے۔ میں نے وہیں سے نشانہ لے کر ان دونوں کو گرا دیا۔ پہلے شوٹر کو ختم کرنے کے لیے مجھے تین فائر کرنا پڑے لیکن دوسرا ایک میں ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ میرے کندھے میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے باوجود میں میز کے پیچھے اوندھا پڑا ہوا اگلے حملے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا پورا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا اور بلڈ پریشر تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ایک دو منٹ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔

میں نے راہداری میں کسی کے قدموں کی آواز سنی پھر دروازہ کھلا۔ میز کے نیچے سے جھانک کر دیکھا تو اس کے پاؤں نظر آئے۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ ریوالور میں کتنی گولیاں باقی ہیں۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ کم از کم ایک گولی تو ضرور ہو گی جسے میں اس کے ٹخنوں پر ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ تبھی اس نے میز کے نیچے جھانک کر دیکھا اور بولا۔ ''جیک؟''

''فروگ۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک اسپتال کے کمرے میں پایا۔ میری داہنی کلائی میں چاندی کی زنجیر تھی جسے بستر سے باندھ دیا گیا تھا۔

''کوئی بھی صحیح الدماغ شخص تمہاری کہانی پر یقین نہیں کرے گا۔'' چیف کا زمارک نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ میرے بستر کے ساتھ ہی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ''ساوارس اور اس کے ساتھیوں نے تم پر چالیس ایکڑ زمین کی خاطر حملہ کیا جبکہ جس کارپوریشن کے لیے وہ کام کر رہا تھا۔ وہ ہزاروں ایکڑ زمین کے حقوق حاصل کر چکی ہے۔ آخر اس چالیس ایکڑ زمین میں کیا خاص بات ہے؟''

''قیاس آرائی مت کرو چیف۔'' فروگ نے کہا پھر مجھ سے بولا۔ ''اس کی کسی بات کا جواب مت دینا۔''

''جس کارپوریشن کی تم بات کر رہی ہو چیف، اس پر پہلے ہی تین ریاستوں میں فرد جرم عائد کی جا چکی ہے جبکہ میرا موکل ایک جنگی ہیرو ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اسے آرام کرنے دو۔'' فروگ نے کہا۔

''اگر میرے بس میں ہوتا تو تم دونوں یہاں سے سیدھے جیل جاتے۔'' وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''تم خوش قسمت ہو جیک کہ یہ میرے دائرۂ اختیار میں نہیں۔ صحت یاب ہونے کے بعد تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔''

وہ جانے کے لیے مڑی پھر دروازے پر پہنچ کر رک گئی اور بولی۔ ''تمہیں اس بددیانت وکیل نے نہیں بلکہ ان بندوقوں نے بچایا ہے۔''

میں نے اپنی بھویں اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ''ہمیں وہاں سے ایک درجن ایم سولہ رائفلیں ملی ہیں جو ایک سال پہلے نیشنل گارڈ کے اسلحہ خانے سے چرائی گئی تھیں۔ ان میں وہ نایاب لوگر ریوالور بھی تھا جو کہ میوزیم میں نقب زنی کر کے چرایا گیا اور اس کے نتیجے میں ایک سیکیورٹی گارڈ کی موت واقع ہوئی۔ اس وقت تم افغانستان میں تھے۔ اس لیے تم پر کوئی الزام نہیں آ سکتا۔ مجھے تمہارے افسر کا بیان مل گیا ہے جس میں اس نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔ اس نے تمہاری بہت تعریف کی ہے اور چاہتا ہے کہ تم واپس آ جاؤ۔ میں بھی یہی کہوں گی کہ اس کی پیشکش قبول کر لو۔''

''مجھے کچھ نامکمل کام نمٹانے ہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

میں ایک بار پھر اسی بند سڑک پر جا رہا تھا لیکن اکیلا نہیں بلکہ برائن بھی میرے ساتھ اپنی وہیل چیئر پر چل رہا تھا۔ اسے میں پیگی کی وین میں یہاں تک لایا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں میں برائن سے کیا ہوا وعدہ پورا نہ کر دوں لیکن برائن نے اسے آمادہ کر لیا۔ اس جگہ پہنچ کر برائن نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''دنیا کو خدا حافظ کہنے کے لیے اس سے اچھی جگہ کوئی نہیں ہو سکتی۔''

''ہاں۔'' میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''میں برسوں سے اس جگہ کا خواب دیکھ رہا تھا اور اب میں اس خواب کو حقیقت بنانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں یہاں ایک نیا مکان بنانا چاہتا ہوں لیکن اس کے لیے پیسا چاہیے۔ لہٰذا مجھے کچھ عرصے کے لیے محاذ پر واپس جانا ہوگا اور تم یہاں رہ کر کام کی نگرانی کرو گے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو جیک؟ میں یہ نہیں کر سکتا۔''

''تمہیں صرف نگرانی کرنا ہے کہ کام ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں۔ تمہیں اس کام کا تجربہ بھی ہے۔''

''یہ بات ہمارے معاہدے میں شامل نہیں تھی۔''

''وہ وعدہ صرف افغانستان کے لیے تھا۔ اب ہم اپنی دنیا میں واپس آ گئے ہیں۔''

''تم اپنے لیے ایسا کہہ سکتے ہو لیکن میں کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ تم ایک بار پھر اپنے وعدے سے پھر رہے ہو۔''

''نہیں۔'' میں نے اس کی کرسی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس جگہ کے خواب نے زندہ رکھا۔ شاید تمہارے اوپر بھی اس کا اثر ہو اور تمہارا ذہن تبدیل ہو جائے۔''

''یہ ممکن نہیں۔''

''اگر ایسا نہیں ہوا تو مجھے فون کر دینا، میں آ جاؤں گا اور تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دوں گا۔''

اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور بولا۔ ''میں تیار ہوں لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو۔ جہاں تک ہو سکا، میں تمہارے مکان کی تعمیر میں مدد کروں گا لیکن جب بھی میں نے تمہیں فون کیا تو دوڑے ہوئے آؤ گے۔''

میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

''اور مجھے اپنے کتے کی طرح اسی جگہ دفن کرو گے۔''

''دوست ہوتے کس لیے ہیں؟'' میں نے کہا۔

”اس طرف کو ڈیڈ!“ میں نے اپنے نوے سالہ تقریباً نابینا اور بہرے والد کی بینک میں راہ نمائی کرتے ہوئے کہا۔

بینک میں داخل ہونے کے بعد ہم چند لمحوں کے لیے رک گئے تاکہ میرے ڈیڈی کی جو تھوڑی سی بینائی باقی تھی، وہ باہر کی تیز روشنی کے مقابلے میں بینک کی اندرونی کم روشنی سے ہم آہنگ ہو جائے۔

میرے ڈیڈی نے اچانک اپنی جیبیں تھپتھپائیں اور اُلجھے ہوئے انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”ڈبا کہاں ہے؟“

”اوہ، سوری، وہ تو میں کار میں چھوڑ آیا۔“ میں نے جواب دیا۔

میرے ڈیڈی قدامت پسند تھے۔ وہ ہر رات کو اپنی جیبوں میں سے تمام ریزگاری نکال کر کافی کے ایک پرانے ڈبے میں ڈال دیا کرتے تھے۔ جب وہ ڈبا بھر جاتا تھا تو وہ اسے کارڈ بورڈ کے ایک مضبوط ڈبے میں ڈال دیا کرتے تھے اور اس پر لاسٹک کی ایک بٹی ہوئی مضبوط ڈوری باندھ دیتے تھے تاکہ ہم اسے بینک لے جاسکیں۔

ہمارے بینک میں ایک کوائن کنورٹر تھا جہاں سکوں کے بدلے کرنسی نوٹ حاصل کیے جاسکتے تھے اور اس کنورٹر کو ہم بلا معاوضہ استعمال کرسکتے تھے۔

میں ڈیڈی کو اس کاؤنٹر کے پاس لے گیا جہاں لوگ کھڑے ہو کر ڈپازٹ سلپ یا چیک وغیرہ پُر کیا کرتے

بروقت اور درست فیصلہ بڑی سے بڑی مشکل سے بچا لیتا ہے... مگر خطرناک صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے صرف چند سیکنڈ کی مہلت درکار ہوتی ہے... اس نے بھی دیکھا... حاضر دماغی دکھائی... اور عملی قدم اٹھا ڈالا... مہارت سے مہلت کا فائدہ اٹھانے والے بہادر کا قصہ...

باپ کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہونہار بیٹے کی بہادری......

عکس فاطمہ

حاضر دماغ

ہیں۔ میں نے ڈیڈی کا ہاتھ کاؤنٹر کے کنارے پر رکھ دیا تاکہ انہیں سہارا مل جائے اور وہ سنبھل کر کھڑے رہ سکیں۔

"یہیں پر انتظار کریں ڈیڈ۔ میں ابھی واپس آیا۔"

میں انہیں دلاسا دے کر بینک سے باہر آگیا۔

پارکنگ لاٹ میں چونکہ جگہ نہیں تھی اس لیے مجھے اپنی کار قدرے فاصلے پر پارک کرنی پڑی تھی۔ ڈیڈی کی وجہ سے میں یہ نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی۔ لیکن اپنی تمام لاچاریوں کے باوجود ڈیڈی پیدل چلنے کے معاملے میں اب بھی توانا تھے۔ انہیں پیدل بینک تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

یہ ہمیشہ سے اُن کی عادت رہی تھی کہ وہ صورتِ حال کے پیشِ نظر جو سب سے بہتر ہوتا تھا، وہ کر گزرتے تھے۔ میں نے بھی بڑی حد تک اُن کی یہ عادت اپنالی تھی۔

مجھے بینک سے نکلنے، کار تک جانے اور ریزگاری کا ڈبا لانے میں چند منٹ لگ گئے۔ اس درمیانی وقفے میں ایک واقعہ پیش آچکا تھا۔

ہوا یوں کہ میں جونہی بینک کے دروازے کے سامنے پہنچا میرے قدم وہیں جم گئے۔ مجھے شیشے کے دروازے ہی سے دکھائی دے گیا کہ بینک میں اندر کچھ گڑبڑ ہے۔ بینک کے اندر موجود لوگ گھبراہٹ کے عالم میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کچھ لوگ چیخ چلا رہے تھے۔

پھر اچانک میں نے انہیں خود کو فرش پر گراتے اور اوندھے منہ لیٹتے ہوئے دیکھا۔ سوائے میرے ڈیڈی کے جو اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔

تب میں نے دیکھا کہ معاملہ کیا ہے۔

جیکٹ میں ملبوس ایک شخص جس نے اپنے چہرے کا نچلا حصہ ایک بڑے سے رومال میں چھپایا ہوا تھا، ایک گن لہرا رہا تھا جو اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔ بینک کے موٹے شیشے کے دروازے کے پار سے مجھے اس کے چیخنے کی آوازیں گھٹی گھٹی اور بمشکل سنائی دے رہی تھیں۔

پھر وہ ڈاکو آگے بڑھا اور اس نے اپنی گن سے میرے ڈیڈی کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگا دی۔ میرے ڈیڈی فرش پر ڈھے گئے۔

یہ دیکھ کر میرا دماغ بھنا گیا اور میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ لیکن میں نے اپنے اوسان خطا نہیں ہونے دیے اور نہ ہی میں بینک میں داخل ہونے کے لیے لپکا۔ اگر میں ایسا کرتا تو ڈاکو گھبراہٹ کے عالم میں کوئی بھی وحشیانہ قدم اٹھا سکتا تھا اور بینک میں موجود لوگوں کی جان خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

مجھے احساس تھا کہ میرے پاس صرف چند سیکنڈ کا وقت ہے کہ میں کچھ کرسکوں۔ لیکن میں کیا کر سکتا تھا؟

میں نے کسی ہتھیار کی تلاش میں تیزی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ لیکن مجھے کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال میں لے آتا۔ تب مجھے اپنے ہاتھ میں موجود سکوں کے بکس کا وزن محسوس ہوا تو میں نے اس پر نگاہ ڈالی۔

بینک کے دروازے کے باہر کنکریٹ کے بنے ہوئے دو بڑے سے آرائشی گملے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے فوراً ہی کارڈ بورڈ کے بکس پر لپٹی ہوئی الاسٹک کی مضبوط ڈوری اتاری اور اس کا ایک سرا ایک جانب کے گملے کے نچلے حصے کے گرد لپیٹ کر اس ڈوری کا دوسرا سرا دروازے کی دوسری جانب رکھے ہوئے گملے کے نچلے حصے سے گھما کر درمیان میں لے آیا اور ایک مضبوط گرہ باندھ دی۔ فرش سے اس ڈوری کی اونچائی پنڈلی کی حد تک تھی۔

پھر میں سیڑھیوں کے برابر میں دبک کر بیٹھ گیا۔ سکوں کا وزنی ڈبا میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے امید تھی کہ میرا یہ عارضی اور کام چلاؤ پھندا ضرور کارگر ثابت ہوگا۔

چند سیکنڈ نہیں گزرے تھے کہ ڈاکو دوڑتا ہوا آیا، اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور سیڑھیوں کی جانب لپکا ہی تھا کہ اس کا پاؤں میری باندھی ہوئی ڈور میں الجھا اور وہ تقریباً اڑتا ہوا سر کے بل فٹ پاتھ پر جا گرا۔ بینک سے لوٹی ہوئی رقم کا بیگ اور ریوالور جو اس کے ہاتھ میں تھے، اس اچانک غیر متوقع افتاد پر اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فٹ پاتھ پر دور جا گرے۔

وقتی طور پر اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں لپک کر اس کے سر پر جا پہنچا اور میں نے سکوں کے وزنی ڈبے سے اس کے سر کو کئی بار نشانہ بنایا تاکہ وہ دیر تک بے ہوش پڑا رہے اور پولیس کے آنے تک اسے ہوش نہ آسکے۔

اس دوران کسی نے بینک کا الارم بھی بجا دیا تھا۔ میرے کانوں میں پولیس کار کی دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر مجھے اپنے ڈیڈی کا خیال آیا تو میں بینک کی جانب لپکا۔ مجھے ان کی خیر خبر لینا تھی۔

ڈیڈی کی اپنائی ہوئی عادت کے مطابق صورتِ حال کے پیشِ نظر جو مجھے سب سے بہتر سجھائی دیا تھا، وہ میں کر گزرا تھا اور میری اس حاضر دماغی سے نہ صرف ڈاکو پکڑا گیا تھا بلکہ بینک کی ایک بڑی رقم بھی لٹنے سے بچ گئی تھی۔

ذہین ساس

سلیم انور

ساسوں کا وجود باعثِ زحمت ہی نہیں... باعثِ رحمت بھی ہوتا ہے... خصوصاً ایسی ساسیں جو کٹھن وقت میں آپ کی دادرسی کریں... اسی قسم کی ایک انوکھی ساس کا ماجرا... جو ذہانت و فطانت کے مظاہرے اکثر بیشتر پیش کرتی تھیں... داماد ان کی موجودی سے خائف ہونے کے باوجود ان کی اہلیت و قابلیت کا قائل بھی تھا...

مغربی ساس کا ایک دلکش روپ جو عقل مند ہونے کے ساتھ معاملہ فہم بھی تھی

میری ساس گلیڈانس ہمارے گھر کی مستقل مکین بن چکی تھیں۔ دس سال قبل اپنے شوہر سے طلاق لینے کے بعد وہ ہمارے پاس آگئی تھیں اور جب سے یہیں ڈیرے جمائے ہوئے ہیں۔ مجھے یہ دس سال دس صدیوں کے برابر محسوس ہوتے تھے۔

میں ایک پولیس سراغ رساں ہوں اور میری ساس گلیڈانس میرے کام میں گہری دلچسپی لیتی ہیں۔ وہ میرے کیسز کو حل کرنے کی ذمے داری اپنے سر لے لیتی ہیں۔ ان

کی اس دلچسپی کی وجہ سے ہیڈ کوارٹر میں میری واہ واہ ہو جاتی ہے۔ البتہ ان کا رویہ ہمیشہ سے مجھ پر برتری جتانے کا رہا تھا۔ ویسے بھی ہمارے تعلقات کسی حد تک کشیدہ کہے جا سکتے تھے۔ لیکن ان کی زیادتیوں کو میں ان کی احسان مندی کی قیمت سمجھ کر سہہ لیتا تھا۔

انہوں نے میرے حالیہ کیس میں بھی فوری دلچسپی لے لی تھی۔

میں کئی گھنٹوں کے بعد گھر واپس پہنچا تھا۔ میں ایک پُرتشدد علاقے میں جہاں اس قسم کے واقعات روزمرہ کا معمول تھے، ایک شوٹنگ کی تحقیقات کرنے گیا تھا جس میں ایک نوعمر لڑکا گولی کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

''کیا تمہیں اس کے مرنے سے قبل اس سے بات کرنے کا موقع ملا تھا؟'' گلیڈ اٹس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں گولی کس نے ماری ہے۔ اس نے مجھے بس یہی بتایا کہ اسے گولی مارنے والے لڑکے کا نام 'بوچ' ہے۔ اسے اس لڑکے کا نہ تو پورا نام معلوم ہے اور نہ ہی یہ جانتا ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔''

''کیا اس نے اس کے علاوہ کچھ اور کہا تھا؟''

''اس نے کہا کہ اسے اس لڑکے کا ٹیلی فون نمبر یاد نہیں آرہا۔''

''یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔ اسے لازمی طور پر اس کا فون نمبر یاد رہنا چاہیے تھا۔'' گلیڈ اٹس نے اپنا بھاری بھرکم وجود صوفے میں دھنساتے ہوئے کہا۔

''ایسا قطعی نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اس محلے کے لڑکے ایک دوسرے کے پورے نام حتیٰ کہ اصلی نام تک سے واقف نہیں ہوں گے۔ لیکن آج کل کے ٹین ایجرز اسمارٹ فونز کے اس دور میں ایک دوسرے کے فون نمبروں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ اب تو وہ آمنے سامنے بمشکل ہی باتیں کرتے ہیں۔ میرے خیال سے اگر ان کے پاس اپنے اپنے سیل فون نہ ہوں تو وہ ایک دوسرے سے باہمی رابطے کے قابل بھی نہ رہیں۔''

''اور اس نے کہا کہ اسے حملہ آور کا فون نمبر بھی یاد نہیں آرہا ہے؟'' گلیڈ اٹس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''اس نے کہا 'فون نمبر۔ آئی فارگوٹ' (Phone number i forgot)۔ یہ مرنے سے قبل اس کے آخری الفاظ تھے۔''

میں نے ایک لمبی آہ بھری۔ ''سو اب میرے پاس صرف قاتل کا نام ہے 'بوچ' ہے۔ اب سو سے زیادہ ایسے نوعمر لڑکے ہوں گے جن کا نام 'بوچ' ہوگا۔ نہ پتا، نہ مکمل یا اصلی نام نہ ہی فون نمبر...... اور اس واقعے کا کوئی عینی گواہ بھی نہیں۔ اگر کوئی گواہ ہوا تب بھی وہ کوئی بات نہیں کرے گا۔ وہ لوگ پولیس کو پسند نہیں کرتے۔ اور وہ ایک دوسرے کی مخبری کرنے کے روادار بھی نہیں ہیں چاہے جرم کتنی سنگین نوعیت کا ہی کیوں نہ ہو۔''

گلیڈ اٹس میری بات دھیان سے نہیں سن رہی تھیں۔ میں ان کی گول چمکیلی آنکھوں کی کیفیت سے بتا سکتا تھا کہ ان کی حقائق جاننے کی فطری صلاحیت عود کر آئی ہے۔ اور وہ گیان میں ہیں۔ مجھے کوئی آئیڈیا نہیں تھا کہ میں نے ایسا کیا کہا ہے یا کیا ہے کہ جو وہ اچانک اس کیفیت سے دوچار ہو گئی ہیں۔

''اس کا کہنا کتنا عجیب تھا؟'' گلیڈ اٹس نے اپنی اسی کیفیت میں مگن ہو کر بلند آواز سے کہا۔

''تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''فون نمبر آئی فارگوٹ۔''

''اس میں عجیب کیا ہے؟''

''میرے خیال میں اسے یہ کہنا چاہیے تھا۔ 'آئی فارگوٹ فون نمبر' (I forgot phone number)۔''

میں نے جھنجلا کر تیوریاں چڑھالیں۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ لڑکا مر رہا ہے۔ اسے تو بات کرنا دشوار ہو رہا ہوگا۔ وہ آکسفرڈ کا عالم فاضل نہیں تھا کہ سیاق و سباق سے گفتگو کرتا۔''

گلیڈ اٹس میری طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ ''تم حسبِ معمول چھوٹی چھوٹی تفصیل کو نظرانداز کر دیتے ہو۔ حالانکہ وہ اہم بھی ہو سکتی ہیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح......'' میں مدھم لہجے میں بڑبڑایا تاکہ گلیڈ اٹس بھی سن لیں۔

میں دوبارہ گویا ہوا۔ ''یہ اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا۔ مجھے اگلا ہفتہ یا اس سے بھی زیادہ وقت بوچ کی تلاش میں اس علاقے کی گلیاں چھاننی ہوں گی۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں اسے تلاش کر سکوں گا یا نہیں۔ وہاں کوئی بھی مجھ سے بات نہیں کرے گا اور کسی نے بات کر بھی لی تو میں اس کی بات پر یقین نہیں کروں گا۔ پوری صورتِ حال مایوس کن ہے۔''

''صورتِ حال نہیں مایوس کن تم ہو۔'' گلیڈ اٹس نے

قدرے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ ''یقیناً پولیس اکیڈمی کے ڈیٹیکٹنگ ون اوون امتحان میں تم ناکام رہے ہو گے۔''

''یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہی ہو؟'' میں نے زچ ہو کر کہا۔

گلیڈائس صوفے پر سے اٹھ کھڑی ہوئیں تو مجھے یوں لگا جیسے صوفے کے کشن نے اطمینان کا سانس لیا ہو۔

''اوہ، میرے نواسوں کے ابا اور میری بیٹی کے شوہر مجھے یہ کہتے ہوئے تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن تم اس کام کے لیے موزوں نہیں ہو۔ تمہارے اندر اتنی اہلیت ہی نہیں ہے۔''

پھر گلیڈائس نے ایک پیڈ اور پنسل اٹھائی اور اس پر کچھ لکھ کر وہ صفحہ پھاڑا اور مجھے تھما دیا۔

''اس نمبر پر فون کرو۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تمہارا مطلوبہ قاتل یہی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

پھر وہ دروازے کی جانب چل پڑیں۔ ''جب ڈنر تیار ہو جائے تو مجھے بلا لینا شرلاک!''

میں ان کے تحریر کردہ فون نمبر کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا سر کھجانے لگا۔ میں جانتا تھا کہ یہ نمبر درست ہوگا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مجھے یہ بتانے میں انہیں کئی دن لگ جائیں گے کہ انہوں نے یہ تخمینہ کس طرح لگایا کہ فون نمبر کیا ہے۔ وہ اسی مزاج کی عورت ہیں۔

☆☆☆

پورا کیس خوش اسلوبی سے نمٹانے کے بعد بالآخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے ایک دن موقع پا کر اپنی ساس گلیڈائس سے پوچھ ہی لیا کہ انہیں قاتل لڑکے کا فون نمبر کیسے پتا چلا؟

تب گلیڈائس نے مجھے بتایا۔ ''آئی فارگوٹ وہ مخصوص لفظ تھا جو مقتول لڑکے نے قاتل لڑکے کا فون نمبر اپنے حافظے میں رکھنے کے لیے یاد کیا ہوا تھا۔ I forgot کے حروف ٹیلی فون کے ڈائل پر لکھے 4367468 کے ہندسوں سے مطابقت رکھتے ہیں اور یہی اُس قاتل لڑکے کا فون نمبر تھا جو بالکل صحیح نکلا تھا۔''

میں ایک بار پھر اپنی ساس کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ کم از کم ان کی وجہ سے میں بے روزگاری کے عفریت سے بچا ہوا تھا۔

ہری مرچیں

☆ پچھلے دنوں مجھے ایک نجومی نے مشورہ دیا کہ ناگہانی مصیبتوں اور آفتوں سے بچنا چاہو تو جنوری کے مہینے میں ہرگز شادی نہ کرنا پھر کہنے لگا باقی گیارہ مہینوں کے لیے بھی میرا یہی مشورہ ہے۔

☆ کسی شادی شدہ آدمی سے کسی نے پوچھا۔ آپ شادی سے پہلے کیا کرتے تھے۔ اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بولا۔ ''جو میرا دل کرتا تھا۔''

☆ ایک لڑکے نے لڑکی سے اظہارِ محبت کیا۔
''ہمارے دل میں آ جاؤ بڑا اسنبھال کے رکھیں گے۔''
لڑکی غصے سے ''چپل اتاروں کیا۔''
''پگلی ایسے ہی آ جاؤ مسجد تھوڑی ہے۔'' لڑکا معصومیت سے بولا۔

☆ نیو ائر پر آپ اپنی لور کو کیا گفٹ دینا چاہیں گے۔
کچھ بھی دے دوں گا یار لور میری ہے اور پریشانی آپ کو ہے۔

مرحا گل۔ درابن کلاں

ساس بہو

نئی نویلی دلہن نے اپنے شوہر کے لیے دروازہ کھولا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
شوہر کو دیکھتے ہی بولی۔ ''تمہاری ماں نے میری بڑی بے عزتی کی ہے۔''
''میری ماں؟ مگر وہ تو سیکڑوں میل دور رہتی ہے یہاں سے۔''
''میں جانتی ہوں مگر آج ڈاک سے تمہارے نام خط آیا تھا جس کو میں نے کھول کر پڑھ لیا۔''
''تو اس میں تمہاری بے عزتی کہاں سے ہو گئی؟'' شوہر نے پریشان ہو کر پوچھا۔
''خط کے آخر میں تمہاری ماں نے لکھا کہ میری پیاری بہو میرے ذاتی خط کو پڑھنے کے بعد اپنے میاں کو دینا مت بھولنا۔ تمہاری ساس۔''

کراچی سے حمیرا اقبال کا شکوہ

انگارے

طاہر جاوید مغل

بیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خودغرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سنسنی خیز... رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور
دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جارہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آجائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبردارنی کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جارہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ مولوی فدا یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ نمبردارنی کو زخمی کرنے والا مولوی صاحب کا شاگرد طارق تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس بلیک میلنگ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر سائیں جی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کی تلاش میں ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ درگاہ کے منافقت آمیز ماحول نے مجھے بہت مایوس کیا اور اس پورے نیٹ ورک کو نیست و نابود کر کے ہم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے دامن میں جا پہنچے۔ اس دوران انیق وغیرہ ہم سے بچھڑ گئے۔ میں اور تاجور بھاگتے ہوئے سجاول ڈکیت کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آگیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو تو بیاہتا دلہن کی طرح سجاسنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم وڈے صاحب کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سب ٹھیک تھا

کہ اچانک چند نقاب پوشوں نے پاراہاؤس پر حملہ کردیا جن کا سرغنہ ثاقب تھا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ سجاول نے جان جوکھوں میں ڈال کر بڑی بیگم صاحبہ کی جان بچائی لیکن سرغنہ ثاقب نے اس کے بیٹے ابراہیم اور ایک مہمان کو یرغمال بنالیا۔ مہمان کا نام سن کر میں چونک گیا یعنی شکیل داراب! پھر میں نے اور سجاول نے چھوٹے صاحب کو اغواکاروں کے چنگل سے نجات دلائی۔ اس معرکے میں کچھ اغواکار مار دیے گئے اور کچھ پکڑے گئے۔ سجاول کو پاراہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پاراہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کررہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کرلیا گیا تھا۔ یہیں مجھ پر انکشاف ہوا کہ ڈاکٹر ارم پاراہاؤس کے ذاتی اسپتال میں موجود ہے اور اس نے دھوکے سے رضوان ٹی کو دوبارہ قابو کرلیا ہے۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پاراہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پاراہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغنہ ثاقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پاراہاؤس میں دھماکے گونج اٹھے۔ تابڑتوڑ گولیاں چلنے لگیں اور مقابلے میں سرغنہ ثاقب اور اس کا ساتھی عبرت ناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ پہلی رپورٹ ڈاکٹر ارم سے تیار کرائی گئی تھی۔ راز کھل جانے کے ڈر سے ڈاکٹر ارم کو بیدردی سے قتل کردیا گیا۔ رضوان ٹی بھی غائب تھا۔ قتل کا الزام رضوان پر ڈالنا چاہتے تھے۔ اب مجھے یقین ہوچلا تھا کہ یہ سب کچھ آقا جان کرارہا ہے۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کرکے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبردآزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کرکے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پاراہاؤس تک آگیا۔ سیف عرف سیفی کی شیخی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ آقا جان کا بیٹا مخالف پارٹی بن چکا تھا اور امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آقا جان کی بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ مجھے پہچان چکی تھی کہ میں ایسٹرن کنگ ہوں۔ وہ ایک خفیہ منصوبہ ترتیب دے چکی تھی اور تنہا اپنے مشن پر جانا چاہتی تھی۔ وہ ہر صورت اپنے والد کے قاتل کو انجام تک پہنچانا چاہتی تھی، وہ ریان فردوس کی پہلی بیوی اس پورے خاندان کی دشمن بن چکی تھی اور اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر جنگ کررہی تھی۔ باپ اور بیٹے آمنے سامنے تھے۔ قسطینا دشمن کے علاقے میں مالکن بن کے پہنچ چکی تھی، میں اس کے ہمراہ تھا۔ زینب محل سے غائب تھی اور انیق کی وجہ سے ہماری گرفت میں تھی۔ ابراہیم کا زینب کے بغیر برا حال تھا آگے دشمن کے علاقے میں جگہ جگہ ناکابندی تھی۔ اس کے باوجود ہم ان کے علاقے میں داخل ہوچکے تھے، سخت تلاشی کے بعد بالآخر ہم مطلوبہ ٹارگٹ تک پہنچ گئے۔ کلب میں جشنِ طرب تھا۔ اعلیٰ فوجی آفیسران اور ان کی بیگمات رنگ و سرور کی محفل میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہمارا مشن کامیابی سے مکمل ہوا۔ مگر میں اور قسطینا بنکر میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ کلب کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی۔ اب امدادی کارروائی شروع ہونے سے ہی ہماری جان بچ سکتی تھی...... زندگی و موت کے کھیل میں ہم موت کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے اور خیریت کے ساتھ پیلس پہنچ گئے۔ انیق کی حالت دیدنی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر لپٹ گیا۔ قسطینا سے غیر محسوس طور پر تعلقات بڑھتے جارہے تھے...... جو کئی سرکردہ عہدے داروں کو قبول نہیں تھے اور کمانڈر افغانی نے مجھے طلب کرلیا تھا......

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وال کلاک کی ٹِک ٹِک کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ لمبا تڑنگا افغانی خاموشی سے میری طرف دیکھتا چلا جارہا تھا۔ قدموں کی چاپ اُبھری۔ وہی شخص اندر داخل ہوا جس کو افغانی نے زمان کہہ کر پکارا تھا اور لڑکی کو اندر لانے کا کہا تھا۔ وہ لڑکی کو لے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گول ٹرے تھی جس میں لڑکی کا سر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ٹرے میں کوئی تربوز پڑا ہے اور تربوز کے سرخ گودے کی وجہ سے تربوز کو ڈھانپنے والے رومال پر سرخ داغ نظر آرہے ہیں۔ یہ درحقیقت خون کے داغ تھے۔

افغانی کے اشارے پر زمان نے سفید رومال ہٹایا۔ منظر لرزا دینے والا تھا۔ لڑکی کی گردن کسی وزنی تیز دھار آلے سے ایک ہی وار میں کاٹ دی گئی تھی۔ ایک طرف سے سرخ و سپید چمڑی کسی جھالر کی طرح لٹکی نظر آتی تھی۔ لمبے سیاہ بال چوٹی کی شکل میں گندھے ہوئے تھے اور یہ چوٹی بھی کنڈلی مارے سانپ کی طرح گول ٹرے میں موجود تھی۔ خوب صورت لڑکی کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ واضح طور پر انڈین تھی، ماتھے پر سرخ بندیا بھی اس کے انڈین ہونے کے امکان کو قوی کررہی تھی

افغانی اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ”تم کو حیرانی ہورہا ہوگا کہ اس چھوکری کا باقی جسم کہاں گیا۔ اس کا باقی جسم بہت تڑپتا مچلتا تھا۔ ہمارے سپاہیوں کا ایمان خراب کرتا تھا ام نے اس کو علیحدہ کردیا ہے۔“

زمان نامی اس شخص نے بڑی بے پروائی سے خون آلود ٹرے کو سامنے ایک منقش تپائی پر رکھ دیا اور سلام کر کے الٹے پاؤں باہر نکل گیا۔

افغانی نے زہرخند انداز میں کہا۔ ”ام جنگ کا حالت میں ہے اور اس حالت میں ایسی غلطیوں کو ماپھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لڑکی کا نام نیرا ہے۔ اس نے ہمارے ایک بڑے فوجی افسر کو اپنے جال میں الجھانے کا کوشش کیا اور یہ کوشش کیا کہ حملے کی رات وہ اپنے مورچے میں ہونے کے بجائے اس کے بستر پر ہو۔ یہ دشمن کا آلۂ کار تھا...... اور ساتھ میں اس کا بہن بھی۔ دونوں کو موت کا منہ دیکھنا پڑا۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”کمانڈر افغانی! آپ مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔ میں بھی دشمن کا آلۂ کار ہوں؟ اور میرا سر بھی اسی طرح لوہے کی ٹرے میں رکھا جا سکتا ہے؟“

”خو بچے، تم دشمن کا آلۂ کار نہیں ہے لیکن کام وہی کر رہا ہے...... بلکہ شاید ایسا کام دشمن کا آلۂ کار بھی اتنی آسانی سے نہ کر سکے۔ ام ابھی تم سے نرم لپظوں (لفظوں) میں بات کر رہا ہے۔ اگر تم اڑی مڑی دکھائے گا تو...... ام ابھی تمہاری دم میں نمدہ پٹ کرے گا۔“ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگی تھیں۔ ”ام تم سے بالکل آخری بار کہہ رہا ہے۔ تم اپنی اس شکل کے ساتھ بی بی قسطینا کے قریب نظر نہیں آئے گا۔ اس کو اس کا کام کرنے دو۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو پھر ام اپنا کام کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔“ اس کا لہجہ مزید خطرناک ہو گیا۔

میرا پارا بھی آہستہ آہستہ چڑھنے لگا تھا۔ میں نے کہا۔ ”کمانڈر افغانی! مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہے اپنے بارے میں۔“

اس نے پھر چونک کر میری جانب دیکھا۔ جیسے حیران ہو کہ کوئی اس سے اس لہجے میں بھی بات کر سکتا ہے۔ اس نے ایک دم میرا گریبان پکڑ لیا اور دہاڑا۔ ”اوئے خدائی خوار...... اوئے خدائی خوار...... کیوں موت آ گئی ہے تیری۔“

اس کی گرفت بے حد سخت تھی۔ مجھے دم گھٹتا محسوس ہوا۔ اس کی آواز سن کر تین مسلح افراد اندر آ گئے۔ ان میں گول ٹوپی والا زمان بھی تھا۔ تینوں افراد کی رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ افغانی نے دوسرے ہاتھ میں وہ گول ٹرے پکڑی جس میں کسی نیرا نامی خوبرو لڑکی کا سر تھا، اس نے ٹرے ترچھی کر کے سر نیچے گرا دیا۔ وہ فٹ بال کی طرح قالین پر لڑھک کر چند فٹ دور چلا گیا اور ذرا گھوم کر رک گیا۔ افغانی نے خالی ٹرے میری آنکھوں کے سامنے کی اور پھنکارا۔ ”ام کو اس ٹرے میں تیرا سر نظر آ رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں...... بس تھوڑی ہی دیر میں۔“

اس نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے نشست گاہ کے دونوں دروازے اندر سے بولٹ کر دیے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر ایل ایم جی کی سرد نال میری گدی سے لگا دی اور دوسرے نے بڑی احتیاط کے ساتھ پستول میری قمیص کے نیچے سے نکال لیا۔ سب کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو صورتِ حال بری نہیں تھی۔ افغانی نے مجھے باقاعدہ ڈرائی فروٹ پیش کیا تھا اور قہوے کی آفر کی تھی مگر اب میں خود کو غیظ و غضب کے گھیرے میں محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال ایسے مرحلوں سے میں بہت مرتبہ گزر چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ افغانی میری جان لینے میں اتنی جلدی نہیں کرے گا۔ وہ مجھے اس قدر خوف زدہ کر دینا چاہتا تھا کہ میں اندر سے ٹوٹ جاؤں اور اپنے رویے پر پچھتاوا ظاہر کروں۔

میں نے کہا۔ ”کمانڈر افغانی! میں سمجھتا تھا کہ تم رضاکاروں اور سپاہیوں کی اتنی بڑی تعداد کی کمان کر رہے ہو...... تم ایک حوصلہ مند اور سمجھ دار بندے ہو گے لیکن تمہارے تیور دیکھ کر اور تمہاری باتیں سن کر مایوسی ہو رہی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اپنی سپریم کمانڈر کے بارے میں اس طرح کی سوچ رکھو گے۔“

”اپنی گندی زبان سے اب ایک لفظ بھی نہ نکالنا ورنہ کلمہ پڑھنے کا مہلت بھی نہیں ملے گا۔“ افغانی چنگھاڑا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک موٹے نمدے کے نیچے سے کوئی تین فٹ لمبی وزنی کٹار نکال لی۔ کٹار کمرے کی روشنی میں لشکارے مار رہی تھی۔ افغانی کا سارا جسم طیش سے لرز رہا تھا۔

میں نے اطمینان سے کہا۔ ”ٹھیک ہے خان، میرا سر بھی اس ٹرے میں سجا لو لیکن اس سے پہلے اگر تنہائی میں مجھ سے ”کچھ“ دیکھ لو تو تمہارے حق میں بہت اچھا ہو گا۔“

اس نے میرے فقرے پر غور کیا اور پھر دہاڑا۔ ”کیا دکھانا چاہتے ہو۔ دکھاؤ ابھی دکھاؤ۔“

”سب کے سامنے ٹھیک نہیں ہو گا۔ میرا پستول تو تم لے ہی چکے ہو۔ ان بندوں کو پانچ منٹ کے لیے باہر بھیج دو۔“

میرے اطمینان اور تاثرات نے کمانڈر افغانی کو سمجھا

دیا کہ میری بات میں وزن ہے اور کوئی نہ کوئی بات ایسی ہے جس نے میرے اندر اتنی ہمت پیدا کر رکھی ہے۔ چند سیکنڈ تک بری طرح کھولنے کے بعد اس نے اپنے آدمیوں کو خفیف اشارہ کیا اور وہ باہر چلے گئے۔

میں نے کہا۔ ''افغانی صاحب! تم عزت مآب ریان فردوس اور اس کے خانوادے کے بہت بڑے خیر خواہ بن رہے ہو۔ تم نے اس جوان لڑکی کا سر صرف اس لیے قلم کر دیا کہ وہ ایک فوجی افسر کو اس کی ذمے داریوں سے غافل کر رہی تھی اور ایسی ہی سزا شاید تم مجھے بھی دینا چاہو کیونکہ تمہارے مطابق میں بھی سپریم کمانڈر کو غافل کر رہا ہوں۔ لیکن تم خود، عزت مآب اور اس کے گھرانے کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟''

''کیا بکتا ہے؟ جو بھی بکواس کرنا ہے صاپ صاپ کرو۔''

''خان بہادر! تمہیں پتا ہی ہے کہ ڈی پیلس کے اندر کیا کہرام مچا ہوا ہے۔ چھوٹا صاحب ابراہیم زندگی موت کی کشمکش میں ہے۔ بڑی بیگم نورل نساء کو غش آ رہے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کی حالت کا ذمے دار عزت مآب کو ٹھہرا رہی ہیں...... اگلے ایک دو روز میں ڈی پیلس کے اندر سے بری سے بری خبر آسکتی ہے......''

''تم سیدھا سیدھا بات کرو۔'' وہ پھر چنگھاڑا۔

''سیدھا سیدھا بات یہ ہے کہ ڈی پیلس میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے ذمے دار تم ہو۔ تم وفادار ہونے کے باوجود اپنے مالکوں کو دھوکا دے رہے ہو۔ تمہاری وجہ سے وہاں صف ماتم بچھی ہوئی ہے اور یہ صف ماتم بچھا کر تم لڑائی بھی جیتنا چاہتے ہو، خوب، بہت خوب...... تمہارا منہ چومنے کو دل چاہتا ہے۔''

افغان فرطِ غضب سے کانپ رہا تھا۔ شاید برداشت کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ کٹار پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے مجھ پر جھپٹ سکتا تھا، میں نے کہا۔ ''میں ثبوت کے بغیر کچھ نہیں کہہ رہا ہوں افغانی صاحب! مجھے پتا ہے، اپنی جس دلہن کے لیے ابراہیم بسترِ مرگ پر جا گرا ہے، اسے تم نے ہی ڈی پیلس سے نکالا اور سمندر کے کنارے ایک گھر تک پہنچایا۔''

میرے اس آخری فقرے نے افغانی کے چہرے کا رنگ بدل دیا۔ آنکھوں سے نکلنے والی چنگاریاں کچھ مدھم پڑ گئیں۔ ان چنگاریوں کی جگہ ایک طرح کے تحیّر نے لے لی۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''میں اس ہیجڑے خیام کے بارے میں بھی سب کچھ جانتا ہوں...... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس نے تمہیں دلہن زینب کا جو شاہی لباس دیا تھا، اس سے تم نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔''

میں نے دیکھا کٹار پر افغانی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اب صرف استعجاب اور پریشانی تھی۔ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکا۔ ''تم اپنے ہوش حواس میں تو ہو؟'' اپنی آواز کا کھوکھلا پن یقیناً اس کو خود بھی محسوس ہوا ہوگا۔

''بالکل ہوش میں ہوں کمانڈر افغانی! جو بات بھی کہہ رہا ہوں پکے ثبوت کے ساتھ کہہ رہا ہوں اور نیک نیتی سے بھی کہہ رہا ہوں...... مجھے اپنا دشمن نہ سمجھنا...... میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم جیسا بڑا اور ہردلعزیز سردار اس طرح کی غلطی کا مرتکب کیوں ہوا...... کیوں ایسی دلدل میں گرا۔ کس وجہ سے؟''

''تت...... تم کن ثبوتوں کی بات کر رہا ہے؟ ام کو تمہارا کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''سمجھ تو تم کو سب کچھ آ رہا ہے کمانڈر افغانی! بس یقین نہیں آ رہا کہ یہ ہو چکا ہے۔''

اس نے کٹار دوبارہ موٹے نمدے کے نیچے رکھ دی۔ ایک نظر دروازوں اور کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ سب بند تو ہیں، اس کا رنگ اب سرخ کے بجائے ہلکا زرد نظر آنے لگا تھا اور یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا...... اور خود بھی بیٹھ گیا۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک سیاہ شال سے کٹے ہوئے سر کو ڈھانپ دیا تھا تاکہ اس کی دید ماحول کو پراگندہ نہ کرے۔

اس نے کچھ دیر تک خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی پھر بولا۔ ''صاپ بتاؤ، تم کیا کہنا چاہتا ہے؟''

اس کا انداز کچھ نرم ہوا تو میں نے بھی اپنا لہجہ کچھ دھیما کر لیا میں نے کہا۔ ''صاف بات تو وہی ہے جس کا آپ کو بھی پتا ہے۔ آپ کو بیگم نورل نے دلہن زینب کے بارے میں جو کچھ کہا، آپ نے اس پر عمل کیا۔ آپ زینب کو ڈی پیلس سے نکال کر یہاں اپنے گھر لے آئے، آپ نے بیگم سے وعدہ کیا تھا کہ آپ زینب کو کسی بھی طرح جاماجی سے نکال کر واپس پاکستان پہنچا دیں گے اور آپ ایسا کر بھی سکتے تھے، اور کرنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے...... یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد جو ہوا وہ ٹھیک نہیں تھا بلکہ بہت غلط تھا۔''

افغانی کی سوالیہ نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ چہرے پر اضطراب تھا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''آپ نے اچانک اپنا ارادہ بدل دیا..... بلکہ پورا کھیل ہی بدل ڈالا۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ آپ زینب کو واپس پاکستان نہیں بھیجیں گے بلکہ یہیں اپنے پاس رکھیں گے۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک اور سنگین فیصلہ بھی کیا......اور وہ یہ کہ زینب کو زندہ ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ ایک ایسا منظر نامہ بنایا جائے گا کہ زینب آپ کے گھر سے فرار ہوکر کنٹرول لائن کی طرف نکل گئی۔ وہ کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی مگر اسی رات ہونے والی خوفناک گولا باری کی زد میں آکر ماری گئی..... کیا میں یہاں تک ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

افغانی کے بارعب چہرے پر کھلبلی کی سی کیفیت تھی۔ وہ اپنی بھاری آواز کی لرزش چھپاتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنی بات جاری رکھو۔ ام بعد میں جواب دے گا۔''

''اس منظر نامے میں حقیقت کا رنگ بھرتے ہوئے، آپ نے زینب کو بڑی خاموشی سے خواجہ سرا خیام کے گھر پر پہنچا دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ گھر کے تہ خانے میں زینب کے طویل قیام کا انتظام کرے۔ آپ نے زینب کا شاہی لباس حاصل کرلیا اور جوتے وغیرہ بھی..... اس کے بعد کسی بدقسمت لڑکی کے جسم پر وہی لباس سجا کر اسے یوں بارود سے اُڑایا گیا کہ اس کا بالائی دو فٹ دھڑ ہی غائب ہو گیا۔ اس کے بقایا جسم کو آپ نے زینب کی لاش قرار دیا اور اسے عزت مآب کی فیملی کے رُوبرو پیش کردیا۔''

میں نے کمانڈر افغانی کے فراخ ماتھے پر پسینے کی چمک دیکھی، اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب کچھ تمہیں کیسے پتا چلا ہے؟ اور تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ سب ویسے ہی ہے جیسے تمہارے علم میں آیا ہے؟''

میں نے سیل فون نکالا۔ اس کے وڈیو سیکشن میں جاکر وہ وڈیو پلے کردی جس میں خیام نے اپنا طویل بیان ریکارڈ کرایا تھا۔ میں نے وڈیو کا صرف وہ مختصر حصہ پلے کیا جس میں خیام سسکیاں لیتے ہوئے بتا رہا تھا کہ کمانڈر افغانی اس کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ دلہن زینب کو حفاظت اور مکمل رازداری سے اپنے گھر کے تہ خانے میں رکھنا ہے، افغانی صاحب نے یہ بھی کہا کہ مکمل رازداری رکھنے کے لیے گھر کے ملازموں کو کچھ دن کے لیے چھٹی دے دی جائے.....وغیرہ وغیرہ۔

ڈیڑھ دو منٹ کا یہ کلپ ہی افغانی کے رہے سہے ہوش اُڑانے کے لیے کافی تھا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر چند طویل کش لیے اور اٹھ کر ایک بار پھر ننگے پاؤں نشست گاہ کا ایک چکر لگایا۔ اور دوبارہ اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''مطلب یہ کہ تم نے جاسوسی کیا ہے اور بغیر کسی ڈر کے تم اور تمہارے ساتھی لوگ ہر حد تک گیا ہے.....'' افغانی کے لہجے میں ایک بار پھر تپش جھلک دکھانے لگی تھی۔

اس سے پہلے کہ یہ تپش بڑھ جاتی، میں نے کہا۔ ''کمانڈر صاحب، اس موبائل فون میں سارے ثبوت موجود ہیں اور آپ یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ ثبوت میں نے کچھ اور لوگوں کے پاس بھی رکھوا دیے ہیں۔ پورے بھروسے کے لوگ ہیں۔ صرف اسی صورت میں زبان کھولیں گے جب میں کہوں گا..... یا پھر کسی کٹار کے ذریعے میرا سر بھی کسی تھالی میں سجا دیا جائے گا۔''

افغانی نے ایک بار پھر تین تالیاں بجائیں۔ دروازہ کھلا اور زمان خان اندر داخل ہوا۔ افغانی نے اسے حکم دیا کہ کٹا ہوا سر اٹھا کر واپس لے جائے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگلے حکم تک ہم دونوں کی گفتگو میں مداخلت نہ کی جائے۔ زمان خان نے کٹے ہوئے سر کو ٹرے میں رکھ کر اوپر ایک اور رومال ڈالا۔ پہلے الٹے قدموں چلتا دروازے تک گیا پھر گھوم کر دروازے سے باہر نکلنے لگا۔ افغانی نے آواز دی۔ ''ٹھہرو۔''

وہ گھوم کر اور جھک کر افغانی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

افغانی بولا۔ ''کھانے پینے کے لیے کچھ لاؤ..... اور تازہ چائے بھی۔''

ایک دوسرا شخص اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک گیلا کپڑا تھا۔ اس نے قالین پر سے چھوٹے چھوٹے داغ اچھی طرح صاف کیے جو ''قلم شدہ'' سر کے لڑھکنے سے پڑ گئے تھے۔ اس کارروائی کے بعد وہ الٹے قدموں چل کر باہر نکل گیا۔ اب میرے اور افغانی کے درمیان جو گفتگو شروع ہوئی تو وہ مختلف لب و لہجے میں تھی۔ اسی گفتگو کے دوران میں افغانی کو ایک فون کال آگئی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ کال قسطینا کی طرف سے ہی تھی، اس نے افغانی کو بتایا تھا کہ آج رات رائے زل کی طرف سے جوابی فضائی حملے کا خطرہ ہے۔ اس لیے ائر ڈیفنس کو پوری طرح چوکس رکھا جائے۔ ڈی پیلس کے گرد دو اینٹی کرافٹ گنوں کا اضافہ کیا جائے اور رات کو مکمل بلیک آؤٹ ہو۔

قسطینا سے گفتگو ختم کر کے افغانی نے فون آف کر دیا اور پوری طرح میری طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ''ام جاننا چاہتا ہے شاہ زیب کہ تم کہاں تک جانتا ہے۔ کیا تم کو

معلوم ہے کہ زینب کو بڑی بیگم نے کیوں امارے سپرد کیا؟''

''ہاں افغانی صاحب، اب تو یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم ہو چکی ہے کہ باپ بیٹے میں زینب کے حوالے سے بہت زیادہ اختلاف پیدا ہو چکا ہے لیکن عام لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ زینب کو حالات سے خوف زدہ کرنے کے بعد اس سے اپنے شوہر کے نام ایک خط لکھوایا گیا اور پھر اسے آپ کے حوالے کیا گیا تاکہ آپ اسے خاموشی سے پاکستان پہنچادیں۔ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ گھریلو تنازع کی وجہ سے دلہن زینب خاموشی سے گھر چھوڑ کر چلی گئی اور غلطی سے خطرناک علاقے میں نکل کر جاں بحق ہوئی۔''

''یعنی یہ بات تو تم جانتا ہے کہ بڑی بیگم صاحب نے زینب کو امارے حوالے کیا تاکہ ام اس کو حفاظت سے پاکستان پہنچا دے۔ لیکن تم یہ بات نہیں جانتا کہ ام نے اسے پاکستان کیوں نہیں پہنچایا۔''

''بالکل یہی بات ہے...... اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی موت والا نہایت خطرناک ڈھونگ کیوں رچایا گیا ہے؟ ایک ایسا ڈھونگ جس کی وجہ سے ابراہیم موت کے کنارے پہنچ گیا ہے اور ڈی پیلس کی گھریلو زندگی تباہی کے دہانے پر ہے۔''

''تمہارے خیال میں ایسا کیوں ہوا ہے؟'' افغان نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

''بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ آپ زینب کو رازداری سے یہیں جاماجی میں رکھنا چاہتے تھے...... اپنے پاس۔''

''کیا تم ام پر اور اماری نیت پر کسی طرح کا شک تو نہیں کر رہا؟ ایک بات یاد رکھنا، وہ امارے لیے بیٹی کی طرح ہے۔''

''میں آپ پر اس طرح کے شک کا سوچ بھی نہیں سکتا لیکن مجھے اپنے سوالوں کا جواب چاہیے۔ اسے پاکستان کیوں نہیں بھیجا گیا اور اس کی موت والا سنگین ناٹک کیوں رچایا گیا؟''

''کچھ باتیں ایسا ہوتا ہے جن کو بندہ بیان کرنا چاہے تو بھی نہیں کر سکتا، اگر تم اماری نیت پر شک نہیں کر رہا تو پھر اس بات پر یقین رکھو کہ ام نے جو کچھ کیا، اچھے کے لیے کیا۔''

''اور جو اچھا ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے، جاماجی کا ولی عہد موت کے منہ میں ہے اور یہ سب کچھ ایسے وقت ہو رہا ہے جب گرین فورس اور گرے فورس میں زندگی موت کی جنگ جاری ہے۔''

''ام مجبور تھا، ام کو کسی کا حکم ماننا تھا اور وہ ام نے مانا۔''

''اس کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''ام مر کر بھی نہیں بتائے گا۔'' کمانڈر افغانی نے چٹانی لہجے میں کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ میں آپ کے بتائے بغیر بھی کافی حد تک سمجھ رہا ہوں۔ ٹھیک ہے آپ نہ بتائیں لیکن یہ تو بتادیں کہ وہ ایسا کیوں چاہتا تھا؟''

افغانی نے سبز چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک امارا خیال ہے وہ اپنے طور پر ٹھیک تھا۔ کم از کم اس معاملے میں تو ٹھیک تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لڑکی پاکستان چلا گیا تو چھوٹے صاحب ابراہیم اسے ڈھونڈنے کے لیے وہاں بھی پہنچ جائے گا جب تک یہ لڑکی زندہ ہے، باپ بیٹے کے درمیان حالات برے سے برا ہوتا جائے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے خلاص کرنے کے لیے اس لڑکی کو ختم کر دیا جائے۔ باپ بیٹے کے رشتے کو بچالیا جائے بلکہ اس پورے خاندان کو بچالیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ ام یہ جنگ بھی تب ہی جیت سکتا ہے جب یہ خاندان اس تباہی سے بچے گا۔''

''اور آپ کے نزدیک وہ ٹھیک سوچ رہا تھا؟''

افغانی نے چند لمحے توقف کیا۔ اس کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا تھا۔ طویل سانس لے کر بولا۔ ''ہاں اس حد تک تو وہ ٹھیک ہی تھا کہ اس خاندان کو بچنا چاہیے تاکہ اس جزیرے کو بچایا جا سکے...... لیکن......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''آپ چپ ہو گئے افغانی صاحب؟''

اس نے پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ ''لیکن جو کچھ بھی تھا، ام ایک معصوم بے گناہ لڑکی کا جان نہیں لے سکتا تھا۔ وہ جو امارے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا اور اپنی ڈری ڈری آنکھوں سے اور امید بھری نظروں سے ام کو دیکھتا تھا، ہاں ام نہیں لے سکتا تھا اس کا جان۔''

''تو پھر؟'' میں نے پوچھا۔

افغانی نے پہلو بدلا۔ پیکٹ میں سے دو سگریٹ نکالے۔ ایک میری طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے ہونٹوں سے لگا کر قیمتی لائٹر سے دونوں سگریٹ سلگائے۔ دھواں فضا میں چھوڑ کر بولا۔ ''ام کسی سے ڈرنے والا نہیں ہے۔ بے شک تمہارے پاس کئی ایک ثبوت ہے، لیکن امارا ضمیر صاف ہے۔ اگر وقت پڑ گیا تو ام ہر بات کا سامنا کر لے گا۔ ام تم کو

جو کچھ بتا رہا ہے اس لیے بتا رہا ہے کہ ام کو تمہارے اندر سے اچھائی کا خوشبو آیا ہے۔ تم ام سے وعدہ کرو کہ یہاں کی باتیں تم اپنے تک ہی رکھے گا۔ اس میں امارا اور تمہارا دونوں کا پائدہ ہوگا۔''

''کمانڈر افغانی! سچی بات تو یہی ہے کہ مجھے بھی آپ کے اندر سے اچھی خوشبو ہی آئی ہے۔ میں آپ کو نقصان پہنچانے کا کبھی نہیں سوچوں گا۔ بس ایک دو باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت ہو جائے تو میری الجھن دور ہو جائے گی۔''

کمانڈر افغانی نے طویل کش لے کر اپنے گرانڈیل جسم کو زرنگار گاؤ تکیے کا سہارا دیا اور بولا۔''شاہ زیب! کچھ لوگوں نے ام سے کہا...... بلکہ حکم دیا کہ ام اس لڑکی کو ختم کر کے اس کا لاش ڈی پیلس میں واپس پہنچا دے...... تاکہ چھوٹے صاحب ابراہیم کے ذہن سے ہمیشہ کے لیے اس لڑکی کا پتور (فتور) اتر جائے...... اور وہ ٹھنڈا ٹھار ہو کر اپنے گھر کے معاملوں کو ٹھیک کرلے۔ ام یہ حکم ماننے پر مجبور تھا اور ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سو ام نے اس کا ایک درمیانی حل نکالا۔ اور یہ حل وہی ہے جس کا پتا تم کو خواجہ سرا خیام مانش سے لگا ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد ام نے زینب کو خیام کے حوالے کر دیا اور ایک دوسری لڑکی کا لاش زینب کا لاش بنا کر ڈی پیلس میں پہنچا دیا۔''

''آپ نے ایک بے گناہ کو بچانے کے لیے ایک دوسری بے گناہ کو مارا؟''

''نہیں، اگر تم کو امارے اندر سے اچھا خوشبو آتا ہے تو پھر اس طرح کا بات کیوں سوچتا ہے؟ یہ جو زینب کی جگہ مرا یہ بے گناہ چھوکری نہیں تھا......'' پھر وہ ذرا رک کر بولا۔ ''ام نے تم کو ابھی بتایا ہے نا کہ دو بہنیں نیوسٹی کا جاسوس تھا اور پکڑا گیا تھا۔ یہ دراصل چھ سات لڑکیوں کا ایک بے حیا ٹیم تھا۔ یہ خدائی خوار ہمارے فوجی اپسروں (افسروں) کو ورغلاتا تھا۔ ان کو رنگ رلیوں میں ڈالتا تھا اور ان سے اندر کا باتیں بھی معلوم کرتا تھا۔ عزت مآب کے حکم سے ان میں سے پانچ چھوکریوں کو موت کی سزا کا حکم آیا تھا۔ یہ دونوں انڈین بہنیں نیرا اور میرا، بھی ان میں شامل تھا، بہت ہی اعلیٰ پائے کا بدمعاش تھا یہ دونوں انڈین بہنیں۔ دو تین قتل بھی ان کے ذمے تھے۔''

میں نے کہا۔''ان میں سے ایک کا کٹا ہوا سر تو میں نے ابھی دیکھا ہے، آپ کی بات کا مطلب یہ ہے کہ دوسری کو آپ نے زینب کی جگہ مارا؟''

''ہاں اس کا رنگ روپ اور قد کاٹھ زینب کے ماپق (مافق) تھا۔ ام نے اسے زینب کا شاہی لباس پہنایا اس کے پاؤں پر ویسا ہی مہندی لگایا گیا جیسا زینب کے پاؤں پر تھا۔ اسے زینب کے جوتے پہنائے گئے۔ اور اس کی موت کو توپ کے ذریعے بالکل آسان بنا دیا۔'' افغانی کے لب و لہجے میں ایک فوجی کمانڈر کی بے رحمی تھی۔

''توپ کے ذریعے؟'' میں نے پوچھا۔

''امارے قبیلوں میں کبھی کبھی پرانے رواج کے ماپق توپ کے منہ پر باندھ کر بھی موت کا سزا دیا جاتا ہے......''

مجھے سنسنی محسوس ہوئی۔ وہ بے سر اور بے کندھوں کی لاش یاد آ گئی جسے زینب کی لاش قرار دیا گیا تھا۔ اب پورا واقعہ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ بات میں نے پہلے بھی سنی ہوئی تھی کہ قیدیوں کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑانے کا رواج رہا ہے۔ آج اس رواج کی جیتی جاگتی بازگشت میں افغانی کی آواز میں سن رہا تھا۔

افغانی نے عمیق سانس لیتے ہوئے کہا۔''شاید کسی کو بھی توقع نہیں تھا کہ زینب کی موت کی خبر کا اثر ابراہیم پر اتنا زیادہ ہوگا...... وہ بستر پر ہی پڑ جائے گا۔ اب تو ام یہ سوچ کر پریشان ہوتا ہے کہ اگر ام نے اوپر سے آنے والے حکم کے مطابق اس بے چاری کو واقعی مار دیا ہوتا تو واپسی کا راستہ ناممکن ہو جاتا۔ اب بھی پتا نہیں یہ ممکن ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو ابراہیم کا مرنا تو قبول ہو مگر زینب کا واپس آنا قبول نہ ہو۔'' وہ گہری سوچ میں نظر آتا تھا۔ اس کی فراخ پیشانی پر سوچوں کا جال تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔''اس سارے معاملے میں ام کو جو بہت زیادہ اپسوس ہوا ہے، وہ خیام مانش کی حالت پر ہوا ہے۔ اس کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس نے امارے حکم پر زینب کو اپنے پاس پناہ دیا ہے اور حپاظت (حفاظت) سے رکھا ہے۔ تم لوگوں نے اسے بہت بے دردی سے مارا ہے۔ وہ کسی پریزر (فریزر) کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا یہ ویڈیو تم نے کہاں بنایا ہے؟''

''آپ کا کیا خیال ہے، کہاں بنایا ہوگا؟''

''اس کے گھر میں ہی بنا ہوگا۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''آپ کا یہ خیال غلط ہے کمانڈر افغانی! اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی غلط ہے کہ خیام مانش نے زینب کو بڑی حفاظت اور رازداری سے رکھا ہوا تھا۔ خیام مانش پر آپ جو اندھا اعتماد رکھتے ہیں، وہ درست نہیں ہے۔ یقیناً آپ کے ذہن میں یہ

سوال ابھر رہا ہوگا کہ میں نے زینب کا کھوج کیسے لگایا؟''

''کیسے لگایا؟'' افغانی نے پوچھا، اس کی حیرانی میں پھر اضافہ ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ آپ جنگی معاملوں میں بہت اُلجھے ہوئے ہیں۔ آپ کو یہ خبر ہی نہیں ہے کہ پچھلے کئی روز سے زینب، خیام ہانش کے پاس نہیں ہے۔ اگر وہ آپ سے ایسا کہتا رہا ہے تو جھوٹ بولتا رہا ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' افغانی کی آواز لرز اٹھی۔

''یہ ہوا ہے کمانڈر افغانی! اور اس لیے ہوا ہے کہ آپ کے معتمد خیام ہانش نے آپ کے اعتماد کا قتل کیا ہے۔''

کمانڈر افغانی منہ کھولے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے وہ سارا واقعہ کہہ سنایا، جب رات کے وقت انیق نے خیام کے ساحلی مکان میں زینب کے چلاّنے کی آوازیں سنیں اور اس کی مدد کو پہنچا۔ خیام کا سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہونا، انیق کا زینب کو وہاں سے نکالنا اور محفوظ ٹھکانے پر پہنچانا، میں نے سب کمانڈر افغانی کے گوش گزار کیا۔ اس کے بعد یہ بھی بتایا کہ خیام کس طرح ڈی پیلس میں ہمارے ہتھے چڑھا اور کس طرح ہم نے اسے زبان کھولنے پر مجبور کیا۔

افغانی حیرت سے گنگ سنتا رہا۔ کہیں کہیں اس نے سوال بھی کیا۔ اسے خیام کے ساتھی ہیجڑے کی موت کا علم بھی ہوا۔ میں نے افغانی کو وضاحت سے بتایا کہ کس طرح ان دونوں خواجہ سراؤں نے میرے ساتھی انیق کی جان لینے کی کوشش کی اور کیسے خیام کا اپنا ہی چلایا ہوا چھرا اس کے ساتھی کے سینے میں اتر گیا۔

اس ساری رُوداد نے کمانڈر افغانی کو ہکا بکا کر دیا۔ خواجہ سرا خیام کا یہ روپ اس کے لیے بے حد حیران کن اور تکلیف دہ تھا۔ سب کچھ سن کر بھی اسے یقین نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں نے اسے خیام کا مکمل وڈیو بیان دکھایا۔ وہ کتنی دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا۔

بند کمرے سے باہر بڑی بڑی پگڑیوں والے پہریدار گھوم رہے تھے اور ان کے سائے کھڑکیوں پر لہرا رہے تھے۔

افغانی ایک بار پھر اٹھ کر بے قراری سے نشست گاہ میں ٹہلنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ سگریٹ کے طویل کش بھی لے رہا تھا۔ میرے سامنے رک کر بولا۔ ''سچ بات یہ ہے برادر شاہ زیب کہ ام پچھلے تین چار روز سے سخت پریشان ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے بھی ام چھوٹے صاحب ابراہیم کا حالت دیکھ کر آیا ہے۔ وہ مہینوں کا بیمار لگتا ہے...... اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ امارے سامنے اپنی والدہ کے رُوبرو ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ زینب کی قبر پر جانا چاہتا ہے۔ اس کی والدہ بیگم نورل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کل وہ ابراہیم کو قبرستان لے کر گیا تھا۔ وہاں پر اس نے قبر کھودنا شروع کر دیا، کہنے لگا کہ میں یہاں رہنا چاہتا ہوں...... یہ کہتے ہوئے بیگم نورل زار و قطار رونے لگا تھا۔''

''اس طرح کی باتیں تو میرے کانوں میں بھی پہنچ رہی ہیں کمانڈر...... میرا اپنا اندازہ بھی یہی ہے کہ چھوٹے صاحب اپنی دلہن کو بہت زیادہ چاہنے لگے تھے جن لوگوں نے دلہن کو ان سے دور کرنا چاہا انہیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔''

''اب ام کو ایک اور ڈر بھی محسوس ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ صدمہ کسی صورت چھوٹے صاحب کا جان ہی لے جائے...... اور وہ بھی یہ جانے بغیر ہی دنیا سے سدھار جائے کہ اس کا دلہن ابھی زندہ ہے۔''

''تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ...... اس کے زندہ ہونے کے بارے میں بتا دیا جائے؟''

''یہ بہت مشکل ہے برادر...... بلکہ ناممکن ہے۔ یہ مسئلہ اور بھی زیادہ بگڑ جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ ام کو بھی اپنا دشمن نمبر ایک سمجھنے لگے گا۔ یہ بہت الجھا ہوا معاملہ ہے۔ ام کو اس کا کوئی درمیانی حل نکالنا ہوگا۔''

''یعنی کوئی ایسا طریقہ جس سے ابراہیم کو پتا چل جائے کہ زینب ابھی زندہ ہے لیکن اس کا پتا صرف اسے چلے کسی اور کو نہیں۔''

''برادر! تم بہت جلد بات کی تہ تک پہنچ گیا ہے۔ امارے ذہن میں کچھ ایسا ہی سوچ آ رہا ہے۔ جس طرح کا حالت ابراہیم کا ہے، ام کو بہت زیادہ دیر بھی نہیں کرنا چاہیے۔ بس ایک دو دن کے اندر اس طرح کا کام ہو جانا چاہیے۔''

''زینب کے بارے میں اب آپ کا کیا حکم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''سچی بات ہے، ام اس کے بارے میں تم کو کوئی ہدایت دیتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہا ہے۔ تم نے اس کو ایک ایسے چنگل سے نکالا ہے جس میں وہ اماری وجہ سے پھنسا۔ امارا خیال ہے کہ ابھی وہ تمہارے پاس ہی رہے تو بہتر ہے۔ ام ابھی سوچتا ہے کہ اس کے لیے زیادہ بہتر جگہ کون سا ہو سکتا ہے۔ ویسے وہ ٹھیک تو ہے نا؟''

میں نے اس حوالے سے کمانڈر افغانی کو پوری تسلی دی...... اور پوچھا کہ اس نے اس بارے میں بیگم نورل کو کیا بتایا ہے؟

وہ بولا۔ ''ام نے وہی بتایا جو ام کو مجبوری کے تحت بتانا تھا۔ ام نے کہا کہ اماری ذرا سی غفلت کا فائدہ اٹھا کر زینب امارے گھر سے نکل گیا اور بارڈر کی طرف جا کر گولا باری کا شکار ہوا۔ یہ سب کچھ بیگم کو بتانا بہت مشکل تھا مگر ام کو بتانا پڑا......''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''اس خیام مانش کا اب کیا کرنا ہے؟''

خیام کا نام سن کر افغانی کے چہرے پر درشتگی بکھر گئی۔ (وہ اب اس کا پورا وڈیو بیان دیکھ چکا تھا) وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''وہ اس حد تک گرا ہوا نکلے گا...... ام کو ہرگز توقع نہیں تھا۔ اچھا ہوتا وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح مر گیا ہوتا۔ ام ابھی اس کا انتظام کرتا ہے۔ اسے ایسی جگہ ڈالے گا جہاں برسوں تک پڑا سڑتا رہے گا۔''

''افغانی صاحب کہیں ایسا تو نہیں کہ خیام کے کسی اور ساتھی کو بھی اصل صورتِ حال کا علم ہو......؟''

''ابھی ام نے اس کا جو بیان دیکھا ہے، اس سے تو ایسا نہیں لگتا۔ پھر بھی، تم واپس جاؤ تو اس ''کاپر'' کے بچے سے پوچھ گچھ کر کے دیکھ لو۔ اگر ایسا کوئی بات ہوا تو ام بندوبست کر لے گا۔ بڑی اچھی طرح کر لے گا۔''

کمانڈر افغانی سے یہ طویل ہنگامہ خیز نشست ختم ہوئی تو میں تیزی سے واپس انیکسی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے باہر نکلنے سے پہلے افغانی نے میرا پستول مجھے واپس کر دیا تھا۔ کمانڈر افغانی کے ساتھ ہونے والی اس طویل گفتگو میں کہیں آقا جان کا نام نہیں آیا تھا لیکن پسِ پردہ وہ آقا جان کا نام اس گفتگو میں موجود تھا۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ وہ آقا جان ہی ہے جس نے کمانڈر افغانی کو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کیا۔ اس کی سفاکی ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ اسی سفاک نے کمانڈر افغانی کو حکم دیا تھا کہ زینب کو ہمیشہ کے لیے ہز ہائی نس ابراہیم کے راستے سے ہٹا دیا جائے۔

☆☆☆

میں انیکسی پہنچا تو انیق دروازے پر ہی کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کاٹرائے کی پینٹ پر ہاف سلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ آج شیو وغیرہ بھی بنائی ہوئی تھی۔ جب بوٹ پہنتا تھا تو قد مناسب ہی لگنے لگتا تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے ہینڈسم نوجوان کہا جا سکتا تھا لیکن جب چہرے پر گاؤدی پن طاری کر لیتا تھا تو شخصیت کا تاثر ماند پڑ جاتا تھا۔ کہتا تھا کہ اسے آج تک کسی لڑکی نے لفٹ نہیں کرائی، حالانکہ میں جانتا تھا، وہ لڑکیوں سے خود دور بھاگتا ہے۔

مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''آپ کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ لڑکی رو رو کر میری جان لے لے گی۔ ایسے لگتا ہے کہ میں ایک والدہ ہوں اور ایک انتہائی مشکل بچہ میرے سپرد کر دیا گیا ہے۔''

''کیوں اب کیا ہوا ہے؟''

''اندر آ کر دیکھ لیں۔'' وہ بولا۔

میں اس کے ساتھ کمرے میں پہنچا اور پھر بغلی دروازہ کھول کر زینب والے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ جائے نماز پر لیٹی ہوئی تھی اور روتی جا رہی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا...... اور تسلی دینے لگا وہ بولی۔ ''بھائی جی! میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بڑی سخت مصیبت میں ہیں۔ مجھے بلا رہے ہیں۔ آپ لوگ مجھے بتاتے کیوں نہیں۔ وہ اب کیسے ہیں؟ آپ لوگ مجھے ماں جی سے کیوں نہیں ملاتے؟''

میں نے کہا۔ ''زینب! ہمیں غافل اور بے فکر نہ سمجھو۔ میں ابھی تمہارے ہی سلسلے میں نکلا ہوا تھا۔ حوصلہ رکھو۔ بہت کچھ اچھا ہونے جا رہا ہے بس تم دعا کرو۔''

''کب تک اچھا ہو گا؟ کیسے ہو گا؟ عزت مآب مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ وہ ان کو (ابراہیم کو) مار دیں گے یا خود کو کچھ کر لیں گے...... یا پھر میری جان لے لیں گے...... آپ مجھے ماں جی سے ملا دیں...... اگر نہیں تو مجھے ویسے ہی جان سے مار دیں، میں اپنا خون آپ دونوں کو معاف کرتی ہوں۔''

میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ رو رو کر جیسے اس کے جسم کا سارا پانی نچڑ گیا تھا۔ اس کے نرم ہونٹ خشک اور خوب صورت رخسار کھنڈر دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ یہاں سے بہت دور...... چاند گڑھی میں مولوی فدا مرحوم کے جگر کا ٹکڑا تھی۔ چودھری عالمگیر جیسے زر پرستوں نے دولت کے لالچ میں اسے برباد کر دیا تھا اور وہ باقاعدہ فروخت ہو کر اپنے ملک سے ہزاروں میل دور یہاں آ گئی تھی۔ بس ایک بازو کے آسرے پر...... اور یہ بازو اس کے شوہر کا تھا مگر یہاں اس سے یہ بازو بھی چھن گیا تھا۔ ہاں، باپ کی دلاری سے پہلے باپ چھنا، پھر اپنا آنگن چھنا، پھر اپنے چھنے اور اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک ننھی بچی کی طرح خود کو اپنے ہی بازوؤں میں سمیٹے، ڈری سہمی اس گوشے میں

بیٹھی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور ایک بار پھر دل ہی دل میں قسم کھائی کہ میں ہر حد تک اس کا ساتھ دوں گا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کچھ دیر پہلے کمانڈر افغانی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ چھوٹے صاحب ابراہیم کی ضد سے مجبور ہو کر اس کے اہلِ خانہ اسے قبرستان میں زینب کی ''جھوٹی قبر'' پر لے گئے تھے۔ اب وہ پھر وہیں جانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ابراہیم کو زینب کے زندہ ہونے کی خبر دی جائے اور اس کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی اسے فراہم کر دیا جائے...... تاکہ وہ خود کو سنبھال سکے۔ میں اس حوالے سے مختلف طریقوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ زینب کو لے کر ڈی پیلس کے رہائشی حصے میں جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ نہ ہی ابراہیم کو بیماری کی حالت میں رہائشی حصے سے باہر لایا جاسکتا تھا۔ مزید برآں کچھ بھی کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ ابراہیم کو مکمل رازداری کا پابند کیا جاتا، کیا اس کی حالت اس قابل تھی کہ اس سے بات کر کے اس سے کوئی وعدہ وعید لیا جاسکتا؟

اس طرح کے کئی سوالات تھے مگر بقول کمانڈر افغانی یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کہیں ابراہیم مایوسی کی انتہا کو چھو کر اپنی زندگی سے ہی دور نہ ہو جائے...... اور اس طرح کا کوئی واقعہ کسی بھی وقت رونما ہوسکتا تھا۔

میرا ذہن مسلسل آقا جان پر لعنتیں ارسال کر رہا تھا۔ وہ ہر موقع پر ایک بدترین روپ میں سامنے آتا تھا اور اس خبیث کی ''گڈ لک'' ایسی تھی کہ وہ کسی موقع پر بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرتا تھا...... یا یوں کہہ لیں کہ اسے موردِ الزام ٹھہرایا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اب بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی تھی۔ اس نے کمانڈر افغانی کو مجبور کیا تھا کہ وہ زینب کو پاکستان پہنچانے کے بجائے قتل کر دے۔ تاکہ یہ ٹنٹا ہمیشہ کے لیے ختم ہو مگر اب اس کے لیے اگر آقا جان کا گریبان پکڑا جاتا تو کمانڈر افغانی اور اس کے قریبی ساتھی اس سازش میں ملوث ٹھہرتے۔ عین جنگ کی حالت میں اس طرح کی اندرونی ہنگامہ خیزی کسی طور مناسب نہیں تھی۔

شام ہو چکی تھی۔ آج نیوسٹی کی طرف سے جوابی فضائی حملے کا شدید خطرہ تھا۔ پورے شہر میں بلیک آؤٹ تھا اور ہائی الرٹ بھی۔ میں کسی بھی طرح ابراہیم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے بیگم تورل اور حلمی سے رابطے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ میں بغیر اطلاع کے ہی ڈی پیلس کے رہائشی حصے کی طرف چل دیا۔ انیق نے حسبِ معمول میرا راستہ روکا۔ ''کہاں جا رہے ہیں؟''

''تم میری بیوی نہیں ہو جو اس طرح انکوائری کرتی ہو۔''

''آپ بھی تو شوہر نہیں جو اس طرح چھپاتے ہیں۔''

''ضروری کام ہے، آ کر بتاؤں گا۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''جہاں بھی جا رہے ہیں۔ سجاول بھائی جان کے سلسلے میں کوئی اچھی اطلاع لے کر آئیں۔ میرا تو اب دل بیٹھنے لگا ہے۔''

''اور تمہارے نزدیک اچھی اطلاع یہی ہے نا کہ اس کی موت کی تصدیق ہو جائے۔''

وہ اپنے گال پیٹنے لگا۔ ''توبہ توبہ، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں نے تو اپنا کہا سنا انہیں معاف کر دیا ہے، ہر وقت ان کی بخشش...... مم...... میرا مطلب ہے خیریت کی دعائیں کرتا رہتا ہوں۔''

''اور وہ بددعا بھی واپس لو نا جو ہر وقت اس کے لیے کرتے تھے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارے چلّے شلّے بھی اسی سلسلے میں تھے۔''

''کل کلاں آپ نے مجھ پر یہ الزام بھی لگا دینا ہے کہ سجاول بھائی کو غائب بھی دراصل میں نے ہی کروایا ہے۔ کوئی بات نہیں اللہ انصاف کرنے والا ہے۔ کل ہم کو بھی مرنا ہے۔ سجاول بھائی سے ملاقات ہوگی تو سب کچھ کھل جائے گا۔'' انیق نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ غضب کا اداکار تھا۔ اداس لہجے میں بولا۔ ''ایسے ہی کسی موقع کے لیے پہلوان حشمت راہی نے کیا خوب قطعہ کہا ہوا ہے۔

ہم مظلوم ہو کے بھی ظالم ٹھہرائے جاتے ہیں
بات بات پر ان کی محفل سے اٹھائے جاتے ہیں
ہمارے سامنے ہی وہ کرتے ہیں رقیب پر لطف و کرم
اس طرح سے دن رات وہ ہم کو سڑاتے جاتے ہیں

دیکھیے کہ سڑائے جانا یعنی جلائے جانا یہاں کتنی خوب صورتی سے استعمال کیا ہے پہلوان جی نے...... اس ایک لفظ سے...... بلکہ یہ دو لفظ ہیں ''سڑائے جانا''...... ان سے کتنی طاقت پیدا ہوگئی ہے ان شعروں میں۔''

''میرے اندر بھی کافی طاقت پیدا ہوگئی ہے اور یہ طاقت میرے تھپڑ میں بھی آئے گی۔ لہٰذا بکواس نہ کرو۔ حالات ایسے نہیں کہ تمہارے اس مسخرے پن کو انجوائے کیا

جا سکے۔"

"حالات سے مطلب یہ کہ سجاول صاحب واقعی......"

"نہیں، سجاول تو انشاء اللہ زندہ واپس آئے گا اور تمہارے سینے پر مونگ بھی دلے گا لیکن ابھی میں ابراہیم کی بات کررہا ہوں۔"

میں نے انیق کو زینب کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور ڈی پیلس کے رہائشی حصے کی طرف چل پڑا۔ (ویسے میں جانتا تھا کہ اندر سے انیق بھی اب سجاول کے لیے پریشان ہے)

حلیمی کی اجازت سے میں ڈی پیلس کے پرائیویٹ پورشن تک پہنچ گیا مگر ابراہیم کی قیام گاہ کی طرف جانا دشوار محسوس ہورہا تھا۔ یہاں کڑا پہرا تھا۔ ابراہیم کے ذاتی ملازمین کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ ایک غمزدہ سا ماحول تھا۔ تب میری نظر سنبل پر پڑی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور میری طرف چلی آئی۔ عزت مآب کی چہیتی رکھیل ہونے کی وجہ سے اس کی نقل و حرکت پر زیادہ پابندیاں نہیں تھیں۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتایا۔ "ابراہیم کی حالت اچھی نہیں۔ صبح سے ڈاکٹر بار بار اس کے کمرے میں آجارہے تھے۔ دوپہر کے بعد وہ سو گیا تھا۔ ابھی جاگا نہیں، اس کے کچھ ٹیسٹ وغیرہ بھی ہوئے ہیں۔ زینب کی موت کا بہت زیادہ صدمہ لے لیا ہے اس نے۔"

ابھی ہم بات ہی کررہے تھے کہ کسی اندرونی حصے سے بار بار دروازہ کھٹکھٹانے اور بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ سنبل کچھ دیر سنتی رہی پھر بولی۔ "آپ اِدھر ہی ٹھہریں، میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ میں وہیں بلند و بالا چھت والی راہداری میں کھڑا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق آوازیں ابراہیم کے بیڈروم کی طرف سے آرہی تھیں۔ دستک کی آواز بار بار ابھرتی تھی۔ کسی کے بولنے یا پکارنے کی آواز بھی آتی تھی۔ میری دھڑکن بڑھ گئی۔ دو تین منٹ بعد سنبل واپس آئی۔ اس کا سفید مینا اس کی گود میں تھا۔ سنبل کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ "ابراہیم کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ بڑی بیگم بار بار دستک دے رہی ہیں۔ دروازہ نہیں کھل رہا۔"

اسی دوران میں دستک کی آواز بہت بلند ہوگئی۔ ساتھ ہی رونے دھونے کی صدائیں بھی آنے لگیں۔ محافظوں میں بھی افراتفری نظر آئی۔ میں سنبل کے ساتھ اندر کو لپکا۔ قالین پوش راہداری میں تیزی سے چلتے ہوئے ہم ابراہیم کے عظیم الشان بیڈروم کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ بیگم نورل دہائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنے لختِ جگر کو دروازہ کھولنے کا کہہ رہی تھیں۔ کئی دیگر افراد کے علاوہ سفید کوٹ والے دو ڈاکٹر صاحبان بھی یہاں موجود تھے۔ سب کے رنگ اُڑے ہوئے تھے۔

اتنے میں عزت مآب ریان فردوس آتا دکھائی دیا۔ حاضرین مؤدب ہوگئے۔ وہ دو محافظوں کے ہمراہ تیزی سے توند ہلاتا چلا آرہا تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی ملائی زبان میں کڑک کر کچھ کہا۔ جو کچھ میری سمجھ میں آیا اس کے مطابق وہ بیگم نورل کو ڈانٹ رہا تھا کہ دروازے کو اس قابل کیوں رہنے دیا گیا کہ اسے اندر سے بولٹ کیا جاسکے۔

جواب میں بیگم نورل نے بھی چلا کر کہا۔ "یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہورہا ہے۔ آپ کی وجہ سے۔"

ریان فردوس دیگر لوگوں کی پروا کیے بغیر گرجا۔ "تو پھر ٹھیک ہے، مر جانے دو۔ مرتا ہے تو مر جائے۔" بات حرف بحرف میری سمجھ میں نہیں آئی مگر مطلب یہی تھا۔ اس نے ایک فرشی گلدان کو زور سے ٹھوکر ماری اور اپنا زرنگار چغا لہراتا ہوا واپس مڑا۔

کچھ دور جا کر وہ پھر رک گیا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہاں اپنا غیظ و غضب دکھائے یا صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے کچھ کرے۔ اتنے میں آقا جان بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ملازمین کو حکم دیا کہ دروازہ توڑ دیا جائے۔ ایک گارڈ نے M16 رائفل کے وزنی دستے سے دروازے پر زوردار ضربیں لگانا شروع کیں۔

میں یہاں ابراہیم کو سنبھالنے کے لیے آیا تھا۔ اسے یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ وہ جس کے غم میں دن رات تڑپ رہا ہے وہ ابھی اس کی دنیا سے دور نہیں گئی ہے...... لیکن یہاں کچھ اور ہی منظر دکھائی دے رہا تھا۔

دروازہ ٹوٹ گیا۔ لوگ بھرا مار کر اندر داخل ہوئے۔ بیگم نورل سب سے آگے تھیں۔ جہازی سائز کے لگژری بیڈ پر ابراہیم بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ "زندہ لوگوں" والا نہیں تھا۔ گہرا پیلا جس میں ہلکی سی سانولاہٹ آگئی تھی۔ رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں مزید گہری زردی کی زد میں تھیں۔

"ابراہیم...... ابراہیم......" بیگم نورل دردناک انداز میں چلائیں...... اور اسے چھونے کی کوشش میں اس کے بیڈ کے قریب قالین پر گر کر بے ہوش ہوگئیں۔ ایک

ڈاکٹر ان کی طرف لپکا، دوسرا ابراہیم کی طرف۔ اس نے ابراہیم کی پلکیں اٹھا کر دیکھیں۔ اسٹیتھو اسکوپ سے دھڑکن چیک کی۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسی دوران میں ایک سینئر ڈاکٹر دو نرسز کے ساتھ بھاگم بھاگ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بھی نوعمر ابراہیم کے وائٹل سائنز چیک کیے۔ ''نو پلز'' اس کی آواز بجلی بن کر سماعتوں پر کوندی۔

''رش کم کیا جائے، پلیز باہر جائیے۔'' دوسرا ڈاکٹر انگلش میں پکار کر بولا۔

سینئر ڈاکٹر نے اپنے ہاتھوں کے ذریعے بے جان ابراہیم کے سینے پر مخصوص انداز میں بار بار دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اسے طبی اصطلاح میں ''سی پی آر'' یا سینے کو پمپ کرنا کہتے ہیں۔

میں نے دیکھا، ابراہیم کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر میڈیسن کی ایک شیشی کھلی پڑی تھی۔ یہ ایک SEDUCTIE تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈپریشن اور شدید گھبراہٹ کو کم کرنے کے لیے، ابراہیم نے دروازہ اندر سے بند کیا اور یہ دوا زیادہ مقدار میں لے کر لیٹ گیا۔

اسٹریچر پہنچ چکا تھا۔ ابراہیم کے ہلکے پھلکے جسم کو اسٹریچر پر ڈالا گیا اور ان قریبی کمروں کی طرف لے جایا گیا جنہیں باقاعدہ ایک اسپتال کی شکل دی گئی تھی۔ بیگم نورل کو ابراہیم کے بستر پر ہی لٹا دیا گیا تھا اور انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

ہمیں باہر نکل جانے کی ہدایت کی گئی۔ عزت مآب ریان فردوس کے سوا سب باہر نکل آئے۔

یہ بڑی تشویش ناک گھڑیاں تھیں...... آخر اندر سے اطلاع آئی کہ چھوٹے صاحب ابراہیم میں زندگی کے آثار موجود ہیں اور ڈاکٹرز ان کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ امید کی کرن تھی۔ ابراہیم کے بھائی کمال احمد نے سسکنا شروع کر دیا۔ آقا جان نے آگے بڑھ کر بڑی ہمدردی سے اسے اپنے ساتھ لگایا اور اس کو پچکارنے لگا۔ اس کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہاں جو بھی آفت مچی ہے اسی شخص کی مچائی ہوئی ہے...... قریباً ایک گھنٹے کے بعد ابراہیم کی طبیعت سنبھل گئی۔ بیگم نورل بھی ہوش میں آ چکی تھیں اور بار بار بیٹے کے پاس جانا چاہ رہی تھیں مگر ڈاکٹرز کی ہدایت تھی کہ ابھی کوئی اس سے نہیں ملے گا۔

☆☆☆

رات کو فضائی حملے یا زمین سے ہیوی شیلنگ کا ڈر تھا...... لیکن یہ رات خیریت سے گزر گئی۔ بارڈر کی طرف سے بھی کبھی چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ ہوتی رہی۔ ہر کسی کی زبان پر ''برج کلب'' کی تباہی کا چرچا تھا۔ سنا جا رہا تھا کہ ملبے سے ابھی تک دیسی اور ولایتی افسروں کی اکا دکا لاشیں مل رہی ہیں۔

اگلے روز دوپہر کے فوراً بعد میں بیگم نورل کی اجازت سے ابراہیم سے ملنے پہنچا۔ وہ ابھی تک اسی پورشن میں تھا جسے اس کے لیے اسپتال کا درجہ دیا گیا تھا۔ ایک طرح سے وہ اب آئی سی یو سے نکل آیا تھا۔ ایک کمرے میں جہاں ہر طرح کی طبی سہولتیں موجود تھیں، ابراہیم سفید براق بستر پر بے حرکت لیٹا تھا۔ وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا اور شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے زبردستی چند لقمے کھلائے گئے تھے۔ (اسے کچھ نہ کچھ کھلایا جانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اسے اور کمال احمد کو روزانہ خاص زہر آمیز ڈوز دی جاتی تھی) اس کی آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے پر ویرانی تھی۔ اس وقت بھی وہ کسی سکون بخش دوا کے زیر اثر ہی دکھائی دیتا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ جیسے اشک بار ہو گیا۔ میں نے قریب بیٹھ کر اس کا استخوانی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ سسک پڑا۔ میں اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا اور تسلی دینے لگا۔ ''شاہ زیب بھائی! وہ چلی گئی۔ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ اب میں بھی نہیں رہوں گا۔ میں کس کے لیے رہوں گا؟'' وہ کربناک آواز میں بولا۔

اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ ڈاکٹر بھاگا ہوا آیا۔ اسے پانی پلایا، سینے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ قدرے پُرسکون ہوا تو سفید فام ڈاکٹر نے اشارے سے مجھے کہا کہ ابراہیم کو زیادہ بات نہ کرنے دی جائے۔

آنسو لگاتار ابراہیم کے دبلے پتلے چہرے پر بہہ رہے تھے۔ میں نے تیز نظروں سے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی سی سی ٹی وی کیمرا یا آڈیو ڈیوائس دکھائی نہیں دیا۔ میں ابراہیم سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا...... تھوڑی دیر بعد پریشان حال بیگم نورل نے اندر جھانکا اور ابراہیم کو قدرے بہتر حالت میں دیکھ کر واپس چلی گئیں۔ میں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ''ابراہیم! اگر میں آپ سے کہوں کہ میرے پاس آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے تو پھر؟''

''میرے لیے اب کوئی اچھی خبر نہیں ہو سکتی...... میں ایک زندہ لاش ہوں۔ آپ لوگ جو مرضی کر لیں، بہت جلد آپ لوگوں نے میرا مرا ہوا منہ دیکھنا ہے۔''

''ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ آپ تو خدا

پر اتنا یقین رکھتے ہیں۔ قدرت کے لیے کیا ممکن نہیں ہے۔''
وہ دلدوز آواز میں بولا۔ ''قدرت بھی تو اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی پابند ہوتی ہے۔ مُردوں کو زندہ کون کرتا ہے؟''
''مگر جو مرے نہ ہوں...... جن کو بس مردہ ظاہر کر دیا گیا ہو، جو حقیقت میں زندہ ہوں؟''
وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ بات کو سمجھ نہیں پایا، کہنے لگا۔ ''بے شک اسے شہادت کی موت ملی ہے اور شہید زندہ ہوتے ہیں لیکن وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی ہے اور میں یہ صدمہ جھیلنے کے قابل نہیں ہوں۔ یہ مجھ سے ہو ہی نہیں سکتا۔'' اس کا لہجہ واقعی زندہ لاش کا سا تھا۔
میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ابراہیم! میں ایک اور بات کہہ رہا ہوں۔ مجھے زینب کی موت میں شک ہے......''
وہ سکتہ زدہ سا میری جانب دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے کی گہرائی میں دبا ہوا کوئی موہوم سا شبہ ایک دم جوان ہو کر اس کی آنکھوں میں آن وارد ہوا ہو۔ چند لمحوں بعد اس کے چہرے پر تلاطم سا نظر آنے لگا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''آ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں شاہ زیب؟''
''وہی جو آپ سن رہے ہو ابراہیم...... مجھے اس میں شک ہے۔''
''کس بنیاد پر شک ہے؟ کیا...... آپ نے...... کچھ دیکھا ہے؟'' اس کی آواز جذبات کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔ چہرے پر کئی رنگ آجا رہے تھے۔
میں نے کہا۔ ''ابراہیم! سب سے پہلے آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اگر میں اس حوالے سے اپنے طور پر کوئی چھان بین کروں تو...... یہ بات صرف اور صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے۔''
''کس طرح کی چھان بین؟''
''یہی کہ زینب کی لاش، واقعی زینب کی تھی؟''
وہ سرتاپا کانپ گیا۔ دل کی گہرائیوں میں ایک کرن کی طرح چمکنے والا شک اب اس کی آنکھوں میں آس کا دریا بن کر لشکارے مارنے لگا تھا۔ وہ ہانپ سا گیا۔ ''شاہ زیب! مم...... میں وعدہ کرتا ہوں، میں یہ بات صرف اپنے تک رکھوں گا......''
''اور یہ وعدہ بھی کریں کہ خود کو سنبھال کر رکھیں گے۔''
''میں کرتا ہوں، مگر مجھے بتائیں...... آپ کس بنیاد پر یہ شک کر رہے ہیں؟ پلیز...... میں کوئی مزید صدمہ سہنے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے کوئی ایسی امید نہ دلایئے گا جو پوری نہ ہو سکے...... مجھے نہ دلایئے گا۔''
''میں کوئی امید نہیں دلا رہا ابراہیم...... میں تو صرف کچھ شبہات دور کرنا چاہ رہا ہوں۔ مجھے ایک بڑے ذمے دار شخص نے کچھ بتایا ہے۔ میں اس بارے میں تصدیق کر کے کل آپ کو کچھ بتاؤں گا۔''
ابراہیم کی حالت پتلی ہونے لگی۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طور خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ یہ میں بھی جانتا تھا کہ اتنی بڑی خوش خبری اسے ایک دم سنانے کے نتیجے خراب نکل سکتے ہیں۔ میں نے ابھی اسے اس خوش خبری کے لیے تیار کیا تھا۔
میں واپس انیکسی آیا تو حسبِ معمول انیق بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے یہ اطلاع دی کہ خیام یہاں سے جا چکا ہے اور ساتھ ہی ڈیپ فریزر میں سے اس کے ساتھی کی لاش بھی اٹھائی جا چکی ہے۔ اس نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے افغانی صاحب خود یہاں تشریف لائے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ ابھی وہ اپنے تین خاص بندوں کو یہاں بھیجیں گے اور وہ دونوں ہیجڑوں کو یہاں سے لے جائیں گے۔ پندرہ بیس منٹ پہلے وہ تینوں افراد آئے۔ ان کے پاس مضبوط ریگ زین کے دو بڑے تھیلے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے آتے ساتھ ہی خیام مانڈ کو انجکشن دے کر نیم بے ہوش کر دیا۔ پھر دونوں کو تھیلوں میں ڈال کر باہر کھڑی ''فوروہیلر'' میں لوڈ کر دیا۔
''چلو، خس کم جہاں پاک۔'' میں نے کہا۔ ''اب خیام جانے اور کمانڈر افغانی جانے۔''
ہم نے تھوڑی دیر اس بارے میں گفتگو کی پھر اصل موضوع پر آگئے یا الفاظ دیگر، ہم سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ یہ بات تو طے تھی کہ ابراہیم کو جلد از جلد زینب والی خوش خبری سنانا پڑے گی ورنہ اس کی وحشت اسے کسی گڑھے میں بھی دھکیل سکتی تھی مگر زبانی کلامی بات تو وہ ماننے والا نہیں تھا۔ تو کیا اسے فون وغیرہ کے ذریعے زینب کی آواز سنا دی جائے؟
میرے اس خیال کو انیق نے فوراً رد کیا، وہ بولا۔ ''مجھے یقین ہے، وہ کسی صورت ابراہیم سے ملنے یا اسے کال کرنے پر رضامند نہیں ہوگی۔ وہ بڑی بیگم کے سامنے کوئی ''بڑی قسم'' کھا کر آئی ہے کہ ابراہیم سے رابطہ نہیں کرے گی اور وہ اپنے عہد سے پھرنے والی نہیں ہے۔''
''تو پھر؟''
ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ابراہیم کو کسی طرح

انیکسی میں لایا جائے اور اس کمرے کی کسی کھڑکی وغیرہ سے اسے زینب کی جھلک دکھادی جائے۔'' انیق نے کہا۔
''نہیں، یہ گڑبڑ والا معاملہ ہے۔ ابراہیم کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ وہ زینب کو دیکھ کر حواس کھو سکتا ہے۔ وہ اس سے ملنے کے لیے ہنگامہ مچا سکتا ہے اور یہ ان دونوں کے لیے بہت برا ہوگا۔ ایک طوفان جو تھما ہوا ہے پھر سے پوری شدت سے اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس مرتبہ زینب کی جان بچ بچ بھی جا سکتی ہے۔''
''آپ کے ذہن میں کیا آتا ہے؟''
''سیل فون پر زینب کا ایک وڈیو ریکارڈ کیا جائے اور ابراہیم کو دکھا دیا جائے۔''
''آپ کا مطلب ہے وہ ابراہیم کے لیے اپنا بیان ریکارڈ کرائے گی؟''
''کوئی ضروری نہیں۔ بس تم یا میں زینب سے چند باتیں کرتے ہیں اور ریکارڈ کر لیتے ہیں۔''
''لیکن...... ابراہیم نکتہ نکال سکتا ہے کہ یہ وڈیو شاید پہلے کا ہے۔''
''اس کا بھی حل ہے۔ یہ سامنے آج کا اخبار پڑا ہے۔ ریکارڈنگ کرتے ہوئے یہ اخبار زینب کے قریب رکھیں گے۔''
انیق نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اتفاق کر رہا تھا۔
تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد ہم نے اس تجویز پر عمل کیا۔ میں پہلے زینب کے پاس گیا۔ اس کے حلیے پر تنقید کی۔ اسے منہ ہاتھ دھونے اور بال سنوارنے کا کہا...... وہ منہ ہاتھ دھونے کے لیے واش روم میں گئی تو میں نے اپنا فون ایک الماری کے اوپر اس طرح ''سیٹ'' کر دیا کہ وہ زینب کی وڈیو بنا سکے اور اسے دکھائی بھی نہ دے۔ میں نے کیمرے کا رخ ایسا رکھا تھا کہ وہ کمرے کے صرف ایک گوشے کو فوکس کر رہا تھا۔ یہ پہچاننا بہت مشکل تھا کہ یہ وڈیو کس جگہ بنائی گئی ہے۔
کچھ دیر بعد جب زینب باہر آکر اپنی جگہ پر بیٹھی تو فون کے کیمرے نے ریکارڈنگ شروع کر رکھی تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی، صرف مختصر جگہ کو ٹیبل لیمپ کی وجہ سے روشنی مل رہی تھی۔ انگریزی کا تازہ اخبار میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس میں سے زینب کو وہ تصویریں دکھائیں جن میں جنگ کی صورتِ حال واضح کی گئی تھی اور جاماجی کے نقطۂ نظر سے کچھ اچھی اطلاعات تھیں۔ اخبار میں نے زینب کے قریب ہی رکھ دیا۔ تین چار منٹ کا یہ وڈیو کلپ ابراہیم کی تشفی کے لیے کافی شافی تھا۔
ابھی میں زینب کے کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ سیل فون پر ابراہیم کی کال آگئی۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں بول رہا تھا مگر اس کی آواز میں انتہائی مضطرب پکار تھی۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کیا پیش رفت ہوئی ہے۔
میں نے کہا۔ ''ابراہیم! کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ آپ اچھے کی امید رکھیں اور دعا کریں اس کے ساتھ ساتھ اپنا یہ وعدہ بھی یاد رکھیں کہ جو بھی نتیجہ ہوا سے آپ نے اپنے تک ہی محدود رکھنا ہے...... اور خود کو سنبھالنا ہے۔''
''آپ جیسے کہہ رہے ہیں، ویسا ہی ہوگا لیکن پلیز شاہ زیب! مجھے زیادہ دیر انتظار کی سولی پر نہ لٹکائیں جو کچھ بھی ہے...... مجھے جلد آگاہ کریں۔'' وہ یوں ہانپ رہا تھا، جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو۔
اس کی قابلِ رحم حالت تھی۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اسے ذہنی طور پر بڑی خبر کے لیے تیار کیا۔
میں اس کا دل بہلانے کے لیے اور زینب کی طرف سے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں اس سے اس جزیرے جاماجی کے بارے میں بھی جاننا چاہ رہا تھا۔ یہ بات تو میں جانتا تھا کہ یہ کئی پشتوں سے ریان فردوس کے خاندان کا ملکیتی جزیرہ ہے مگر اس کی علاقائی حیثیت کیا تھی؟
ابراہیم کی باتوں سے پتا چلا کہ قریبی خود مختار ملک کی عملداری یہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان لوگوں کا اپنا جھنڈا ہے۔ اب یہ اپنی علیحدہ کرنسی بھی رکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ درحقیقت یہ جزیرہ ایک ''مائیکرو اسٹیٹ'' کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ مائیکرو اسٹیٹ ایسی جگہوں کو کہا جاتا ہے جو خود مختار ہوتی ہیں اور ان کے اپنے قوانین ہوتے ہیں۔ یہ مائیکرو نیشن کی حیثیت بھی رکھتا تھا کیونکہ یہاں موجود قریباً ساری آبادی تین چار بڑے خاندانوں کی اولادوں سے ہی بنی تھی۔ امریکی ایجنسی کا یہاں موجود ہونا اس بات کا اشارہ تھا کہ ایجنسی کے ارادے نیک نہیں اور یہ ہمیشہ کی طرح یہاں کے اندرونی جھگڑوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔
ابراہیم کو یہ ساری گفتگو بالکل خشک محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دھیان گھوم پھر کر اپنی دلہن زینب کی طرف ہی جاتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس بارے میں جتنی زیادہ بات کرے گا، اتنی ہی اس کی بے قراری اور وحشت بڑھتی جائے گی۔ میں نے اسے پھر تسلی تشفی دی اور اس بات چیت کو اختتام تک پہنچایا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تب تک رات کے نو بج چکے تھے۔ شہر میں آج پھر مکمل بلیک آؤٹ تھا۔ سڑکوں پر فوجی گاڑیاں جگہ جگہ کھڑی تھیں اور مورچوں میں گرین فورس کے سپاہی دشمن کی طرف سے کسی بھی جوابی حملے کے لیے چوکس تھے۔ اس وقت ڈی پیلس کے رہائشی حصے میں جانا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ میں نے ابراہیم سے ملنے اور اسے زینب کے حوالے سے خوش خبری سنانے کا پروگرام صبح پر رکھا۔

انیق کے کمرے میں سیف بھی موجود تھا۔ وہ دونوں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ خواجہ سرا خیام اور اس کے مردہ ساتھی کے روانہ ہوجانے کے بعد انیق خود کو کافی ایزی محسوس کررہا تھا۔ اسی دوران میں کرخت سنگھ بھی وارد ہوگیا۔ وہ کافی عرصے سے جزیرہ جاماجی میں موجود تھا اور گرین فورس میں اس کی حیثیت حوالدار کی تھی۔ سیف کی طرح وہ بھی زبردست قسم کا کھابہ خور تھا۔ عشقیہ پنجابی گانے بھی الاپتا تھا اور پکا پینڈو ہونے پر فخر محسوس کرتا تھا۔

تاش کی بازی شروع ہوگئی۔ انہوں نے مجھے بھی شریک ہونے کو کہا مگر میرا ذہن دیگر معاملوں میں الجھا ہوا تھا۔ سیف عرف سیفی کا وہ رنگ برنگا سیل فون قریب ہی پڑا تھا جس پر سکھیرا اینڈ کا وال پیپر تھا اور جس کے اندر تاجور کی تصویریں تھیں۔ ہاں اس سیل فون کی صورت میں وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی لیکن حقیقت میں بہت دور تھی۔ میں چاہتا تو سجاول کے ڈیرے پر اسے ہمیشہ کے لیے اپنی مٹھی میں بند کرسکتا تھا...... مگر جن سے محبت کی جاتی ہے ان کو پابند نہیں کیا جاتا۔ ان کو آزاد کردیا جاتا ہے۔ اگر وہ آپ کے ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی طور کبھی نہ کبھی آپ کے پاس واپس لوٹ آتے ہیں۔ اسے آزاد کرتے وقت شاید میرے دل کی گہرائیوں میں بھی کہیں یہ موہوم خواہش موجود تھی کہ وہ میری تمام تر خامیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے...... اور میرے جذبے کی شدت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک دن میری طرف پلٹ آئے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے وہی کیا تھا جو کہتی تھی۔ اپنے والدین کی منشا کے عین مطابق اس نے اپنے ہی جیسے زمیندار گھرانے کے ایک نوجوان کو شریک حیات کے طور پر پسند کرلیا تھا۔

کتنا اچھا ہوتا، مجھے یہ سب کچھ پتا ہی نہ چلتا۔ وہ ہمیشہ میرے حالات سے اور میں اس کے حالات سے بے خبر ہی رہتا۔ میں تاش کی محفل چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ سیل فون کی بیل ہوئی۔ یہ جاناں تھی۔ آج اس سے ملاقات ہوئے تین چار دن گزر چکے تھے۔

میں نے کال ریسیو کی۔ میرے حوالے سے وہ ہر وقت ''گرمجوش موڈ'' میں رہتی تھی لیکن آج وہ بھی بے حد افسردہ تھی۔ زینب کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اور اب ابراہیم کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ جاناں کو بھی بری طرح ''بے قرار'' کر رہا تھا۔ اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا شاہ زیب کہ وہ ہم میں نہیں ہے۔ وہ گھریلو حالات سے ''اَپ سیٹ'' ضرور تھی مگر یہ بالکل نہیں لگتا تھا کہ وہ یوں اچانک گھر چھوڑ جائے گی اور پھر ایسے دردناک حادثے کا شکار ہوگی۔''

ابھی جاناں کی بات جاری ہی تھی کہ ہیلی کاپٹروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ یہ آواز اب ہم بخوبی پہچاننے لگے تھے۔ یہ اپنے ہی ہیلی کاپٹر ''اپاچی'' کی آواز تھی۔ وہ ڈی پیلس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔

''شاید دو ہیلی کاپٹر ہیں۔'' جاناں نے کہا۔

''مگر اپنے ہی ہیں۔ پریشانی کی بات نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ ایک زبردست دھماکے سے قرب و جوار لرز اٹھے۔ سامنے کارنس پر رکھے ہوئے دو بلوری ڈیکوریشن پیس فرش پر گر کر ٹوٹ گئے۔ فون پر جاناں کے چلانے کی آواز آئی۔ ''یہ کیا ہوا شاہ زیب؟''

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، ایک اور دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی گن شپ ہیلی کاپٹر نے تین چار بڑے برسٹ چلائے۔ ڈی پیلس کے وسیع و عریض احاطے میں کہرام سا مچ گیا۔ یہاں رضاکار دستوں نے کھلی جگہوں پر پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ وہ براہِ راست فائرنگ کی زد میں آئے۔

میں نے فون بند کیا اور باہر کی طرف لپکا۔ انیق، سیفی اور کرخت سنگھ بھی احاطے کی طرف جا رہے تھے۔ میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ گرین فورس کا اپنا ہی بلیک ہاک ہیلی کاپٹر احاطے پر اندھادھند برسٹ چلاتا ہوا ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ ڈی پیلس کے اردگرد کم و بیش آٹھ اینٹی ائرکرافٹ گنیں اور راکٹ لانچرز موجود تھے مگر سب خاموش تھے۔ شاید کوئی بھی یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اپنے ہی ہیلی کاپٹرز کو نشانہ بنائے یا نہیں؟

انیکسی کے مین گیٹ کے عین اوپر ایک بم گرا۔ میں نے گیٹ کے ساتھ کھڑی دو گاڑیوں اور چند افراد کے پرخچے اڑتے دیکھے۔ قریبی کمروں میں آگ کے بلند شعلے نظر آئے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے شاہ زیب بھائی۔'' انیق چلایا۔

''اپنے ہی ہیلی کاپٹر بم پھینک رہے ہیں۔''

یہ وہی بات ہو رہی تھی کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ ڈی پیلس اور اردگرد کی عمارتوں کا سارا ڈیفنس اور ہائی الرٹ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ دفاعی حصار کے اندر سے اپنے ہی دو ہیلی کاپٹر اڑے تھے اور بارود کی بارش کر دی تھی۔ بیس تیس سیکنڈ کے اندر انہوں نے کم و بیش چھ بم گرائے (ہیلی کاپٹرز کے ذریعے بمباری میں استعمال ہونے والے یہ بڑے سائز کے BARREL BOMB تھے۔ مشین گنوں سے جو برسٹ چلائے گئے وہ اس کے علاوہ تھے۔

اس سے پہلے کہ نیچے سے اینٹی ائرکرافٹ گنیں فائر کھولتیں یا راکٹ وغیرہ لانچ کیے جاتے، ہیلی کاپٹر اونچی پرواز کرتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس تیز رفتار ترین آپریشن کے دوران میں شاید ایک ''اینٹی ائرکرافٹ'' ہی چند راؤنڈ فائر کر سکی تھی۔

ہر چہرہ سوالیہ نشان تھا۔ یہ کیا ہوا تھا؟ اپنے ہی پائلٹوں نے ڈی پیلس کو نشانہ بنا ڈالا تھا، کیا یہ غداری کا کوئی واقعہ تھا یا پھر ہیلی کاپٹروں میں گرین فورس کے بجائے گرے فورس کے پائلٹ پہنچ گئے تھے۔ یہ دوسرا امکان تو قرین قیاس نہیں تھا۔ زیادہ چانس اس امر کا تھا کہ یہ کوئی غداری کا معاملہ ہے۔

کم از کم ایک بم ضرور ڈی پیلس کے خاص الخاص حصے پر گرا تھا۔ یہ وہی پورشن تھا جہاں شاہی فیملی کی قیام گاہیں تھیں۔ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایسی ہی آگ انیکسی کے سامنے والے حصے میں بھی بھڑک اٹھی تھی۔ ہوا کا رخ انیکسی کے مرکزی حصے کی جانب تھا۔ گاڑھا سیاہ دھواں تیزی سے انیکسی میں بھرتا جا رہا تھا۔ انیق اور سیفی وغیرہ تو احاطے میں موجود زخمیوں کی مدد کو دوڑے، میں انیکسی کی طرف لپکا تاکہ زینب کو دیکھ سکوں۔ اپنے کمرے کا بغلی دروازہ کھول کر میں اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ ایک گوشے میں سمٹی ہوئی تھی اور کھانس کھانس کر بے حال ہو رہی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے چمٹ گئی۔ راہداری کی طرف بھاگتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ انیکسی سے نکل رہے تھے۔ ہمیں بھی نکلنا چاہیے تھا لیکن ہمارا نکلنا مشکل تھا۔ زینب اس کمرے سے نکل آتی تو کئی نگاہوں کے سامنے آ جاتی اور یہ اس کے لیے بہت برا ہوتا۔ وہ ڈی پیلس والوں کی نگاہوں میں مر چکی تھی اور ابھی اس کا ''مرے

رہنا'' ہی اس کی سلامتی کے لیے بہتر تھا۔

''میرا سانس بند ہو رہا ہے۔'' وہ کراہی۔

''حوصلہ رکھو زینب! ابھی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے تھے پھر اندازہ ہوا کہ آگ پر پانی کی بوچھاڑیں شروع ہو گئی ہیں لیکن ہمارے لیے یہ صورتِ حال مزید سنگین ثابت ہوئی۔ گہرا سیاہ دھواں اور گاڑھا ہو گیا۔

میں نے ایک کپڑا بھگو کر اس کی طرف بڑھایا۔

''اسے منہ پر رکھو، سانس آسانی سے آئے گا۔''

اس نے کھانستے کھانستے کپڑا منہ پر رکھ لیا۔ ایک ایسا ہی کپڑا میں نے بھی منہ پر رکھا مگر صورتِ حال بگڑتی چلی جارہی تھی۔ ایک موقع پر جی میں آئی کہ میں زینب کو لے کر باہر نکل جاؤں مگر اب یہ کام مشکل ہو گیا تھا۔ آگ راہداری تک پہنچ گئی تھی۔ اس کمرے میں رہ کر تو شاید ہم آگ سے محفوظ رہتے لیکن باہر نکل کر نہیں رہ سکتے تھے۔ میں نے اپنی سانس روک لی تھی۔ میرا ''سی ڈائیونگ'' کا تجربہ کسی حد تک میرے کام آرہا تھا مگر زینب کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔ تو کیا وہ یہیں میرے ہاتھوں میں دم توڑ جائے گی؟ میں نے بے حد کرب کے عالم میں سوچا۔ اس نے دو تین الٹیاں کیں۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میرے والے کمرے میں ایک ماسک موجود تھا۔ ایسے ماسک کو ''اسموک فلٹر ماسک'' کہا جاتا ہے اور یہ ہنگامی حالات میں استعمال ہوتے ہیں۔ میں اندھوں کی طرح ہاتھ چلاتا اپنے کمرے میں پہنچا اور ''اسموک فلٹر'' لا کر زینب کے چہرے پر چڑھا دیا۔ ایک طرح سے یہ آخری کوشش تھی جو میں اس کے لیے کرسکتا تھا۔ ''اسموک فلٹر'' لگنے سے زینب کی حالت تو کچھ بہتر ہو گئی لیکن میرا سینہ آکسیجن کی طلب میں پھٹنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ چند سیکنڈ مزید گزر گئے تو میں ہوش میں نہ رہ سکوں گا۔

''تو کیا میں زینب کو یہیں چھوڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کروں؟ کوئی بیڈ شیٹ لپیٹوں اور دوڑ کر آگ میں سے گزرنے کا رسک لوں؟ کیا ابھی وقت ہے کہ ایسا کیا جاسکے؟ مگر اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ کیا زینب دو تین منٹ بھی یہاں اکیلی گزار سکے گی۔ وہ قیامت کے لمحے تھے...... اور پھر وہ گزر گئے۔ ایک دم ہی دھواں چھٹنا شروع ہو گیا۔ یوں لگا جیسے کسی نے یکایک بہت بڑا ایگزاسٹ فین چلا دیا ہو جو دھوئیں کو کھینچتا چلا جارہا ہو۔ دراصل فائر فائٹرز نے انیکسی کی دوسری جانب کے کئی دروازے کھول دیے تھے جن کے سبب ہوا آر پار ہوئی تھی اور دھواں تیزی سے اوجھل ہونے لگا تھا۔

ہمیں جیسے پھر سے زندگی ملی تھی۔ آگ پر بھی تقریباً کنٹرول حاصل کرلیا گیا تھا۔ انیق ہمیں ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ہمیں صحیح سلامت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشی امڈ آئی مگر پھر فوراً ہی اس خوشی پر سایہ سا لہرا گیا، بولا۔ ''شاہ زیب بھائی، باہر بہت نقصان ہوا ہے۔ کافی لشکری مارے گئے ہیں۔ زخمی ہونے والے بھی بہت ہیں۔ یہ زیادہ تر مقامی لوگ ہی ہیں۔''

''رہائشی حصے کی طرف کیا سچویشن ہے۔ ابراہیم وغیرہ تو خیریت سے ہیں؟''

''جی ہاں، ابھی لاؤڈ اسپیکرز پر ہر ہائی نس قسطینا نے اعلان کیا ہے کہ اندرونی حصے میں خیریت ہے۔ چند افراد معمولی زخمی ہوئے ہیں۔ عزت مآب اور اہلِ خانہ کو کوئی گزند نہیں پہنچی۔''

انیق کو وہاں حیران پریشان زینب کے پاس چھوڑ کر میں باہر نکلا۔ احاطے میں ابھی تک بھگدڑ تھی۔ کم از کم تیس لاشیں اٹھائی جا چکی تھیں۔ زخمیوں کو اسٹریچرز پر لاد لاد کر لے جایا جارہا تھا۔ ہر طرف یہی چرچا تھا کہ اپنے ہی ہیلی کاپٹرز نے یہ تباہی مچائی ہے۔ میں نے کچھ بڑی عمر کے رضا کاروں کے چہروں پر عجیب سی دہشت دیکھی، شروع میں تو میں اس دہشت کو کوئی خاص معنی نہیں پہنا سکا۔ لیکن پھر مجھ پر انکشاف ہوا کہ کچھ مقامی لوگ اس واقعے کو رائے زل کی والدہ ہاناوانی کی ''سحر کاری'' سے جوڑ رہے ہیں۔ وہ بڑے یقین سے کہہ رہے تھے کہ یہ وفاداری تبدیل کرنے، یا غداری کا معاملہ نہیں ہے، یہ سراسر اُن عملیات کا نتیجہ ہے جن میں ہاناوانی برسوں سے نہایت تجربہ کار تصور کی جاتی ہے۔ سننے میں یہ سب کچھ بڑا عجیب اور دقیانوسی لگ رہا تھا مگر جزیرے کے باشندے بڑے یقین سے ایسی باتیں کررہے تھے۔ ایسی چہ میگوئیاں میں جاماجی میں پہلے بھی کئی مرتبہ سن چکا تھا۔

رات کا زیادہ تر حصہ بے قراری اور پریشانی میں ہی گزرا۔ خون کے عطیات کی اپیل کی جارہی تھی۔ میں نے خون دیا تو انیق، سیفی اور گرخت سنگھ نے بھی تقلید کی۔ رات کے آخری پہر میں کچھ دیر کے لیے سو گیا۔ جاگا تو دس بج رہے تھے۔ سیل فون دیکھا۔ وہ سائیلنٹ پر تھا۔ اس پر

ابراہیم کی کم وبیش دس کالز آئی ہوئی تھیں۔ اس کی بے چینی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ میں اب خود بھی یہ چاہتا تھا کہ اسے جلد از جلد زینب کے بارے میں بتادیا جائے۔

میں نے بیگم نورل سے رابطہ کیا اور ان سے اجازت لے کر ابراہیم کے پاس اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ یہ اس کا بیڈ روم نہیں تھا، وہی جگہ تھی جسے اسپتال کی شکل دی گئی تھی۔ وہ سفید بستر پر ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ آنکھوں سے شب بیداری ظاہر ہوتی تھی۔ کمرے کی ایک کھڑکی کے شیشوں میں بڑی بڑی ''کریکس'' نظر آرہی تھیں۔ یہ رات والے ہنگامے اور دھماکوں کے اثرات تھے۔ جونہی میں اندر داخل ہوا، ابراہیم کی آس بھری نظریں مجھ پر جم گئیں۔ وہ جیسے سرتاپا سوال بن گیا۔

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''شاہ زیب...... مجھے کوئی...... اچھی خبر سنایئے گا۔ بری خبر سننے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے......''

میں نے کہا۔ ''اگر میں کہوں کہ...... اچھی خبر نہیں ہے......اور نہ ہی بری خبر ہے تو پھر؟''

''تو پھر......آپ مجھے انتظار کی سولی پر لٹکائیں گے، مجھ میں انتظار کی ہمت بھی نہیں ہے۔'' اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

''ابراہیم! آپ ایک وعدہ کریں۔ مجھ سے کوئی ایسا سوال نہیں پوچھیں گے جس کا جواب میں فی الحال آپ کو نہ دینا چاہوں، اور ایک بار پھر وہی تاکید بھی کہ...... جو کچھ میں کہوں گا، اسے ابھی صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھیں گے۔''

اس کی ڈری ہوئی آنکھوں کے اندر امید کے سہمے سہمے جگنو چمکے۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور لرزاں آواز میں بولا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں...... میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''زینب زندہ ہے ابراہیم۔'' میں نے سرگوشی کی۔

وہ جیسے سکتے میں چلا گیا۔ کتنی ہی دیر تک کچھ بول ہی نہیں سکا۔ پھر اس کے ہونٹ کپکپائے۔ ''میرے ساتھ...... کوئی مذاق نہ کیجیے گا...... مم...... میں سہہ نہیں سکوں گا۔'' ایسی بے چارگی اور التجا تھی اس کے لہجے میں جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''نہیں ابراہیم! یہ سچ ہے آپ کی دلہن زندہ ہے۔ وہ ایک سازش تھی۔ آپ سے دور کرنے کی گہری سازش تھی۔ وقت آنے پر میں آپ کو ثبوت بھی دوں گا۔''

''وہ......وہ لاش کس کی تھی؟ میں کیسے یقین کرلوں۔ مجھے بتائیں...... وہ زندہ ہے......تو کہاں ہے؟''

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سیل فون نکال کر اسے زینب کا وڈیو کلپ دکھا دیا۔ زینب کی تصویر، اس کی آواز، تازہ اخبار، سب کچھ اس میں موجود تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس نے کلپ کو دو بار ''پلے'' کیا، پھر سیل فون کو مٹھی میں دبایا اور سسکیوں سے رونے لگا، یہ بے پایاں مسرت کے آنسو تھے۔ میں نے اسے رونے دیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ''یہ سب کیسے ہوا ہے شاہ زیب بھائی۔''

وہ مجھے پہلی دفعہ ''بھائی'' کہہ کر بلا رہا تھا۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ابراہیم، میں تمہیں ایک دو روز میں سب کچھ بتادوں گا۔ ابھی تمہیں تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا۔''

اس نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ ایک بار پھر وڈیو پلے کیا۔ شاید وہ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ وڈیو کس جگہ بنایا گیا ہے جس جگہ اخبار نمایاں نظر آرہا تھا۔ اس نے وڈیو کو ''پاز'' دیا اور اخبار کو بغور دیکھنے کے بعد وہی فقرہ کہا جس کی میں توقع کررہا تھا۔ ''شاہ زیب بھائی! یہ وڈیو کلپ کل ہی بنا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ کانپتی آواز میں کہنے لگا۔ ''یہ کلپ آپ نے خود بنایا ہے۔ آپ کل اس سے ملے ہیں۔ وہ کہاں تھی؟ کس نے کیا ہے اس کے ساتھ ایسا؟ کیا یہ...... عزت مآب نے کیا ہے؟ اور کس میں اتنی ہمت ہوسکتی ہے۔ مجھے کم از کم اتنا تو بتادیں کہ وہ لاش اور کپڑے اور پاؤں کی مہندی......؟''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''ابراہیم...... ابھی فوری طور پر میں ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتا۔ ہاں یہ تسلی رکھیں کہ یہ عزت مآب نے نہیں کیا۔ اور آپ نے وعدہ کیا ہے ابھی مجھے مجبور نہیں کریں گے کہ میں جوابات دوں۔''

وہ جیسے سہم کر چپ ہوگیا۔ رکے ہوئے کلپ کو پھر دیکھنے لگا۔ ''یہ بیمار لگ رہی ہے شاہ زیب بھائی! کتنی کمزور ہوگئی ہے۔ بہت پریشانی میں ہے۔''

''یہ پریشانی آپ کی وجہ سے ہے ابراہیم......آپ یہ پریشانی دور کرسکتے ہیں۔'' وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا، میں نے کہا۔ ''وہ آپ کی صحت کی طرف سے بہت فکرمند ہے جس طرح آپ نے اس کا یہ وڈیو کلپ

دیکھا ہے اور پھر سے جی اٹھے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی آپ کو دیکھ کر اپنے غم کے گھیرے میں سے نکل آئے گی۔ آپ اس کے لیے دو چار فقرے بولیے اور اس سے کہیے کہ اب آپ کی صحت بہتر ہے۔ عزت مآب سے آپ کی بات چیت ہو رہی ہے، جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''لیکن......''

''پلیز ابراہیم، میں جو کہہ رہا ہوں ویسا کیجیے اور باقی مجھ پر چھوڑ دیجیے۔''

وہ رضامند نظر آنے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی حالت تھوڑی سی بہتر بنالے۔ وہ اٹھا اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے، لرزتے قدموں کے ساتھ واش روم میں چلا گیا۔ اس نے واش روم میں ہی زینب کے لیے دو چار فقرے بولے اور میرے سیل فون پر ریکارڈ کر دیے۔ باہر آ کر اس نے سیل فون میرے حوالے کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں مسلسل خوشی کے آنسو چمک رہے تھے۔ وہ جیسے سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اپنی دلی کیفیت کا اظہار کس طرح کرے۔

میری نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی، ہاتھوں کی جلد بالکل خشک ہو چکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک دو دن میں اس کی جلد پھٹنا شروع ہو جائے گی۔ پاکستان میں ابراہیم نے خود مجھے بتایا تھا کہ ان دونوں بھائیوں کے لیے روزانہ کی بنیاد پر مخصوص زہر کی ڈوز ضروری ہے۔ ورنہ ان کے جسم میں غیر معمولی تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں جن میں ایک تبدیلی ''ڈی ہائیڈریشن'' بھی ہے۔ یقیناً ابراہیم کے ہاتھ پاؤں کی یہ حالت اسی وجہ سے تھی کہ وہ کھانا نہیں کھا رہا تھا اور یوں ''ڈوز'' سے بھی محروم تھا۔ میں نے اس سلسلے میں ابراہیم کو سمجھایا اور زور دیا کہ وہ اپنی صحت کی بحالی کی طرف توجہ دے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سمجھ رہا ہے۔ اس کی اندرونی خوشی کو محسوس کر کے میرا اپنا دل خوشی سے کھل اٹھا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک درد سا بھی لہر لے رہا تھا۔ کسی کی یاد آ رہی تھی۔ وہی جو بچھڑ گئی تھی...... اور اب اور دور چلی گئی تھی۔ پتا نہیں کہ ان لمحوں میں وہ کیوں یاد آ گئی تھی۔ اپنے ہی خیالوں میں مگن میں ابراہیم کی قیام گاہ سے نکلا اور ڈی پیلس کی بلند و بالا قالین پوش راہداریوں میں چلتا احاطے کی طرف روانہ ہو گیا۔ احاطے میں نئی خندقیں کھودی جا رہی تھیں اور حفاظتی انتظامات کیے جا رہے تھے۔ کل رات والے نقصان کے باوجود رضاکار دستے پُرجوش تھے۔ ابھی میں نے احاطے میں چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایک باوردی لیفٹیننٹ تیز قدموں سے آیا اور مجھے سیلوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہر ہائی فس آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔''

اس کی مراد قسطینا سے تھی۔ شاید اس نے مجھے اپنے آفس کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا یا پھر کسی کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرے میں۔ میں لیفٹیننٹ کے ساتھ اس کے آفس میں پہنچا۔ وہ وردی میں تھی اور ذرا مؤدب انداز میں کھڑی فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں بیٹھ گیا۔

وہ ملائی زبان میں کسی کو تسلی دے رہی تھی کہ یہ چھوٹا سا عارضی ''اپ سیٹ'' ہے۔ آخری فتح ہماری ہی ہونی ہے۔ ہمیں ثابت قدم رہنا چاہیے...... جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ عزت مآب ریان فردوس سے بات کر رہی ہے اور وہ ہمیشہ کی طرح جنگی صورت حال سے گھبرایا ہوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ریان فردوس کے دل و دماغ میں امریکیوں کا خوف گھر کر چکا ہے۔ یہ سوچ اس کا پیچھا چھوڑتی ہی نہیں کہ آخر کار امریکی ایجنسی نے غالب ہو جانا ہے۔

ریان فردوس سے بات ختم کر کے قسطینا کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر کچھ دیر خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر میری طرف دیکھا۔ میرے بازو کی خیر خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں؟

میں نے بتایا کہ ابراہیم کو دیکھ کر آیا ہوں۔

وہ بولی۔ ''خدا کا شکر ہے کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔ اس نے زینب کی موت کا بہت زیادہ صدمہ لے لیا ہوا ہے۔ اگر پرسوں بروقت اس کے کمرے کا دروازہ نہ توڑ دیا جاتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

ایک دو منٹ اس بارے میں بات ہوئی پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''کل رات والے واقعے کا کیا کھوج لگا ہے؟ سنا ہے کہ ہیلی کاپٹرز اپنے تھے اور ان میں پائلٹ بھی اپنے ہی تھے۔''

''یہ سراسر غداری کا معاملہ ہے۔ یہ ایجنسی والے ''باسٹرڈز'' جوڑ توڑ کے ماہر ہیں۔''

''لیکن یہاں تو کچھ اور طرح کی افواہیں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ اسے ہاناوانی کی سپر نیچرل صلاحیتوں کا شاخسانہ قرار دیا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ان دونوں پائلٹس نے ایک خطرناک ''عاملہ'' کے لیے معمول کا کردار ادا کیا ہے۔''

''یہ سب بکواس ہے۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔ یہ سب یہاں کے مقامی لوگوں کی توہم پرستی ہے اور فرسودہ عقیدے ہیں۔''

''آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ہاناوانی ایک نارمل عورت ہے۔ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں جسے سپر نیچرل کہا جا سکے؟''

''میں صرف اتنا سمجھتی ہوں کہ وہ بے حد ذہین ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر آنے والے وقت کو بھانپ لیتی ہے اور پیش گوئی کر سکتی ہے۔ اپنی اسی پیش گوئی کی صلاحیت کے زور پر وہ لوگوں کو اپنے اثر میں لے لیتی ہے...... اور کچھ نہیں۔ باقی جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ جھوٹ ہے۔ حقیقت اور سائنس سے بہت دور ہے۔''

''لیکن قسطینا! کچھ چیزوں کو تو سائنس بھی مانتی تھی۔ مثلاً ہپناٹزم اور خیال خوانی وغیرہ۔''

''یہاں پر ہپناٹزم کہاں سے آگیا؟'' وہ ذرا چڑ کر بولی۔ ''جن دو پائلٹس کی ہم بات کر رہے ہیں، وہ اپنی ڈیوٹی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ حالیہ دنوں بلکہ حالیہ مہینوں میں وہ جاماجی کی حدود سے باہر ہی نہیں گئے۔ پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی ہاناوانی سے نہیں ملے۔ پھر وہ کیسے اس عورت کے ''معمول'' بن گئے۔ یہ سب زبانی جمع خرچ ہے اور یقین کی کمزوری ہے۔''

''کہیں ایسا نہ ہو کہ رضا کاروں میں بددلی پھیلنا شروع ہو جائے۔'' میں نے اندیشے کا اظہار کیا۔

''اس بات کا مجھے بھی ڈر ہے۔ یہ ہاناوانی اور رائے زل کا پرانا طریقہ ہے کہ افواہیں پھیلانے کے لیے اپنے جاسوس چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں متعلقہ لوگوں کو ہدایات جاری کی ہیں۔ وہ مشکوک لوگوں کی ٹوہ لگا رہے ہیں۔''

میرا دل چاہ رہا تھا کہ زینب کے سلسلے میں قسطینا کو اعتماد میں لوں اور اسے بتاؤں کہ ان سب کا چھپا آقا جان پسِ پردہ رہ کر کیا کیا کام دکھا رہا ہے۔ مگر میں اس حوالے سے جلد بازی بھی کرنا نہیں چاہتا تھا، آقا جان کی جڑیں ان لوگوں میں بہت گہری تھیں۔

کچھ افسران جن میں فوجی افسران بھی تھے، قسطینا سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔ قسطینا نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور میں اس سے رخصت ہو کر انیکسی پہنچ گیا۔

انیکسی کا مین گیٹ اور قریب والے دو تین کمرے بالکل تباہ ہو گئے تھے۔ کئی دیواریں دھوئیں سے بالکل سیاہ دکھائی دے رہی تھیں۔ کل رات والی بمباری کے اثرات اکثر لوگوں کے چہروں پر تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ایک انجانا سا خوف بھی لوگوں کے چہروں پر دکھائی دیتا تھا۔ اس خوف کا تعلق اسراریت سے تھا۔ اپنے ہی پائلٹوں کا ڈی پیلس جیسی اہم ترین جگہ پر حملہ کر دینا بے حد تشویش اور حیرت کا باعث تھا۔

میں اپنے کمرے کا بغلی دروازہ کھول کر زینب کے پاس پہنچا۔ انیق بھی وہیں موجود تھا اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے زینب کو وہ وڈیو دکھائی جو ابھی کچھ دیر پہلے ابراہیم نے ریکارڈ کروائی تھی۔

بڑی صاف اور واضح وڈیو تھی۔ ابراہیم نے زینب کو اپنی صحت کے بارے میں تسلی دی تھی اور ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ عزت مآب سے وہ اور والدہ بات چیت کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ زینب کی فرمائش پر میں نے وڈیو کو دو تین بار پلے کیا۔ اس کے رنج و غم میں کمی محسوس ہونے لگی۔ وہ ایک بار پھر ضد کرنے لگی کہ وہ ماں جی یعنی بیگم نورل سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ بار بار سسکنے لگتی تھی۔

اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ جاماجی کے لوگوں کی نظر میں وہ مر چکی ہے۔ قریبی قبرستان میں اس کی قبر موجود ہے اور اس کے نام کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ اب ماں جی سے ملنا یا عام لوگوں کے سامنے آنا اتنا آسان نہیں تھا۔ حسبِ معمول اسے تسلی تشفی دے کر میں اور انیق دوسرے کمرے میں آن بیٹھے۔

انیق نے کہا۔ ''وہ کل رات والے واقعے سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ آپ نے اسے بچانے کے لیے خود کو خطرے میں ڈال لیا۔ دھوئیں سے بچنے کے لیے بس ایک ہی ماسک تھا جو آپ نے اس کے چہرے پر چڑھایا۔''

''ہاں، ایک دفعہ تو مجھے بھی تارے نظر آگئے تھے لیکن پھر دروازے کھلنے کی وجہ سے دھواں ایک دم نکلنا شروع ہو گیا۔''

اس کی حسِ ظرافت جو کسی بھی موقع پر پھڑک سکتی تھی، پھڑک اٹھی۔ بڑے اشتیاق سے بولا۔ ''ویسے میرا بہت دل چاہتا ہے جی کہ کسی وقت مجھ پر بھی کوئی ایسا وقت بنے، میں کسی مصیبت میں پھنسوں اور آپ ''انیق...... انیق'' پکارتے ہوئے میری مدد کو لپکیں۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ایسا وقت جلد ہی آجائے، تم جس طرح سجاول کی شان میں قصیدے پڑھتے رہتے ہو، اس نے تمہیں اٹھا کر پٹخنا ہے اور نچوڑنا ہے۔ مجھے ہی انیق...... انیق کہتے ہوئے

تمہاری طرف لپکنا ہے اور یہ بات بھول جاؤ کہ وہ واپس نہیں آئے گا۔''

''اللہ کا نام لیں۔ شام کا وقت ہے۔ کیوں بری بری باتیں کرتے ہیں۔''

''یہ شام کا نہیں، دوپہر کا وقت ہے۔ میرا خیال ہے کہ سجاول کا نام سن کر تمہیں ویسے ہی تارے نظر آنے لگتے ہیں۔''

تارے تو مجھے امریش...... مم میرا مطلب ہے سجاول بھائی کے بغیر بھی نظر آرہے ہیں۔ زینب کی بڑی سخت ڈیوٹی دینا پڑ رہی ہے۔ یہ دھڑکا علیحدہ سے لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کا بھید نہ کھل جائے۔ ویسے میں آپ کو سچ بتاتا ہوں شاہ زیب بھائی، ہم زینب کو اب زیادہ دیر چھپا نہیں سکیں گے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہاں کے ملازمین اور گارڈز وغیرہ بھی شک میں پڑ چکے ہیں۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''کمانڈر افغانی جس طرح خیام مانش کو یہاں سے لے کر گئے ہیں، زینب کو بھی لے جائیں۔ یقینی بات ہے کہ وہ اب اسے پوری حفاظت سے رکھیں گے۔''

''زینب نہیں مانے گی۔ میں نے اس سے تھوڑی سی بات کر کے دیکھی تھی۔ اسے کمانڈر افغانی سے بھی خوف آنے لگا ہے۔ حالانکہ افغانی نے اپنے طور پر اس کا بھلا ہی سوچا تھا۔ بہت بڑا رسک لیا تھا اس کی خاطر۔ وہ چاہتے تھے کہ اسے چند ہفتوں تک خیام کے گھر کے تہ خانے میں حفاظت سے رکھیں اور جب معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے تو اسے یہاں سے نکال کر پاکستان پہنچا دیں...... یا پھر کسی اور جگہ جہاں وہ زندہ رہ سکے۔''

''کمانڈر افغانی سے یہ سب کچھ کروایا کس نے؟ انہیں تو بس یہ کرنا تھا کہ بیگم نورل کی ہدایت پر زینب کو پاکستان پہنچا دینا تھا؟''

''اس حوالے سے تمہارے دماغ شریف میں کون سا نام آتا ہے؟''

''میرے دماغ میں تو بس ایک ہی منحوس چہرہ ابھرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں...... آدھا سر گنجا، پرلے درجے کا سڑیل لیکن بہت زیادہ خچرا۔ آقا جان...... آقا جان۔''

''خچرا نہیں ہے بے حد عیار کہو اور بہت خطرناک بھی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ واقعی زینب کے لیے مہلک ثابت نہ ہو جائے۔''

''اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ اب ہمیں زینب کو مزید اس کمرے میں نہیں رکھنا چاہیے۔''

''میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں قسطینا کو اس سلسلے میں اعتماد میں لوں۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر تک میرے اور انیق کے درمیان اس موضوع پر بات ہوئی۔ پھر میں نے قسطینا کو کال کی اور اسے کہا کہ میں ایک ضروری بات کرنے کے لیے اس سے ملنا چاہتا ہوں۔

وہ بولی۔ ''ایک گھنٹے بعد ایک اہم میٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ تم دس پندرہ منٹ تک آفس میں پہنچ جاؤ۔''

میں قسطینا سے دوبارہ ملنے کے لیے روانہ ہوا۔ سیفی کے کمرے کے پاس سے گزرا تو ٹھٹک گیا۔ اس کے کمرے کے دروازے کی نچلی درز سے دھواں نکل رہا تھا۔ میں نے پہلے دستک دی، پھر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ واش روم میں پانی گرنے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ قالین پر سگریٹ کا ٹکڑا پڑا تھا جس نے قالین کے ایک کونے کو جلا دیا تھا۔ میں نے پاؤں مار کر سلگتے ہوئے قالین کو بجھایا۔ سیف کی بے پروائی پر غصہ آیا۔ وہ سگریٹ بھی پیتا تھا اس کا پتا مجھے آج ہی چلا تھا۔

میں وہیں بیٹھ گیا اور اس کے واش روم سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا تاکہ اسے تھوڑی سی سرزنش کر سکوں۔ اسی دوران میں سیفی کے رنگ برنگے سیل فون کی بیل ہوئی۔ میوزک بجنے لگا۔ عیسیٰ خیلوی نغمہ سرا ہوا...... قمیص تیری کالی...... تے سوہنے پھلاں والی۔ سیل فون بیڈ پر تکیے کے پاس پڑا تھا۔ میں نے اس کی اسکرین دیکھی اور دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اسکرین پر تاجور کی تصویر نظر آرہی تھی اور نیچے لکھا ہوا تھا۔ ''سجن پیارا'' سیفی نے تاجور کا نمبر ''سجن پیارا'' کے نام سے سیو کر رکھا تھا۔

یہ ٹیکنالوجی کا کمال ہی تو تھا۔ پاکستان سے ہزاروں میل دور برونائی دارالسلام کے اس نواحی جزیرے میں ایک لڑکی کی کال آرہی تھی۔ وہ پنجاب کے ایک دور دراز گاؤں کی کسی حویلی میں بیٹھی ہوگی اور اپنے محبوب کے لیے اس کی صدا یہاں ڈی پیلس کے اس کمرے تک پہنچ رہی تھی۔ سیل فون مجھ سے چند فٹ کی دوری پر تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لوں۔ کال ریسیو کر کے 'ہیلو' کہوں اور جواب میں تاجور کی آواز یا اس کے سانسوں کی آہٹ سنوں۔ اس سے کہوں۔ میں بدنصیب شاہ زیب بول رہا ہوں...... کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا...... تمہیں یاد ہو کہ نہ

یاد ہو۔

لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں ایسا کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اگر کرنا ہوتا تو پھر اسے جانے ہی کیوں دیتا۔

میوزک بند ہو گیا۔ اسکرین تاریک ہو گئی۔ وہ چہرہ اوجھل ہو گیا جو ہمیشہ کے لیے میرے دل کی گہرائیوں میں نقش ہو چکا تھا۔

دو تین منٹ بعد سیفی تولیے سے سر پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس نے پہلے حیرانی سے مجھے دیکھا، پھر دھوئیں کی بُو سونگھی، تب اس کی نگاہ قیمتی قالین کے جلے ہوئے کنارے پر پڑی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہاں تماشا ہونے والا تھا۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ ''استاد صاحب! میں کھلاڑی ہوں۔ تمبا کو شمبا کو کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ یہ کرخت سنگھ کا کارنامہ ہے۔ دو تین پیگ بھی لگائے ہوئے تھے اس نے...... سگریٹ کا ٹوٹا غلطی سے ایش ٹرے میں رکھنے کے بجائے نیچے پھینک دیا ہوگا۔''

''اور تم نے کتنے پیگ لگائے ہوئے تھے؟''

''صرف ایک...... آپ کو پتا ہی ہے کہ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولتا۔''

اسی دوران میں اس نے اپنے فون کی اسکرین چیک کی...... اور ذرا مضطرب نظر آنے لگا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ کس کی 'مسڈ کال' ہے اور یہ کال وہ میرے سامنے ریسیو نہیں کر سکتا تھا۔ رسمی انداز میں بولا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔ اگر آپ نہ دیکھتے تو کیا پتا آگ ہی لگ جاتی۔ مجھے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی ہے......'' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''آپ کے لیے چائے منگواؤں بڑی زبردست قسم کی؟''

میں اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، میں اب چلتا ہوں۔ آئندہ بہت احتیاط رکھنا۔''

''میں ابھی بات کرتا ہوں جی کرخت سنگھ سے۔''

میں باہر آ گیا...... سینے میں ایک دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ قسطینا کی طرف جانے کو بھی دل نہیں چاہا۔ سگریٹ کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ میں واپس کمرے میں آ گیا۔ سگریٹ سلگایا پھر چند تلخ گھونٹ الکحل کے لیے۔ برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ نگاہ سیفی والے کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے سیفی نظر آ رہا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور فون پر بات کر رہا تھا۔ یقیناً دوسری طرف تاجور ہی تھی۔ سیفی کے چہرے پر مسکراہٹیں تھیں۔ وقفے وقفے سے وہ بلند آواز میں ہنستا بھی تھا اور اس کے سفید دانت چمکنے لگتے تھے۔ میرے سینے میں بھرا ہوا دھواں کچھ اور گہرا کچھ اور گاڑھا ہو گیا۔ دم گھٹنے لگا۔ میں نے اب تک کی زندگی میں عورت کو کبھی بہت زیادہ اہمیت نہیں دی تھی اور جن کو کچھ اہمیت دی تھی، انہوں نے کئی گنا زیادہ ''مجھے'' اہمیت دی تھی اور وہ کوئی معمولی خواتین نہیں تھیں، یورپ کے ایک سے بڑھ کر حسین چہرے، مگر اس عام سی دیہاتی لڑکی نے میرے دل و دماغ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔

اسی دوران میں سیف نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور کھلی جگہ پر آ کر ''ہیلو...... ہیلو'' کرنے لگا۔

''ہیلو تاج...... ہیلو تاج۔'' اس کی مدھم آواز میری سماعت تک پہنچی۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ یقیناً یہ سمندر پار سے ایک مہنگی کال تھی۔ دو چار منٹ میں ہی شاید دوسری طرف سے بیلنس ختم ہو گیا تھا۔

میں اپنی کمزوریاں چھپا نہیں رہا۔ اپنی قلبی وارداتوں کو صاف صاف بیان کر رہا ہوں۔ ان دنوں تاجور کے غم سے لڑنے کے لیے مجھے دو ہی طریقے سمجھ میں آتے تھے۔ الکحل کے تلخ کڑوے گھونٹ، یا پھر زلفوں کی چھاؤں اور گرم سانسوں کی سرسراہٹ۔ بے شک میرا دل یہ گواہی بھی دیتا تھا کہ یہ سب کچھ ٹھیک نہیں، یہ محبت کی توہین ہے...... لیکن میرے پاس دکھ کے حصار سے نکلنے کے لیے کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ دبلی پتلی نازک اندام جاناں میرے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ہر وقت منتظر رہتی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اسے فون کروں مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ جو چیز اسے ہر وقت بلا رکاوٹ میسر ہوتی ہے، اس کے لیے طلب اور بے قراری کم ہو جاتی ہے۔ انسان نئی زمینوں پر قدم رکھنے کے لیے اور نئی فتوحات کے لیے ہر وقت بے چین رہتا ہے۔ اسے بھی انسانی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری یا کج روی ہی کہا جا سکتا ہے۔

میرا دل چاہا کہ ''قسطینا'' کے پاس پہنچوں۔ اسے خود میں الجھاؤں اور خود اس میں الجھوں۔ اس نے مجھے دس پندرہ منٹ میں آنے کے لیے کہا تھا۔ اب آدھ گھنٹے سے بھی زائد وقت گزر چکا تھا۔ میں نے ریفریجریٹر میں سے ایک کیک پیسٹری نکالی اور اسے احتیاط سے لپیٹ کر ہاتھ میں لے لیا۔

سیکیورٹی کے مختلف مراحل سے گزر کر میں ڈی پیلس

کے اس حصے میں داخل ہوا جہاں قسطینا یعنی جاماجی کی سپریم کمانڈر کا شاندار دفتر تھا۔ وہاں جاماجی کا دو رنگ والا جھنڈا لہرا رہا تھا اور حفاظتی دستے کے ارکان چمکتی دمکتی وردیوں کے ساتھ چوکس کھڑے تھے۔ پروٹوکول کی گاڑیاں بھی موجود تھیں اور کچھ فاصلے پر ڈی پیلس کے ہیلی پیڈ پر ایک گن شپ ہیلی کاپٹر کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ میں اس کے آفس میں پہنچا تو وہ میری ہی منتظر تھی۔

"تم پورا آدھ گھنٹا لیٹ ہو۔" اس نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔

"لیکن یہ بھی تو پوچھیں کہ کیوں لیٹ ہوں؟"

"میرے خیال میں اس کے بجائے تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا بات کرنا چاہ رہے تھے؟" اس نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ بہت جلدی میں ہیں تو پھر کسی اور وقت سہی۔"

"نہیں، نہیں۔ ابھی کچھ وقت ہے، تم بتاؤ۔" اس نے ذرا ایزی نظر آنے کی کوشش کی اور سیل فون آف کر دیا۔

"میں آج خود کو تنہا محسوس کر رہا ہوں...... بہت زیادہ تنہا۔" میں نے اپنی دلی کیفیت بیان کی۔

وہ مسکرائی۔ "عجیب بات ہے۔ یہ بات ایک اسٹار کھلاڑی کہہ رہا ہے۔ جو اَن گنت دلوں کی دھڑکن ہے جس کے ایک اشارے پر اس کے اردگرد اس کے چاہنے والوں کے جمگھٹے لگ سکتے ہیں۔"

"بعض دفعہ بندہ ہجوم میں بھی تو اکیلا ہوتا ہے۔"

"آج تو فائٹر، شاعرانہ موڈ میں نظر آ رہا ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔"

"یہ...... تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

میں نے ریپر کھول کر بلیک فاریسٹ کی پیسٹری اس کے سامنے...... شیشے کی تپائی پر رکھ دی۔ "آج میری سالگرہ ہے اور پتا نہیں کیوں دل چاہ رہا تھا کہ آج میں یہ سالگرہ آپ کے ساتھ مناؤں۔"

"بھئی، واقعی شاعرانہ موڈ ہے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر الماری کی طرف گئی اور پیسٹری کاٹنے کے لیے چھری نکال لائی۔ "چلو آؤ۔" اس نے کہا۔

"کہاں؟"

"بھئی یہ آفس ہے، یہاں سالگرہ تو نہیں منائی جا سکتی نا؟" وہ مسکرائی۔

ہم اٹھ کر ساتھ والے ریٹائرنگ روم میں آ گئے۔ یہ وہی سجا سجایا آرام دہ کمرا تھا جہاں ہم اس سے پہلے بھی کچھ "اچھا وقت" گزار چکے تھے۔ یہیں پر وہ بے مثال اسپائی کیمرا بھی نصب تھا جو اَب تک نگاہوں سے اوجھل تھا اور گاہے بگاہے مجھے قسطینا کے حوالے سے انفارمیشن فراہم کرتا رہتا تھا۔

آج واقعی میری سالگرہ کا دن تھا...... اور مجھے کسی کی اچھی کمپنی کی ضرورت بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ قسطینا مجھے کچھ اور "آگے بڑھنے" کا موقع دے اور میں خود کو اس کی دلکش قربت میں کچھ دیر کے لیے فراموش کر دوں۔ قسطینا، دو تین اسنیکس لے آئی۔ میں نے پیسٹری کو کاٹ کر دو ٹکڑوں میں بدلا۔ قسطینا نے تالی بجائی اور "ہیپی برتھ ڈے" کہا۔

اس نے اپنی گرین کیپ اتار دی اور اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولی۔ "تمہیں کیا تحفہ دیا جائے شاہ زائب؟"

"میرے لیے آپ کسی بڑے تحفے سے کم نہیں ہیں۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

اس کے سرخ و سپید چہرے پر شرم کی سرخی لہرا گئی۔ شاید اسے پچھلی ملاقات کی "گرمجوشی" یاد آ گئی تھی۔ "چلو تحفہ ادھار سہی" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اور کیپ دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے بولی۔ اس کی نگاہ بار بار وال کلاک کی طرف اٹھ رہی تھی۔

میں ابھی تک اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ اچانک قسطینا کو احساس ہوا کہ وہ آدابِ میزبانی کے خلاف جا رہی ہے۔ میں ابھی تک بیٹھا تھا اور وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے میرے چہرے پر تھوڑا تاسف بھی نظر آیا ہوگا۔ وہ پھر سے میرے قریب بیٹھ گئی اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر میرے رخسار کو چوما۔ "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔"

میں تو پہلے ہی کسی ایسی پیش رفت کا منتظر تھا۔ میں نے اسے اپنے اکلوتے سلامت بازو کے حصار میں لے لیا۔ اگلے ایک دو منٹ دو طرفہ گرمجوشی کے تھے۔ ایک دم میری نظر وال کلاک پر پڑی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ "قسطینا! اس وقت تو آپ کو میٹنگ میں ہونا چاہیے تھا۔ آپ لیٹ ہو رہی ہیں۔"

"لیٹ ہو چکی ہوں۔" وہ اپنی جگہ لیٹے لیٹے بولی پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا سیل فون اٹھایا...... اور آن کیا۔ آن ہوتے ہی اس پر کال کے سگنلز آنے لگے۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے حلیمی کی مدھم آواز ابھری۔ "یور

ہائی نس، یہاں میٹنگ کے لیے آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔‘‘

’’سوری، میں میٹنگ میں نہیں آسکوں گی۔ آپ خود اسے ہیڈ کرلیں اور جن پوائنٹس پر بات ہوئی تھی، وہ ڈسکس کرلیں۔‘‘

’’آ......آپ خیریت سے تو ہیں؟‘‘ حلمی کی فکرمند آواز ابھری۔

’’طبیعت ذرا بوجھل ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا آرام کرنا چاہتی ہوں۔ شام والی میٹنگ اور تقریر کا پروگرام وہی رہے گا۔‘‘ اس کے لہجے میں لیڈرانہ طمطراق تھا۔

حلمی کو کچھ ضروری ہدایات دے کر قسطینا نے سیل فون کو سائیلنٹ پر کر دیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی، جیسے پوچھ رہی ہو...... ایسٹرن کنگ اب خوش ہو؟

میں واقعی خوش تھا۔ قسطینا نے مجھے کمپنی دینے کے لیے ایک اہم ملاقات کو کینسل کیا تھا لیکن کچھ ’’گلٹی‘‘ بھی محسوس کر رہا تھا۔ میں اس طرح اس کا حرج کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ’’مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔ شاید کچھ افسران ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ میں آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں۔‘‘

’’اب اور ڈسٹرب تو نہ کرو۔‘‘ وہ میری ناک کو چٹکی میں پکڑتے ہوئے بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ’’میں ذرا ’’چینج‘‘ کر کے آتی ہوں۔‘‘

چند منٹ بعد وہ ایک ایزی سے اسمارٹ لباس میں واپس آئی۔ یہ سفید پتلون اور سرخ رنگ کی ہاف سلیو شرٹ پر مشتمل تھا۔ پسٹل جو ہر لباس میں اس کی کمر سے بندھا رہتا تھا اب نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے مدھم آواز میں میوزک آن کر دیا اور بولی۔ ’’کیا پیو گے ایسٹرن؟‘‘

’’جو آپ کی مرضی۔‘‘

اس نے اپنے لیے سافٹ ڈرنک اور میرے لیے بیئر انڈیلی۔ ’’تمہارے موڈ کے مطابق ٹھیک انتخاب کیا ہے نا؟‘‘ اس نے گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اپنے مشروب کی چسکی بھرتے ہوئے بولی۔ ’’کسی وقت لگتا ہے ایسٹرن! کہ کوئی بہت بھاری بوجھ اٹھائے پھرتے ہو...... کوئی لڑکی تھی؟‘‘

’’اگر میں کہوں کہ ’’ہاں‘‘ ...... تو آپ کو کوئی فرق پڑے گا؟‘‘

’’مجھے ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں نے بھی تو تمہیں بتایا تھا کہ میں نے ماضی میں ایک لڑکے کو چاہا تھا۔ تمہیں کیا فرق پڑا؟‘‘

’’ہاں، یہ سب کچھ ہماری زندگی کا حصہ ہوتا ہے۔ اگر ہم ایسی باتوں کو جھٹلاتے ہیں تو اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے۔‘‘

میں نے اسے اپنی زندگی کے مختلف نشیب و فراز کے بارے میں مختصراً بتایا اور سرسری انداز میں تاجور کا ذکر بھی کیا۔ میں اس کا ذکر اتنی شدت سے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ رقابت محسوس کرنے لگتی۔ میں نے اسے بتایا کہ اب میری اور اس کی راہیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہیں۔ قسطینا نے بھی اپنے حالات کے بارے میں مختصر تذکرہ کیا...... اور اپنے پیارے والد کی موت کے بعد کے احساسات میرے ساتھ شیئر کیے۔ اسے اس بات کا دکھ تھا کہ ’’برج کلب‘‘ پر اتنے کامیاب حملے کے باوجود اس کے والد کا اصل قاتل چیف گیرٹ زندہ ہے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ چیف گیرٹ مرتا تو شاید رائے زل کو اتنا نقصان نہ ہوتا جتنا کئی بڑے بڑے جرنیلوں کے جہنم واصل ہونے سے ہوا ہے اور چیف گیرٹ بھی کون سا سلامت ہے اسپتال کے آئی سی یو میں پڑا ہے۔

وہ بولی۔ ’’ایسٹرن! تمہاری یہ بات تو درست ہے کہ برج کلب کی تباہی میں گرے فورس کی ہائی کمان بری طرح تہس نہس ہو گئی ہے۔ کئی اہم کمانڈر جان سے گئے ہیں۔ امریکن ایجنسی کے اہم آفیسر بھی مرنے والوں میں شامل ہیں۔ اس حوالے سے ہم ایک پلان بنا رہے ہیں۔ شام والی میٹنگ بھی اسی سلسلے میں ہے۔‘‘

’’کس قسم کا پلان ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ وہ مسکرائی۔ ’’یہ کونفیڈینشل ہے۔ کم از کم ابھی تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔‘‘

میں نے زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ہم ایک ہی آرام دہ صوفے پر ایزی موڈ میں بیٹھے تھے۔ میں ہاف سلیو شرٹ میں تھا۔ وہ میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ’’تمہیں ٹی وی اسکرین پر اور انٹرنیٹ وغیرہ پر سیکڑوں دفعہ دیکھا تھا لیکن کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تمہیں اس طرح چھو کر دیکھ سکوں گی۔ تم اپنے اس داہنے بازو کا استعمال بہت زیادہ کیا کرتے ہو اور کبھی کبھی اس کہنی سے چوٹ بھی لگاتے ہو۔‘‘ اس نے بازو کو پلٹ کر میری کہنی دیکھی۔ وہاں ایک براؤن نشان سا تھا، جیسے گٹا پڑ گیا ہو۔ یہ اسی وجہ سے تھا کہ میں ’’ایم ایم اے‘‘ کی فائٹس میں اس کہنی کو اکثر ضرب لگانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ (ہر فائٹر کا کوئی نہ کوئی

پسندیدہ ہتھیار تو ہوتا ہے)

وہ بولی۔ ''دیکھا، میں ٹھیک کہہ رہی تھی نا؟ تمہاری کہنی یہاں سے براؤن اور سخت ہو چکی ہے۔'' پھر جیسے اُسے اچانک کچھ یاد آیا۔ اس نے میری شرٹ کو پتلون میں سے کھینچا اور اسے اوپر اٹھا کر میرے پہلو کی پسلیوں کو دھیان سے دیکھنے لگی۔ میں اسے روکتا ہی رہ گیا۔ اس نے ایک جگہ انگلی رکھی اور بولی۔ ''دیکھ لو، میں نے ڈھونڈ لیا نا۔''

یہ ایک بہت ہلکا سا نشان تھا۔ ڈیڑھ دو انچ کی مدھم لکیر سی تھی۔ میں اسے خود بھی فراموش کر چکا تھا لیکن اسے سب یاد تھا۔ کہنے لگی۔ ''تمہاری فائٹ ہوئی تھی۔ کوئی یورپی فائٹر ہی تھا۔ ملک یاد نہیں مگر نام اب تک یاد ہے۔ انتھونی برک...... بڑی خوفناک فائٹ تھی وہ...... پورا رِنگ خوناں خون ہو گیا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا؟''

''تھوڑا تھوڑا۔'' میں نے اندازِ بے نیازی سے کہا اور مسکرایا۔

وہ بولی۔ ''اب تم سپر اسٹار بننے کی کوشش کر رہے ہو لیکن...... تم ہو بھی سپر اسٹار۔ اب اس نشان کو ہی دیکھو، یہ سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو یاد ہوگا اور وہ واقعہ بھی یاد ہوگا۔ تم وہ لڑائی پوائنٹس پر جیت گئے تھے۔ لڑائی ختم ہونے اور ٹرافی اٹھانے کے بعد تم رِنگ سے نیچے آئے تھے اور اس وقت تم پر انتھونی کے ایک پرستار نے قینچی سے حملہ کر دیا تھا، پھر اس کے دو تین ساتھی بھی تم پر چڑھ دوڑے تھے۔ تم نے ایک کی ناک کی ہڈی توڑ ڈالی تھی دیگر کو تمہارے پرستاروں نے سنبھال لیا تھا، اچھا خاصا ہنگامہ ہوا تھا، کئی لوگ گرفتار ہوئے تھے۔''

''زبردست۔'' میں نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ ''آپ تو پوری وکی پیڈیا ہیں۔''

وہ ستائشی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ''میں اکیلی نہیں، ہزاروں بلکہ لاکھوں ہوں گے جنہیں تم سے زیادہ تمہارا پتا ہو گا۔ میں کوئی ناجائز تعریف یا قصیدہ خوانی نہیں کر رہی ہوں۔ یہ حقیقت ہے ایسٹرن کہ تم لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہو۔ شاید تمہیں خود بھی اپنی پذیرائی اور مقبولیت کا احساس نہیں۔ میں اب تک ٹھیک سے سمجھ نہیں پائی کہ تم کیوں بتدریج Ring سے نکلے ہو، دنگا فساد میں پڑے ہو اور اب ایم ایم اے کے میدان میں بالکل ہی دکھائی نہیں دے رہے ہو۔''

''چلو، یہاں تو دکھائی دے رہا ہوں۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''اور یہ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات ہے۔''

''چلیں، یہ کہانی بھی آپ کو جلد سناؤں گا یہ شرطِ زندگی۔''

اس نے میرے زخمی کندھے والے بازو پر ہاتھ چلایا۔ انداز وہی کھویا کھویا سا تھا تب اس نے سائڈ ٹیبل پر سے مارکر پین اٹھایا اور میرے بازو کے پلاستر پر لکھ دیا۔ ''گیٹ ویل سون۔''

''یہ کیا غضب فرما رہی ہیں۔ آپ کی لکھائی آپ کے کمانڈر اور بزرگ اچھی طرح پہچانتے ہیں۔''

''تو پھر کیا ہوا۔ کسی کے صحت مند ہونے کی دعا کرنا، کیا کوئی بری بات ہے؟''

''لیکن جاماجی گرین فورس کی ''سپریم کمانڈر'' جب یہ دعا اپنے ہاتھ سے کسی پردیسی کے بازو پر لکھتی ہے تو پھر یہ بری بات ہو جاتی ہے شاید آپ کو احساس نہیں کہ آپ کے کمانڈرز اور آفیسرز ہمارے میل جول کا کتنا برا منا رہے ہیں۔''

''کیا تم سے کسی نے کچھ کہا ہے؟''

میں کہنا چاہتا تھا کہ ہاں ایسا ہوا ہے۔ (کمانڈر افغانی کے ساتھ میری جو دھواں دھار گفتگو ہوئی تھی، اس کا نکتہ آغاز، میرا اور قسطینا کا میل جول ہی تھا) لیکن میں افغانی کا نام لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آقا جان صاحب کی نظروں میں اپنے لیے کئی دفعہ بیگانگی اور غصہ دیکھا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہماری ہر ملاقات کی رپورٹ اُن تک پہنچتی ہے اور ان کے اندر طیش جمع ہو رہا ہے۔''

''نہیں ایسٹرن! انکل آقا جان کے بارے میں کوئی منفی بات ذہن میں نہ لاؤ۔ وہ ہر طرح سے اس خاندان کے وفادار ہیں...... اور اب سے نہیں مدتوں سے ہیں۔ ان کا ہر قدم بہتری اور بھلائی کے لیے ہی ہوتا ہے۔''

''قسطینا! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آقا جان پر اس طرح اندھا اور غیر مشروط اعتماد کیوں کیا جاتا ہے۔ آخر کو وہ بھی انسان ہیں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔''

''مگر وہ سب سے بہتر ہیں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنا ہاتھ قسطینا کے ہاتھ پر رکھا۔ ''قسطینا! اگر میں یہ بات کہوں کہ آقا جان بہت سی باتوں سے آپ کو بھی بے خبر رکھ رہے ہیں اور یہ کہوں کہ ڈی پیلس میں جو نہایت سنگین صورتِ حال بنی ہوئی ہے، اس کی وجہ آقا جان ہیں تو پھر؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''کیسی بات کہہ رہے ہو؟ اور سنگین صورتِ حال سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''زینب کی موت کی وجہ سے ابراہیم خود بھی موت کے منہ میں ہے۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا ہے تو بیگم نورل بھی شاید زندہ نہیں رہ سکیں گی۔ چھوٹے بھائی کو کچھ ہو گیا تو بڑا بھائی بھی باپ سے باغی ہو جائے گا۔ عین جنگ کی حالت میں ڈی پیلس کا شیرازہ بکھر جائے گا۔''

''ابراہیم کی حالت سے انکل کا کیا تعلق؟''

''بے حد گہرا تعلق ہے قسطینا! لیکن آپ لوگ بے خبر ہیں۔ میں آپ کو اپنا سمجھ کر یہ باتیں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ انہیں اپنے تک ہی رکھیں گی۔ اگر میں آپ پر یہ انکشاف کروں کہ ابراہیم کی دلہن زینب ابھی زندہ ہے...... تو پھر؟''

اس نے حیران ہو کر بیئر کے گلاس کی طرف دیکھا۔ جیسے جانچنا چاہ رہی ہو کہ میں کہیں کوئی اور کڑک چیز بہت زیادہ مقدار میں تو نہیں پی گیا پھر لرزاں لہجے میں بولی۔ ''مجھے تمہاری بات سمجھ میں نہیں آرہی شاہ زائب۔''

میں نے پہلے قسطینا کو رازداری کا پابند کیا، پھر تفصیل کے ساتھ سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا...... آدھی رات کے وقت زینب کا ابراہیم کے نام خط لکھنا...... بیگم نورل کا اسے کمانڈر افغانی کے حوالے کرنا...... اور پاکستان پہنچانے کی ہدایت کرنا، کمانڈر کو آقا جان کا حکم کہ زینب کو قتل کر دیا جائے۔ افغانی کی رحم دلی...... زینب کو نہ مارنا اور اس کی ہلاکت کا ڈھونگ رچانا...... میں نے سب کچھ قسطینا کے گوش گزار کر دیا۔ وہ حیرت سے گنگ سنتی رہی۔ اس کا چہرہ رنگ پر رنگ بدلتا رہا۔ لیکن اس ساری رُوداد کے آخر میں مجھے ایک بار پھر حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ حالانکہ یہ بات واضح تھی کہ یہ سب کچھ آقا جان کے ایما پر ہوا ہے اور اس نے قسطینا اور بیگم نورل وغیرہ کو زینب کے قتل کے حکم سے بے خبر رکھا ہے...... قسطینا نے آقا جان کے بارے میں کسی منفی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے جو فقرہ کہا وہ مجھے بہت برا لگا۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زائب! یقین تو نہیں آرہا کہ انکل نے زینب کے لیے ایسا کرنے کو کہا ہوگا، لیکن اگر ایسا ہے تو پھر ضرور اس میں کوئی نہ کوئی بہتری رہی ہوگی۔''

میں بھڑک اٹھا۔ ''قسطینا! آپ کا مطلب ہے کہ ایک بے گناہ لڑکی کو جو اس خاندان کی بہو بھی ہے، بے دردی سے مار دینے میں کوئی بہتری پوشیدہ ہے؟''

''انکل کی کئی باتیں فوری طور پر سمجھ میں نہیں آتیں شاہ زائب......''

''مجھے بھی آپ کی بات سمجھ میں نہیں آرہی، نہ فوری طور پر، نہ آئندہ آئے گی۔ میں نے آپ کو جو بتانا تھا بتا دیا ہے...... میرا مطالبہ اس لڑکی کی سلامتی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

قسطینا نے میری ناراضگی دیکھ کر رویّہ بدلا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے واپس بٹھا لیا۔ ''پلیز شاہ زائب! جذباتی نہ بنو۔ میں اس سلسلے میں خود انکل سے بات کروں گی۔ واقعے کی تہ تک پہنچوں گی اور اگر ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو پھر وہ اس سلسلے میں جواب دہ بھی ہوں گے۔''

''صرف جواب دہ؟''

''پلیز شاہ زائب! ابھی ہم کسی طرح کے اختلافی مسائل نہیں چھیڑ سکتے۔ تمہیں پتا نہیں کہ اصل صورتِ حال کیا ہے۔ فی الوقت ہماری ساری پلاننگ کا دارومدار ہمارے اندر کی ہم آہنگی اور یکسوئی میں ہے۔''

وہ دوسری بار کسی ''پلاننگ'' کا ذکر کر رہی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں استفسار کیا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر میری طرف دیکھنے لگی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ مجھے اس حوالے سے بتائے یا نہیں۔

اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ کمرے کے اندر ہی ایک چکر لگایا۔ پھر میرے پاس بیٹھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں بولی۔ ''شاہ زائب! ہم قریباً 72 گھنٹے کے اندر اندر رائے زل پر فیصلہ کن حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ اپنی پوری طاقت کے ساتھ...... بری، فضائی اور پانی کی طرف سے بھی۔ یہ تخت یا تختے والی بات ہوگی۔''

میں نے تعجب سے قسطینا کی طرف دیکھا۔ اگلے چند منٹ میں اس نے جو تفصیل بتائی، وہ سمجھ میں آتی تھی۔ برج کلب پر نہایت کامیاب فضائی حملے نے رائے زل کی گریے فورس کو بہت سے اہم کمانڈروں سے محروم کر دیا تھا۔ سپہ سالار چیف گیرٹ اسپتال میں پڑا تھا۔ ان کی ساری صف بندی درہم برہم تھی۔ قسطینا اور اس کے اہم کمانڈروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا تھا...... اور جمعے کی رات نیوٹی پر فل فلیج ہلا بولنے جا رہے تھے۔ اس حملے کے لیے جو کوڈ ورڈ استعمال کیا جا رہا تھا وہ ''درخت کاٹنے'' کا تھا۔ حملے کے وقت کو ٹی ٹائم کا نام دیا گیا تھا۔ اسی طرح مختلف کوڈ ورڈ تھے۔

یہ ایک سنسنی خیز پلاننگ تھی۔ اسے بیان کرتے ہوئے

قسطینا کی بادامی رنگ آنکھوں میں شعلوں کا عکس تھا۔ اس موقع پر دیگر موضوعات پر گفتگو کرنا مناسب ہی معلوم ہو رہا تھا۔ قسطینا سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس سے بس دو باتیں ہی کہیں۔ ایک تو یہ کہ جب وہ آقا جان سے زینب کے متعلق کسی طرح کے سوال جواب کرے تو اس میں کمانڈر افغانی کا ذکر بالکل نہ آئے اور دوسری یہ کہ وہ زینب کو اپنی حفاظت اور تحویل میں لے لے۔

قسطینا نے میری یہ دونوں باتیں مان لیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے میں کمانڈر افغانی کا نام ہرگز زبان پر نہیں لائے گی۔ زینب کے حوالے سے وہ بولی۔ ''میں ایک دو گھنٹے میں اسے رازداری سے یہاں اپنے پاس لانے کا انتظام کرتی ہوں۔''

وقتِ رخصت حسب سابق اس نے الوداعی انداز میں میرے رخسار کو چوما۔ ہم کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کی بانہوں میں گم رہے، پھر میں باہر نکل آیا۔

ڈی پیلس پر اور اردگرد کی عمارتوں پر شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوا میں پام کے بلند درخت جھومتے اور ڈگمگاتے محسوس ہوتے تھے۔ کمانڈر افغانی اور اس کے رضاکار دستوں نے ڈی پیلس کے وسیع و عریض احاطے میں مستقل ڈیرے جما رکھے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے عزت مآب کے حق میں نعرے لگاتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ بڑے جوش و خروش سے پریڈ میں حصہ لے رہے تھے۔ ایک فوجی افسر نے بڑی ستائشی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ خاص خاص لوگوں کو پتا چل گیا ہے کہ میں ''ایم ایم اے'' کا ایک جانا پہچانا فائٹر بھی ہوں۔

میں انیکسی سے کافی دور تھا جب میری نظر ڈی پیلس کے مرکزی باغیچے کی طرف اٹھ گئی۔ میں نے دراز قد جاناں کو ایک فوارے کے پاس کھڑے دیکھا۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ اپنے پسندیدہ لباس، یعنی ساڑی میں تھی۔ درمیانی فاصلہ کافی تھا، پھر بھی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی ہے۔ شاید اس نے مجھے قسطینا کی طرف جاتے اور وہاں سے آتے بھی دیکھا تھا۔ ان لمحوں میں وہ اداسی کی تصویر نظر آئی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو...... تمہاری اڑان بہت اونچی ہے، میں تم تک نہیں پہنچ سکتی، ہاں جو وقت تم مجھے دیتے ہو، وہی میرے لیے بہت غنیمت ہے۔

وہ میری جانب آنا چاہ رہی تھی لیکن اسی دوران میں ایک طرف سے سیفی نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لڈو کا ڈبا تھا۔ اس نے لڈو میری طرف بڑھائے اور ٹھیٹ پنجابی انداز میں بولا۔ ''لو جی استاد جی...... منہ میٹھا کرو۔ اصلی بوندی کے لڈو ہیں...... ہمارے دیہات میں بھی زیادہ چلتے ہیں۔''

''لیکن کس خوشی میں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''دو خوشیاں ہیں بادشاہو۔ پہلی تو یہ کہ میرا ایچ بچاؤ ہو گیا۔ اگر قالین کو واقعی آگ لگ جاتی اور میں غسل خانے میں غسل فرماتا رہتا تو یقیناً کبڈی کے کھیل کو ایک بہت بڑے کھلاڑی سے ہاتھ دھونے پڑتے......''

''اور دوسری خوشی؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کی دعا سے آپ کے اس نالائق شاگرد کو وردی مل گئی ہے۔ پرسوں جو مشقیں ہوئی تھیں، اس میں میرا ''کام'' دیکھ کر کمانڈر صاحب نے مجھے باقاعدہ لشکری بنا دیا ہے اور دس بندوں کی ایک ٹولی میرے انڈر کی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس دفعہ میں لڑائی میں واقعی حصہ لے سکوں گا۔''

وہ بہت پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ ایکشن اور سنسنی خیزی کا رسیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے نزدیک یہ کفر اور اسلام کی لڑائی بھی تھی اور یہ بات مکمل نہیں تو کسی حد تک درست بھی تھی۔ بے شک نیوسٹی میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہی تھی لیکن وہاں دوسرے مذاہب کے لوگ بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ امریکی ایجنسی سے گٹھ جوڑ کرنے کے بعد یہ نیوسٹی والے مکمل طور پر غیر مسلموں کے آلۂ کار بن گئے تھے۔ ایک طرح سے وہ باہمی دشمنی میں اندھے ہو کر جزیرے پر امریکن تسلط کی راہ ہموار کر رہے تھے۔

سیفی سے بات کرتے کرتے میں انیکسی تک پہنچ گیا۔ مڑ کر دیکھا، اب جاناں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ سنبل اور جاناں وغیرہ یہاں سے واپس پاکستان چلی جائیں۔ یہاں کے حالات نازک سے نازک تر ہو رہے تھے اور خبر نہیں تھی کہ آئندہ کیا اودھم مچنا ہے۔ سنبل بھی ابھی تک عزت مآب کی منظورِ نظر تھی لیکن یہ سچویشن کسی بھی صورت زیادہ دیر چلنے والی نہیں تھی۔ عزت مآب بھونرا صفت تھا۔ عنقریب کوئی اور پری چہرہ اس کی تنہائی کا ساتھی بن سکتا تھا۔ بلکہ مجھے کچھ ایسی اطلاع مل بھی رہی تھی۔ ایک انڈین لڑکی جو بے مثال رقاصہ بھی تھی، بڑی تیزی سے عزت مآب کے قریب آ رہی تھی۔ عزت مآب شاید جلد ہی اسے اپنی خواصوں میں شامل کرنے والا تھا۔

اس عمل کو یہ لوگ ''ملازم رکھنا'' کہتے تھے۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ قسطینا ہوگی لیکن جب اسکرین دیکھی تو یہ جاناں کی کال تھی۔ میرے ریسیو کرنے سے پہلے ہی بیل خاموش ہوگئی۔ میں فون آف کر کے جیب میں رکھ رہا تھا جب اچانک قسطینا کا خیال آیا۔ وہ یقیناً ابھی اسی کمرے میں موجود تھی جہاں میرے اسپائی کیمرے نے گھات لگا رکھی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہم دونوں اسی کمرے میں موجود تھے۔ میں نے چند بٹن پریس کر کے سیل فون کو ''وڈیو ریسیور'' کی شکل دے دی۔ دو چار سیکنڈ بعد قسطینا کے ریٹائرنگ روم کا منظر اسکرین پر ابھرا۔ میرا اندازہ درست تھا، وہ ابھی تک وہیں تھی۔ صوفے پر نیم دراز تھی۔ میرے سینے میں خوشگوار دھڑکنیں جاگیں...... وہ بڑے رومانی موڈ میں تھی۔ میڈونا کا گیت مدھم آواز میں گونج رہا تھا۔ قسطینا کے ہاتھ میں وہی پوسٹر تھا جو ایک روز پہلے ہی اس نے مجھے دکھایا تھا۔ اس پر میری ہی تصویر تھی۔ وہ بڑے پُرشوق انداز میں تصویر کو دیکھ رہی تھی، اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے اپنے دانتوں تلے دبایا ہوا تھا پھر اس نے پوسٹر میں میرے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور چند سیکنڈ کے لیے چادر کی طرح پوسٹر کو اوڑھ لیا۔ یہی وقت تھا جب اس کے دو سیل فونز کی گھنٹیاں ایک ساتھ بجنے لگیں۔ وہ اٹھ بیٹھی، ایک دم ہی ایک نوجوان دوشیزہ سے ایک سنجیدہ وذمے دار سالار نظر آنے لگی۔

اس نے ایک فون کی کال ریجیکٹ کی اور دوسرے کی وصول کرتے ہوئے اپنی قدرے بھاری آواز میں بولی۔

''ہیلو حلمی، تیاری کی کیا صورتِ حال ہے؟''

جواب میں حلمی نے جو کچھ کہا، وہ میرے کانوں تک نہیں پہنچا۔ جواب میں قسطینا کی مدھم آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی۔ وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے حلمی صاحب، مگر ایک بات یاد رہے، ہم نے اس حملے میں تحیّر کا عنصر ہر صورت میں شامل رکھنا ہے۔ یہ حملہ جتنا اچانک ہوگا اتنا ہی کامیاب ہوگا۔ آپ بڑے افسروں کو تو پوری معلومات دیں مگر چھوٹے ''رینکس'' کو ابھی ان معلومات سے فاصلے پر رکھیں......''

وہ بات کرتے کرتے چند فٹ آگے نکل گئی۔ اس کی تصویر اوجھل ہوگئی اور آڈیو بھی اتنی مدھم ہوگئی کہ سنی نہیں جارہی تھی۔ میں نے اپنے اسپائی کیمرے کی بیٹری چیک کی۔ وہ اب بھی تین روز تک مجھے مسلسل سگنل فراہم کرسکتا تھا۔ میں سلسلہ منقطع کر کے بستر پر دراز ہوگیا اور خود کو قسطینا کے دلکش خیال میں الجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے بہت کوشش کی، اس کے باوجود ''سجن پیارا'' کے الفاظ گاہے بگاہے میری نگاہوں میں چمکتے رہے...... سجن پیارا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ کچھ جانی پہچانی سی دستک تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے جاناں کھڑی تھی۔ وہ پھولدار ساڑی میں تھی۔ اس میں گلابی زرد اور سرخ رنگ نمایاں تھا۔ خوشبو کے ایک جھونکے کی طرح وہ اندر آگئی۔ اب تک وہ ''زینب کی موت'' کے صدمے سے کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ آج وہ کچھ عجیب سے موڈ کے ساتھ آئی تھی۔ میری طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھ کر بولی۔

''آج کل بہت مصروف ہو گئے ہیں آپ؟ بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ قسطینا کی بات کر رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ''میرے اور تمہارے درمیان کسی طرح کا عہد و پیمان نہیں ہے جاناں، ہم دونوں ہر طرح آزاد ہیں۔''

''آپ صرف اپنی بات کریں تو بہتر ہے شاہ زیب! آپ واقعی آزاد ہیں۔ لیکن اب میں بھی آزاد ہونے کا سوچ رہی ہوں، میری غلامی...... آپ کو تکلیف دیتی ہے نا۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو، ہم میں سے کوئی آقا یا غلام نہیں ہے۔ تم کسی وقت بہت زیادہ جذباتی ہو جاتی ہو۔ عجیب رویّے کا مظاہرہ کرتی ہو۔''

''اب نہیں کروں گی شاہ زیب...... لیکن اس کے بدلے آپ کو مجھے کچھ دینا ہوگا۔''

''کیا؟''

وہ انوکھے انداز میں بولی۔ ''اپنی قیمتی زندگی میں سے صرف دو دن...... یعنی اڑتالیس گھنٹے۔ میں یہاں اپنے آخری اڑتالیس گھنٹے آپ کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں، اس کے بعد میں پاکستان واپس چلی جاؤں گی۔ میں نے میڈم لورین سے بات کر لی ہے۔ انہوں نے بمشکل مجھے اپنی خدمت سے فارغ کیا ہے۔ میں نے ان کے لیے چار پانچ اچھے ناولز کی آڈیو ریکارڈنگ کر دی ہے جب تک انہیں کوئی اور مناسب ''ریڈر'' نہیں مل جاتی، ان کا گزارا ہو جائے گا۔''

میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سچائی کی جھلک تھی۔ یہ جھلک میرے لیے دلی اطمینان کا باعث بنی۔ یہ میری دلی خواہش تھی کہ وہ عافیت سے واپس چلی جائے۔ میں نے اسے آفر کی تھی کہ میں اسے

لاہور سے دور کراچی میں ایک محفوظ پناہ گاہ فراہم کر سکتا ہوں۔

''اڑتالیس گھنٹے والی شرط نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا؟'' وہ میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں بولی۔

اس کے انداز نے مجھے سب سمجھا دیا تھا۔ میں اس کی شرط ماننے سے انکار نہیں کر سکا۔ اس کی شخصیت میں بہت کچھ یکجا ہو گیا تھا۔ وہ بے چاری بھی تھی اور چارہ گر بھی۔ سوالی بھی تھی اور سخی بھی...... بہت کمزور بھی اور طاقتور بھی۔ شاید اس کی کمزوری اور بے چارگی ہی میرے لیے اس کی طاقت بن گئی تھی۔ وہ ان یادگار لمحوں کی اسیر تھی جب میں نے اس کی زندگی بچائی تھی اور وہ خود اسیر ہو کر بھی کامیابی سے مجھ پر اپنی قربت کا جال پھینک لیتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

وہ ایک یادگار رات تھی۔ نجانے جاناں کو بھی کیسے معلوم تھا کہ آج میری سالگرہ کا دن ہے۔ غالباً اس نے میرا نیا پاسپورٹ یا آئی ڈی کارڈ وغیرہ دیکھا تھا۔ بادل تو شام سے ہی منڈلا رہے تھے تاہم نو بجے تک گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یہ جزیرے کی بارش تھی، اور ایسی بارشیں جل تھل ایک کر دیتی ہیں۔ ایک بار آسمان سے پانی برسنا شروع ہوا تو برستا ہی چلا گیا۔ لوگ شام کے فوراً بعد ہی اپنی اپنی جگہوں پر قید ہو کر رہ گئے۔ جاناں نے کہا۔ ''میں آج آپ کو اپنے ہاتھ سے پکا کر کھانا کھلانا چاہتی ہوں۔ ایسے موسم میں آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟''

''میں تو باہر کی ہوا کھانا پسند کرتا، لیکن مجھے پتا ہے کہ تمہارے اڑتالیس گھنٹے شروع ہو چکے ہیں اور تم مجھے باہر نہیں نکلنے دو گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''یہ بات تو بالکل سچ ہے۔ چلیں میں آپ کے لیے چکن والے پکوڑے بناتی ہوں اور ساتھ میں گرما گرم چائے۔''

''لیکن بات یہ ہے کہ......''

اُس نے میرے ہونٹوں پر اپنا خوشبودار نرم ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں، ان دو دنوں میں میری مرضی چلے گی اور میرا ہی مینیو۔''

''تو پھر مجھ سے پوچھا کیوں تھا؟...... اچھا چلو ٹھیک ہے...... چکن پکوڑے ہی بناؤ لیکن ذرا زیادہ بنانا۔ انیق اور وہ پٹو سیفی بھی شامل ہوں گے۔''

''وہ دونوں میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟'' وہ ذرا شوخی سے بولی۔

''انہیں سب پتا ہے۔ تم آقا جان کی بیوی میڈم لورین کو انگلش ناولز پڑھ کر سناتی ہو اور کبھی کبھی ان کی ٹانگیں بھی دباتی ہو۔ اس کے علاوہ میری منہ بولی بیوی ہو...... اور وقتاً فوقتاً یہاں انیکسی میں مجھے یہاں اپنا ''اسٹیٹس'' یاد دلانے کے لیے آتی رہتی ہو۔''

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ ادا سے بولی اور اپنی ساڑی کے پلو کو اپنی پتلی کمر کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ (یہ وہی اٹیچڈ کچن تھا جس کے فریزر میں دو روز تک دو ہیجڑے پڑے رہے تھے۔ ایک زندہ اور دوسرا لاش کی صورت میں۔ بہرحال اب وہاں بہت اچھی صفائی کی جا چکی تھی) جاناں کی ہدایت پر ایک باورچی نے فوراً ضروری اشیا فراہم کر دیں اور جاناں نے شتابی سے ہاتھ چلا کر ایک ہی گھنٹے میں چکن پکوڑے، سبزی رول اور سموسے تیار کر لیے۔ انیق اور سیفی بھی اس ''ڈنر کم ٹی'' میں شریک ہوئے اور گرجتی چمکتی بارش کا لطف بھی اٹھایا۔

بیڈ روم میں تنہائی ملتے ہی جاناں کسی ریشمی تھان کی طرح کھلتی چلی گئی۔ اس کے طویل بال ایک آبشار کی صورت میں تھے اور ایسی ہی درجنوں آبشاریں کھڑکیوں سے باہر بارش کے پانی کی صورت گر رہی تھیں۔ بجلی چمکتی تھی تو لمحے بھر کے لیے پام کے جھومتے درخت اور ڈی پیلس کی بلند برجیاں روشنی میں نہا کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی تھیں۔ وہ میرے بہت قریب تھی، اس کے ہونٹ کا تل مجھ سے بس چند انچ کی دوری پر تھا اور یہ تل نہیں تھا، یہ سوئی چبھونے کا وہ نشان تھا جو اس نے اپنے خون سے رومانی نظم لکھنے کے لیے بنایا تھا۔

میں اُسے کیسے بھلا دوں
وہ تو میری رگ رگ میں بس چکا ہے
میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی
اور پل پل ختم ہو رہی تھی میری زندگی......

وہ جذبے کی شدت کے ساتھ میری آغوش میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں زخمی سپاہی ہوں، ایک بازو والا۔ ڈاکٹر حضرات مجھے مکمل آرام کا مشورہ دے رہے ہیں۔''

''تو پھر کیا ہوا؟'' وہ حوصلے سے بولی۔ ''سب کچھ جسموں کا کھیل ہی تو نہیں ہوتا۔ آپ کے پاس رہنا...... آپ کو محسوس کرنا...... آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارنا، یہی میرے لیے کافی ہے۔''

کسی محبت کرنے والی بلی کی طرح اس نے اپنا سر میرے بازو سے رگڑا۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے بیگم نورل سے درخواست کی تھی اور انہوں نے کمالِ مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی واپسی کا انتظام کردیا ہے۔ اس نے بتایا کہ ہفتے کی صبح عزت مآب ریانِ فردوس کی ایک حاملہ خواص ہیلی کاپٹر کے ذریعے برونائی جائے گی۔ دو لیڈی ڈاکٹرز بھی ساتھ ہوں گی۔ اسی ہیلی کاپٹر میں وہ بھی برونائی پہنچے گی اور وہاں دو روز رکنے کے بعد پاکستان روانہ ہوجائے گی۔

میڈم لورین اور بیگم نورل نے اسے کچھ تحفے بھی دیے تھے۔ اس نے اپنے پرس میں سے کچھ جیولری نکال کر مجھے دکھائی۔ قیمتی جیولری تھی، ایک ہار میں روبی کے نفیس ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جڑاؤ انگوٹھی اس کی انگلی میں تھی۔

اس نے جو کچھ بتایا، اس میں ایک بات تھوڑی سی پریشان کن تھی۔ وہ اپنی روانگی کا وقت ہفتے کی صبح بتا رہی تھی اور مجھ تک قسطینا کی زبانی جو ٹاپ سیکرٹ معلومات پہنچی تھیں، ان کے مطابق جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب نیوسٹی پر زوردار حملے کا امکان تھا۔ کئی دفعہ بندے کے ذہن میں کوئی سوال ابھرتا ہے اور اس کا جواب بھی فوراً ہی آجاتا ہے۔ میرے فون پر کال کے سگنل آئے۔ یہ قسطینا کی کال تھی۔ ذرا دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے کال ریسیو کی۔ وہ بولی۔ ”ہیلو شاہ زائب! کیا ہورہا ہے اس خوب صورت موسم میں؟“

اگر میں اسے بتا دیتا کہ کیا ہورہا ہے تو یقیناً وہ بہت بدمزہ ہوتی۔ میں نے بس اتنا کہا۔ ”موسم انجوائے ہورہا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”یہاں جب اس طرح کی بارش ہوتی ہے تو جلدی ختم نہیں ہوتی۔ مجھے تو اب ”درخت کاٹنے“ والا پروگرام بھی آگے جاتا لگ رہا ہے۔ صبح تک بارش رک بھی جائے تو ایک دو دن تو مزید انتظار کرنا پڑے گا۔“

”یہ تو پھر اپ سیٹ ہوا۔“

”نہیں، ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔ اگر ”کٹائی“ کے دوران میں موسم ایسا ہوجاتا تو زیادہ مشکل ہوتی۔“

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی بات کرکے اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ اس دوران میں جاناں دم سادھے بالکل ساکت ایک کونے میں بیٹھی رہی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس نے اونچی سانس بھی لی تو کمرے میں اس کی موجودگی کا پتا چل جائے گا۔

میں نے کہا۔ ”اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ سب جانتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری آج کی ملاقات کا پتا بھی اسے چل جائے۔ وہ بہت باخبر ہے۔ آخر کو سپریم کمانڈر ہے یہاں کی۔“

جاناں کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، بولی۔ ”کمانڈر کی حیثیت سے اسے پتا چل جائے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن آپ کی سہیلی کی حیثیت سے پتا چلے تو اچھی بات نہیں ہے۔“

”تم کچھ زیادہ ہی غلط فہمی کا شکار نہیں ہورہی ہو؟“

”آپ کا مطلب ہے، تھوڑی بہت غلط فہمی کی گنجائش موجود ہے۔“ وہ مسکرائی اور اس کے گداز ہونٹ کا تل نما نشان مزید واضح ہوگیا۔

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے اپنے ہاتھوں کا استعمال کیے بغیر میرے ہونٹوں کو بند کردیا۔ وہ اس سہانے موسم کو اور ان ”قیمتی گھڑیوں“ کو فضول کی بحث و تکرار میں کھونا نہیں چاہتی تھی۔

یک لخت بادل زور سے گرجے۔ یوں لگا کہ اچانک سیکڑوں من بارود کی بارش ہوگئی ہے۔ وہ بے ساختہ مجھ سے پیوست ہوگئی۔ شاید روزِ ازل سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ رات کی تاریکیوں میں جب جب آسمان سے پانی برسا ہے، جب جب بجلی کڑکی ہے اور بوچھاڑیں تیز ہوئی ہیں، مرد و زن کی قربت بڑھی ہے۔ ان کے دلوں میں ترنگ کی شدت میں اضافہ ہوا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس نے بڑی سادگی سے کہا تھا کہ میرے قریب رہنا اور میرے ساتھ کچھ وقت گزارنا ہی اس کے لیے غنیمت ہے لیکن میں جانتا تھا کہ دل و دماغ کے کچھ اپنے تقاضے بھی ہوتے ہیں...... اور ”میزبانی“ کے بھی کچھ آداب بیان کیے جاتے ہیں۔ میں اس کے قریب تر ہوتا گیا......

یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ وہ میرے بازو پر سر رکھے لیٹی تھی۔ کمرے میں نیلگوں بلب کی بہت مدھم روشنی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر بارش کی لے کبھی تیز اور کبھی مدھم ہوجاتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”کراچی چلی جاؤ تو بہتر ہے۔ وہاں میرے جاننے والے موجود ہیں۔ تم کسی بھی حوالے سے اُن سے مدد مانگ سکتی ہو۔“

وہ بولی۔ ”میرا اپنا ارادہ بھی کراچی کا ہی ہے۔ انسپکٹر

قیصر، پاشا اور وریام جیسے لوگوں سے جتنا دور رہوں گی، اتنا ہی میرے لیے بہتر ہے۔ یہ لوگ انسانوں کی کھال میں جانور ہیں اور عورت کے لیے تو سراسر بھیڑیے ہیں۔''

''تمہیں اب اِن بھیڑیوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اب تمہارے ساتھ ہوں جاناں۔''

''آپ ساتھ کہاں ہیں؟ آپ تو یہاں ہیں...... بلکہ ''بہت زیادہ'' یہاں ہیں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''لیکن یہ عارضی قیام ہے۔ مجھے بہت جلد پاکستان واپس پہنچنا ہے۔''

''تو پھر ابھی کیوں نہیں چلے جاتے، یہ لوگ اپنی لڑائی خود ہی لڑ لیں گے۔ آپ تو زینب کے لیے یہاں تھے نا۔ اور اب وہ بے چاری اس دنیا میں نہیں رہی......''

میں اُسے کیسے بتاتا کہ وہ اس دنیا میں ہی ہے...... بلکہ ایک ساتھ والے کمرے میں موجود ہے اور اس کے اردگرد بہت سے خطرات منڈلا رہے ہیں۔ میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''بیگم نورل اور ابراہیم وغیرہ کے لیے ان جابر امریکیوں سے ٹکر لینا بھی تو عین ثواب کا کام ہے...... اور پھر سجاول کو بھی ڈھونڈنا ہے۔ کیا ہم اسی طرح اسے یہاں لاپتا چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟''

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں آپ کا انتظار کروں گی کراچی میں۔''

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''کراچی تمہارے لیے اس لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ وہ کمرشلز اور ٹی وی پروڈکشنز کا مرکز ہے۔ وہاں تمہیں اپنا شوق پورا کرنے کا بھرپور موقع مل سکتا ہے۔''

''لیکن میں یہ شوق پورا کروں گی تو قیصر اور پاشا جیسے بے رحم لوگوں کو ''اپنا شوق'' پورا کرنے کا موقع مل جائے گا۔ وہ مجھے ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''میں اپنا شوق پورا کرنے کے لیے، آپ کی واپسی کا انتظار کروں گی۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا۔

اُس نے ایک بار پھر خود کو میری بانہوں میں گم کر دیا۔

رات بھر کی تابڑ توڑ بارش کے باوجود اگلا دن بھی بارش سے خالی نہیں تھا۔ ہوا چلتی تھی، بادل گھر کر آتے تھے، اندھیرا گہرا ہو جاتا تھا اور دھیمی پڑتی بارش پھر زور پکڑ لیتی تھی۔ زندگی جیسے جہاں کی تہاں ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ ڈی پیلس کے احاطے کے اندر اور باہر ہزاروں رضا کار موجود تھے۔ ان میں سے کچھ نے تو ڈی پیلس کے طویل طویل برآمدوں اور شیڈز میں پناہ لے لی تھی اور بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے احاطے میں خیمے گاڑ رکھے تھے۔ یہ سب کے سب لوگ عزت مآب ریان فردوس کے خاندان کے وفادار تھے اور ریان فردوس کو دوبارہ پوری آن بان کے ساتھ یہاں کا مالک و مختار دیکھنا چاہتے تھے۔

جاناں بہت خوش تھی۔ ایک خوشی اسے اس بات کی بھی تھی کہ آج کا سارا دن اور پھر رات بھی اس کی تھی۔ انیکسی میں بہترین خانساماں کے علاوہ کئی ملازم بھی موجود تھے، لیکن جاناں نے آج پھر اپنے ہاتھ سے دو تین ڈشز بنائیں اور اشتیاق سے مجھے اور انیق وغیرہ کو کھلائیں۔ ایک اچھی بات آج یہ ہوئی تھی کہ صبح منہ اندھیرے ہی پروگرام کے مطابق قسطینا نے اپنی قریبی دوست ڈاکٹر ماریہ اور اپنے دو ذاتی محافظوں کو انیکسی میں بھیجا تھا۔ ڈاکٹر ماریہ کمرے کے باہر والے دروازے سے زینب کے پاس پہنچی تھی، انیق نے زینب کو اس صورتِ حال کے لیے پہلے ہی مکمل تیار کر لیا تھا۔ زینب ایک چادر پوش پردہ دار عورت کی حیثیت سے ڈاکٹر ماریہ اور محافظوں کے ساتھ قسطینا کی تحویل میں پہنچ گئی تھی۔

دوپہر کے کچھ ہی دیر بعد بارش نے ایک بار پھر زور پکڑ لیا۔ یوں لگتا تھا کہ گہری شام ہو گئی ہے۔ ہریالی اور نباتات سے لدا ہوا یہ جزیرہ ہر طرف سے سمندری اور بارشی پانی کے نرغے میں تھا۔ ایک عجیب رومانی سا ماحول بنا ہوا تھا۔ جاناں نے مدھم آواز میں میوزک آن کر دیا۔ وہ اچھی موسیقی کے ساتھ ساتھ اچھی شاعری کی بھی شوقین تھی۔ سجاول کے ڈیرے پر بھی میں نے اسے بڑے انہماک سے ریڈیو پر پاکستانی اور انڈین گانے اور غزلیں سنتے دیکھا تھا۔

بے شک وہ ایک کچلی مسلی ہوئی لڑکی تھی۔ اس پر جھپٹنے والوں نے اسے مسمار کر کے رکھ دیا تھا مگر اس کے اندر کی رومانیت کو مسمار نہیں کر سکے تھے۔ اس کی یہی رومانیت اس کی توانائی تھی اور اسے بہت آگے بھی لے جا سکتی تھی۔ اس کی دلکشی، اس کا لمبا نازک بدن، آبشار جیسے بال اور رقص وغیرہ میں مہارت، یہ سب اس کے لیے آگے بڑھنے میں معاون عناصر تھے۔ یہ رات بھی پچھلی رات کا مکمل ''ری پلے'' تھی، مگر نصف شب کے کچھ دیر بعد وہ اداس نظر آنا شروع ہو گئی۔ کچھ کھوئی کھوئی کچھ پریشان...... میں اس کی اس کیفیت کی وجہ کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تم رومانی ''موڈ'' سے نکل کر سفر کے ''موڈ'' میں آتی جا رہی ہو۔''

"سفر پر نکلنا بھی تو ایک رومان ہی ہوتا ہے۔ بڑے بڑے شعر کہے گئے ہیں اس موقع کے لیے......

سفر کی شام بھی کیسی اداسی لے کے آتی ہے
جو رک جاؤں تو رسوائی، جو چلتا ہوں جدائی ہے

وغیرہ......"

اچانک میں بری طرح چونکا۔ مجھے ایک باریک سیٹی کی سی آواز دروازے کی طرف سے سنائی دی تھی۔ میں اٹھا اور بستر سے نیچے قدم رکھا۔ ایک تیز بو نتھنوں میں گھسی۔ یک دم گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ میں نے دروازے کی نچلی درز کی طرف دیکھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہاں سے کوئی نہایت سریع الاثر اور بے رنگ گیس تیزی سے اندر داخل ہوئی ہے۔ میں نے سانس روک لی او سائڈ ٹیبل سے اپنا لوڈڈ پستول نکالا۔ یہی وقت تھا، میرے کانوں میں جاناں کے کھانسنے کی تیز آواز آئی۔ وہ پہلو کے بل بستر پر گر گئی تھی۔ جو سانس سینے سے نکل گئی تھی، وہ اب واپس نہیں جا رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا تھاما ہوا تھا۔ میں دروازے کی طرف لپکا۔ مگر جو گیس سانس روکنے سے پہلے سینے میں بھر گئی تھی وہ اپنا کام دکھا رہی تھی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ میرا ہاتھ ابھی دروازے کے ہینڈل سے دور تھا کہ نگاہیں دھندلا گئیں۔ میرے دل سے آواز آئی...... شاہ زیب! تم ایک سنگین صورتِ حال کا شکار ہوئے ہو اور اب بے ہوش ہو کر قالین پر گر رہے ہو۔ پھر میرا سر اور جسم کسی سخت چیز سے ٹکرایا اور میں مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

یہ کون سی جگہ تھی۔ میں کہاں تھا؟ مجھے ہلکی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بے ہوشی اور غنودگی کی کوئی درمیانی کیفیت تھی۔ مجھے لگا کہ میں پنجاب کے کسی گاؤں میں ہوں۔ فصلوں اور مٹی کی بھینی خوشبو میرے نتھنوں میں گھس رہی ہے۔ تاجور مجھ پر جھکی ہوئی ہے۔ اپنے گرم ہاتھ سے میری سرد پیشانی سہلا رہی ہے۔ بڑی محبت سے مجھے پکار رہی ہے......شاہ زیب! مجھے یقین تھا، تم واپس آؤ گے۔ ہمارے درمیان جو دوری ہے وہ ختم ہو جائے گی...... غلط فہمیاں نہیں رہیں گی......

پھر مجھے محسوس ہوا کہ پہلوان حشمت کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے۔ "یہ کیا ڈاکٹری پلستر چڑھا لیا ہے تم نے اپنے بازو پر؟ میں چار دن مالش کروں گا سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ ہمارے گاؤں کا تو پانی ہی پیتے

رہو تو سارے روگ دور ہو جاتے ہیں، کیوں تاجور؟"
تاجور نے اثبات میں جواب دیا...... اور میرے اوپر جھکتے ہوئے بولی۔ "یہ دیکھو...... یہ ہوش میں آرہے ہیں۔" میرے اوپر جھکنے سے اس کی دونوں لٹیں میرے چہرے کو چھونے لگیں۔ لیکن...... لیکن تاجور کی آواز کچھ بدلی بدلی تھی اور یہ شاید بالوں کی لٹیں بھی نہیں تھیں، نہ پہلوان حشمت تھا، نہ ہی وہ کسی سنہری گاؤں کی رنگین حویلی تھی۔ میرے سامنے چوڑی ناک والی ایک ہٹی کٹی حبشن بیٹھی تھی۔ وہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے کچھ سنگھا رہی تھی۔ شاید "کورامین" قسم کی کوئی شے تھی۔ پہلوان حشمت کی جگہ ایک دبلا پتلا ملائیشین، جس کے بارے میں بعد ازاں پتا چلا کہ ڈاکٹر ہے جو میرے بازو کو ہلا جلا کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہلانے سے ہر بار میرے کندھے میں ناقابلِ بیان ٹیس اٹھتی تھی۔

اچانک مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میں نے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی تب مجھے پتا چلا کہ میری گردن میں ایک رسی ہے جس کا دوسرا سرا لکڑی کے ایک "پلر" سے بندھا ہوا ہے۔ میں جس فرش پر لیٹا تھا، وہ بھی لکڑی کا ہی تھا۔ میرے جسم پر ایک ٹراؤزر تھا اور یہ وہی ٹراؤزر تھا جو میں نے اپنے کمرے میں پہنا ہوا تھا۔ بالائی بدن عریاں تھا اور یہی وجہ تھی کہ مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔

"میری ساتھی کہاں ہے؟" میں نے چوڑی ناک والی حبشن سے پوچھا۔

وہ شستہ انگلش میں بولی۔ "وہ جہنم میں ہے اور جلد ہی تم بھی جانے والے ہو...... ویسے وہ زندہ ہے اور تمہاری خیر خیریت کے بارے میں فکر مند ہے۔"

"میں کہاں ہوں۔ مجھے یہاں کون لایا ہے؟" میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور گردن میں موجود رسی کے کھچاؤ نے دوبارہ لکڑی کے فرش پر لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ دھچکے کے سبب کندھے سے پھر ٹیسیں اٹھیں اور سر پر کسی گومڑ کا احساس بھی ہوا۔ یقیناً یہ بے ہوش ہونے کے بعد فرش پر گرنے کے مضر نتائج تھے۔

میں نے ٹانگوں کو حرکت دینا چاہی تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کسی چیز سے بندھی ہوئی ہیں۔

"میرے کندھے میں بہت درد ہے۔ میں اٹھنا چاہتا ہوں۔" میں نے بھنا کر کہا۔

دبلا پتلا ڈاکٹر بولا۔ "اس لڑکی کے ساتھ موج میلہ کرتے ہوئے تو تمہارے کندھے میں درد نہیں ہوتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارے کندھے کو آرام سے نہیں مشقت سے فائدہ ہوتا ہے۔ چلو ابھی مشقت کراتے ہیں تمہیں۔"

میرا رخ پہلو کی ایک طویل کھڑکی کی طرف تھا۔ دفعتاً زور سے بجلی چمکی۔ باہر بارش کی بوچھاڑیں اور ناریل کے بلند درخت جھومتے نظر آئے۔ اس بات کی تصدیق ہو رہی تھی کہ میں جاماجی میں ہی ہوں اور شاید ڈی پیلس سے بہت زیادہ دور بھی نہیں ہوں۔ ہاں...... بے ہوشی کے دورانیے کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ کیا یہ وہی رات تھی یا پھر پورا ایک دن گزر چکا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر جاناں کی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں جاناں کے بارے میں پھر استفسار کرتا، کمرے کی بلند و بالا کھڑکی کھلی اور مجھے دوسری طرف ایک ایسی شکل دکھائی دی جس نے نہ صرف میرے بدترین خدشات کو حقیقت کا روپ دیا، بلکہ میرے تن بدن میں آگ بھی لگا دی...... وہاں آقا جان کھڑا تھا۔ اپنی تمام تر نحوست اور شیطانیت کے ساتھ۔ غالباً اس نے ضرورت سے زیادہ پی رکھی تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں کچھ اور بھی چھوٹی ہو گئی تھیں۔ وہ اکثر نیلی جین پہنتا تھا۔ سردی کی وجہ سے اس نے رین کوٹ کے نیچے سویٹر بھی پہن رکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بے حد زہریلے لہجے میں بولا۔ "بہت پھرتیاں دکھاتے تھے۔ آخر داڑھ کے نیچے آہی گئے ہو نا۔"

"جاناں کہاں ہے؟" میں نے اس کی چمکیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ حرام زادی تمہاری اصلی نہیں، منہ بولی بیوی تھی۔ یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں، اس کے لیے اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" میں دہاڑا۔

"اس کی ایک سو دس ریزن تو میں ابھی گنوا سکتا ہوں۔ لیکن جو تازہ ترین ریزن ہے اس کا پتا تمہیں بھی بڑی اچھی طرح ہے۔ بہت جوانی چڑھی ہوئی ہے تمہیں۔ عشق کا بخار بلکہ بہت سے عشقوں کے بخار چڑھ رہے ہیں۔ اب یہاں تمہاری ان ساری تکلیفوں کا شافی علاج ہوگا۔" اس کا لہجہ از حد خطرناک تھا۔

میں سمجھ گیا کہ افغانی کی طرح وہ بھی میرے اور قسطینا کے میل جول کا ذکر کر رہا ہے۔ لیکن یہ کوئی ایک ہی بات نہیں تھی۔ میں جانتا تھا اسے میری طرف سے کافی گہری چوٹیں لگی ہوئی ہیں۔ پاکستان میں پارا ہاؤس کے اندر مجھے اور سجاول کو ایک دم جو مقام ملا تھا، اس نے آقا جان کو اندر سے

جلا کر کوئلہ کر دیا تھا۔ پارا ہاؤس میں کم از کم تین مواقع ایسے آئے تھے جب میں نے آقا جان کے وفادار کارندوں کی درگت بنائی تھی اور اس شاندار درگت کے بعد ''بات چیت'' میں بھی آقا جان کو ہر بار ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔

آقا جان آہنی گرل والی کھڑکی کے عین سامنے برآمدہ نما جگہ پر کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں طرف دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ دونوں شکل وصورت سے انڈین یا پاکستانی دکھائی دیتے تھے۔ آقا جان نے ایک تیکھی نظر میرے بازو کے پلاستر پر ڈالی جہاں قسطینا نے ''گیٹ ویل سون'' کے الفاظ لکھ دیے تھے۔ وہ اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''تم تو چھپے رستم نکلے۔ ایسٹرن کنگ...... مکس مارشل آرٹ کا مشہور کھلاڑی۔ سنا ہے بڑا تہلکہ مچایا ہے تم نے چھوٹی اسکرین اور انٹرنیٹ وغیرہ پر۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے حبشی عورت اور سوکھے سڑے ڈاکٹر کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور وہ مجھے وہیں بندھا چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ آقا جان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی حیران تھا کہ میرے اچھے بھلے بندوں کی ٹھکائی ہو رہی ہے۔ یہ پتا نہیں تھا کہ ایک ''لڑاکے بھیڈو'' سے واسطہ پڑا ہوا ہے۔ یہ تو ایسا ہی تھا کہ عام مرغ کو لڑنے والے مرغ سے لڑا دیا جائے۔'' وہ جیسے تماشا دیکھنے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ الکحل کی کثرت نے اس کا بھیجا گھمایا ہوا تھا۔

اس نے ایک گارڈ کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ وہ سر جھکا کر ایک طرف چلا گیا۔ آقا جان کی ناک کا بل موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے مخصوص سڑیل لہجے میں بولا۔ ''چلیں اب دیکھتے ہیں لڑاکے مرغ کے سامنے تمہاری کارکردگی کیا ہوتی ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد تین صحت مند افراد کھڑکی کے سامنے نظر آئے۔ یہ تینوں ہی شکلوں سے ملائیشین نظر آتے تھے مگر حقیقت میں ان میں سے ایک جاپانی تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا میں نے اسے ایم ایم اے کی فائٹس میں کہیں دیکھا بھی ہوا تھا۔ آقا جان کے سامنے ایک میز سجا دی گئی تھی جس پر ناؤ نوش کے لوازمات پڑے تھے۔ وہ بڑی تسلی سے آرام دہ کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''چلو، آج کی شام کو ذرا دلچسپ بناتے ہیں۔ تمہارے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔'' اس کے ارادے بے حد خطرناک نظر آتے تھے۔ جب اس نے شام کا ذکر کیا تو میں سمجھ گیا کہ یہ وہی رات نہیں جب میں بے ہوش ہوا تھا، یہ اگلی رات ہے۔

اس نے تینوں میں سے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ وہ ایک پختہ کار فائٹر کے انداز و اطوار رکھتا تھا۔ وہ عجیب وضع کے اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا اور دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھلا ہوا چاقو تھا۔ اندر آتے ہی اس نے میری گردن اور پاؤں والی رسیاں کاٹ دیں اور پھر چاقو گرل دار کھڑکی میں سے باہر کھڑے محافظ کو دے دیا۔

میں لکڑی کے ٹھنڈے فرش سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سر ابھی تک چکرا رہا تھا مگر مجھے خود پر اعتماد تھا۔ اس چکراتے سر اور زخمی بازو کے باوجود میں اس فائٹر کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ دو تین منٹ کے اندر میدان پوری طرح سج گیا۔ فالتو اشیا کمرے کی دیواروں کے ساتھ لگا دی گئیں اور میں ملائیشین کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی حرکات وسکنات نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ وہ ایک منجھا ہوا، سخت مدِمقابل ہے لیکن وہ کچھ نروس بھی نظر آتا تھا۔ شاید اسے میرے بارے میں پہلے سے پتا تھا یا اسے بتا دیا گیا تھا۔

آقا جان نے نصف گلاس وہسکی اپنے اندر انڈیلی اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''بازو کا ایکسکیوز اب تمہارے لیے کوئی ایکسکیوز نہیں ہے۔ تم ایک چیمپئن فائٹر رہ چکے ہو۔ تمہارے جیسے فائٹر تو کبھی کبھی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنے مدِمقابل کو ہاتھ لگائے بغیر صرف ٹانگوں سے مار گرائیں گے۔ کیوں کرتے ہیں نا دعویٰ؟''

میرے کندھے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اس کی وجہ میرا، ایکسی میں بے ہوش ہو کر گرنا تھا۔ میں نے آقا جان کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ایسے دعوے کیے جاتے ہوں گے لیکن دعویٰ کرنے والے کا بازو اس طرح ٹوٹا ہوا نہیں ہوتا۔''

آقا جان نے بھی بھرپور طنز کیا اور اس سے ملتی جلتی بات کہی جو تھوڑی دیر پہلے سوکھے سڑے ملائیشین ڈاکٹر نے کہی تھی، وہ بولا۔ ''اس ٹوٹے بازو کے ساتھ تم اپنی منہ بولی بیوی سے رنگ رلیاں منا سکتے ہو اور اسی بازو کے ساتھ نیوسٹی کا دورہ کر کے آ سکتے ہو تو پھر اب یہ بازو تمہارے رستے میں روڑے کیوں اٹکا رہا ہے؟'' اس فقرے میں اس نے کم از کم ...... تین غلیظ گالیاں بھی استعمال کی تھیں۔ گالیاں اس کی گفتگو میں بوچھاڑ کی طرح آتی تھیں اور جوں جوں اس کی ناک کا منحوس بل موٹا ہوتا تھا، یہ بوچھاڑ تیز ہوتی جاتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''میں نے صرف تمہاری بات کا جواب دیا ہے، ورنہ میں تیار ہوں۔''

آقا جان کا اشارہ پاتے ہی ملائیشین فائٹر تیر کی طرح میری طرف آیا۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے "بیک فٹ" پر لانے کے لیے وہ پہلا حملہ ہی میرے زخمی کندھے پر کرے گا۔

اور یہی ہوا۔ میں چونکہ پہلے سے تیار تھا اس لیے میں نے نہ صرف اس کی مہلک کک سے خود کو بچایا بلکہ اس کی پسلیوں میں ایسا گھٹنا رسید کیا کہ وہ اڑتا ہوا لکڑی کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اگلے دو تین منٹ تک میرے اور اس کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ میرے زخمی کندھے نے مجھے آدھا کر ڈالا تھا یا شاید اس سے بھی کم...... اس کے باوجود میں نے اس خطرناک لڑائی کو تین چار منٹ سے زائد نہیں چلنے دیا۔ میری زوردار ٹھوکر کھا کر وہ آہنی گریل والی کھڑکی سے ٹکرایا۔ سر پر لگنے والی چوٹ زوردار تھی۔ وہ پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ بے ہوش ہو کر لکڑی کے فرش پر لڑھک گیا مگر یہ عارضی بے ہوشی تھی جس کا شکار عام طور پر باکسر اور فائٹرز وغیرہ ہوتے ہیں۔ پندرہ بیس سیکنڈ بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور دوبارہ لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ اب وہ لڑنے کے قابل نہیں تھا۔

آقا جان نے اس کا مشکل سا نام پکارتے ہوئے کہا۔ "چلو آ جاؤ باہر۔"

وہ مجھے خونی نظروں سے گھورتا اور دیوار کا سہارا لیتا باہر چلا گیا۔ اس دوران میں دونوں مسلح محافظوں نے اپنی رائفلیں میری جانب تانے رکھی تھیں۔

فائٹ کی مشقت سے جہاں میرا بازو درد سے بھر گیا تھا، وہیں جسم بھی پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ حالانکہ کچھ ہی دیر پہلے اسی کمرے میں، میں سردی محسوس کر رہا تھا۔ اب دوسرا فائٹر اندر آیا۔ یہ پہلے سے زیادہ سخت جان اور پھرتیلا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے آقا جان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے تم مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگو۔ میں نے اگر کبھی کچھ کیا بھی ہے تو اپنے دفاع میں کیا ہے۔ پھر بھی اگر تم سمجھتے ہو کہ میں دشمن ہوں تو یہ دشمنی میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ اس لڑکی جاناں کو درمیان میں مت لاؤ۔"

"اس لڑکی کو کچھ نہیں کہوں گا...... بلکہ تمہیں بھی کچھ نہیں کہوں گا، یہ وعدہ ہے میرا۔ اگر ان تینوں بندوں کو نیچا دکھا لو گے تو یہاں موجود کوئی بندہ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ ہاں، تچ بھی نہیں کرے گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے میرے مقابل آنے والے شخص کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔

اس شخص کی چال ڈھال نے ہی مجھے سمجھا دیا تھا کہ وہ ایم ایم اے کا کھلاڑی ہی نہیں، اسٹریٹ فائٹر یعنی گلیوں کا بدمعاش بھی ہے۔ اس کے منڈے ہوئے سر اور چہرے پر زخموں کے کئی پرانے نشان تھے۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ کسی بلا کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں نے خود کو اس کے وار سے بچایا اور اگلے ایک منٹ تک میں بس خود کو بچاتا ہی رہا۔ وہ ذرا ہانپا تو میں نے اسے پاؤں سے ایک دو ضربیں لگائیں۔ اچانک اس نے کامیاب جھکائی دی۔ وہ میری پنڈلیوں پر جھپٹا اور ٹانگیں کھینچ کر مجھے پشت کے بل گرا دیا۔

اب فرشی لڑائی شروع ہوئی۔ پشت کے بل گرنے سے میرا زخمی بازو جھنجھنا اٹھا تھا اور یوں لگتا تھا کہ کوئی اس بازو کو کندھے سے اکھاڑ رہا ہے۔ مجھے اپنے مدِمقابل کے "کیلبے بر" کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ معمولی فائٹر نہیں تھا۔ میں اپنے زخمی بازو کو حتی الامکان اس سے دور رکھ رہا تھا اور اپنے سلامت بازو سے اسے "نیک لاک" لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کے نیچے سے تقریباً نکل آیا تھا جب اچانک اس کا داؤ چل گیا۔ میں اسے اپنے اکلوتے بازو کی گرفت میں نہ رکھ سکا، وہ تڑپ کر میرے پہلو میں آ گیا اور اس نے میری زخمی کلائی تھام لی۔ اس کا ایک پاؤں میری بغل پر اور دوسرا گردن پر تھا۔ یہ آرم لاک کی ایک پرفیکٹ پوزیشن تھی...... اور یہ سفاکی کا عروج بھی تھا۔ اس نے بغیر کسی وارننگ کے میرے بازو کو مروڑا۔ میرا کندھا بری طرح تڑخ گیا۔ ایک لمحے کے اندر مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہڈی جوڑنے کے لیے جو پلیٹس یا پیچ وغیرہ لگائے گئے ہوں گے سب اپنی جگہ چھوڑ گئے ہیں۔ درد کی ایسی ناقابلِ بیان لہریں اٹھیں کہ میں بے ساختہ بلند آواز میں کراہ اٹھا۔ اس نے مجھے مشکل میں دیکھا تو وحشیانہ انداز میں مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میرے چہرے پر تابڑ توڑ گھونسے رسید کیے اور میرے دوسرے بازو کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ مجبور ہو کر میں نے اسے وہ ضرب لگائی جو میں اسٹریٹ فائٹ میں تو لگاتا تھا لیکن Ring میں عام طور پر نہیں لگاتا تھا۔ یہ کہنی کی ضرب تھی۔ یہ ضرب اس کے سینے پر سامنے کی طرف اس جگہ لگی جہاں سینے کی ہڈی ختم ہو جاتی ہے...... میرا مدِمقابل تڑپ کر دور جا گرا۔ میں نے اپنی رہی سہی قوت جمع کی اور اس کے اوپر ترچھا گر کر اس کی گردن اپنی ٹانگوں کی قینچی میں پھنسالی۔ سینے پر لگنے والی ضرب نے اسے پہلے ہی نیم جان کر دیا تھا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے میری طرف

دیکھا اور لکڑی کے فرش پر ہاتھ مار کر اپنی شکست کا اعلان کر دیا۔

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ لیکن میری اپنی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ میرا چہرہ میرے اپنے ہی خون میں لتھڑ گیا تھا اور بازو بے جان ہو کر توری کی طرح لٹک رہا تھا۔ میں اسے معمولی سی حرکت بھی دیتا تو پورا جسم درد کے ناقابلِ برداشت شکنجے میں آجاتا تھا...... کھڑکی سے باہر کھڑے محافظوں نے ایک بار پھر اپنی رائفلیں میری سمت تان لیں۔ آقا جان کے حکم پر ہار مان لینے والے مدِمقابل کو سہارا دے کر کمرے سے باہر نکال لیا گیا۔ اسے سانس لینے میں بے حد دشواری ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا اسے ''اسپتال یاترا'' کرنا پڑے گی۔

اور ''اسپتال یاترا'' کی ضرورت فوری طور پر مجھے بھی تھی۔ اندھا دھند لڑائی میں میرے بازو کا پلاستر ایک جگہ سے کریک ہو چکا تھا اور وہاں خون کے بڑے بڑے دھبے نمودار ہو گئے تھے۔ ایک ٹخنا بھی بری طرح سوج گیا تھا اور وہاں سے خون رس رہا تھا مگر جو لوگ مجھے لڑا رہے تھے، ان کی آنکھوں میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔

''ویل ڈن۔'' آقا جان نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ ''جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔ اس شام کا مزہ دوبالا کر دیا تم نے۔''

اس نے وہسکی کے دو گھونٹ لیے اور ذرا توقف کر کے بولا۔ ''چند منٹ ریسٹ کرنا چاہو گے یا اگلا کھلاڑی میدان میں اترے؟''

میں نے کہا۔ ''کھلاڑی تو کھیل کے میدان میں اترتے ہیں۔ یہ تو درندگی کا تماشا ہے۔ میں جانتا ہوں یہاں تمہاری سفاکی کے بنائے ہوئے اصول ہی لاگو ہوں گے۔''

''بکواس کرنا بہت اچھی طرح آتی ہے تمہیں۔ اسی لیے تو فٹافٹ آگے بڑھنے کے راستے بناتے ہو اور تو اور سپریم کمانڈر تک کو چکرا دیتے ہو۔'' اس نے ایک بار پھر ڈھکے چھپے الفاظ میں میرے اور قسطینا کے تعلق کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے غصیلے لہجے میں نفرت کی بجلی کوندرہی تھی۔ ایسی ہی بجلی بار بار باہر بھی کوندتی تھی اور بادلوں کی گرج در و دیوار کو دہلاتی تھی۔

میری حالت کو خاطر میں لائے بغیر، آقا جان نے جاپانی فائٹر کو اشارہ کیا اور یہاں ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ جاپانی فائٹر نے آگے بڑھنے کے بجائے آقا جان کی طرف رخ کیا۔ اس کے قریب پہنچ کر وہ ادب سے جھکا اور کوئی بات اس کے گوش گزار کی۔

آقا جان نے حسبِ معمول تلخ لہجے میں جواب دیا۔ دونوں کے درمیان ہونے والے اس مکالمے کی آواز لحہ بہ لحہ بلند ہوتی گئی۔ آقا جان انگلش میں پھنکارا۔ ''تمہارا کام سوال اٹھانا نہیں تو ماشی۔ میں تم سے یہ بکواس کر رہا ہوں کہ تم اس سے لڑو۔ اگر اس لڑائی میں یہ جان سے بھی مرتا ہے تو مار دو اِسے......''

''لیکن یہ عام بندہ نہیں ہے سر۔'' جاپانی بھی شکستہ انگلش میں بولا۔ ''یہ میں جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں، یہ ایسٹرن کنگ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک مارشل آرٹ میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔''

''تب اس کا ڈنکا بجتا تھا اور اب یہ خود بجے گا، بلکہ بج چکا ہے۔'' آقا جان پھنکارا پھر جاپانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔ ''میں تمہیں حکم دے رہا ہوں، توڑ دو اس کی ہڈیاں...... مار ڈالو۔''

جاپانی کا رنگ پہلے زرد ہوا پھر دھیرے دھیرے سرخ ہو گیا، وہ بولا۔ ''میں ہاتھ جوڑ کے معافی چاہتا ہوں یہ جس حالت میں ہے، میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ Ring کے اصولوں کے بھی سراسر خلاف ہے۔''

آقا جان نے جاپانی کو اس کے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ ''میں تمہیں حکم دیتا ہوں تو ماشی۔''

''میں آپ کا نہیں علمی صاحب کا ملازم ہوں اور اس وقت آپ کی پراپرٹی پر نہیں علمی صاحب کی پراپرٹی پر ہوں۔''

''بکواس بند کرو۔ میں کہتا ہوں جاؤ اندر۔'' آقا جان نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تو آقا جان کا پارا حسبِ عادت آسمان کو چھو گیا، اس نے تھپڑ جڑ دیا۔ دوسرا تھپڑ پڑنے سے پہلے جاپانی نے آقا جان کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ لی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر تین چار گارڈز جاپانی پر پل پڑے۔ میں اس ہنگامے سے فائدہ اٹھانے کے لیے لنگڑاتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ اس کے ہینڈل کو پکڑ کر جھنجوڑا مگر وہ حسبِ اندیشہ باہر سے بند تھا۔ گارڈز دیوانہ وار جاپانی پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ انہیں روئی کی طرح دھنک ڈالے گا۔ لیکن اس سے پہلے ہی آقا جان غصے سے چنگھاڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے جاپانی کی پشت پر صرف ایک فٹ کے فاصلے سے نائن ایم ایم کے پستول کا فائر کیا۔ ایک گولی نے شیر جیسے جوان کو پہلو کے بل

فرش پر گرادیا۔ دوسری گولی آقا جان نے جنونی انداز میں اس کی کنپٹی پر ماری۔

بجلی چمکی، آقا جان کا چہرہ کسی عفریت کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے جاپانی کی لاش کو ٹھوکریں رسید کیں۔ وہ سیڑھیوں کے بالکل پاس پڑا تھا۔ لڑھک کر سیڑھیوں پر گیا اور پھر پلٹیاں کھاتا ہوا انیس چالیس زینے نیچے پہنچ کر اوجھل ہو گیا۔

آقا جان نے قہرناک نظروں سے مجھے گھورا۔ اس کا یہ بدترین روپ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے اوپر تلے وہسکی کے دو پیگ چڑھائے اور پھر پھیل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ملائی زبان میں فون پر کسی سے بات کرتا رہا۔ دو ملازم اس کے کندھے دبانے میں مصروف ہو گئے۔ فون پر بات ختم کر کے آقا جان نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک کپڑے سے وہ خون پونچھا جو میری ناک اور ہونٹوں سے قطروں کی صورت ٹپک رہا تھا۔ بازو اور کندھے سے اٹھنے والی ٹیسیں ناقابلِ برداشت تھیں۔

دو تین منٹ بعد آقا جان واقعی پرسکون نظر آنے لگا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ اس کی ناک کے بل کی موٹائی کچھ کم ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اب کیا ارادہ ہے تمہارا...... تم ان تینوں بندوں کو زیر کرنے والی شرط تو پوری نہیں کر سکے؟''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں میرے ساتھ جو کرنا ہے، وہ کر کے ہی رہنا ہے۔ یہ شرطیں وغیرہ تو تم بس دل لگی کے لیے بتا رہے ہو۔''

''نہیں نہیں...... میرے چیمپئن شہزادے، تم دلیل سے بات کرو۔ میں تمہاری بات سنوں گا۔'' وہ سخت زہریلے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''دلیل کی بات تو پھر یہی ہے کہ تمہارے تیسرے بندے نے خود لڑنے سے انکار کیا، وہ دوسروں کی طرح بے غیرت نہیں تھا۔''

آقا جان نے وہسکی کے زیرِ اثر ''ٹن'' انداز میں ایک ہچکی لی اور اپنی چندیا سہلا کر بولا۔ ''ہاں، تمہاری دلیل میں وزن تو ہے۔'' پھر وہ اپنے مسلح محافظوں کی طرف رخ کر کے بولا۔ ''کیوں بھئی...... اس باغیرت کی بات میں وزن تو ہے؟''

''یس سر!'' دونوں محافظوں نے ایک ساتھ اپنے سروں کو حرکت دی۔ ویسے وہ بالکل اٹین شین حالت میں کھڑے رہے۔

آقا جان کسی جج کی طرح فیصلہ کرنے والے انداز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے باغیرت بچے! میں اپنا وعدہ نبھاتا ہوں۔ اب یہاں موجود بندوں میں سے کوئی تمہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔'' پھر وہ ذرا وقفہ دے کر بولا۔ ''اب کچھ اور بندے تمہیں ہاتھ لگائیں گے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے تالی بجائی۔ میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، پانچ کے قریب مزید افراد برآمدے میں پہنچ گئے۔ یہ سب شکلوں سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش اور لڑاکے لگتے تھے۔ ایک کے سوا ان کے جسموں پر گارڈز کی وردیاں تھیں۔ وہ میری طرف جلتی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر آنکھوں میں ایک طرح کا ہراس بھی تھا۔

آقا جان دانت پیس کر بولا۔ ''چلو بھئی...... اندر چلے جاؤ...... ذرا مارا ماری کرو اس سے۔ تمہارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہو گی کہ اتنے بڑے چیمپئن کو اپنے ہاتھوں سے گٹ چڑھاؤ گے۔ تاریخ میں تمہارا نام لکھا جائے گا۔''

میں سمجھ گیا کہ بدترین لمحات آنے والے ہیں۔ مزاحمت کی گنجائش نہیں تھی۔ کھڑکی کے باہر سے دو چوکس محافظوں نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ پانچوں افراد بھرا مار کر اندر داخل ہوئے۔ مجھے یہی لگا جیسے آقا جان ڈنمارک یا ناروے وغیرہ کا کوئی سخت گیر نواب ہے۔ اپنے خاندان کی لڑکی سے میل جول رکھنے کے جرم میں مجھے اپنے نوکروں سے مروا دینا چاہتا ہے۔ اندر داخل ہونے والے افراد میری حالتِ زار کی پروا کیے بغیر...... آتے ساتھ ہی مجھ پر پل پڑے۔ میں نے بچی کھچی طاقت کے مطابق مزاحمت کی۔ ایک شخص نے عقب سے میرے سر پر کسی سخت چیز سے شدید چوٹ لگائی۔ میں گھٹنوں کے بل گر گیا۔ وہ شہد کی زہریلی مکھیوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ نہایت بے دردی سے مجھے مارنے لگے۔ اگر میری جگہ کوئی عام شخص ہوتا تو شاید چند سیکنڈ میں بے ہوش ہو جاتا۔ مجھے لگا کہ میرے پورے جسم پر وزنی ہتھوڑے برس رہے ہیں۔ میری ہڈیاں کڑکڑا رہی ہیں، رگ پٹھے ٹوٹ رہے ہیں۔ آہنی گرل والی کھڑکی سے باہر آقا جان پھیل کر آرام کرسی پر براجمان تھا اور اس تماشے سے اپنی روح کو ''تسکین'' فراہم کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تک تو اپنے ٹوٹے ہوئے کندھے کو طوفانی ضربوں سے بچانے کی کوشش کرتا رہا، پھر کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا، میرے ڈوبتے ہوئے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا یہ لوگ مجھے اسی جگہ مار ڈالیں گے...... یا ابھی

مزید زندہ رکھیں گے۔ سرسوں کے کھیت میں کھڑی، مسکراتی لڑکی، بالوں کی دو لٹیں...... اور پھر سب کچھ اندھیروں میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

اس مرتبہ بھی میں کافی دیر بے ہوش رہا۔ بے ہوشی کی اس کیفیت میں شعور بھی کسی حد تک کام کر رہا تھا۔ کسی وقت شدید سردی کا احساس ہوتا اور مجھے لگتا کہ برفیلے پانی میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں۔ کسی وقت یہ برفیلا پانی جسمانی چوٹوں پر مرچوں کی طرح لگتا اور پورا جسم جلن اور درد سے بھر جاتا۔ کیا میں مر رہا ہوں...... کیا میں مرنے والا ہوں؟ کیا میرے بدن کا سارا خون کسی زخم کے راستے بہہ جائے گا اور میں لکڑی کے اس سرد فرش پر لاش کی صورت پڑا رہ جاؤں گا؟

کیا بارش اب بھی ہو رہی ہے؟ بارش کے ساتھ ہی جاناں کا خیال بھی ذہن میں آ گیا۔ میں نے اپنی منوں بھاری پلکوں کو بمشکل اٹھایا اور اردگرد دیکھنے کی کوشش کی۔ کسی زخم کا خون میری آنکھوں میں بھر چکا تھا۔ میں نے کوشش کی اور اٹھ بیٹھا۔ مجھے لگا کہ کندھے کے بعد میرا ٹخنا بھی ٹوٹ چکا ہے۔ پسلیاں بھی چٹخی ہوئی لگتی تھیں۔ ذرا سی حرکت بھی برداشت نہیں کر پا رہی تھیں...... ہاں میں چیمپئن تھا اور چیمپئن کو اس طرح مارا گیا تھا کہ وہ اٹھنے کے قابل بھی نہیں تھا...... اور کچھ دیر پہلے ایک باصلاحیت جاپانی فائٹر کو صرف ایک گولی نے بے بس کر کے زمین پر لٹا دیا تھا۔ کیا یہی ہوتا ہے مارشل آرٹ؟ کیا یہی ہے ذاتی دفاع کی تربیت؟ بے شک یہی کڑوی حقیقت تھی جس نے مجھے ڈنمارک میں مارشل آرٹ سے دور اور مارا ماری سے قریب کیا تھا۔ میں اپنے فائٹر دوست کی موت کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

میرے سینے میں آگ سی بھڑکنے لگی۔ آقا جان کا منحوس چہرہ اپنی پوری کراہت کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس نے کتنے اطمینان سے جاپانی کو مارا تھا، ایسے ہی اطمینان سے اس نے زینب کے قتل کا حکم بھی دیا ہوگا۔ اور ایسے ہی نجانے کن کن لوگوں سے ان کی زندگی چھینی ہوں گی۔ میں نے آنکھوں میں جمع ہو جانے والا خون صاف کیا۔ کمرے کا مضبوط دروازہ باہر سے لاک تھا۔ میں گرل دار کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک اندازہ سا تھا کہ رات کا آخری پہر ہے۔ مثانے پر بے پناہ دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ میں دیوار کا سہارا لیتا ہوا کمرے کے ایک گوشے میں گیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا تاریک باتھ روم موجود تھا۔ کچھ دیر بعد باتھ روم سے نکلا تو نقاہت نے مزید یلغار کی۔ کھڑکی کے قریب کسی چیز سے الجھ کر اوندھے منہ گرا۔ اٹھنے کے بجائے وہیں لیٹے رہنا زیادہ سہل لگا۔ کچھ دیر بعد درد اور نقاہت کی لہروں پر غنودگی غالب آ گئی۔

اگلا دن بڑا چمکیلا اور شفاف تھا۔ دو روز کی زبردست بارش کے بعد نکھری ہوئی دھوپ نکلی تھی۔ میں نے گرل دار کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس ساری جگہ کی بناوٹ عجیب سی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ عمارت نہیں کوئی بہت بڑا گھونسلا ہے جس کے کئی پورشن ہیں۔ کھڑکی میں سے پام کے چند بلند درخت بھی نظر آتے تھے۔ ان درختوں پر بھی گھونسلے تھے۔ دو دو درختوں پر ایک ایک گھونسلا بنایا گیا تھا۔ اس گھونسلے تک جانے کے لیے لکڑی کے چوڑے تختوں والی آسان سیڑھیاں تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ گھونسلے اندر سے آرام دہ کمروں کی طرح ہیں۔

میں نے کہیں سنا تھا کہ کچھ لوگوں کو پرندوں کی طرح گھونسلوں میں رہنے کا "کریز" ہوتا ہے اور وہ تفریح کے لیے ایسے گھونسلے تعمیر کرتے ہیں، شاید حلمی بھی کچھ ایسا ہی شوق رکھتا تھا۔ میری ادھوری معلومات کے مطابق یہ جگہ حلمی کی پراپرٹی تھی۔ جاناں کہاں ہوگی؟ یہ سوال تیر کی طرح ایک بار پھر میرے سینے میں پیوست ہوا۔

میں اٹھ کر کھڑکی تک پہنچا۔ اپنا چہرہ گرل سے لگایا اور رہی سہی توانائی جمع کر کے پکارنے لگا۔ "کہاں ہو تم لوگ...... میری بات سنو...... کہاں ہو؟"

یہ فقرہ میں نے کئی بار دہرایا لیکن کوئی سامنے نہیں آیا۔ اردگرد زیادہ نہیں تو دو چار لوگ تو موجود تھے لیکن مجھے مکمل نظرانداز کر رہے تھے۔

ڈینی فلاورز کی بھینی بھینی مہک میرے اس نخ بستہ قفس تک پہنچ رہی تھی۔ یہ کھلا علاقہ یقیناً جزیرے کا ہی حصہ تھا اور نباتات سے اٹا ہوا تھا۔ میں نے قسطینا کے بارے میں سوچا اس نے میری اور جاناں کی گمشدگی کو کس طرح لیا ہوگا؟ وہاں کیا صورتِ حال ہوگی؟ بہت سے سوالات تھے۔ پچھلے قریباً 48 گھنٹوں سے میرے منہ میں خوراک کا ایک ذرہ تک اڑ کر نہیں گیا تھا۔ لیکن یہاں کسی کو پروا نہیں تھی۔

میرا ٹخنا بے طرح سوجتا جا رہا تھا۔ بازو کی حالت کا تو ذکر ہی کیا۔ وہ جیسے میرے جسم کا حصہ ہی نہیں تھا۔ اس میں ذرا سی حرکت ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ کیا میں ہمیشہ کے لیے ایک بازو سے معذور ہو چکا ہوں۔ یہ سوال بے حد اذیت ناک تھا۔

وہ سارا دن گزر گیا۔ یوں لگتا تھا کہ آقا جان بھی اس جگہ موجود نہیں۔ دور سے گزرنے والے ایک دو گارڈز کے علاوہ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اسی طرح کہیں ..... دور سے رکھوالی کے کتوں کی آواز بھی گاہے بگاہے کانوں تک پہنچی۔ اسی طرح رات ہو گئی۔ چلا چلا کر اب تو میرا گلا بھی جواب دینے لگا تھا۔ آخر کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ کسی گاڑی کی آواز بھی آئی پھر ایک فقرہ کانوں تک پہنچا۔ کوئی انگلش میں کہہ رہا تھا۔ ''آقا جان آ گئے ہیں۔''

ایک دوسری آواز نے کہا۔ ''لیکن زیادہ دیر ٹھہریں گے نہیں۔ سب کچھ ایمرجنسی میں ہو رہا ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہوا؟''

پہلی آواز نے کہا۔ ''سب ٹاپ سیکرٹ چل رہا ہے...... آگے بڑھنے کا آرڈر ہو گا تو بات کلیئر ہو گی۔''

آوازیں معدوم ہو گئیں۔ نقاہت کے سبب میں ایک بار پھر نیم بے ہوشی یا غنودگی کے نرغے میں چلا گیا۔ میں دوبارہ اپنے حواس میں آیا تو کھڑکی سے باہر اندھیرا تھا۔ میرا بالائی جسم عریاں تھا اور مچھروں نے بے تحاشا کاٹا تھا۔ شاید میں جاگا بھی اسی بے چینی کی وجہ سے تھا۔ میرے سامنے ہی چند فٹ کے فاصلے پر ایک ٹرے رکھی تھی جس میں چاول کی پلیٹ اور کسی ترکاری کا سالن تھا۔ میرا کندھا درد سے پھٹا جا رہا تھا، اس درد نے شاید بھوک کو بھی پس منظر میں دھکیل دیا تھا۔ اچانک میں چونک گیا۔ تاریک رات کے اس سناٹے میں مجھے دروازے پر ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ جیسے کوئی لرزتے ہاتھوں سے دروازے کے تالے میں چابی لگانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں دروازے کے قریب چلا گیا۔ میں رہی سہی قوت جمع کر کے یہاں سے نکلنے کی کامیاب کوشش کر سکتا تھا۔ جونہی تالے میں چابی گھومی، میں کسی بھی ردِعمل کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن دروازہ کھول کر اندر آنے والا ہیولا مجھے اپنی جگہ سکتہ زدہ کر گیا۔ وہ ایک لڑکی تھی...... وہ جاناں تھی...... اور وہ زخمی تھی۔ وہ جیسے لڑکھڑا کر میرے اکلوتے بازو پر گری۔

''جاناں۔'' میں نے اسے پہچان کر تیز سرگوشی کی۔

''دروازہ بند کر دیں۔'' وہ کراہ کر بولی۔

میں نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا اور اسے سہارا دیتے ہوئے اس گوشے تک لایا جہاں ناریل کے چھلکے کی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جاناں کے جسم پر مکمل لباس کے بجائے ایک سفید چادر ہے جسے اس نے ایک چھوٹی ساڑی کی طرح اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر گرہ دی ہوئی ہے۔ جاناں کے پیٹ کے قریب زخم تھا جہاں سے خون کا اخراج نمایاں نظر آتا تھا۔

''یہ کیا ہوا جاناں؟'' میں نے تڑپ کر کہا۔

''چاقو لگا ہے، لیکن زخم...... زیادہ...... نہیں۔'' وہ کراہی۔

تب مجھے دوسری بار شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ جاناں کے اپنے ہاتھ میں بھی ایک خون آلود چاقو نظر آ رہا تھا۔ ''یہ تم نے کیا کیا ہے جاناں؟ کیا کسی کو مارا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے دیوار کے ساتھ ٹیک لگانے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئی تو میں نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی بند کر دی۔ چار سُو سناٹا تھا۔ بس کسی وقت رکھوالی کا کوئی کتا شور مچا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ کمرے کی مدھم روشنی میں، میں نے ذرا دھیان سے جاناں کو دیکھا اور لرز گیا۔ اس کے چہرے، گردن اور بازوؤں پر کئی نیل اور چوٹوں کے نشان تھے۔ اس کا حلیہ گواہی دے رہا تھا کہ اسے ''جارحیت'' کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میری نظر ایک بار پھر اس خون آلود چاقو پر جم گئی جو اس نے مضبوطی سے اپنے دائیں ہاتھ میں دبایا ہوا تھا۔

جس طرح میں اُسے دیکھ رہا تھا، وہ بھی میرے بازو کے خون آلود پلاستر اور میرے جسم کے خونچکاں زخموں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جیسے سسک کر میرے گلے سے لگ گئی۔ یوں گلے لگنے سے جہاں مجھے تکلیف ہوئی یقیناً وہ بھی درد سے بھر گئی ہو گی۔ ''میں جانتی ہوں شاہ زیب! آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے...... مجھے پتا ہے۔''

''لیکن مجھے نہیں پتا، تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے...... مجھے بتاؤ جاناں، تمہارا زخم تم تو کہہ رہی ہو کہ یہ زیادہ گہرا نہیں ہے...... لیکن تمہارا خون تیزی سے بہہ رہا ہے۔'' میں نے اس کے پیٹ پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''آپ میری فکر چھوڑو شاہ زیب! مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ آپ کو کچھ اور فکر کرنا ہو گی۔ کچھ بہت برا ہونے جا رہا ہے۔ بہت زیادہ برا۔'' اس نے ذرا توقف کیا اور بولی۔ ''آج رات عزت مآب کی گرین فورس نیوسٹی پر زوردار حملہ کرنے جا رہی ہے، سمجھیں کہ تخت یا تختہ کرنے جا رہی ہے۔ لیکن یہ حملہ ناکام ہو گا۔ بری طرح ناکام ہو گا۔ سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ ڈی پیلس کی بھی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ ہو سکتا ہے...... ہو سکتا ہے...... عزت

ناب، ابراہیم، کمال احمد، بیگم نورل، قسطینا سب مارے جائیں۔" وہ سخت جذباتی انداز میں بولتی چلی گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو جاناں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"اس لیے کہ...... گھر کا بھیدی ہی سب کچھ اجاڑ رہا ہے۔ آقا جان، صرف بداخلاق اور ظالم ہی نہیں، بہت بڑا غدار بھی ہے۔ ڈی پیلس والے اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں، لیکن آج کی رات ان کے اعتماد کا خون ہوجائے گا۔ میں سب کچھ آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں، کانوں سے سن چکی ہوں......"

وہ بری طرح ہانپ گئی، درد اور گھبراہٹ کی شدت سے کچھ بول نہیں سکی۔ میں نے گردن کے نیچے اس کا سینہ سہلایا تاکہ اسے سانس لینے میں آسانی ہو۔ اس کی حالت بتارہی تھی کہ اس کا زخم اس کے بیان کے برعکس سنگین نوعیت کا ہے۔ میں نے اسے سہارا دے کر چٹائی پر لٹا دیا۔

"جاناں! پلیز پہلے مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟ کس نے زخمی کیا تمہیں۔ اور یہ چاقو...... تمہارے ہاتھ میں کیسے ہے؟ کیا تم نے بھی کسی کو مارا ہے؟"

اس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا، عجیب لہجے میں بولی۔ "دو بندوں کو مارا ہے میں نے...... تیسرا ابھی شاید بچ نہیں سکے گا۔" اس نے باقاعدہ اپنے خون آلود ہاتھ کی تین انگلیاں کھڑی کیں۔ میں ششدر رہ گیا۔

عجب صورتِ حال تھی۔ میں خود بھی سخت زخمی تھا لیکن اس وقت جاناں کے زخموں کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ اس نے رک رک کر اگلے تین چار منٹ میں مختصراً جو کچھ بتایا، اس نے ایک نقشہ سا میرے سامنے کھینچ دیا۔ وہ نقشہ کچھ اس طرح تھا۔

یہ جگہ جہاں ہم موجود تھے، شہر سے دور جزیرے کے ایک سرے پر تھی۔ چاروں طرف گھنا جنگل اور گھاٹیاں تھیں۔ یہ کبھی حلمی کے لیے ایک تفریح گاہ ہوتی تھی۔ یہاں وہ اور اس کے دوست اپنی گرل فرینڈز اور رکھیلوں کے ساتھ قیام کرتے تھے۔ گھونسلا نما گھروں میں ناؤنوش کی محفلیں چلتی تھیں لیکن اب کافی عرصہ سے یہ جگہ خالی تھی، اسے آقا جان اور حلمی کے نجی ٹارچر سیل کی سی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ مجھے اور جاناں کو بھی یہاں لایا گیا تھا۔ جاناں کو تو اب تک بڑے آرام سکون سے رکھا گیا تھا۔ تاہم میرے لیے یہ جگہ واقعی عقوبت خانہ ثابت ہوتی تھی۔ یہاں آنے کے بعد جاناں، آقا جان اور حلمی وغیرہ کے خاص کارندے آرب کے سپرد ہوگئی تھی۔ (یہ آرب وہی تھا جس نے کچھ روز پہلے ہوٹل واشگنن میں غیرملکی عورتوں کے ساتھ زیادتی میں حصہ لیا تھا) جاناں تین روز سے اسی کے پاس تھی۔ ڈی پیلس میں بے ہوش ہونے کے قریباً 18 گھنٹے بعد اسے یہیں آرب کے کمرے میں ہوش آیا تھا۔ ہوش میں آنے کے باوجود اس نے خود کو نیم بے ہوش ہی ظاہر کیا اور بے سدھ پڑی رہی۔ آرب اس وقت کمرے میں ہی تھا۔ کچھ دیر بعد جاناں نے دیکھا کہ وہ دودھ کے ایک گلاس میں کچھ ملا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جاناں کو ذرا جھنجوڑ کر اٹھایا۔ دونوں کے درمیان کچھ سوال جواب ہوئے۔ پھر آرب نے جاناں سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور اس سے کہا کہ وہ کل رات سے بھوکی ہے، یہ دودھ پی لے۔ یہاں جاناں نے تھوڑی سی ہوشیاری دکھائی۔ اس نے آرب کے سامنے ایک دو گھونٹ لیے لیکن جب وہ ایک کال اٹینڈ کرنے کے لیے اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہوگیا تو جاناں نے دودھ ایک "ڈسٹ بن" میں انڈیل دیا...... اور پھر بستر پر لیٹ گئی۔ آرب کے خیال کے مطابق وہ اگلے کئی گھنٹوں کے لیے پھر دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوچکی تھی۔ مگر وہ ہوش میں تھی۔ نصف شب کے بعد جب اردگرد خاموشی تھی، اس نے اس اپارٹمنٹ سے نکلنے کی تگ ودو کی (یہ وہی وقت تھا جب کل آقا جان کے کارندوں نے مجھے مار مار کر ادھ موا کر ڈالا تھا اور میں یہاں لکڑی کے فرش پر بے ہوش پڑا تھا) جاناں کو الماری کی دراز سے ایک چابی ملی۔ وہ اس چابی کو مختلف تالوں میں لگا لگا کر دیکھنے لگی۔ یہ چابی کسی باہر کے دروازے کو تو نہیں لگی مگر ایک اندرونی دروازے کو لگ گئی۔ یہ ایک اور چھوٹے سائز کا کمرا تھا۔ یہاں بھی باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، لیکن یہاں جاناں کو کچھ مدھم آوازیں سنائی دیں۔

ان آوازوں نے جاناں کو چونکا دیا۔ ان میں آقا جان کی آواز بھی شامل تھی۔ یہاں کچھ لوگ مٹھائی کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کو پیشگی مبارک باد دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کسی کو کوئی بہت اہم عہدہ ملا ہے یا ملنے والا ہے، اور اس کی خوشی منائی جارہی ہے۔ یہاں پر جو انتہائی انکشاف انگیز گفتگو ہورہی تھی اس میں سے زیادہ تر اردو میں تھی، کہیں کہیں انگلش کے فقرے بھی بولے جارہے تھے۔ اس گفتگو سے جاناں کو معلوم ہوا کہ کل رات (یعنی آج رات) پچھلے پہر نیوسٹی پر ایک فیصلہ کن حملہ کیا جارہا ہے۔ مگر حملے سے پہلے ہی حملہ ناکام کرنے کی پوری منصوبہ بندی ہو

چکی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ''حملہ'' راز نہیں رہا بلکہ حملے سے قبل ہی گرین فورس کی کمر توڑی جارہی ہے۔ جاماجی میں گرین فورس کے تین بڑے ''ایمونیشن ڈپوز'' تھے۔ رازداری کے پیشِ نظر یہاں سے اسلحہ بالکل آخری وقت میں اگلے مورچوں میں منتقل کیا جانا تھا۔ لیکن اب یہ اسلحہ کبھی منتقل نہیں ہونا تھا۔ آج رات ایک بجے کے قریب یہ تینوں بڑے اسلحہ گودام دھماکوں سے اُڑا دیے جانے تھے۔ یہ تینوں دھماکے ایک ساتھ ہونا تھے۔ یقیناً ان میں سیکڑوں لوگوں کی جان آناً فاناً چلی جانا تھی۔ اس کے ساتھ ہی رائے زل کی فورس کو کنٹرول لائن عبور کر کے حملہ کر دینا تھا اور چند میل دور ڈی پیلس میں پہنچ کر دم لینا تھا۔

جاناں کا کھینچا ہوا یہ نقشہ بے شک مختصر الفاظ میں تھا، مگر اس کا ''امپیکٹ'' اتنا شدید تھا کہ میں سرتاپا لرز گیا۔ یہ بہت بڑا اور خوفناک انکشاف تھا۔ مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں جاناں کی باقی رُوداد سن سکوں اور یہ جان سکوں کہ وہ دو افراد کو قتل اور ایک کو شدید زخمی کر کے یہاں تک کیسے پہنچی۔ میں نے جاناں سے اس انکشاف انگیز گفتگو کے سلسلے میں بہ عجلت دو تین سوال مزید پوچھے۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ یہاں بہت کچھ برا ہونے والا ہے اور آقا جان جو اَب تک چھپا دشمن ہے بالکل کھل کر سامنے آگیا ہے (لیکن یہ سوال ابھی تک جواب طلب تھا کہ ڈی پیلس والے اب بھی اس دشمنی سے آگاہ ہوئے ہیں یا نہیں)

میں نے کہا۔ ''جاناں! اب ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ اگر تمہاری معلومات درست ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈپوز کی تباہی میں صرف ڈیڑھ گھنٹا رہ گیا ہے۔''

جاناں نے میری بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''جن بندوں کو تم نے مارا ہے، ان میں سے کسی کے پاس سیل فون تھا؟''

''سیل فون تو شاید تینوں کے پاس ہوں گے لیکن کچھ فائدہ نہیں۔'' اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''شاید آپ کو پتا نہیں کل پھر ڈی پیلس کے آس پاس کچھ گولے گرے ہیں۔ اس سے دو بڑے سیل ٹاورز تباہ ہو گئے ہیں اور سب موبائل فون بند ہیں۔''

''تو پھر؟''

''مجھے تو یہی لگتا ہے کہ...... آپ یہاں سے باہر...... کسی سے رابطہ نہیں کر سکتے...... آپ کو یہاں سے نکلنے کے لیے خود ہی کوشش کرنا ہوگی۔ لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''ابھی نہیں شاہ زیب...... ابھی نہیں۔ آپ اس کمرے سے باہر قدم نکالیں گے تو یہ لوگ آپ کو گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ ابھی آپ کو آدھ گھنٹا انتظار کرنا ہوگا......'' وہ رک رک کر بول رہی تھی۔

''آدھ گھنٹا؟ کیا مطلب؟''

''کھڑکی سے باہر آپ نے درختوں پر تین گھونسلے سے بنے دیکھے ہیں نا؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ''اب یہ گھونسلے، سیکیورٹی اور نگرانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں مشین گنوں والے ملائیشین گارڈز چوکس بیٹھے رہتے ہیں۔ پورے بارہ بجے ان کی ڈیوٹی بدلے گی۔ تینوں گارڈز سیڑھیاں اتر کر نیچے آئیں گے اور نئے آنے والے اوپر جائیں گے۔ میرے خیال میں یہی وقت ہوگا آپ کے نکلنے کا...... اور اپنی قسمت آزمانے کا۔ لیکن میں پھر کہتی ہوں، یہاں سے نکلنا آسان نہیں ہوگا...... یہاں بہت سخت نگرانی ہے...... اور شاید آپ کو ایک اور بات کا پتا نہ ہو...... یہاں بس ہم دونوں ہی نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟ کوئی اور بھی ہے؟''

''ہاں۔'' وہ کراہی۔ ''میڈم قسطینا کے کئی اور وفادار ساتھیوں اور فوجی افسروں کو بھی پکڑ کر یہاں بند کیا گیا ہے...... یہ ایک بڑی سوچی سمجھی سازش ہے۔'' تکلیف کی شدت کے سبب اس کی آواز ٹوٹنے لگی۔

میں نے اس کے زخم کو سمجھنا چاہا۔ زخم زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن خون بہت زیادہ مقدار میں بہہ چکا تھا۔ اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا...... اور میرے خونچکاں بازوؤں کو چوم لیا۔ وہ شمع کی طرح پگھل رہی تھی، ختم ہو رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں سرک رہی تھیں۔ تین دن پہلے تک وہ کراچی جانے والی تھی مگر مجھے لگا کہ اب وہ کراچی نہیں جارہی...... میرے سینے میں دل، ایک بہت بڑے انگارے کی طرح دہک اٹھا۔ اس دہکتے ہوئے دل نے گواہی دی کہ یہ رات اپنے اندر بہت سے ستم چھپا کر لائی ہے۔ یہ سناٹا ایک طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہونے والا تھا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

دوسری دنیا

منظر امام

نیکی اور بدی کی راہیں ٹرین کی پٹری کی طرح ہوتیں تو ساتھ ساتھ ہیں مگر جدا جدا... معمولی سی لرزش ایک ہی لمحے میں قدموں کو غلط راستے پر دھکیل دیتی ہے... پُراسرار علوم میں دلچسپی رکھنے والے صاحبان کے لیے ایک حیرت انگیز واقعہ...

خوابِ غفلت سے بیداری کا سفر طے کرتی ایک مسافر کی کتھا......

میرے ایک دوست اختر حمید نے اس پُراسرار آدمی سے میری ملاقات کروائی تھی۔

''کاشف صاحب! یہ میرے دوست ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی تجربات حاصل کرتے ہوئے گزاری ہے۔ افریقا کے جنگلوں سے لے کر تبت کی برف پوش پہاڑیوں تک۔ کیا کیا حاصل نہیں کیا۔''

''ہاں بھائی۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''بہت کچھ سیکھا ہے میں نے۔''

''ہاں میں ان کا نام تو بتانا بھول ہی گیا۔ ویسے تو ان کا

نام سلیم ہے لیکن یہ مسافر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔''
مسافر پینتالیس اور پچاس کے درمیان کا تھا۔ اس کے چہرے پر...... تجربات کے گہرے نقوش تھے۔ اس کے بال آدھے سفید ہو چکے تھے۔ مجموعی طور پر وہ ایک پُراسرار آدمی معلوم ہوتا تھا۔
''مسافر صاحب، ذرا اپنے تجربات کے بارے میں تو بتائیں؟'' میں نے کہا۔
''کاشف صاحب، بہت طویل کہانیاں ہیں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ 'میں تو اب تھک چکا ہوں۔ لیکن میں نے جس انداز کی زندگی گزاری ہے، وہ سارے تجربات میں ایک کتابی شکل میں لکھ رہا ہوں۔''
''پھر تو وہ ایک دلچسپ کتاب ہوگی۔'' میں نے کہا۔
''ہاں، بہت دلچسپ۔''
چائے آگئی۔ اس وقت ہم اختر حمید کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اختر حمید خود بھی ایک پڑھے لکھے انسان تھے۔ کتابوں کی الماریوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔
''کاشف صاحب، مسافر صاحب کے حوالے سے ایک بات اور سُن لیں۔ انہوں نے تبت کے لاماؤں سے حاضرات کا علم بھی سیکھ رکھا ہے۔''
''کیا؟'' اب اس پُراسرار شخص میں میری دلچسپی اور بڑھ گئی تھی۔ ''حاضرات کا یعنی روحوں کو بلانے کا علم۔''
''جی ہاں۔'' مسافر مسکرا دیا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ بہت پھیکی سی تھی۔ ''لیکن اب میں یہ چھوڑ چکا ہوں۔ اب حاضرات کا عمل نہیں کرتا۔''
''وہ کیوں؟'' اختر حمید نے پوچھا۔
''ایک ایسا واقعہ ہوا تھا جس نے مجھے ذہنی طور پر پریشان کر کے رکھ دیا۔'' مسافر نے بتایا۔ ''اس کے بعد میں نے یہ عمل ہی چھوڑ دیا۔''
''یار، ہمیں وہ واقعہ تو بتا دو۔'' اختر حمید نے کہا۔
''بتا دوں گا، پھر کسی دن۔''
''کسی دن کیوں؟ آج ہی بتا دو۔ آج تم آئے ہوئے ہو۔ خدا جانے پھر کب سفر پر نکل جاؤ۔ پھر کاشف بھی آئے ہوئے ہیں۔ ان کو بھی تمہاری کہانی سے دلچسپی ہوگی۔''
''چلو سنا دیتا ہوں۔''
اس دوران اختر حمید کے ایک دوست منور عالم بھی آگئے۔ وہ کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ اختر حمید نے دوبارہ چائے بنوائی تھی۔ اس کے ساتھ کھانے پینے کی بہت سی چیزیں بھی آگئی تھیں۔

''میں نے یہ علم تبت کے ایک لاما سے سیکھا تھا۔'' مسافر نے بتانا شروع کیا۔ ''آپ لوگوں کو شاید معلوم ہو کہ یہ بہت باکمال لوگ ہوتے ہیں۔ زندگی بھر کی ریاضت ان کے اندر کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیتی ہے۔ خاص طور پر اس قسم کے پُراسرار علوم۔ جن کو اکلٹ سائنس کہا جاتا ہے۔''
''ہاں، میں نے بھی ان کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔'' منور عالم نے کہا۔ ''بلکہ پڑھا بھی ہے۔ یہ لوگ ٹیلی پیتھی وغیرہ جانتے ہیں۔''
''ٹیلی پیتھی تو بہت معمولی سی چیز ہے۔'' مسافر نے بتایا۔ ''یہ لوگ اندھیروں کی دنیا سے روحوں کو ہماری دنیا میں بُلا لیتے ہیں۔ اس علم کو حاضرات کا علم کہا جاتا ہے۔ ایک بات اور بتا دوں کہ حاضرات کے نام پر مغرب میں جو کچھ ہوا کرتا ہے، وہ صرف ڈرامے ہیں۔ اصل علم تو ان لوگوں کے پاس ہے۔''
''تو کتنے دنوں میں تم نے یہ علم سیکھا؟'' اختر حمید نے پوچھا۔
''تین سال میں۔'' مسافر نے بتایا۔ ''ویسے تو اس نے ایک ہی مہینے میں سکھا دیا تھا۔ لیکن تین سال اس کی خوشامد کرنے میں، راضی کرنے میں لگ گئے۔ پھر تربیت کا مرحلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد اس نے یہ ہنر سکھا دیا۔''
''کیا اس کا عملی مظاہرہ بھی کرتے رہے؟'' میں نے پوچھا۔
''درجنوں بار۔ جب میں یوکے میں تھا۔ جب کینیڈا گیا تو ہر جگہ میں نے اس کا کامیاب مظاہرہ کیا۔''
''مسافر صاحب، کیا روح باقاعدہ سامنے آجاتی ہے۔'' منور عالم نے پوچھا۔
''نہیں، ایسا نہیں ہوتا... بلکہ حاضرات کا علم کرنے والا کسی شخص کو اپنا معمول بنا لیتا ہے۔ اس پر ٹرانس کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس کیفیت میں جس روح کو بلایا جاتا ہے، وہ روح اس کو میڈیم یا واسطہ بنا کر اس کے ذریعے بات کیا کرتی ہے۔''
''آپ وہ واقعہ بتائیں جس کے بعد آپ نے یہ کام چھوڑ دیا؟'' میں نے پوچھا۔
''میں یہ مہارت لے کر تبت سے ہوتا ہوا ہندوستان آگیا تھا۔ یہاں میں نے بہت مظاہرے کیے۔ لوگوں کی فرمائشیں پوری کرتا رہا۔ پھر ایک بار لکھنؤ میں حضرت گنج کے ایک نواب صاحب نے مجھے دعوت دی۔ وہاں اور بھی لوگ تھے۔ باتوں کے درمیان یہ قصہ بھی شروع ہو گیا۔ ان میں

سے ایک صاحب جن کا نام مجھے آج بھی یاد ہے معظم۔ وہ ایک بوڑھے آدمی تھے۔ انہوں نے فرمائش کی کہ میں ان کے بیٹے کی روح کو بلاؤں جو ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گیا تھا۔

میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''محترم رہنے دیں۔ وہ جہاں ہے، وہاں سکون سے ہوگا۔ اسے بلا کر خوانخواہ اسے پریشان کیوں کریں۔'' لیکن وہ بضد رہے۔

''بہرحال میں نے ضروری تیاریاں کیں اور دوسری شام کو آنے کا کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ میں ان صاحب کے بیٹے کی روح کو بلانے کے حق میں نہیں تھا۔''

''وہ کیوں؟'' اختر حمید نے پوچھا۔

''یار، وہ ایک باپ تھا اور ایک باپ کے لیے کتنے دکھ کی بات ہوگی کہ اس کا وہ بیٹا ایک بار پھر اس کے سامنے آجائے جس کو وہ کھو چکا ہے۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ دوسری شام نواب صاحب نے مجھے بلانے کے لیے سواری بھیج دی۔ بہرحال میں ان کے گھر پہنچ گیا۔''

''وہاں اور بھی لوگ تھے۔ ایک تو وہی صاحب تھے جو اپنے بیٹے کی روح کو بلانا چاہتے تھے۔ ان کے علاوہ دو چار اور لوگ بھی تھے۔ ان ہی میں ایک ہندو پنڈت بھی بیٹھا ہوا تھا جس کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ اس کی موجودگی اچھی نہیں لگی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے بھی بہت ریاضت کر رکھی ہے اور بہت کچھ جانتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں اس عمل کو کرنے کا دل نہیں ہو رہا تھا۔''

''کیا آپ کو خوف آرہا تھا مسافر صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید لیکن جو احساس تھا اس کو مکمل خوف بھی نہیں کہہ سکتے۔'' مسافر نے کہا۔ ''ایک حس تھی جو یہ بتا رہی تھی کہ میں اس کے سامنے یہ عمل نہ کروں ورنہ نقصان کا اندیشہ ہے۔''

''کس قسم کا نقصان؟''

''یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے ذرا سی دیر کے لیے سادھی لگانے کی کوشش کی۔ سمادھی سمجھتے ہیں۔ یہ استغراق کی سب سے گہری کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن وہاں جا کر بھی کچھ پتا نہیں چلا۔ پھر میں نے ان صاحب سے معذرت کر لی جن کے صاحب زادے کی روح کو بلانا تھا لیکن وہ انتہائی مایوس اور اداس ہو گئے تھے۔ بہرحال مجھے ان کی بات ماننی پڑ گئی، پھر میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو تیار کیا۔ دو چار وظیفے پڑھے اس کے بعد اس عمل کے لیے تیار ہو گیا۔''

ہم سب اس کی باتوں میں محو ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے بیان کرنے کا انداز بھی بہت موثر اور ڈرامائی تھا۔

''اب مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جس کو معمول بنا سکوں تاکہ وہ روح اس پر آسکے۔'' مسافر نے آگے بتانا شروع کیا۔ وہ پھر اچانک میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نا اس پنڈت کو معمول بنا لیا جائے۔ کیونکہ دشمن کو یا جس سے کچھ خدشہ ہو اس کو باندھنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کو ذمے داری دے دی جائے۔''

اس دوران وہ پنڈت گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے بھی میرا جائزہ لے لیا تھا۔

''مہاراج۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''کیا اس عمل میں آپ میرا ساتھ دیں گے؟''

''ضرور، ضرور، بتاؤ کیا کرنا ہے۔''

’’آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کیا کرنا ہوتا ہے۔ آپ کو میں اپنا معمول بنالوں گا۔ آپ پر سادھی کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ اس کے بعد میں جس کی روح کو بلاؤں گا، وہ آپ کی زبان سے اپنی باتیں کرے گی۔‘‘

’’ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔‘‘ پنڈت نے گردن ہلائی۔

’’میرے ذریعے کوئی کام ہوتا ہے تو پھر میں حاضر ہوں۔‘‘

اب میں ان صاحب کی طرف متوجہ ہوا جن کے بیٹے کی روح کو بلانا تھا۔ ’’اب مجھے اپنے بیٹے کا نام بتائیں اور اگر اس کی کوئی تصویر ہے تو مجھے دکھادیں۔‘‘

’’ہاں، تصویر تو اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔‘‘ انہوں نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر میرے حوالے کر دی۔ وہ ایک سجیلا نوجوان تھا۔ بے چارہ جوانی میں انتقال کر گیا تھا۔

’’اس کا نام فیضان بیگ تھا۔‘‘ انہوں نے بتایا۔

’’بہت ہمدرد، بہت ذہین اور صورت شکل تو آپ کے سامنے ہے۔‘‘

’’ہاں، وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ اچھا تو پھر اجازت ہے نا۔‘‘

’’اب سب میری طرف متوجہ تھے۔ میں نے پنڈت کی پیشانی پر اپنی انگلی رکھ دی۔ میں اس کو سے دے رہا تھا۔ سب دلچسپی لے رہے تھے۔ اس نے کچھ دیر بعد اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔

وہ ٹرانس کی کیفیت میں چلا گیا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس وقت بھی میرے دل میں کھٹکا سا ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ سب چھوڑ چھاڑ دوں۔

’’کیا یہ کیفیت پہلے کبھی ہوئی تھی؟‘‘

’’نہیں، کبھی نہیں۔‘‘

’’پھر اس پنڈت میں کیا خاص بات تھی؟‘‘

’’اس وقت تک تو صرف خدشے تھے۔ بعد میں معلوم ہوگیا کہ میں بلاوجہ ہی نہیں چونکا تھا بلکہ کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی۔ اب وہ مرحلہ آگیا تھا کہ میں واپس بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنے عمل کو جاری رکھا اور اس نوجوان کی روح کو بلانے کی کوشش شروع کردی۔‘‘

مسافر بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ جیسے اس وقت بھی وہ کچھ یاد کر کے اذیت محسوس کررہا ہو۔

’’میں نے اس روح کو حکم دیا کہ وہ حاضر ہو جائے۔ ایک بار، دوبار، لیکن کچھ نہیں ہوا۔ میں نے اپنے عمل کی رفتار تیز کردی۔ کچھ بکی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ کاش میں اس مرحلے سے واپس ہوجاتا۔‘‘

’’کیا اس نے آپ کی طاقت سلب کرلی تھی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں، وہ طاقت تو آج بھی میرے پاس ہے۔‘‘

’’تو پھر کیا بات تھی؟‘‘

’’وہ روح حاضر بھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے مجھے کچھ آہیں اور سسکیاں بھی سنائی دی تھیں۔ جن کو صرف میری ہی سماعت نے محسوس کیا ہوگا۔ دوسروں کو احساس بھی نہیں ہوا ہوگا کہ اس کمرے میں کیا واقعہ رونما ہو رہا ہے۔‘‘

’’مسافر صاحب، آخر ہوا کیا تھا؟‘‘

’’پلیز، ذرا مجھے اپنے حواس میں آنے دیں۔ میں پہلی بار کسی کو یہ سب بتا رہا ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پھر بتانا شروع کیا۔ ’’وہ پنڈت اچانک اٹھا اور ہم سبھوں کو رام رام کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ بظاہر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن بہت کچھ ہوگیا تھا۔‘‘

’’اس بے بس نوجوان کی روح آئی تھی اس پنڈت کے پاس۔ اور اس نے اسے قید کرلیا۔‘‘

’’قید کرلیا؟‘‘ ہم سب بیک وقت بول پڑے تھے۔

’’ہاں، اس کا مقصد حل ہوگیا۔ وہ اپنے گندے اور سفلی عمل کے لیے کسی ایسی ہی روح کی تلاش میں تھا جس کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوا ہو اور بدقسمتی سے میں نے اسے پورا پورا موقع فراہم کردیا۔ یہ سمجھیں کہ ایک مسلمان لڑکے کی روح کو بلا کر تحفے کے طور پر اسے پیش کردیا۔ اور اب وہ خدا جانے اس سے کیا کیا کام لے رہا ہوگا۔ میں نے جو آہیں اور سسکیاں سنی تھیں، وہ اس بدقسمت نوجوان کی روح کی تھیں۔ کاش! کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ میں نے اسے زبردستی اس پنڈت کی طرف بھیجا تھا اور اس نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھالیا۔ اس کے بعد میں نے یہ عمل چھوڑ دیا۔ میں اب کسی اور کو گندی طاقتوں کے حوالے نہیں کر سکتا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو چکا ہے۔‘‘

وہ چلا گیا۔ نہ جانے کہاں۔

اور ہم یہ سوچتے ہی رہ گئے کہ یہ کیسی دنیا ہے۔ کیا ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں؟ کیا ایک دنیا ایسے اندھیروں کی بھی ہے جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔

اثباتِ جرم

تمکین رضا

ذہنی کج روی معاملاتِ زندگی کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے... جرم کی نوعیت کچھ بھی ہو... ہر صورت میں جرم ہی گردانا جاتا ہے۔ لفظوں سے لکھتے کھلاڑی کی روداد... کوئی بھی کام ہو اس کی انجام دہی کے لیے غیر معمولی قوتِ ارادی اور حق گوئی کا حامل ہونا پڑتا ہے... اس کی زندگی کی کہانی میں نئے اور پرانے کردار آرہے تھے... اور معاملات کو سلجھانے کے بجائے الجھا رہے تھے...

جرم کا اعتراف اور ارتکاب جرم کی حامل کہانی کی تشنگی

''اوہ میرے خدا!'' میجر بائن نے اپنی بیوی کے کندھوں پر جھکتے ہوئے کہا۔ اس کی نظریں کمپیوٹر اسکرین پر تھیں۔ ''کیا واقعی وہ اپنی بہو کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی نہیں کر رہی؟''

اس کی بیوی سراغ رسانی سے متعلق کہانیاں لکھتی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ''وہ ایسا محسوس کرتی ہے کیونکہ اس کی بہو مینا نے اس کی زندگی عذاب بنا دی ہے۔ اس نے جونی کو ماں سے ملنے یا رابطہ کرنے سے روک دیا ہے۔

جارجیا نے اپنے بیٹے کو تین سال سے نہیں دیکھا جب سے اس کی شادی ہوئی ہے۔ جونی بہت ہی پیارا اور محبت کرنے والا لڑکا تھا جس نے کبھی اپنے والدین کو لمحہ بھر کے لیے پریشان نہیں کیا لیکن اب وہ بالکل بدل گیا ہے اور اس کی ذمے دار مینا ہے جس نے اس کے دماغ میں ماں کے خلاف زہر بھر دیا ہے۔ وہ ایک جذباتی بدروح کی طرح ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ شروع سے ہی جارجیا کی دشمن تھی گو کہ جارجیا مانتی ہے کہ یہ نفرت دوطرفہ ہے۔ شادی کے موقع پر مینا نے سیاہ لباس پہنا جس پر سیاہ نقاب لگا ہوا تھا۔ اسے اس لباس میں دیکھ کر جارجیا اپنی نفرت نہ چھپا سکی اور اس کے ردِعمل نے مینا کو مشتعل کر دیا۔ شادی کے استقبالیہ میں دونوں عورتوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ مینا اپنے زبردست ردِعمل کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ احساسِ برتری میں مبتلا ہے اور تھوڑی بہت فراڈ بھی۔ جارجیا اسے ایک عفریت سمجھتی ہے۔''

''دلچسپ مواد ہے لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ پڈنگ میں انڈوں کی مقدار زیادہ ہوگئی ہے؟''

انتونیا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیسی پڈنگ؟''

''اس طرح کے ولن جیمز بانڈ کی فلموں میں پائے جاتے ہیں لیکن شاید تمہارے پڑھنے والے......''

''کون سے پڑھنے والے؟'' انتونیا نے شوہر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''تمہارے پڑھنے والے میری جان۔ مجھے تو یہ کسی سراغ رساں کہانی کا آغاز لگ رہا ہے۔''

''کاش یہ سراغ رساں کہانی ہوتی لیکن ایسا نہیں ہے۔'' انتونیا نے کہا۔ ''یہ میری کاپی ایڈیٹر جارجیا لوئس ڈیل کی جانب سے بھیجی گئی تازہ ترین ای میل ہے جس کی زندگی اس کی بہو نے تباہ کر دی ہے۔ اس نے مجھے مینا کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تھا لیکن معاملہ بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ جارجیا کو یقین ہے کہ بیٹے کی شادی کے بعد جو پریشانیاں ہوئیں، انہی کی وجہ سے اس کے شوہر کو فالج اور پھر موت واقع ہوگئی۔ میں نے اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا۔''

اس ای میل کا مضمون کچھ یوں تھا۔ ''پیاری انتونیا! تمہارے پیغام کا شکریہ۔ معذرت خواہ ہوں کہ ذاتی مسائل کی وجہ سے تمہارے ناول پر ہونے والا کام رک گیا ہے۔ میرے لیے اس پر توجہ دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک خوش گوار اور روشن دن ہے لیکن میرے ذہن پر گہری دھند چھائی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ میں بھول بھلیوں میں بھٹک رہی ہوں اور مسلسل یہی بات سوچ رہی ہوں کہ مینا کا قتل ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ اس کے قتل سے معاملات اور خراب ہو جائیں گے تاوقتیکہ میں اسے ایک حادثے کا رنگ نہ دوں۔ گزشتہ ایک ہفتے سے میں ہر رات ایک ہی خواب دیکھ رہی ہوں۔ روزانہ میرا شوہر خواب میں آ کر کہتا ہے کہ وقت آ گیا ہے۔ تم اس بارے میں کچھ کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ ناقابلِ تصور تباہ کن قوتیں مجھے اس جانب دھکیل رہی ہیں۔ میرے اندر غصہ بھرا ہوا ہے۔ میں اسے مردہ دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ میرا بیٹا آزاد ہو جائے۔ وہ واپس آ جائے۔ جب تک وہ عورت زندہ ہے، یہ دنیا اندھیری اور تکلیف دہ جگہ رہے گی۔''

انتونیا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''صاف لگ رہا ہے کہ یہ لکھتے وقت وہ بری حالت میں تھی۔ شاید وہ پہلے سے پچھتا رہی ہو، بے چاری جارجیا۔ وہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد سے ہی ڈپریشن دور کرنے والی دوائیں لے رہی تھی۔ میں اس سے ہمدردی کے سوا کیا کر سکتی ہوں لیکن اس کے معاملات میں ملوث نہیں ہونا چاہتی۔ ان کا تعلق اس کی ذات سے ہے۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پائن نے کہا۔ ''وہ ایسی کوئی حماقت نہیں کرے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ اپنی بہو کو قتل کر دے گی۔ نہیں یہ قطعی خلافِ قیاس ہے۔''

اس کے ایک ماہ بعد پندرہ ستمبر کو ایلڈرج ہاؤس میں لیڈی فریڈا کی پارٹی تھی، تقریباً سبھی مہمان آ چکے تھے اور ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ اچانک کسی نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے درمیان عفریت موجود ہے۔'' اس کے بعد اس کا ہسٹریائی قہقہہ فضا میں گونجا۔

گو کہ وہ پورے ہال کا بڑی احتیاط سے جائزہ لے چکی تھی لیکن اپنے ذہن میں خاص طور پر قتل کرنے کا خیال لے کر نہیں آئی تھی۔ اس کی اصل نیت کچھ اور تھی۔ وہ چونکانا، حیران اور پریشان کرنا چاہ رہی تھی لیکن جیسے ہی اس کی نظر میز پر رکھی ہوئی چمک دار شے پر گئی تو اس کے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال آیا۔ اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ ایک ویٹر نے اسے کاک ٹیل پیش کی۔ اس نے شیمپئن کا ایک گھونٹ لیا اور اچانک ہی اس کے

ذہن میں طریقہ کار واضح ہوگیا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس پر اسے کس طرح عمل کرنا ہے۔

دوسرے دن صبح ناشتے کی میز پر میجر پائن نے ٹائمز کے تازہ شمارے پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔

''شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن مینا مرچکی ہے۔ اس کی موت گزشتہ شب ہوئی۔ وہ ایلڈرج ہاؤس کی پارٹی میں شریک تھی جو لیڈی فریڈا کی ملکیت ہے...... بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔''

انتونیا نے حیرانی سے شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی مینا ہے؟''

''ہاں، اس کا پورا نام لکھا ہے مینا لوئس ڈیل۔ اس کے علاوہ لیڈی فریڈا بھی جارجیا کے مصنفین میں شامل ہے۔ یہ بات تم نے ہی مجھے بتائی تھی۔''

''ہاں، وہ تو ہے۔ یہ وہی ہوسکتی ہے لیکن مینا اس لیڈی فریڈا کی پارٹی میں کیا کررہی تھی۔ اس میں کچھ لکھا ہے کہ اسے کس نوعیت کا حادثہ پیش آیا؟''

''نہیں، ایسا کچھ نہیں لکھا۔''

''کیا اس خبر میں جارجیا کا ذکر ہے کہ وہ بھی مہمانوں میں شامل تھی؟''

''نہیں لیکن یہ کتنی غیر معمولی بات ہے۔''

اسی اثنا میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انتونیا نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک گھبرائی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ ''انتونیا! تمہیں زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں۔ کیا تم نے آج کا اخبار دیکھا؟''

''ہاں جارجیا۔ وہی دیکھ رہی تھی۔''

''وہ مرگئی ہے اور میں ظاہری طور پر افسوس بھی نہیں کرسکتی۔''

''میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک حادثہ تھا۔''

''مجھے اس بارے میں تفصیل معلوم نہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ میں اس پارٹی میں موجود تھی لیکن بخدا مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ بھی وہاں ہوگی۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ میں کبھی نہ جاتی لیکن فریڈا نے کار بھیج دی اور اسے انکار کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اتفاق یہ ہے کہ جونی بھی وہاں موجود تھا۔''

''جونی! تمہارا بیٹا؟ وہ بھی پارٹی میں تھا؟''

''ہاں، ہم تینوں وہاں تھے۔ جونی نے مجھ سے بات کی اور مجھے بوسہ بھی دیا۔ بہرحال میں مینا کی موت کی خواہش کررہی تھی اور وہ مرگئی۔ میں خوش ہوں۔ کیا تم میرے پاس آسکتی ہو؟''

''تمہارا مطلب ہے ابھی؟''

''ہاں ابھی، جتنی جلدی ممکن ہوسکے۔ میں تمہاری بے حد شکرگزار رہوں گی۔ اچھا ہے کہ جب پولیس آئے تو میرے پاس ایک دوست موجود ہو۔''

''پولیس؟'' انتونیا کا تجسس بڑھ گیا۔

''ہاں، وہ ساڑھے بارہ بجے آئیں گے۔ پولیس مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔''

جارجیا، ایلگن ٹیرس میں رہتی تھی۔ انتونیا نے محسوس کیا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں کافی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ گوکہ وہ اس سے پہلے صرف دو مرتبہ ملی تھیں لیکن انتونیا کو وہ ایک لمبی، ہینڈسم اور پُراعتماد عورت کے طور پر یاد تھی گوکہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن اس کا چہرہ سکڑ گیا تھا۔ اس نے نیلی بلاؤز اور چاکلیٹی رنگ کا اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ گلے میں اس کا نظر کا چشمہ لٹک رہا تھا۔

جارجیا کو حیرت تو ہوئی کہ انتونیا اپنے شوہر کے ساتھ کیوں آئی ہے لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا اور انہیں اپنے ہمراہ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ اس نے کہا۔ ''پولیس مجھ سے کیوں پوچھ گچھ کرنے اور میری چھوٹی سی خوشی کا جشن برباد کرنے آرہی ہے؟''

''مجھے امید ہے تم پولیس کو نہیں بتاؤ گی کہ مینا کی موت پر جشن منارہی ہو۔'' انتونیا نے کہا۔

''نہیں بالکل نہیں۔ گوکہ میں اپنے آپ کو غمزدہ بھی ظاہر نہیں کرسکتی۔'' جارجیا نے کافی پاٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''چلٹرن نامی ایک انسپکٹر ساڑھے بارہ بجے آرہا ہے۔'' اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم فریڈا کو جانتی ہو؟''

''کچھ زیادہ اچھی طرح نہیں۔ ہم ایک یا دو مرتبہ ملے ہیں۔ پہلی ملاقات گزشتہ برس ہیچرڈ کی سالانہ پارٹی میں ہوئی تھی پھر ہم ایک ادبی لنچ میں ملے۔ وہ بڑی دوست نواز ہے۔ مجھے اچھی لگی۔''

''میں بھی اسے پسند کرتی ہوں۔ اس کے ساتھ کام کرنا بہت آسان ہے۔ جب اسے کوئی مشورہ دیا جائے تو اس سے انحراف نہیں کرتی اور ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ عملی طور پر میں ہی اس کی کتابیں لکھتی ہوں۔ وہ بہت ہی دلچسپ باتیں کرتی ہے۔''

''فوائل کے لنچ میں بھی وہ انتہائی قیمتی فر کا کوٹ اور ہیرے پہن کر آئی تھی اور ہاتھ سے بنے ہوئے سگریٹ پی

رہی تھی جن پر اس کا سنہری مونوگرام بنا ہوا تھا۔'' انتونیا نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''وہ بہت امیر اور مہربان عورت ہے۔ اس نے رومانیہ سے آئے ہوئے یتیم بچوں کی مدد کے لیے اپنی جائداد کا بڑا حصہ عطیہ دے دیا تھا۔''

میجر پائن نے کافی کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔''وہ ارل آف لینی لائن کی بیٹی ہے جو میری آنٹی کا پرانا عاشق تھا اور اب بھی زندہ ہے۔ اس کی عمر سو سال تو ہو گی۔ فریڈا کی شادی ایڈورڈ ٹرس ٹریل سے ہوئی تھی، اب ان کی طلاق ہو چکی ہے۔ اس کا ایک بچہ گم ہو گیا تھا یا خانہ بدوشوں نے اغوا کر لیا تھا۔ یہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے کے اخبارات میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے۔''

''میرا ماننا ہے کہ اس کا بیٹا گم ہو گیا تھا۔'' جارجیا بولی۔''پھر اس نے ایک رومانیہ کی یتیم لڑکی گود لے لی۔ وہ بہت ہی خوب صورت ہے۔ انتہائی دلکش، متین اور نیلی آنکھوں والی۔ مجھے اس کا لباس بہت پسند ہے اور وہ اپنے سر پر ایک جڑاؤ ٹوپی پہنتی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے کسی کی یاد آجاتی ہے۔ شاید وہ اور جونی شادی کر لیں۔ میں توجہ دیے بغیر نہ رہ سکی جب انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مینا کی موت کے بعد ان کے لیے صورتِ حال بہتر ہو جانی چاہیے۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتیں؟''

''پولیس تم سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ اس کا تعلق مینا کی موت سے ہی ہو گا گو کہ میں نہیں سمجھتی کہ اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہوں جبکہ میں نے اسے وہاں دیکھا ہی نہیں۔''

چند لمحے جارجیا خاموش بیٹھی رہی پھر بولی۔''یہ فریڈا کی مہربانی تھی کہ اس نے مجھے پارٹی میں مدعو کیا۔ میں نے اس کی کتاب کی ایڈیٹنگ کی تھی جو بیسٹ سیلر ثابت ہوئی۔ تم نے بھی اس کا نام سنا ہو گا 'عفریت ہمارے درمیان ہیں' میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا لیکن اس نے میری ایک نہ سنی اور کہا کہ وہ گاڑی بھیج رہی ہے اور میرے لیے یہ بہت اہم ہے کہ اچھی طرح تیار ہو کر آؤں۔

''چنانچہ میں نے ایک گولی کھائی۔ اپنا بہترین لباس زیب تن کیا اور پارٹی میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئی۔ فریڈا نے استقبال کرتے ہوئے کہا کہ میرے لیے ایک سرپرائز ہے پھر اس نے مجھے جونی سے ملوایا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اسے کیسے جانتی ہے جبکہ میں نے کبھی اس سے جونی کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ پہلے تو میں اسے پہچان ہی نہ سکی۔ وہ بہت دبلا ہو گیا ہے۔''

''وہ بھی تمہیں دیکھ کر خوش ہوا ہو گا؟''

''ہاں گو کہ میں سمجھتی ہوں کہ اس کے علاوہ بھی کوئی وجہ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ بہت شرمندہ ہے پھر اس نے مجھے پیار کیا۔ اس کے بعد مجھ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ مجھے ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آرہی تھی چنانچہ مجھے کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ پھر میں نے برانڈی مانگی اور بالکل بھول گئی کہ ڈاکٹر نے ٹرینکس لینے کے بعد شراب پینے سے منع کیا تھا۔ میں پہلے ہی شیمپئن کی کاک ٹیل پی چکی تھی پھر مجھے سب چیزیں دو دو نظر آنے لگیں۔ اچانک ہی میں نے دو خوب صورت رومانین لڑکیوں کو دیکھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جب دوبارہ کھولیں تو اپنے سامنے کورل اسمتھ کو دیکھا۔''

''اوہ ڈیئر، وہ بھی وہاں تھی؟''

انتونیا اسے جانتی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح سراغ رسانی کی کہانیاں لکھا کرتی تھی۔ بدقسمتی سے جارجیا کو اس کے ساتھ کام کرنا پڑ گیا۔ کورل نے پبلشر سے جارجیا کی شکایت کی اور کہا کہ اسے دوسرا کاپی ایڈیٹر دیا جائے۔ اسے یہ اچھا نہیں لگا کہ جارجیا نے اس کے جملوں کی ساخت اور گرامر میں تصحیح کیوں کی۔

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ مینا کو جانتی ہے یا نہیں۔'' جارجیا نے کہا۔

''ٹھیک ساڑھے بارہ بجے بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی اور انسپکٹر چلٹرن اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ کوئی سارجنٹ نہیں تھا جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کا دورہ مکمل طور پر سرکاری نہیں ہے۔

''مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میری بہو بھی پارٹی میں موجود ہو گی۔'' جارجیا نے کہا۔''اگر میں اسے دیکھ بھی لیتی تو شاید نہ پہچان پاتی کیونکہ میں نے اسے تین سال پہلے دیکھا تھا۔''

''یہ ایک طویل عرصہ ہے۔'' انسپکٹر چلٹرن نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔''اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کیا تمہاری آپس میں بنتی نہیں تھی؟''

جارجیا نے بتایا کہ ان دونوں کے درمیان اچھے تعلقات تھے لیکن مینا بہت مصروف رہتی تھی۔''اسے اپنے کیریئر کی بہت فکر تھی اور یہی حال جونی کا بھی ہے۔ وہ زیر

تربیت بہتر ہے۔ ان دونوں کے پاس فیملی کو دینے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پارٹی میں موجود ہوگا۔ یہ اس وقت پتا چلا جب اس نے پاس آکر مجھے ہیلو کہا لیکن مینا کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ میں نہیں سمجھتی کہ اسے وہاں مینا کی موجودگی کے بارے میں علم ہوگا۔ میرے خیال میں یہ سب باتیں تمہارے لیے ناقابلِ یقین ہیں۔"

"ہاں بہت زیادہ۔" انسپکٹر نے ایک نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔ "کیا تم لیڈی فریڈا کی دوست ہو؟"

"میں اس کی کاپی ایڈیٹر ہوں۔"

"بظاہر لیڈی فریڈا نے سب کو یہی بتایا تھا کہ وہ دہرا جشن منا رہی ہے اور اس پارٹی میں وہ ایک اہم اعلان کرنے والی ہے لیکن تمہاری بہو کی موت کی وجہ سے اسے یہ اعلان ملتوی کرنا پڑ گیا۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ دہرے جشن سے اس کی کیا مراد تھی؟"

"نہیں، کیا تم نے اُس سے نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔ اس نے کہا کہ دہری خوشی سے اس کی مراد اس کی کتاب کی کامیابی اور خوش گوار موسم ہے کیونکہ تین سال سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں لیکن مجھے لگا کہ وہ کچھ چھپا رہی تھی۔"

"ضروری نہیں۔ وہ تھوڑی سی غیر روایتی ہے۔"

میجر پائن گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "میں غیر متعلقہ تفصیلات میں تمہاری توجہ دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ تم کسی بھی طرح مینا کی موت کو مشتبہ نہیں سمجھ رہے۔"

"اس کیس کے کچھ پہلو پریشان کر دینے والے ہیں۔" چلٹرن نے کہا پھر وہ جارجیا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"میں تمہارا بہت شکر گزار رہوں گا اگر تم گزشتہ شب ہونے والی پارٹی میں اپنی نقل و حرکت کی تفصیل بتا سکو۔ تم وہاں کس وقت پہنچی تھیں؟"

"تقریباً سات بجے۔ اس وقت پارٹی شروع ہو گئی تھی اور بڑی تعداد میں مہمان آچکے تھے۔ بینڈ دھنیں بکھیر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو بے سمت محسوس کیا کیونکہ میں دوا کے زیرِ اثر تھی۔ پھر فریڈا آئی۔ میری ملاقات اپنے بیٹے اور ایک عورت کورل اسمتھ سے ہوئی پھر میں نے ایک موٹے شخص سے گرمی کی شکایت کی اور کہا کہ اگر فوراً باہر نہ گئی تو میرے بال جلنا شروع ہو جائیں گے۔ میں نے ایک خوب صورت رومانین لڑکی مارگریٹا سے بھی بات کی۔"

انسپکٹر چلٹرن نے اپنے نوٹس دیکھے اور بولا۔ "مس مارگریٹا کیپرو۔ وہ لیڈی فریڈا کے ساتھ ہی رہتی ہے۔"

"اوہ ہاں۔ فریڈا نے اس کا تعارف ایک یتیم لڑکی کے طور پر کروایا تھا۔ وہ ایک فلاحی تنظیم کی سرپرست ہے جو رومانیہ سے آئے ہوئے یتیم بچوں کے لیے کام کرتی ہے۔ وہ لڑکی بہترین انگریزی بول رہی تھی پھر میں نے اچانک ہی اپنی طبیعت میں خرابی محسوس کی۔"

"کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ پارٹی میں اپنی بہو کی موجودگی کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا؟"

"ہاں، یہ میرے لیے ایک معما ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک مقالہ لکھنے کے سلسلے میں جرمنی گئی ہوئی ہے۔ وہ علم موسیقی کی ماہر تھی اور اس نے اس حوالے سے کئی مقالے لکھے تھے۔"

"ایسا لگتا ہے کہ مینا اپنے شوہر کو بتائے بغیر خفیہ طریقے سے لندن آئی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ بھی لیڈی فریڈا کی پارٹی میں موجود ہوگا۔" انسپکٹر چلٹرن نے آہستہ سے کہا۔ "اس بات کے مضبوط شواہد موجود ہیں کہ تمہاری بہو جونی کو پریشان کرنے کی نیت سے آئی تھی۔ وہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہ رہی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ جونی کو دکھانا چاہتی ہے۔ اسے اس کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے اور یہ کہ وہ اس سے بے وفائی کر رہا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ جونی کو لیڈی فریڈا نے نہیں بلکہ مارگریٹا نے پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ وہ دونوں ایک ماہ قبل فیس بک کے ذریعے دوست بنے تھے۔ وہ اس وقت بھی رومانیہ میں تھی۔"

چلٹرن نے نوٹ بک کا صفحہ پلٹتے ہوئے کہا۔ "اور اب ہم اس کیس کے نمایاں پہلو کی طرف آتے ہیں جو سب سے زیادہ تعجب کا باعث ہے اور یہ وہ حلیہ ہے جو تمہاری بہو نے اس پارٹی میں شرکت کے لیے اختیار کیا۔"

"کیسا حلیہ؟"

"مینا اس پارٹی میں ہوبہو مس مارگریٹا جیسا لباس پہن کر گئی۔ یہاں تک کہ اس نے ویسی ہی مرصع ٹوپی بھی سر پر اوڑھ رکھی تھی۔ اس لباس کے علاوہ مینا نے ایک سیاہ وگ بھی لگا رکھی تھی جس کا اسٹائل بالکل مس مارگریٹا کے بالوں جیسا تھا۔ اس نے فاؤنڈیشن کے ذریعے اپنے چہرے کا رنگ بھی تبدیل کیا اور ویسے ہی رنگ کی لپ اسٹک بھی لگائی۔ مس مارگریٹا کی طرح اپنے گال پر ایک تل بھی لگایا۔

اس کے بعد کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ مینا کی نیت ہو بہو مس مارگریٹا جیسا بننے کی تھی۔

"وہ کیا احمقانہ حرکت کرنا چاہ رہی تھی؟" جارجیا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "لیکن مینا کو اس رومانین لڑکی کے حلیے کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"جب ہم نے مینا کے موبائل نمبر کا معائنہ کیا تو اس میں کئی تصویریں ایسی ملیں جن میں مارگریٹا نے تابیچھا ویب ڈریس پہنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہومز اینڈ گارڈنز میں شائع ہونے والی ایلڈرج ہاؤس کی اندرونی آرائش سے متعلق بھی تصاویر اس موبائل میں محفوظ ہیں۔ مس مارگریٹا نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے جونی کو اپنی یہ تصویر ایک پیغام کے ساتھ بھیجی تھی جس میں لکھا تھا 'یہ میرا پارٹی ڈریس ہے۔ امید ہے کہ تمہیں پسند آئے گا' میرا اندازہ ہے کہ مینا نے اپنے شوہر کی ای میل اور فیس بک اکاؤنٹ تک کسی طرح رسائی حاصل کر لی اور پھر مارگریٹا کی تصویر کے مطابق روپ دھار لیا۔"

"گویا مجھے دو دو چیزیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ شکر ہے خدا کا۔ ورنہ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ دوسری رومانین لڑکی درحقیقت مینا تھی۔"

"اس طرح مینا اپنے شوہر کو بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ مس کیپر و اور اس کی دوستی کے بارے میں جانتی ہے۔" انسپکٹر نے اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے کہا۔

"کیا جونی نے مینا کو پہچان لیا تھا؟" میجر پائن نے پوچھا۔

"ہاں... گوکہ فوری طور پر نہیں۔ مینا نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس نے دور سے ہی اسے ہیلو کہا لیکن اس کے قریب نہیں گئی اور مہمانوں میں گھل مل گئی۔"

"تم نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی۔ اخبارات نے اسے حادثہ لکھا ہے لیکن اس بارے میں کوئی تفصیل نہیں دی۔" جارجیا نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کی نظریں اس شے پر جم گئی تھیں جو انسپکٹر نے اپنے بریف کیس سے نکالی تھی۔ یہ ایک پلاسٹک کا لفافہ تھا جس میں ایک لمبی اور سانپ جیسی کوئی چیز تھی۔

"ہمیں یقین ہے کہ یہ تمہاری ہے مسز لوئس ڈیل۔" انسپکٹر نے کہا۔

"یہ تو میری سلور بیلٹ لگ رہی ہے۔" جارجیا نے کہا۔ "کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟"

"بالکل۔" اس نے لفافہ جارجیا کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے پارٹی میں شرکت کے لیے سلور رنگ کا لباس پہنا تھا۔"

"ہاں، یہ میری بیلٹ ہے۔" جارجیا نے کہا۔ "مجھے یاد آ گیا کہ کیا ہوا تھا۔ میری بیلٹ اچانک ہی چبھنے لگی اور میں نے اسے اتار کر اپنی کرسی کے برابر والی چھوٹی میز پر رکھ دیا۔ پھر میں وہیں بھول آئی۔ واقعی گزشتہ شب میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور میں دواؤں کے زیر اثر تھی لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ میری بہو کی موت کا اس بیلٹ سے کیا تعلق ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کیسے مری؟"

"وہ پہلی منزل کی کھڑکی سے ٹیرس پر آن گری تھی۔ یہ کھڑکی لیڈی فریڈا کی اسٹڈی میں ہے۔ اس کی موت فوری طور پر واقع ہوگئی۔ تمہاری بہو کے سر میں شدید نوعیت کی چوٹیں آئی تھیں۔"

"ایلڈرج ہاؤس کی تمام کھڑکیاں گزشتہ شب کھلی ہوئی تھیں کیونکہ وہاں بہت زیادہ گرمی تھی بلکہ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں تو پنکھے بھی دیکھے گئے۔" جارجیا نے کہا۔ "کیونکہ وہ تاریخی اہمیت کی حامل عمارت ہے اس لیے وہاں ائرکنڈیشنر لگانے کی اجازت نہیں۔"

"تمہاری بیلٹ مینا کے سیدھے ہاتھ میں بندھی ہوئی تھی۔" انسپکٹر نے کہا۔

جارجیا نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "تو کیا ہوا؟ شاید وہ حادثے سے کچھ دیر قبل وہاں آئی اور اس نے بیلٹ اٹھالی ہو۔ کچھ لوگوں کو اس طرح چیزیں اٹھانے کی عادت ہوتی ہے۔ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

"تم سے یہ سوال پوچھنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" انسپکٹر چلٹرن نے کہا۔ "لیکن کیا کبھی تمہارے دل میں اپنی بہو سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا؟ کیا کبھی تمہارے دل میں اسے قتل کرنے کا خیال آیا۔ اچھی طرح سوچ کر جواب دینا۔"

"کبھی نہیں۔ یہ تصور ہی بعید از قیاس ہے۔" جارجیا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے خیال میں یہ بعید از قیاس ہے۔" انسپکٹر نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور بولا۔ "اس کے بارے میں کیا کہو گی؟"

"یہ کیا ہے؟"

"یہ ایک ای میل ہے جو تم نے کسی انتونیا نامی عورت کو بھیجی تھی۔ اس میں لکھا ہے 'میں مسلسل سوچ رہی ہوں کہ

مینا کو مارنا ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے لیکن نہیں۔ اسے مار دینے سے معاملات مزید خراب ہو جائیں گے تاوقتیکہ یہ کام اس طرح انجام دیا جائے کہ مجھ پر شک نہ کیا جائے اور میں اسے ایک حادثے کی شکل نہ دے دوں۔"

انسپکٹر نے جارجیا پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بہو گزشتہ شب مرگئی اور اس کی موت ایک حادثہ ہی دکھائی دے رہی ہے۔"

چند لمحے کمرے میں خاموشی رہی پھر جارجیا نے کہا۔

"انتونیا، تم یہ کیسے کرسکتی ہو۔ میرا خیال تھا کہ تم پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔"

انتونیا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے کچھ نہیں کیا۔"

انسپکٹر تیزی سے اس عورت کی جانب مڑا جس کا تعارف جارجیا نے مسز پائن کے نام سے کروایا تھا۔ "تو تم انتونیا ہو؟ مسز لوکس ڈیل نے یہ ای میل تمہیں بھیجی تھی؟"

"یہ ذاتی خط و کتابت ہے۔" انتونیا نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں یہ کیسے مل گئی؟"

"یہ مجھے کسی ایسے شخص نے دی ہے جو گزشتہ شب پارٹی میں موجود تھا۔"

"وہ کون شخص ہے۔" جارجیا نے کہا۔ "میں اس کا نام جاننا چاہتی ہوں۔"

"وہ اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔"

"گویا وہ کوئی عورت ہے؟"

"اس عورت نے آج صبح ہم سے رابطہ کیا۔ اس نے کہا وہ یہ حقیقت جان کر پریشان ہو رہی تھی کہ ایک ماہ قبل تم اپنی بہو کو قتل کرنے اور اسے حادثے کا رنگ دینے کے بارے میں سوچ رہی تھیں اور وہ واقعی ایک حادثے کا شکار ہوگئی۔ اس نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ تمہاری ای میل کو ہمارے علم میں لایا جائے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ ای میل اس کے پاس کیسے پہنچی۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ ای میل تم نے خود اسے غلطی سے بھیج دی تھی۔ اس نے یہ حقیقت تمہیں نہیں بتائی کیونکہ وہ خود بہت پریشان تھی۔"

"وہ پارٹی میں موجود تھی۔" جارجیا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ وہ کون ہے۔ کورل احمق ہے۔ اس کے دل میں میرے لیے بغض بھرا ہوا ہے۔ اس نے پبلشر سے میری شکایت کی کہ اس کے کام میں ضرورت سے زیادہ غلطیاں نکالتی ہوں۔ حالانکہ یہ میرا کام ہے کہ ناول کی ایڈیٹنگ کے دوران ہجے اور گرامر کی غلطیاں ٹھیک کروں لیکن اسے یہ بات پسند نہیں آئی۔ بہر حال اس ای میل کا مینا کی موت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ای میل میں نے پریشانی کے عالم میں لکھ دی تھی۔"

"تم کتنی دیر اس پارٹی میں رہیں؟"

"تقریباً ایک یا ڈیڑھ گھنٹے۔ میں ٹھیک سے نہیں بتا سکتی۔ برانڈی پینے کے بعد ہر چیز دھندلا گئی تھی لیکن یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ نو بجے سے پہلے گھر پہنچ گئی تھی۔ مجھے ایلڈرج ہاؤس کے باہر ہی ٹیکسی مل گئی۔ میں نو بجے کی خبریں دیکھنا چاہ رہی تھی لیکن پھر ارادہ ملتوی کر کے سونے چلی گئی۔"

میجر پائن نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "مینا کی لاش سب سے پہلے کس نے دیکھی انسپکٹر؟"

"لیڈی فریڈا کے بٹلر نے۔ وہ لائٹیں بند کرنے ٹیرس پر گیا تھا۔ اس وقت ٹھیک دس بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ مینا کی موت آٹھ اور نو بجے کے درمیان ہوئی تھی۔"

"کیا کسی نے مینا کو لیڈی فریڈا کی اسٹڈی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا؟" انتونیا نے پوچھا۔

"ہاں، اسے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا۔ کچھ لوگوں نے سوا آٹھ اور کچھ نے ساڑھے آٹھ کا وقت بتایا ہے جبکہ چند لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ مس کیمپر تھی کیونکہ کچھ فاصلے سے دونوں لڑکیاں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔"

"کیا تم یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکے کہ مینا اسٹڈی میں کیا کر رہی تھی؟" انتونیا نے پوچھا۔

"نہیں۔"

خاموشی کا ایک وقفہ آیا پھر جارجیا نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے انسپکٹر۔ میں تمہیں مزید وقت نہیں دے سکتی۔ مجھے دوا لینی ہے۔ جو کچھ جانتی تھی، وہ تمہیں بتا دیا۔ اب میرے پاس اس میں اضافہ کرنے کے لیے مزید کچھ نہیں ہے۔ اس ای میل کا مینا کی موت سے کوئی تعلق نہیں۔" پھر وہ اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ "بعض اوقات ساس غصے میں آکر بہت سی احمقانہ باتیں کہہ دیتی ہیں لیکن شاید ہی کسی نے اپنی بہو کو قتل کیا ہو۔"

انسپکٹر چلٹرن کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "ایک آخری سوال۔ کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ گزشتہ شب تم نے ایلڈرج ہاؤس میں جو کچھ کیا، وہ سب بتا دیا ہے۔"

"ہاں۔"

"تم نے یہاں بھی ایڈیٹنگ کر دی۔ حقیقت یہ ہے

کہ تم نے ایلڈرج ہاؤس روانہ ہونے سے پہلے ایک کام اور کیا تھا۔ تم نو بجنے میں تین منٹ پر سیڑھیوں کے ذریعے اوپر گئیں جہاں سے پہلے مینا جا چکی تھی۔''

جارجیا نے کہا۔ ''میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔''

''تمہیں اوپر جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔''

''اس پارٹی میں صرف چند لوگ ہی مجھے جانتے تھے جن میں لیڈی فریڈا، میرا بیٹا، رومانین لڑکی اور کورل اسمتھ شامل ہیں۔'' جارجیا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''کورل نے ہی تمہیں کچھ بتایا ہوگا لیکن میں اس کی کسی بات پر یقین نہیں کر سکتی۔ تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ مجھ سے بغض رکھتی ہے۔''

''یہ بات مجھے ایک بیرے نے بتائی ہے جس سے تم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ٹکرا گئی تھیں اور اس کے ہاتھ سے سینڈوچ کی ٹرے گر گئی تھی۔''

''یہ جھوٹ ہے، ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔'' اچانک ہی جارجیا بہت تھکی ہوئی نظر آنے لگی۔

''یہ سب بکواس ہے۔ کورل نے ہی اس بیرے کو یہ کہنے پر اکسایا ہوگا کہ اس نے مجھے سیڑھیوں کے ذریعے اوپر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس طرح وہ مجھے پھنسانا چاہتی ہے۔''

میجر پائن نے کہا۔ ''معاف کرنا انسپکٹر۔ کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مسز لوئس ڈیل نے اپنی بہو کو قتل کیا ہے؟''

چلٹرن نے کہا۔ ''نہیں، بالکل نہیں۔ میں تمہیں صرف وہ حقائق بتا رہا ہوں جو مجھے معلوم ہوئے ہیں..... فی الحال یہی کافی ہے۔ مسز لوئس ڈیل۔ مستقبل قریب میں تمہارا بیرونِ ملک جانے کا امکان تو نہیں؟''

''نہیں، میں تو بمشکل پارک تک ہی جا سکتی ہوں۔''

''امید ہے کہ تم جلد صحت یاب ہو جاؤ گی، خدا حافظ۔''

اس کے جانے کے بعد انتونیا نے پوچھا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں۔'' جارجیا آہستہ سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ میں نے مینا کو قتل نہیں کیا۔ وہ میرے خلاف انتہائی مشکوک واقعاتی شہادتوں کے علاوہ کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکے۔ کیا تم نہیں سمجھتیں کہ مجھے کسی وکیل سے رابطہ کرنا چاہیے۔''

''ابھی نہیں۔'' پائن نے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ اس کی نوبت آئے گی۔''

ایک بار پھر بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔ جارجیا کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولی۔ ''امید ہے کہ انسپکٹر مجھے گرفتار کرنے نہیں آیا ہوگا۔''

''جونی۔'' انہوں نے ایک حیرت بھری چیخ سنی پھر ماں بیٹے کے درمیان کچھ جملوں کا تبادلہ ہوا اور ایک منٹ بعد جارجیا اپنے بیٹے کا بازو پکڑے اندر آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''یہ میرے دوست ہیں۔ ہف اور انتونیا پائن اور شاید یہی لوگ اس کیس سے میرا نام کلیئر کروائیں گے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔ مینا کی موت ایک حادثہ تھی۔'' جونی نے کہا۔ ''اچھا، تم اس انسپکٹر کی وجہ سے کہہ رہی ہو۔ میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ کیا وہ یہ سوچ رہا ہے کہ مینا کی موت سے تمہارا کوئی تعلق ہے؟''

''اس نے مجھ پر قتل کا الزام نہیں لگایا لیکن لگتا یہی ہے کہ وہ اس امکان پر غور کر رہا ہے۔'' جارجیا نے کہا۔ ''کیا تم کافی پینا پسند کرو گے۔''

''میں تم سے ایک دو سوال کر سکتا ہوں۔'' میجر پائن نے جونی سے کہا۔ ''امید ہے کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''کیا تم پرائیویٹ سراغ رساں ہو؟''

''نہیں، یہ میرے لیے کام کر رہے ہیں؟'' جارجیا نے کہا۔

جونی گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''پوچھو۔''

''ہم جانتے ہیں کہ مارگریٹا کیپرو نے تمہیں اس پارٹی میں مدعو کیا تھا جس سے تمہاری دوستی فیس بک کے ذریعے ہوئی تھی۔ کیا ایسا ہی ہے؟''

''ہاں، اس نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ کیا میں اس کے دوستوں میں شامل ہونا چاہوں گا۔ میں نے ہاں کہہ دی۔''

''یہ ایک غیر معمولی اتفاق ہے۔'' انتونیا نے کہا۔

''مارگریٹا نے تم سے کب رابطہ کیا تھا؟''

''تقریباً ایک ماہ قبل۔ میرا خیال ہے کہ ایسے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بخارسٹ یونیورسٹی کی طالبہ ہے۔ انگلینڈ میں اس کے کئی دوست ہیں اور وہ یہاں آنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ مجھے وہ اچھی لگی۔ اس نے کچھ تصویریں بھی بھیجی تھیں جن میں وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔''

''کیا میں فرض کرلوں کہ بیوی کے ساتھ تمہارے

تعلقات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے؟''

''تم ایسا سوچ سکتے ہو۔ ہمارے درمیان معاملات خراب ہوتے جارہے تھے۔ مجھے بچوں کی خواہش تھی جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔'' جونی کا چہرہ تاریک ہوگیا۔'' اس کے علاوہ وہ حد سے زیادہ شکی تھی۔ اگر میں کسی سے فون پر بات کررہا ہوتا تو وہ اصرار کرتی کہ اسپیکر کھول دوں تاکہ وہ بھی ہماری گفتگو سن سکے۔ کسی وجہ سے وہ میری ماں کے بھی خلاف ہوگئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ میری ماں ہمیں اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتی ہے۔ مجھے مینا کو روکنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ کرسکا۔ میں ایک بزدل شخص ہوں۔''

''بہت اچھا ہوا کہ تم واپس آگئے ڈارلنگ۔'' جارجیا نے کہا۔

''مینا پریشانی کے عالم میں ایسی باتیں کرنے لگی تھی جس سے میں خوف زدہ ہوجاتا۔ کبھی کہتی کہ وہ اپنے آپ کو مار ڈالے گی اور کبھی دھمکی دیتی کہ وہ میرے باس کو خط لکھ کر بتائے گی کہ میں کیسا شخص ہوں اور کبھی کہتی کہ اگر میں نے اسے چھوڑا تو وہ مجھے مار ڈالے گی۔ اس کے جرمنی جانے سے مجھے کچھ سکون ملا۔ تاہم مارگریٹا نے مجھے بتایا کہ وہ لندن میں ایک خاندانی دوست کے پاس ٹھہری ہوئی ہے اور مجھ سے ملنے کی شدید خواہش مند ہے۔ میں فوراً ہی رضامند ہوگیا۔ پارٹی سے ایک دن پہلے مجھے معلوم ہوا کہ جس فیملی فرینڈ کی وہ بات کررہی تھی، وہ لیڈی فریڈا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ مارگریٹا تو یتیم ہے۔''

''ہاں، لیکن کسی نے اسے گود لے لیا تھا۔ لیڈی فریڈا اس خاندان کو جانتی ہے۔''

''مینا نے تمہاری اور مارگریٹا کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کس طرح پڑھ لی؟''

''یقیناً وہ میرا پاس ورڈ جان گئی ہوگی۔ شاید میں نے وہ کہیں لکھ رہا تھا۔ ویسے بھی میری کوئی بات اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ لگتا ہے کہ وہ میری جاسوسی کررہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے میرا ہر پیغام پڑھ لیا ہوگا۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے میرا ای میل پاس ورڈ بھی معلوم ہوگیا ہو؟'' جارجیا نے کہا۔

جونی شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔'' شادی کے ابتدائی دنوں میں شاید میں نے اسے بتا دیا تھا کیونکہ وہ بہت ہی دلچسپ پاس ورڈ تھا۔''

''گویا وہ میرا پاس ورڈ جانتی تھی؟'' جارجیا پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

''اگر جانتی تھی تو کیا ہوا؟ اس میں پریشانی والی کیا بات ہے؟'' جونی نے کہا۔

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ اس ای میل کی بات کررہی ہوں جس میں مینا کے بارے میں کچھ اچھے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا اور وہ غلط ہاتھوں میں پہنچ گئی۔'' جارجیا نے کہا پھر وہ انتونیا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''کیا وہ میرے اکاؤنٹ تک رسائی حاصل کرکے وہ ای میل کورل کو نہیں بھیج سکتی؟''

''ممکن ہے۔'' انتونیا نے کہا۔'' اس نے سوچا ہوگا کہ کورل اس ای میل کو تمہارے خلاف استعمال کرسکتی ہے۔ غالباً اس نے وہ ای میل بھی پڑھ لی ہوں گی جو کورل نے تمہیں بھیجی تھیں اور وہ جان گئی ہوگی کہ کورل کے دل میں تمہارے لیے بغض ہے۔''

پائن نے جونی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ رات تمہیں کب احساس ہوا کہ مارگریٹا جیسی نظر آنے والی عورت تمہاری بیوی ہے؟''

''فوراً ہی نہیں۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو ہنسی آگئی اور میں سمجھا کہ یہ لیڈی فریڈا کا کوئی ناٹک ہے۔ اگر مارگریٹا میرے برابر میں نہ کھڑی ہوئی ہوتی تو میں بھی دھوکا کھا جاتا۔ یہ اس وقت معلوم ہوا جب مینا نے مجھے ہیلو کہا تو میں نے اس کی آواز پہچان لی۔''

''کیا تم نے مارگریٹا کو بتایا کہ وہ تمہاری بیوی تھی؟''

''نہیں، میں جانتا تھا کہ وہ پریشان ہوجائے گی بلکہ میں نے یہ کہا کہ اس عورت کو نہیں جانتا۔ مینا میرے قریب نہیں آئی اور مجمع میں غائب ہوگئی۔ مجھے یوں لگا جیسے ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں خوف زدہ ہوگیا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں؟''

''پھر تم نے کیا کیا؟'' پائن نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ ایک دو منٹ یونہی کھڑا رہا پھر ایک ڈرنک لی۔ اس کے بعد دوسری۔ اچانک ہی محسوس ہوا کہ مارگریٹا میرے برابر میں نہیں کھڑی۔ ایک لمحہ قبل میں نے ایک ویٹر کو اس کے پاس آکر کوئی بات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں اسے دیکھنے چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ لیڈی فریڈا کو مینا کے بارے میں بتادوں لیکن وہ بھی نہیں ملی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنا وقت گزر گیا۔ بالآخر وہ مجھے مل گئی۔ وہ کچھ پریشان نظر آرہی تھی۔ میں نے اسے مینا کے بارے میں بتایا تو وہ تالی بجاتے ہوئے بولی۔'' اچھا تو وہ دوسری مارگریٹا دراصل تمہاری بیوی ہے۔ پھر وہ پُرسکون ہوگئی، اس

نے بتایا کہ مارگریٹا کے لیے پریشان ہو رہی تھی کیونکہ اس نے اپنا ہمزاد دیکھ لیا تھا۔لگتا ہے کہ مارگریٹا بہت توہم پرست ہے۔"

"اگر تم اپنے ہمزاد کو دیکھ لو تو مر جاؤ گے؟" انتونیا نے کہا۔

"ہاں، بہرحال یہ سب بکواس ہے لیکن مارگریٹا بہت خوف زدہ ہو گئی تھی۔ مجھے لیڈی فریڈا نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ مارگریٹا سے مل کر اسے بتانا چاہتا ہوں کہ دوسری مارگریٹا اس کی ہمزاد نہیں بلکہ میری بیوی ہے جسے میں نے طلاق دینے کا ارادہ کر رکھا ہے لیکن لیڈی فریڈا نے منع کر دیا اور کہا کہ اسے آرام کرنے دیا جائے۔"

"کیا تم بعد میں مارگریٹا سے ملے؟" پائن نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے اسے فون کیا تھا لیکن مینا کے بارے میں کوئی بات نہیں کی صرف اتنا کہا کہ وہ پریشان نہ ہو، کسی نے اس کا بہروپ بھر کر ناٹک کیا ہے۔ میں نے اسے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ طبیعت بہتر ہو جائے تو وہ مجھے فون کرے گی لیکن اس کا کوئی فون نہیں آیا۔"

"کیا تم آج اس سے ملے تھے؟" انتونیا نے پوچھا۔

"نہیں، اس نے میرے فون کا جواب نہیں دیا اور جب میں ایلڈرج ہاؤس گیا تو لیڈی فریڈا نے بتایا کہ میں اس سے نہیں مل سکتا کیونکہ مارگریٹا کو بخار ہے اور ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا ہوا ہے اور یہ کہ مکان میں اس وقت بھی پولیس موجود ہے۔ میں نے اصرار کیا لیکن وہ نہیں مانی۔ بعد میں اسے فون بھی کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ مینا کی لاش کیسے دریافت ہوئی؟"

"مجھے لگا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ جب میں نے لیڈی فریڈا کے بٹلر میںڈریس کو اس سے سرگوشیاں کرتے دیکھا۔ اس کے بعد وہ دونوں مجمع کو چیرتے ہوئے ایک جانب چل دیے۔ میں نے بھی ان کا پیچھا کیا کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ مارگریٹا سے متعلق کوئی بات ہے۔ مینا کا تو مجھے خیال بھی نہیں آیا۔ وہ دونوں ٹیرس پر گئے تب میں نے وہ لاش دیکھی۔ میں اسے لباس کی وجہ سے مارگریٹا ہی سمجھا۔ اس کے قریب جانا چاہ رہا تھا لیکن لیڈی فریڈا نے دیکھ لیا اور میںڈریس سے کہا کہ وہ مجھے آگے جانے سے روکے، وہ مجھے پکڑ کر نیچے لے آیا اور جب میں نے احتجاج کیا تو اس نے میرے حلق میں کوئی سیال شے انڈیل دی جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی اور میں ایک کاؤچ پر لیٹا ہوا تھا پھر ایک پولیس انسپکٹر آیا اور اس نے مجھ سے سوالات شروع کر دیے تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ لاش مینا کی تھی۔"

"کیا انہوں نے تمہیں لاش دکھائی؟ یقیناً انہوں نے اسے شناخت کرنے کے لیے کہا ہوگا؟" انتونیا نے کہا۔

"ہاں، بہرحال میں اس کا شوہر ہوں اور میں نے پہچان لیا۔ وہ میری بیوی مینا ہی تھی۔"

"کیا انہوں نے اس کا میک اپ اور وگ اتاری تھی؟"

"نہیں لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی مصنوعی پلکیں غائب تھیں اور وہ اب بھی مارگریٹا کی طرح ہی لگ رہی تھی۔ البتہ اس کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی میں نے فوراً پہچان لی۔ اس کے علاوہ اس نے سونے کا بریسلیٹ پہن رکھا تھا جس پر اس کا نام کندہ تھا۔" وہ کہتے کہتے رک گیا اور بولا۔ "تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" انتونیا نے کہا۔ "یونہی مجھے ایک خیال آ گیا تھا۔"

"کیا؟ تم یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ مینا نہیں بلکہ مارگریٹا کی لاش تھی۔ اوہ میرے خدا! میں نے اس کا چہرہ ٹھیک طرح سے نہیں دیکھا۔ وہاں روشنی بہت کم تھی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بھلا کوئی مینا کی انگوٹھی... اور بریسلیٹ مارگریٹا کو کیسے پہنا سکتا ہے۔ وہ مارگریٹا نہیں ہو سکتی۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مارگریٹا کی لاش نہیں تھی۔" انتونیا معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ "میرا ذہن اسی طرح کام کرتا ہے اور ظاہری باتوں سے مطمئن نہیں ہوتا۔ دراصل میں سراغ رسانی پر مبنی کہانیاں لکھتی ہوں۔"

جارجیا نے اپنے بیٹے کو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو بولی۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں جاننا چاہتا ہوں۔ اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں۔ اسی لیے ایلڈرج ہاؤس جا رہا ہوں اور مارگریٹا سے ملے بغیر واپس نہیں آؤں گا۔"

"تمہاری حالت ایسی نہیں کہ گاڑی چلا سکو۔" میجر پائن نے کہا۔ "ہم بھی تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں وہاں جانا ہی تھا۔"

وہ تینوں وہاں سے روانہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ

ایلڈرج ہاؤس پر پولیس بھی ہوگی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔
میجر پائن نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم کار میں ہی بیٹھو۔ پہلے ہم اس سے بات کرتے ہیں۔ اس وقت وہ تم سے ناراض ہے۔ اگر ہم معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں تو بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ پہلے ہم راستہ ہموار کرلیں پھر تمہیں فون کردیں گے۔“

میجر پائن نے گھنٹی بجائی اور بٹلر سے انٹرکام پر کہا۔ ”میرا نام پائن ہے۔ میں اور میری بیوی لیڈی فریڈا سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہاں ہاں مجھے معلوم ہے کہ یہاں ایک سنجیدہ واقعہ پیش آیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ہم سے ملنا پسند کرے گی۔ اسے بتا دینا کہ پینسٹھ سال پہلے میری آنٹی کی شادی اس کے باپ سے ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔“

ان کی توقع کے خلاف ایک منٹ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ لیڈی فریڈا ماربل ہال میں ان کا انتظار کررہی تھی۔ اس نے رسمی انداز میں ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ”تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی، انتونیا اور تمہاری آنٹی کا کیا حال ہے ہف؟“

”وہ ٹھیک ہے۔ ہمارے گلف میں قیام کے دوران وہ کچھ تھک گئی تھی لیکن اب تیزی سے صحت یاب ہورہی ہے۔“

لیڈی فریڈا انہیں ایک وسیع وعریض ڈرائنگ روم میں لے گئی اور بٹلر کو شیمپئن لانے کے لیے کہا پھر وہ انتونیا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یقین تھا کہ میں نے اس احمقانہ ای میل کا صحیح استعمال کیا ہے جو بے چاری جارجیا نے تمہیں بھیجی تھی جس میں اس نے مینا کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔“

”تمہیں اس ای میل کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“ انتونیا نے پوچھا۔

”لگتا ہے، مجھے غلطی سے مل گئی۔“

انتونیا اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”لیکن وہ ای میل کورل کو بھی غلطی سے بھیجی گئی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“

”تمہارے خیال میں جان بوجھ کر ایسا کیا گیا ہے اور یہ کسی کی شرارت ہے؟“

”میری سمجھ میں ایک بات آرہی ہے۔“ پائن نے کہا۔ ”جونی نے ہمیں بتایا کہ مینا کو اس کی ساس کے ای میل ایڈریس اور پاس ورڈ کا علم تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے یہ ای میل پڑھ کر ان لوگوں کو بھیجنے کا فیصلہ کرلیا ہو جن کے لیے جارجیا کام کرتی تھی۔ اس طرح وہ لوگوں پر جارجیا کی

جھوٹ پکڑنے والی مشین

ایک نوجوان کار ڈرائیور کو ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر پولیس افسر نے عدالت میں پیش کیا۔ جج کے سامنے وہ اپنے بے قصور ہونے کے دلائل دینے لگا۔ سڑک خراب تھی، ٹریفک بہت زیادہ تھی، اسے جلدی تھی وغیرہ۔ آخر میں اس نے کہا کہ وہ جھوٹ پکڑنے کی مشین کے سامنے جانے کو تیار ہے۔

”نوجوان، تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جھوٹ پکڑنے کی مشین میں ہوں۔“ جج نے کہا۔

کراچی سے شمیم کا تعاون

ایک فیکٹری میں دستور بن گیا تھا کہ کارکن اگلی شفٹ والوں کے لیے ضروری ہدایات ایک چٹ پر لکھ کر میز پر چھوڑ جاتے تھے۔ ایک روز میز پر بڑا سا پیالہ رکھا ہوا ملا جس کے نیچے ایک چٹ رکھی ہوئی تھی۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ براہ مہربانی کولڈ ڈرنک کے کاگ اس پیالے میں ڈال لیے۔ میری لڑکی جاننا چاہتی ہے کہ ایک ہزار تعداد کیسی ہوتی ہے۔ چند ہفتوں میں پیالہ لبالب بھر گیا۔

اگلے روز وہ خالی تھا اور اس کے نیچے رکھی ہوئی چٹ پر لکھا ہوا تھا: ”ازراہ کرم کوئی فالتو ڈالر اس پیالے میں ڈالتے رہیے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ایک ہزار تعداد کیسی ہوتی ہے۔“

ملتان سے احمد شاہ کا تعاون

ایک خاتون بک اسٹال پر آئی اور اس نے ایک ہوٹل کے بارے میں پوچھا۔

بک اسٹال والے نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”میڈم! سر گھما کر دیکھیے، وہ سامنے ہوٹل نظر آرہا ہے۔“

”وہ تو ہر سمت سے نظر آتا ہے۔“ خاتون جز بز ہو کر بولی۔ ”میں وہاں تک پہنچنے کا راستہ پوچھ رہی ہوں۔“

حیدرآباد سے حیدر اعجاز کا تعاون

حقیقت واضح کرنا چاہ رہی تھی۔"
"یہ ممکن ہے۔" انتونیا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"میں کمینگی سے نفرت کرتی ہوں چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔" لیڈی فریڈا نے کہا۔ "بہر حال اس ای میل کو پڑھ کر مجھے ایک ماں کو اس کے بیٹے سے ملانے اور جونی کو مارگریٹا سے قریب لانے کا خیال آیا۔ مجھے جارجیا سے ہمدردی تھی، میں جونی کے لیے بھی کچھ کرنا چاہ رہی تھی اسی لیے میں نے جارجیا کو پارٹی میں آنے پر مجبور کیا اور مارگریٹا سے کہا کہ وہ جونی سے رابطہ کرے پھر جو کچھ ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مینا بھی پارٹی میں آجائے گی۔"
"مینا اندر داخل ہونے میں کیسے کامیاب ہو گئی۔" انتونیا نے کہا۔ "کیا مہمانوں کے دعوت نامے نہیں دیکھے گئے تھے؟"
"میں نے مہمانوں سے کہا تھا کہ وہ دعوت نامہ ساتھ لائیں لیکن مینا نے کہا کہ وہ مارگریٹا کی جڑواں بہن ہے اور اچانک ہی رومانیہ سے آئی ہے۔ چنانچہ مینڈریس نے اسے اندر آنے دیا۔ ویسے بھی اسے کم نظر آتا ہے اور وہ بالکل مارگریٹا جیسی لگ رہی تھی۔ کیا بات ہے انتونیا، تم کچھ سوچ رہی ہو؟"
"کچھ نہیں۔ یہ بتاؤ کہ یہ خفیہ راستہ کہاں جاتا ہے؟"
"اسٹڈی کی طرف۔ جہاں یہ واقعہ ہوا تھا۔"
"کیا ہم اسے دیکھ سکتے ہیں؟"
"یقیناً، پولیس ایک یا دو گھنٹے پہلے وہاں سے گئی ہے۔ کیوں نا ہم اسی خفیہ دروازے سے چلیں، مجھے یقین ہے کہ یہ ایک پُرلطف تجربہ ہوگا۔"
وہ ایک چکردار زینے کے ذریعے اوپر گئے۔ لیڈی فریڈا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ "میں یہاں بہت کم آتی ہوں۔ کچھ پڑھنے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔"
وہ ایک درمیانے سائز کا کمرا تھا جس کی ایک دیوار پر بک شیلف اور دوسری پر تصویریں آویزاں تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی میز، صوفہ اور دو آرام کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ لیڈی فریڈا نے دونوں کھڑکیوں میں سے ایک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بائیں والی۔"
انتونیا اور پائن دونوں اس کھڑکی کی طرف گئے۔ پائن نے کھڑکی کھولی اور وہ دونوں نیچے جھانکنے لگے۔
"وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟" انتونیا نے کہا۔
"یہ تم مجھے بتاؤ گی کیونکہ تم سراغ رسانی کی ماہر ہو۔"
لیڈی فریڈا ایک آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی لیکن شاید اس کا جواب بہت آسان ہے۔ ممکن ہے کہ وہ یہاں آرام کرنے کی غرض سے آئی ہو۔ شاید وہ تھکن محسوس کر رہی ہو کیونکہ گرمی بہت زیادہ تھی اور اس نے دو شیمپئن کے گلاس چڑھا لیے تھے۔"
وہ نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ "وہ ہوا کھانے کے لیے کھڑکی کی طرف گئی ہوگی اور جھکتے وقت اس کا توازن بگڑ گیا۔ وہ نیچے گر پڑی۔ اسے محض ایک حادثہ ہی کہا جا سکتا ہے۔"
"جارجیا کی سلور بیلٹ کے بارے میں کیا کہو گی؟" پائن بولا۔ "وہ مینا کے ہاتھ میں کیسے پہنچی؟"
"یہ واقعی عجیب بات ہے۔" لیڈی فریڈا نے کہا۔
"ہم مارگریٹا سے ملنا چاہیں گے۔" انتونیا نے کہا۔
"ہم نے جونی سے وعدہ کیا ہے کہ فون پر اس کی خیریت سے مطلع کریں گے۔" وہ اس کے فون کا جواب کیوں نہیں دے رہی؟ جونی کو اس سے کیوں نہیں ملنے دیا جا رہا؟"
"مارگریٹا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور ڈاکٹر نے اسے جونی سے ملنے سے منع کیا ہے گو کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی کہ گزشتہ شب اس کی بیوی کا انتقال ہوا ہے۔ وہ بہت حساس ہے اور اس کا ذمے دار اپنے آپ کو سمجھ رہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مینا نے اس کی وجہ سے خودکشی کی ہے۔"
"ہم مارگریٹا سے ملے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔" انتونیا نے کہا۔
"تم نہیں جاؤ گی۔" لیڈی فریڈا کی بھویں تن گئیں۔
"مجھے اس کی پروا نہیں۔ تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری صحبت سے لطف اندوز ہو سکوں گی۔ تم مجھے اپنی کہانیاں سنا سکتی ہو یا پھر ہم برج کھیلیں گے لیکن تم مارگریٹا سے نہیں مل سکتیں۔"
"ہم مارگریٹا سے ملے بغیر نہیں جائیں گے۔" میجر پائن نے بھی اصرار کیا۔
لیڈی فریڈا نے ان دونوں کو باری باری دیکھا پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے، کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ مر چکی ہے یا اس نام کی کسی لڑکی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے تم مارگریٹا کو دیکھ سکو گے براہ مہربانی یہیں ٹھہرو۔"

وہ کچھ کہے بغیر اسٹڈی سے چلی گئی۔ اس کے بعد پائن کے فون پر جونی کا پیغام آیا۔ ”کیا ہوا؟ تم اس سے ملے؟“

پائن نے جواب دیا۔ ”بس ملنے ہی والے ہیں۔“

دروازہ کھلا اور مینڈریس نے اندر آ کر پوچھا کہ کیا وہ شیمپین یا کافی پینا پسند کریں گے۔ انہوں نے انکار کر دیا پھر میجر پائن نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم نے لاش دریافت کی تھی؟“

”ہاں۔“ مینڈریس جاتے جاتے رک گیا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے آدمی کئی روز تک نہیں بھولتا۔“

”سچی بات تو یہ ہے کہ اس لاش کو دیکھ کر مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب میں اسے ایک خواب کی طرح سمجھتا ہوں۔“ مینڈریس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”ایک بات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ جب بیگم صاحبہ کو اس لاش کے بارے میں بتانے گیا تو میں نے ان کے لباس پر سے ایک چھپکلی ہٹائی اور اسے اپنے بوٹ تلے کچل دیا۔ مجھے چھپکلیوں سے نفرت ہے۔“

اس کے جانے کے بعد پائن کو جونی کا ایک اور پیغام موصول ہوا، پائن نے اسے اس بار بھی وہی جواب دیا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور لیڈی فریڈا نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”اب اس کی حالت بہتر لگ رہی ہے اور میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ تم اسے تنگ نہیں کرو گے۔ اس پر وہ نیچے آنے کے لیے تیار ہو گئی۔“ پھر وہ دروازے کی طرف منہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اندر آ جاؤ مارگریٹا۔“

ایک لمبے قد کی نوجوان لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس نے سیاہ رنگ کا گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں۔ اس نے گلے میں سیاہ رنگ کے ویلوٹ کا ربن باندھ رکھا تھا جس میں ایک قیمتی پتھر بندھا ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ نیند کی حالت میں چلتی ہوئی آئی ہے۔ وہ ان دونوں پر نظریں جمائے کھڑی رہی لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ کچھ خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی۔

”یہ مارگریٹا نہیں ہے۔“

وہ لڑکی اس طرح پیچھے ہٹی جیسے کسی نے اسے تھپڑ مار دیا ہو۔ ”یہ مارگریٹا ہی ہے۔“ لیڈی فریڈا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں اس کا پاسپورٹ دکھا سکتی ہوں۔“

”میں...... میں مارگریٹا ہوں۔“ لڑکی نے سرگوشی کی۔

”تم مارگریٹا نہیں ہو سکتیں۔ اس کی آنکھیں سیاہ نہیں بلکہ ہلکی نیلی ہیں۔“ انتونیا نے کہا۔ ”اس کی گردن راج ہنس جیسی ہے اور وہ کبھی زیور نہیں پہنتی۔“

لڑکی چونک پڑی اور اس کا ہاتھ بے اختیار گلے کی طرف چلا گیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے کسی خاص وجہ سے رنگین کنٹیکٹ لینس لگائے اور گلے میں ربن ڈالا۔“

”کیوں؟ مارگریٹا اپنی آنکھوں کا سیاہ رنگ کیوں کرے گی؟“ لیڈی فریڈا نے پوچھا۔

”تاکہ جہاں تک ممکن ہو، تم سے مختلف نظر آئے۔“ انتونیا نے کہا۔ ”تم دونوں کی ایک جیسی ہلکی نیلی آنکھیں ہیں۔ کیونکہ تمہارے درمیان ماں بیٹی کا رشتہ ہے۔ تمہاری بیٹی کو بیس سال پہلے خانہ بدوشوں نے اغوا کر لیا تھا جب تم اپنے شوہر کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ مارگریٹا کو ایک جوڑے کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ وہ عورت ایک اداکارہ اور مرد فلاسفی کا پروفیسر تھا۔ کسی طرح مارگریٹا کو معلوم ہو گیا کہ تم اس کی حقیقی ماں ہو، اس نے تم سے رابطہ کیا اور تم نے اسے لندن آنے اور اپنے پاس رہنے کی دعوت دے دی۔ یہ دوسری خوشی تھی جس کا اعلان تم پارٹی میں کرنے والی تھیں لیکن مینا کی موت کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ اس کے بعد تم نے مناسب نہیں سمجھا کہ لوگوں کو اس رشتے کے بارے میں علم ہو ورنہ گزشتہ شب پارٹی میں جو کچھ ہوا، اس کی وضاحت مشکل ہو جاتی۔“

”تمہارے خیال میں کیا ہوا تھا؟“

”مینا اس پارٹی میں اپنے شوہر اور اس کی گرل فرینڈ کو شرمندہ کرنے کی نیت سے آئی تھی پھر اچانک ہی اس نے اپنی ساس کو بھی دیکھ لیا۔ جارجیا ایک چھوٹی میز کی برابر والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس میز پر اس کی ٹوٹی ہوئی بیلٹ بھی رکھی ہوئی تھی۔ مینا نے اسی وقت ایک منصوبہ بنایا جس پر عمل کرنے سے مارگریٹا کی موت واقع ہو جاتی اور اس کے قتل کے الزام میں جارجیا جیل چلی جاتی۔ مینا نے چپکے سے وہ بیلٹ اٹھائی اور ایک ویٹر سے کہا کہ وہ مارگریٹا کو اسٹڈی میں بھیج دے۔“ پھر اس نے مارگریٹا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”شاید اس نے یہ کہا ہو کہ لیڈی فریڈا تم سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔“

”ہاں، اس نے یہی کہا تھا۔“ مارگریٹا نے سرگوشی میں جواب دیا۔

”مینا ڈرائنگ روم کے خفیہ دروازے سے نکلی اور اوپر اسٹڈی میں چلی گئی۔ کسی نے اسے نہیں دیکھا لیکن جب

تم نے مارگریٹا کو سیڑھیوں کی طرف جاتے دیکھا تو چونک گئیں اور اس کے پیچھے چل دیں۔ تم نے دیکھا کہ مینا اس بیلٹ کے ذریعے تمہاری بیٹی کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس بیلٹ کے نشانات چھپانے کے لیے ہی تم نے اپنے گلے کے گرد یہ ربن لپیٹا ہے۔ کیونکہ جارجیا ایک ای میل میں مینا کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکی تھی۔ اس لیے مینا نے یہ منصوبہ بنایا تاکہ یہی ظاہر ہو کہ جارجیا نے مینا کے دھوکے میں مارگریٹا کو قتل کر دیا ہے۔ تم نے وقت ضائع کیے بغیر مینا کو مارگریٹا سے الگ کیا اور اسے دور دھکیلنے لگیں۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور کھڑکی سے باہر جا گری لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ تم نے جان بوجھ کر اسے قتل کیا۔''

''تمہارے پاس ممکنہ طور پر کوئی ثبوت نہیں کہ میں مینا کے قریب بھی گئی تھی۔''

''ثبوت ہے۔ اسی لیے یہ بات کہہ رہی ہوں۔'' انتونیا نے کہا۔ ''جب وہ تمہارے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی تو اس کی ایک مصنوعی پلک الگ ہو کر تمہارے لباس سے چپک گئی جسے بعد میں مینڈریس چھپکلی سمجھا اور اسے اپنے بوٹ کے تلے سے کچل دیا۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ تم نے مینڈریس سے جوتے کا تلا دکھانے کے لیے کہا ہوگا۔''

''ہاں، ہم نے کہا تھا۔'' میجر پائن نے جواب دیا۔ ''اسے جوتے صاف کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ لہٰذا وہ پچکی ہوئی مصنوعی پلک اس کے دائیں پاؤں کے بوٹ سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ میں نے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی۔'' حالانکہ یہ سراسر جھوٹ تھا۔

لیڈی فریڈا کی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ یہ کوئی ثبوت ہے۔ ویسے بھی پولیس والے شوقیہ سراغ رسانوں کی بات کو اہمیت نہیں دیتے۔ دراصل سب کچھ بڑی تیزی سے ہوا اور مجھے سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میری بیٹی کی زندگی خطرے میں تھی۔ مینا نے دستانے نہیں پہنے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے سوچا ہوگا بعد میں جارجیا کی بیلٹ پر سے انگلیوں کے نشانات مٹا دے گی۔ میں پولیس کو سچ بتانا چاہ رہی تھی لیکن مارگریٹا نے مجھے روک دیا۔ لگتا ہے کہ اس کا بخارسٹ میں کوئی مجرمانہ ریکارڈ ہے اور وہ ڈرتی ہے کہ برطانوی پولیس اس کے ماضی کے بارے میں تحقیقات نہ شروع کر دے۔ کیا ہوا تھا ڈارلنگ؟ غالباً تم دو مرتبہ بغیر لائسنس گاڑی چلاتے ہوئے پکڑی گئی تھیں؟''

''تین مرتبہ۔'' مارگریٹا نے سرگوشی کی۔

''مارگریٹا بہت خوف زدہ اور تکلیف میں تھی اس لیے میں نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔ بہرحال مینا کی موت ایک حادثہ ہی تھی اور مجھے یقین نہیں کہ میرا ارادہ اسے کھڑکی سے باہر پھینکنے کا تھا۔ ممکن ہے کہ میں نے ایسا کیا ہو لیکن اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ مارگریٹا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں نے اسے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اگر لوگوں کو ہمارے رشتے کے بارے میں علم نہ ہوا تو وہ اس حادثے پر زیادہ قیاس آرائی نہیں کریں گے۔ اب بتاؤ انتونیا تم اس سلسلے میں کیا کرنے والی ہو؟''

''کچھ نہیں، میں صرف جارجیا کے لیے پریشان ہوں۔ لگتا ہے جیسے اس پر شبہ کیا جا رہا ہے۔''

''پریشان مت ہو۔ پولیس کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتی لیکن اگر انہوں نے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی تو میں اس کی پوزیشن واضح کر دوں گی۔''

''جونی کا پیغام ہے۔'' میجر پائن نے اپنا موبائل دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ اندر آنے کے لیے بے چین ہے۔''

''میں مینڈریس سے کہہ دیتی ہوں کہ اسے اندر لے آئے۔''

انتونیا اور پائن کے جانے کے بعد لیڈی فریڈا واپس ڈرائنگ روم میں آگئی۔ اس نے اپنے لیے شیمپین کا گلاس بنوایا اور گزشتہ شب کے بارے میں سوچنے لگی جب وہ اسٹڈی میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ مارگریٹا کھلی ہوئی کھڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے گلے پر تھا اور وہ نیچے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ لیڈی فریڈا کے کانوں میں اس کے الفاظ گونجنے لگے۔ ''مجھے فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ وہ اس کی بیوی تھی۔ اس نے مجھے کچھ دھمکی آمیز پیغامات بھیجے تھے اور تنبیہ کی تھی کہ میں جونی سے دور ہو جاؤں۔ یہ بات میں نے جونی کو نہیں بتائی لیکن میں توقع کر رہی تھی کہ وہ کچھ کرنے کی کوشش ضرور کرے گی۔''

مینا جسمانی لحاظ سے مارگریٹا کے ہم پلہ نہیں تھی۔ اس لیے شکست کھا گئی۔ مارگریٹا نے انتونیا اور پائن کے سامنے شاندار اداکاری کرتے ہوئے اپنے مجرمانہ ماضی کا اعتراف کر لیا جبکہ اس نے کوئی قانون شکنی نہیں کی تھی۔ دراصل وہ اپنے آپ کو قتل کا مجرم سمجھ رہی تھی لیکن زبان سے اقرار نہ کر سکی۔

قبضہ

مختار آزاد

کچھ لوگ ہوتے ہیں جنہیں سفر میں بھی نیند آجاتی ہے... اور بعض تھکن کے بوجھ سے لدے ہوتے ہیں مگر نیند ان سے کوسوں دور کھڑی ہوتی ہے... ایک عمر رسیدہ عورت کے گرد گھومتی کہانی... جو وقت اور فاصلوں کے ہندسوں کو بدلتے ہوئے... اپنی آنکھوں میں ان گنت خواب بنتے اور پھر بکھر کر ٹوٹتے ہوئے دیکھتی رہی تھی... زیست کے آخری پڑائو کی جانب گامزن تھی... اور چاہتی تھی کہ وقت کی گردشیں تھمنے تک اپنے مسکن سے جڑی رہے... مگر اچانک ہی اس کے پُرسکون اور پرسکوت لمحات میں ایک کنکر نے ہلچل مچادی...

بقائے حیات کی جنگ سے نبردآزما ایک ستم رسیدہ کے حفاظتی اقدامات

ڈوربیل کی چنگھاڑتی آواز نے خاموشی توڑ دی تھی لیکن موڈی اٹھنے کے بجائے بے حس و حرکت آرام کرسی پر بیٹھی رہی۔ جانتی تھی کہ ایک بار اور، ایک بار اور، ایک بار اور..... گھنٹی بجتی ہی رہے گی۔ ایسا گزشتہ کئی ہفتوں سے ہو رہا تھا۔

اس سارے معاملے کے پیچھے اصل بات رہائشی انتظام کی تھی۔ دل کے دورے سے باپ کی اچانک موت کے بعد فیملی کے پاس جو کچھ باقی بچا، اس میں صرف یہی

ایک اپارٹمنٹ تھا، جس میں اس وقت موڈی رہ رہی تھی۔ موت کے وقت باپ دیوالیا تھا اور پھر اُن کے بعد، سارے معاملات طے کرکے واقعی اُن کے پاس ایک دھیلا بھی باقی نہ بچا تھا۔ اگر کوئی قیمتی چیز باقی تھی تو یہی بڑا سا اپارٹمنٹ تھا جسے بیچ کر وکیل کی فیس اور گزر اوقات کا بندوبست کرنا تھا۔

خاندانی وکیل نے فلیٹ کی فروخت کے معاہدے میں نہایت چالاکی سے کام لیتے ہوئے یہ شرط ڈال دی تھی کہ نئے خریدار سابقہ مالکہ جو بیوہ ہو چکی اور اس کی دو بیٹیوں کو بنا کسی کرائے یا ادائیگی کے، اپارٹمنٹ میں رہنے دیں گے۔ یہ شق بجلی، گیس سمیت تمام بلوں اور ٹیکسوں پر محیط ہوگی۔ پرانی مالکہ ہر قسم کی ذمے داری سے بری الذمہ ہوں گی۔ اس کے بدلے وہ فلیٹ کو مناسب لیکن نہایت کم داموں پر فروخت کردیں گی۔

اسی معاہدے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر کبھی کوئی فیملی ممبر یہاں سے چلا جائے اور پھر دوبارہ اپارٹمنٹ میں رہنے کی خواہش کرے تو بنا کسی قسم کی ادائیگی کے، وہ جب تک چاہے، رہ سکتا ہے۔ معاہدے میں 'فیملی' کی تعریف 'بیوہ اور اُس کی دو بیٹیاں تھیں۔ معاہدے کو ستر سال ہو چکے تھے۔ کوئی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اُن دو میں سے ایک بیٹی اب تک فلیٹ میں مقیم ہوگی۔

کافی پہلے جب ہاؤسنگ ایسوسی ایشن بورڈ نے فلیٹ کی ملکیت حاصل کی تو کئی دہائیوں پہلے کیے گئے معاہدے کی تشریح پر تنازعہ پیدا ہوا تھا۔ معاملہ عدالت میں گیا لیکن موڈی مقدمہ جیت گئی، البتہ عدالت نے اسے پابند کردیا تھا کہ وہ اپارٹمنٹ کی دیکھ بھال کی مد میں ایسوسی ایشن کو معمولی سی رقم سالانہ طور پر ادا کرے گی۔ تب سے وہ بڑے سکون سے اُسی اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔

موڈی اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ باپ کی موت کے وقت اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اس واقعے نے اُس کی پوری زندگی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس صدمے کے باعث ماں اور چھوٹی بہن شارلیٹ بدترین اعصابی بیماری سے دوچار ہوگئی تھیں، یوں وہ دونوں کی دیکھ بھال کے سوا کسی اور کام کے قابل نہیں رہی تھی۔ باپ کی موت کے دو سال بعد بیمار ماں چل بسی اور اس کے تیس برس بعد شارلیٹ دنیا کو اللہ حافظ کہہ گئی۔ تب تک موڈی خود عمر کے اس حصے میں پہنچ چکی تھی، جہاں وہ کسی اور کام کے قابل ہی نہ تھی ماسوائے اپارٹمنٹ میں رہنے کے۔ شارلیٹ کے بعد وہ پچھلے چالیس سال سے اُسی فلیٹ میں مقیم تھی۔

اس طویل عرصے کے دوران میں دنیا نے کئی رنگ بدلے، بہت سارے موسمی پرندے آئے، ٹھہرے اور چلے گئے لیکن موڈی بدستور تنہا رہی۔ وہ چھٹیاں منانے بھی تنہا جاتی تھی۔ وہ تنہائی اور آزادی پسند تھی۔ اس کی طویل تنہا زندگی میں کئی مسائل آئے مگر وہ سب سے خوش اسلوبی سے نمٹتی رہی۔ اُن دنوں ایک اور بہت بڑا مسئلہ اس کی پُرسکون زندگی میں خلل ڈالنے آگیا تھا۔ اب وہ اس سے نکلنے کا راستہ تلاش کررہی تھی۔ جو کچھ ہوا، موڈی اس کا ذمے دار خود کو ٹھہرا رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے خطرے سے بہت پہلے خبردار کردیا تھا لیکن بقول اُس کے، آنکھیں کھولنے کے بجائے سیدھی چلتی ہوئی جال کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ جو کچھ ہوا، وہ اِس کے لیے بہت بُرا تھا لیکن اس سارے معاملے کی ابتدا نہایت معصومانہ تھی۔

یہ ایک موسم بہار کی بات تھی جب اس کے اپارٹمنٹ میں چالیس سال کی نہایت حسین و جمیل عورت جیسمن شیرہاف رہنے کے لیے آئی۔ وہ مشہور اور متنازعہ شخصیت تھی۔ وجہِ شہرت بھی وہ خود نہیں بلکہ اس کے مشہور و معروف والدین تھے۔ وہ سوئیڈن کے ایک ایسے جوڑے کی اکلوتی بیٹی تھی جنھیں اپنی مصروفیات نے وقت نہ دیا اور بیٹی بورڈنگ اسکولوں اور ملازماؤں کے ہاتھوں پلتے ہوئے تنہائی پسند، نشے کی عادی اور نفسیاتی مریضہ بنتی چلی گئی۔

جیسمن کا باپ ایک بہت بڑا سرمایہ کار اور ماں عالمی شہرت یافتہ اوپرا سنگر تھی۔ ماریہ شیرہاف ہر وقت اپنے کسی نہ کسی کنسرٹ کے سبب گھر اور شہر سے ہی نہیں بلکہ ملک سے بھی باہر رہتی تھی۔ کبھی کبھار ہی ایسا موقع آتا تھا کہ ماں باپ اپنی اکلوتی بچی کے ساتھ گھر پر کچھ وقت گزار رہے ہوتے تھے۔ چند سال قبل نیویارک کے نواح میں ہونے والے ایک کار حادثے میں اس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ حادثہ کیسے ہوا۔ جس وقت اُس کی کار کھمبے سے ٹکرائی، تب وہ تنہا ڈرائیو کررہی تھی۔

ماریہ کی تدفین کے موقع پر اخبارات میں آخری رسومات سے متعلق بڑی بڑی رنگین تصاویر شائع ہوئی تھیں تاہم حیرت انگیز طور پر جیسمن ماں کے جنازے میں کہیں دکھائی نہ دی۔ بعد میں چٹ پٹی خبریں شائع کرنے والے اخبارات نے ہی یہ اطلاع دی تھی کہ جیسمن مختلف اقسام کے نشے کرنے کے علاوہ شراب نوشی بھی کرنے لگی تھی۔ انہی عادتِ بد سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ ایک بحالی مرکز میں بھی زیرِ علاج رہی تھی۔ جس روز اس کی ماں کی تدفین تھی، وہ

اس قدر نشے میں تھی کہ ماں کی آخری رسومات میں بھی شریک نہ ہوسکی۔

اخبارات کا یہ بھی کہنا تھا کہ چھ ماہ پہلے دوسری شادی کا انجام بھی طلاق پر ہونے کے بعد جیسمن شدید افسردہ تھی۔ جذباتی لحاظ سے پہنچنے والے صدمے سے نکلنے کے لیے اس نے شراب اور دیگر نشہ آور ادویات کا سہارا لیا۔ طلاق کے بعد وہ بری طرح نشہ کرنے لگی تھی۔ دونوں سابقہ شوہروں سے اس کی کوئی اولاد نہ ہوسکی تھی۔

ماریہ کی حادثاتی موت کے بعد شیمر ہاف فیملی کافی عرصے تک خبروں کی زینت بنتی رہی۔ اخبارات انہیں ایک بااثر فیملی کے طور پر پیش کررہے تھے۔ اس سے پہلے کہ حادثہ بھلادیا جاتا، آئزن شیمر ہاف کی دوسری شادی نے خبروں کو ایک نیا موڑ دے دیا۔

بیوی کی موت کے صرف چھ ماہ بعد، آئزن نے اپنی ایک جونیئر مطلقہ اسٹاف افسر سے شادی کرلی تھی۔ شادی سوئیڈن میں ہی ہوئی تھی۔ جب وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ بیٹی کے پاس پہنچا تب انکشاف ہوا کہ سوتیلی ماں اپنی اکلوتی سوتیلی بیٹی سے بھی کئی سال چھوٹی تھی۔ اس شادی کے بعد کئی اخبارات نے یہ خبریں بھی شائع کی تھیں کہ کیا واقعی ماریہ کی موت ایک حادثہ تھی یا خودکشی؟ اخبارات نے کئی تصویریں چھاپ کر یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ مسٹر آئزن کے اپنی نئی بیوی کے ساتھ پرانے 'تعلقات' استوار تھے اور جب انہوں نے شادی کی تب نئی نویلی دلہن 'امید' سے تھی۔

رفتہ رفتہ اخبارات خاموش ہونے لگے۔ دو سال تک جیسمن بھی پس منظر میں رہی۔ کہا جاتا تھا وہ لوگوں سے دور رہ کر اپنی سوانح حیات لکھ رہی ہے۔ معروف خاندان کی اکلوتی بیٹی کے حالاتِ زندگی جاننے کے لیے بہت سے لوگ بے چین تھے۔ جب سوانح عمری شائع ہوئی تو چند ہفتوں میں ہی کتاب 'بیسٹ سیلر' بن چکی تھی۔ ہر شخص خوش و خرم مسکراتے چہروں والے مشہور لوگوں کی حقیقی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ موت کے بعد بھی اس کی ماں ماریہ کا گلیمر اب تک باقی تھا۔ کچھ لوگ بیٹی کی زبانی ماں کے بارے میں پڑھنا چاہتے تھے، کچھ کو آئزن شیمر ہاف کی مالی کامیابیوں کی ٹوہ لینے کی پڑی تھی اور بہت سوں کو یہ فکر تھی کہ دولت، شہرت اور پُرآسائش زندگی کے باوجود جیسمن کی ازدواجی زندگی کی ناکامی اور نشے کا عادی بننے کی وجہ کیا تھی۔

کتاب پر ناقدین نے متنازع رائے دی۔ اخبارات میں شائع تبصروں میں کسی نے زبان و بیان کی خامیاں نکالیں تو کسی نے کرداروں پہ گرفت کمزور کہی...... کسی نے کہانی بیان کرنے کے انداز کو ہی بھونڈا قرار دیا لیکن ان لوگوں کو ان میں سے کسی بات کی پروانہ تھی فین اور دلدادہ بک اسٹورز پر لمبی لمبی قطاروں میں لگ کر کتاب خریدرہے تھے۔

کتاب میں جیسمن نے اپنے والدین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ 'باپ نے پُرآسائش زندگی دی لیکن باپ کا پیار نہ ملا۔ ماں نے پیار کیا لیکن ویسے ہی جیسے کوئی راہ چلتا شخص کہیں رکے اور گزرتے ہوئے کسی بچے کے سر پر دستِ شفقت رکھ دے، مسکرائے، ایک چاکلیٹ دے اور چل دے اجنبیوں کی طرح۔'

چند سال بعد جیسمن نے ویسٹن ٹاؤن کے علاقے گوتھن برگ میں ایک اپارٹمنٹ خریدلیا۔ یہ وہ بلڈنگ تھی، جس کے فرسٹ فلور کے ایک اپارٹمنٹ میں موڈی مقیم تھی۔ جیسمن کا اپارٹمنٹ بلڈنگ کا واحد اپارٹمنٹ تھا جو گراؤنڈ فلور پہ واقع تھا۔ لابی سے اس کا علیحدہ داخلی راستہ تھا جبکہ اس کی کھڑکیاں سڑک اور عقبی حصے، دونوں طرف کھلتی تھیں۔

موڈی نے سنا تھا کہ ہاؤسنگ ایسوسی ایشن کی اجازت سے سابقہ مالک نے اپارٹمنٹ کے عقبی حصے میں ایک خوبصورت ٹیرس تعمیر کروایا تھا اور پورے اپارٹمنٹ کی نہایت شاندار انداز میں تزئین نو بھی کرائی تھی۔ اپارٹمنٹ کا سابق مالک کسی آئی ٹی کمپنی کا سربراہ اور بہت زیادہ دولت مند تھا۔ شادی کے بعد ان کے پہلے بچے کی ولادت متوقع تھی، تب اس نے اپارٹمنٹ جیسمن کے ہاتھوں بیچ کر ساحل کنارے تعمیر شدہ پُرآسائش گھر خرید لیا اور وہیں وہ گھرانا منتقل ہوگیا۔

اپارٹمنٹ ویسے تو کشادہ تھا لیکن جیسمن کے منصوبوں کے لیے وہ بہت چھوٹا پڑنے لگا تھا۔ کتاب کی کامیابی کے بعد بطور آرٹسٹ وہ اپنا نیا کیریئر شروع کرنا چاہتی تھی، ساتھ ہی وہ انٹرنیٹ پر 'می جیسمن' کے نام سے بلاگ بھی لکھ رہی تھی۔ اسے ایسی جگہ چاہیے تھی جہاں وہ اپنا تخلیقی کام کرسکے اور اس کے بلاگ کے نوجوان قارئین بھی وہاں ہفتے کے کسی ایک روز اکٹھا ہو کر ادبی محفل جماسکیں۔

جیسمن کے بارے میں موڈی کی تمام تر معلومات کا ذریعہ اخبارات اور اُس کے بلاگ تھے۔ 'می جیسمن' کے ذریعے ہی موڈی کو پتا چلا تھا کہ چند ماہ بعد اکتوبر میں اوسلو کی ایک مقامی آرٹ گیلری میں اس کی پینٹنگز اور مجسموں کی

نمائش ہونے والی ہے۔ موڈی روزانہ انٹرنیٹ پر کئی گھنٹوں تک سرفنگ کرتی تھی۔ اسے لوگوں اور تقریبات کے بارے میں جاننے اور پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ جب سے جیسمن بلڈنگ میں رہنے کے لیے آئی تھی، تب سے وہ نہ صرف اُس کا بلاگ باقاعدگی سے پڑھتی تھی بلکہ اس کے بارے میں مزید معلومات کے لیے گوگل کے ذریعے بھی سرچ کرتی رہتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح اس کے ساتھ تعلقات بنائے جائیں لیکن پہل کرنے سے پہلے ہی اسے چھٹی منانے کی سوجھی اور وہ سارڈینا چلی گئی۔ تین ماہ بعد جب وہ گوٹنے برگ واپس پلٹی، تب اس قصے کی شروعات ہوئی۔

موڈی کو گھر لوٹے دو یا تین روز ہوئے ہوں گے کہ ایک دن اس کے گھر کی گھنٹی بجی۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ وہ دروازے کی طرف لپکی۔ سامنے اکہرے جسم کی خوبصورت، لمبی اور بے ترتیب سنہرے بالوں والی عورت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ موڈی نے جیسے ہی دروازہ کھولا، اس نے فوراً مسکرا کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بنا سانس لیے تیز آواز میں جلدی جلدی کہنے لگی۔

''ہائے...... میرا نام جیسمن شیر ہاف ہے۔ میں گزشتہ موسم بہار میں یہاں منتقل ہوئی ہوں، اگست میں۔ میں نے تمام ہمسائیوں کو نئے گھر کی خوشی میں ہاؤس وارمنگ پارٹی دی تھی لیکن افسوس کہ تم یہاں نہ تھیں، سو ملاقات نہ ہو سکی اس لیے میں آج تم سے ملنے چلی آئی ہوں، کیا میں اندر آسکتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ رکی اور انتظار کرنے لگی کہ کیا جواب ملتا ہے۔

موڈی محسوس کر رہی تھی کہ گزشتہ چند ماہ سے بعض ہمسائے اُس سے اونچی آواز میں بات کرنے لگے تھے۔ اگرچہ اس کے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے، وہ بہری نہ تھی مگر پھر بھی وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ قوتِ سماعت ٹھیک ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسے بہرا سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا لوگ منہ پر ایسی باتیں بھی کر جاتے ہیں کہ جو اُن کے خیال میں وہ سن نہیں سکی ہوگی۔ اس سے کئی بار موڈی کو فائدہ ہی ہوا تھا لیکن اُس کی آواز واقعی بہت اونچی تھی۔ لگتا تھا کہ کان کے پردے ہی پھاڑ ڈالے گی۔

موڈی نہیں جانتی تھی کہ وہ ایک بڑی غلطی کرنے والی ہے۔ وہ ایک مشہور شخصیت کو اپنے دروازے پر دیکھ کر اندر سے بہت خوش تھی۔ وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ گئی۔

''اندر آیئے......''

جیسمن بے تابی سے اندر داخل ہوئی اور دروازے پر ہی رک گئی۔ وہ گردن گھما گھما کر پورے گھر کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہی تھی۔ کچھ دیر تک چاروں طرف نظریں گھمانے کے بعد اس نے اپنے عقب میں دیکھا۔ وہ بدستور دروازے کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ ''بہت بڑا اپارٹمنٹ ہے تمہارا۔'' جیسمن اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ''اور جگہ بھی خوب خالی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی طرف ایک قدم آگے بڑھی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا گفٹ پیک اس کی بڑھایا۔ ''یہ میری طرف سے پہلی ملاقات یادگار بنانے کے لیے۔''

موڈی اپنی جگہ جیسے جم گئی تھی۔

جیسمن کا گفٹ باکس والا ہاتھ اُس کی طرف اور نظریں دوسری طرف کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ''کچن کس طرف ہے؟'' اس نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ موڈی بتا کر دوسری غلطی کرتی، ہاتھ بڑھا کر گفٹ باکس تھام لیا۔ ''شکریہ...... ویسے اس تکلف کی کوئی ضرورت تو نہ تھی۔'' وہ مسکرا کر نرم لہجے میں بولی۔

''ضرورت تھی۔'' جیسمن مسکرائی۔ ''یہ تحفہ تمہیں میرا احساس دلائے گا۔ ایک اچھے ہمسائے کے ساتھ کا احساس......'' یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا اور بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ ہم اچھے ہمسائے اور اس سے بھی زیادہ اچھے دوست بننے جا رہے ہیں۔''

اگرچہ جیسمن کا لہجہ نرم تھا لیکن آواز بدستور بہت اونچی تھی۔ اس سے پہلے کہ موڈی اسے آواز نیچی رکھنے کا کہتی، اُس کی بے چین نظروں نے ایک چھوٹی سی راہداری دیکھ لی۔ اسے کچن کا راستہ مل گیا تھا۔ اب کون تھا اُسے روکنے والا۔ وہ تیزی سے راہداری کی طرف بڑھ گئی۔

موڈی کے پاس اس کے پیچھے جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر کچن کی طرف جانے لگی۔

''واہ واہ...... کتنا خوبصورت اور بڑا ہے تمہارا کچن۔'' اسے دروازے پر دیکھ کر جیسمن نے بڑے جوشیلے انداز میں کہا۔ ''کتنی گنجائش ہے یہاں۔'' وہ بدستور کچن کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

موڈی مسکرا دی۔ اسے ایک مشہور شخصیت کے منہ سے اپنے اپارٹمنٹ کی تعریف سننا اچھا لگ رہا تھا۔

''لگتا ہے جب سے بنا ہے تب سے یہاں کچھ بھی نہیں بدلا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے جیسمن نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ ''ماسوائے چولھے اور فریج کے۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ

بھر توقف کیا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ ''سو سال پرانا تو ہوگا یہ اپارٹمنٹ۔''

موڈی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کتنا بڑا ہے نا یہ گھر......'' جیسمن اپنی ہی دُھن میں بولے جارہی تھی۔ اسے بالکل بھی پروا نہیں تھی کہ وہ جو کچھ بول رہی ہے وہ سننے والے کو پسند بھی آتا ہے یا نہیں۔

موڈی سوچ رہی تھی کہ وہ کتنی باتونی عورت ہے۔ اس نے اب تک یہ محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ شکریہ کہنے کے سوا وہ بالکل خاموش تھی۔ صرف سنے جارہی تھی۔ بولتی تو تب، جب یہ اُسے بولنے کا موقع دیتی۔

''یہ میرے اپارٹمنٹ سے کچھ زیادہ بڑا نہیں ہے؟'' جیسمن نے سوال کیا۔

موڈی نے سر ہلایا اور ہچکچاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''دراصل تمہارا اپارٹمنٹ ساڑھے چار سو فٹ جبکہ یہ اس سے تھوڑا سا بڑا ہے۔''

''کتنا......'' جیسمن نے جلدی سے پوچھا۔ ''تمہیں کچھ علم ہے کہ اس کا رقبہ کتنا ہے؟''

''تقریباً ایک ہزار اسکوائر فٹ سے کچھ زیادہ۔'' موڈی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

جیسمن نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اسے کچھ احساس ہوا اور وہ کہتے کہتے رک گئی۔ کچھ دیر تک کچن میں خاموشی رہی۔ جیسمن کی نگاہیں بدستور چاروں طرف کا جائزہ لے جارہی تھیں۔ ''یہاں آکر اچھا لگا۔'' اس بار اس کی آواز کچھ نچی تھی۔ ''کبھی وقت ملے تو میری طرف آنا، میں نے اپنا چھوٹا سا اسٹوڈیو بنایا ہے۔''

موڈی مسکرادی۔ ''جانتی ہوں۔''

جیسمن نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

وہ سمجھ گئی۔ ''تمہارے اسٹوڈیو کے بارے میں اخبارات میں کبھی کبھار کچھ نہ کچھ چھپتا ہی رہتا ہے۔''

یہ سن کر جیسمن مسکرادی۔ اس کے چہرے پر خوشی نمایاں تھی۔ ''مجھے خوشی ہوگی اگر تم میرا اسٹوڈیو آکر دیکھو۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی اور بات ادھوری چھوڑ دی۔ ''مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں...... اب چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

موڈی نے ڈائننگ ٹیبل پر اس کا دیا ہوا گفٹ باکس رکھا اور بن بلائے مہمان کو چھوڑنے کے لیے باہر کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھی۔ جیسمن اس کے برابر برابر آگے بڑھ رہی تھی۔

دروازے پر پہنچ کر جیسمن رکی اور بڑے پیار اور گرمجوشی سے موڈی کو گلے لگالیا۔ موڈی کو مدتوں بعد کسی نے اتنے پیار اور اپنائیت پن سے گلے لگایا تھا۔ ایک لمحے کو خیال آیا کہ وہ اس کے گلے سے لگ کر روتی رہے لیکن اس نے بہنے کے لیے تیار آنسو اور جذبات کو بڑی مشکل سے قابو کیا۔

''اچھا......'' جیسمن علیحدہ ہوئی۔ ''مجھے امید ہے ہم بہت جلد ملیں گے۔''

موڈی نے مسکرا کر سر ہلایا۔ ''کیوں نہیں، ہم ہمسائے ہیں، ضرور ملیں گے۔''

موڈی کو شروع میں جیسمن کی بے تکلفی پر غصہ آیا تھا لیکن جس پیار سے اُس نے اسے گلے لگایا، تب سے اسے خود پر شرمندگی محسوس ہورہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے جیسمن سے متعلق تیزی سے رائے قائم کرکے غلطی کی تھی۔

''میں چلتی ہوں...... بائے۔'' یہ کہتے ہوئے جیسمن سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

موڈی دروازے پر کھڑی تھی۔ اسے جیسمن کے جاتے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھیں۔

جیسمن جاچکی تھی لیکن جس گرمجوشی اور خلوص سے اس نے موڈی کو گلے لگایا اور مسکرا کر دیکھا تھا، اُس نے بوڑھی خاتون کے دماغ میں ہلچل مچادی تھی۔ وہ برسوں سے تنہا رہ رہی تھی۔ مدت ہوئی کسی نے اس کی طرف خلوص بھری مسکراہٹ کے ساتھ نہیں دیکھا تھا، کسی نے اسے اپنائیت کے لمس سے نہیں چھوا تھا۔ اس کے دماغ میں ہلچل مچ رہی تھی۔ اسے اپنی طویل زندگی کے سارے دکھ ایک ایک کرکے یاد آنے لگے تھے۔

موڈی کچن میں پلٹی اور اس کا لایا ہوا گفٹ باکس کھولنے لگی۔ وہ نہایت مہنگے برانڈ کی شیمپئن تھی۔ مدتوں بعد اسے کسی نے کوئی تحفہ دیا تھا، وہ بھی اتنا مہنگا۔ خوشی کے مارے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ خیالوں میں گم تھی۔ سوچ رہی تھی کہ کیا اپنے گھر کی ہاؤس وارمنگ پارٹی میں جیسمن نے سب کی تواضع اسی طرح کی نہایت قیمتی شراب سے کی ہوگی، کیا اُسے میرے گھر میں رکھی کتابیں پسند آگئی ہیں؟ وہ سوچ رہی تھی کہ اخباروں میں اس کے بچپن کی باتیں چھپی تھیں کہ وہ ماں کے پیار سے محروم رہی تو کیا وہ اپنی عمر سے لگ بھگ دگنی عمر کی بوڑھی عورت میں ماں یا دادی کا پیار تلاش کرنے کی کوشش کررہی ہے؟ اسے کسی سوال کا جواب تو نہ ملا البتہ وہ اتنی جذباتی ہوئی کہ کئی

گھنٹوں تک اپنی تنہا زندگی پر آنسو بہاتی رہی۔ اس دن اسے پہلی بار اپنے ماں باپ اور بہن نہایت شدت کے ساتھ یاد آئے تھے۔

رات جب کافی دیر تک موڈی کو نیند نہ آئی تو اس نے انٹرنیٹ پر جیسمن کے خاندان سے متعلق معلومات ڈھونڈنا شروع کر دیں۔ اس کی نانی زندہ تھی۔ اس کی نہایت خوبصورت تصویر بھی ویب سائٹ پر موجود تھی۔ وہ عمر میں موڈی سے لگ بھگ دو برس چھوٹی لیکن دیکھنے میں کہیں زیادہ چھوٹی نظر آ رہی تھی۔ ''سب دولت کا کھیل ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔ جیسمن کا ننھیال بھی بہت دولت مند تھا۔ اپنی تین ماہ کی چھٹیوں کے دوران وہ اخبارات سے دور رہی تھی۔ انٹرنیٹ سے ہی علم ہوا کہ انہی دنوں دل کا دورہ پڑنے سے آئزن شیمر ہاف کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ ترکے کا زیادہ حصہ اس کی بیوہ کو ملا لیکن قانونی طور جو دولت جیسمن کے حصے میں آئی، وہ بھی کچھ کم نہ تھی۔

موڈی مسکرا دی۔ ''اتنی زیادہ دولت مل جائے تو پھر لٹانے میں تکلیف نہیں ہوتی۔'' اسے شیمپین کا قیمتی تحفہ یاد آ گیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ جیسمن نے ہاؤس وارمنگ پارٹی میں بھی مہمانوں کی تواضع بہت شاندار طریقے سے کی ہوگی۔

موڈی نے پوری زندگی نہایت عسرت میں بسر کی تھی۔ ایک ایک پیسہ نہایت احتیاط سے خرچ کرتی تھی۔ اگر جیسمن نہ دیتی تو اتنی مہنگی شیمپین پینے کا وہ تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی آمدنی دراصل وہ کرایہ دار تھے جو کبھی کبھار یہاں کچھ وقت کے لیے رہنے آ جاتے تھے، کچھ پنشن مل جاتی تھی، تھوڑی بہت رقم ترکے میں ملی تھی، جسے اس نے بینک میں فکسڈ ڈپازٹ کرا دیا تھا۔ یہی آمدنی اس کی گزر بسر کا ذریعہ تھی۔

اتنے بڑے گھر میں وہ بالکل تنہا رہتی تھی۔ آخری کرایہ دار بھی پچیس سال پہلے چلا گیا تھا۔ جن کی ملکیت یہ گھر تھا، انہوں نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اگر مالک رہتے ہوتے تو اور بات تھی لیکن چونکہ وہ تنہا رہتی تھی لہٰذا قانونی معاہدہ ہونے کے باوجود اسے بجلی، گیس پانی سمیت تمام بل اور ٹیکس خود ادا کرنے پڑتے تھے ورنہ یہ تمام سہولتیں چھن بھی سکتی تھیں۔ ایک بار پھر اسے خیال آیا کہ اگر اسے کوئی کرایہ دار مل جائے تو بلوں کی صورت پڑنے والا مالی بوجھ کافی کم ہو سکتا تھا۔

موڈی اپنی محدود آمدنی کا سالانہ بجٹ بناتی تھی جس میں ہر سال تین مہینوں کے لیے کسی اچھی جگہ پر چھٹیاں منانے کا پروگرام بھی شامل ہوتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پوری دنیا میں اس کا کوئی ہے نہیں، عمر اتنی زیادہ ہو چکی، اگر اس نے اپنی آمدنی خرچ نہ کی تو مرنے کے بعد کوئی وارث ہے نہیں، ایسے میں ساری جمع پونجی حکومت کی ملکیت میں چلی جائے گی۔ بہت سارے ہمسائے اسے کنجوس تصور کرتے تھے لیکن وہ خود کو کفایت شعار گردانتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جیسمن نے جو بوتل دی، وہ اسے خریدنے کی خواہش ضرور رکھتی تھی لیکن کبھی اتنی ہمت نہ کر سکی کہ خرید سکے۔ جیسمن کے قیمتی تحفے نے بوڑھی موڈی کے دل میں اُس کے لیے اچھی خاصی جگہ بنا دی تھی۔

اچانک اس کے دل میں شک پیدا ہوا۔ ایک بار پھر وہ سوچنے لگی کہ آخر اس نے اتنا قیمتی تحفہ کیوں دیا۔ نانی کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ اسے کسی اور بزرگ کے پیار کی ضرورت نہ تھی۔ تو آخر ایسا کیا تھا کہ وہ قیمتی تحفہ لائی اور اتنی گرمجوشی سے ایک اجنبی بوڑھی عورت کو گلے لگایا۔ کیا اُس کا کوئی مقصد تھا۔ ایسا ہے تو وہ کیا چاہتی ہوگی؟ بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی اسے اس بات کی کوئی منطقی وجہ سمجھ نہ آ سکی۔

تھک کر موڈی نے کمپیوٹر بند کیا اور بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اس کا دماغ بری طرح تھکا ہوا تھا۔ وہ لمبی نیند لینے کی خواہش مند تھی۔

جیسمن سے ملاقات کو ایک ہفتہ ہونے والا تھا۔ موڈی آرم کرسی پر بیٹھی تھی کہ ڈور بیل کئی بار زور سے بجی۔ موڈی سمجھ گئی کہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ اٹھی اور دروازے پر لگے چھوٹے سے عدسے سے باہر جھانکا۔ اس کا شک حقیقت میں بدل گیا۔ سامنے جیسمن تھی۔ دروازہ کھولنا موڈی کی تیسری غلطی ہوتی لیکن اس نے بنا کچھ سوچے سمجھے دروازہ کھول دیا۔ غلطی ہو چکی تھی۔

''ہائے موڈی......'' اسے دیکھتے ہی جیسمن گرمجوشی سے چلائی۔ ''میں کچھ پیسٹریز لائی ہوں، سوچا ہم اکٹھے بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔'' اس نے حسب سابق بنا رکے، اونچی آواز میں کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبا تھا۔

موڈی دروازے سے ایک طرف کو ہٹی۔ اگلے لمحے جیسمن اندر داخل ہوئی اور بنا کچھ کہے سیدھی کچن کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس کے لباس سے کسی نہایت مہنگے پرفیوم کی تیز لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ تازہ تازہ ونیلا پیسٹریوں کی مہک بھی شامل تھی۔

مُوڈی مسکرائی اور دروازہ بند کر کے پلٹی۔ جب وہ کچن میں داخل ہوئی تب تک جیسمن کیتلی میں پانی بھر کر چولھے پر رکھ چکی تھی۔ کافی کی بوتل برابر میں رکھی تھی۔

''ہم دونوں اکیلے رہتے ہیں اور زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزارتے ہیں۔'' جیسمن نے کیتلی میں کافی ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم دونوں کچھ وقت اکٹھے بیٹھ کر گزار لیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''ہے نا ہم دونوں کی قدرِ مشترک۔''

مُوڈی نے کچھ کہنے کے بجائے مسکرا کر سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''ایک تو میں گھر سے بڑی پریشان ہوں، کوئی جگہ ہی خالی نہیں بچی ہے۔'' جیسمن بنا رکے بولے جا رہی تھی۔ ''ایک تو میں بڑے فارمیٹ پر کام کرتی ہوں۔ میری پینٹنگز قدِ آدم ہوتی ہیں، مجسمے بھی بڑے بڑے ہیں، پورے گھر میں کہیں ایسی جگہ نہیں بچی کہ ایک تصویر تک ٹانگ سکوں۔ کیا کروں، کام کرنا ہے۔ پندرہ اکتوبر کو میری پینٹنگز اور مجسمے کی نمائش ہونے جا رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نظر چولھے سے ہٹائی۔ ''تم کو بلاؤں گی، ضرور آنا۔''

مُوڈی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جیسمن نے لحہ بھر رک کر دو تین گہری سانسیں لیں اور پھر اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں مُوڈی پر مرکوز کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''دراصل، عام طور پر میں لوگوں سے دور رہتی ہوں، میرے ملنے جلنے والے تو بہت ہیں لیکن شاید دوست کوئی نہیں اس لیے مجھے پتا نہیں کہ بڑی عمر کے لوگوں سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نگاہیں پھیر کر کیتلی کی طرف دیکھا۔

مُوڈی کو اس کی کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آخر وہ کہنا یا بتانا کیا چاہتی ہے۔ اس کا جلدی جلدی بولنا اور وہ بھی اونچی آواز میں، اسے آواز کان کے پردوں سے ٹکراتی محسوس ہو رہی تھی۔

''ویسے بھی کہیں باہر جانے کا دل کرے تو مجھ سے کہنا۔'' جیسمن نے ریک سے کافی مگ نکالتے ہوئے کہا۔ ''ہم ٹیکسی منگالیں گے اور پھر خوب گھومیں پھریں گے۔''

مُوڈی مسکرائی۔ اس وقت اسے جیسمن بہت پیاری اور معصوم لگی تھی بالکل کسی ننھی بچی کی طرح۔ اُس کی آنکھوں سے معصومیت جھلک رہی تھی۔

''تم دودھ شکر لیتی ہو؟''

مُوڈی نے کچھ کہنے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دینا ہی کافی سمجھا۔

جیسمن نے فریج کھولا مگر وہاں دودھ کی بوتل نہیں تھی۔

''دودھ نہیں ہے کیا؟'' جیسمن نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔'' مُوڈی نے مختصر سا جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں۔'' جیسمن نے مسکراتے ہوئے فریج کا دروازہ بند کیا۔ ''بلیک کافی کا بھی اپنا منفرد ٹیسٹ ہوتا ہے۔''

جیسمن کافی اور پیسٹریز کی ٹرے لے کر ٹی وی لاؤنج میں آگئی جہاں مُوڈی جاگنے کے بعد دن کا زیادہ تر حصہ گزارتی تھی۔ یہاں سے چھوٹی سی راہداری عبور کر کے اس کا اٹیچڈ باتھ بیڈ روم آتا تھا۔ جیسا کہ باتوں ہی باتوں میں جیسمن نے اندازہ لگایا تھا، اتنے بڑے اپارٹمنٹ کا صرف دو سوفٹ رقبہ ہی مُوڈی کے زیرِ استعمال تھا۔

پہلی ملاقات کے دوران جیسمن پر اسے جو غصہ آیا تھا، اب وہ جھاگ کی طرح بیٹھ کر غائب ہو چکا تھا۔ تنہائی پسند مُوڈی کو اس کی رفاقت پسند آ رہی تھی۔ برسوں کے بعد وہ کسی کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر اہتمام کے ساتھ کافی پی رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کا رویہ انتہائی محتاط تھا۔ وہ بڑے پنے تلے انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ تنہائی کی زندگی نے اسے شکی بنا دیا تھا۔ وہ آسانی سے کسی اجنبی پر بھروسا کرنے کے لیے خود کو آمادہ نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ بیک وقت اعتبار اور بے اعتباری کی ملی جلی کیفیت کا شکار تھی۔

جیسمن اس کے محتاط رویّے کو یا تو سمجھ نہیں سکی تھی یا پھر نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حسبِ عادت وہ بولے چلی جا رہی تھی۔ ''اصل میں ہم دونوں لگ بھگ ایک جیسی ہی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مجھے اپنے کام کے لیے بہت جگہ درکار ہے، اس لیے میری رہائش ایک کمرے تک محدود ہے اور باتھ روم کے علاوہ کچن ہی استعمال کر سکتی ہوں بالکل تمہاری طرح محدود جگہ۔ اس کے علاوہ تو پورا گھر اسٹوڈیو ورکشاپ میں تبدیل ہو چکا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے سانس لی۔ ''اب اس کے بعد تو عقبی حصے کا ٹیرس ہی بچتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے مُوڈی کی طرف دیکھا۔ ''تم نے تو ہمارا ٹیرس دیکھا نہیں ہوگا، گھر سے جو نہیں نکلتی ہو۔'' یہ کہہ کر اس پر آنکھیں مرکوز کیں۔ ''کسی دن نیچے اتر کر آؤ، دیکھو میں نے اتنے سامان کے باوجود کس طرح اپارٹمنٹ کو

صاف ستھرا رکھا ہوا ہے۔ ہر چیز بالکل نئی نویلی لگتی ہے۔'' اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

''پیسٹریز بڑی عمدہ ہیں، لگتا ہے کسی اچھی بیکری کی ہیں۔'' موڈی نے اس کی پیشکش نظر انداز کرتے ہوئے دوسری بات کی۔

''شکریہ...... تمہیں پسند آئی ہیں۔'' جیسمن نے خوشی خوشی اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے مجھے یقین تھا کہ یہ تمہیں پسند آئیں گی۔ مجھے تو اس بیکری کی ہر چیز بہت لذیذ لگتی ہے۔ ہمیشہ وہیں سے بسکٹ، کیک وغیرہ خریدتی ہوں۔''

کافی ختم ہونے تک انہوں نے بہت باتیں کیں۔ زیادہ تر جیسمن ہی بولتی رہی، موڈی تو ہوں ہاں کے ذریعے ہی کام چلا رہی تھی۔ کافی دیر بعد وہ جانے کے لیے اٹھی تو موڈی اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

سیڑھیوں کی طرف جاتے جاتے اچانک وہ پلٹی اور اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ''اگر تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو تو آؤ، ذرا نیچے تک ساتھ چلی چلو۔''

''نہیں نہیں...... '' موڈی جلدی سے بولی۔ سیڑھیاں اترتے چڑھتے ہوئے تھک جاتی ہوں۔''

''او کے......'' یہ کہتے ہوئے جیسمن سیڑھیاں اترنے لگی اور موڈی نے دروازہ بند کر دیا۔

اگلے چند ہفتوں کے دوران موڈی کے اپارٹمنٹ میں جیسمن کا آنا جانا بڑھتا چلا گیا۔ اکثر وہ کیک، بسکٹ اور اسی قسم کی کھانے پینے کی دوسری چیزیں ساتھ لے کر آجاتی اور خود ہی کافی بنا کر کئی گھنٹوں تک وہیں جم جاتی تھی۔ موڈی اس کے تحائف اور یوں روز روز آنے جانے سے خاصی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ اس کا شک بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اس سے کچھ کچھ ڈرنے لگی تھی۔ چاہتی تھی اسے تحفے لانے اور اپارٹمنٹ میں یوں آنے جانے سے منع کر دے لیکن نہ جانے کیوں، چاہنے کے باوجود وہ ایسا کہہ نہ سکی۔

اُس دن ایک بار پھر جیسمن چاکلیٹ کیک کے ساتھ آئی، کافی بنائی اور بہت دیر تک باتیں کرنے کے بعد واپس جانے لگی۔ اچانک پھر دروازے کی طرف پلٹی۔ ''چلو...... میرا اپارٹمنٹ چل کر دیکھ لو۔''

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی موڈی نے تھکن کا بہانہ بنا دیا۔

جیسمن جس گرمجوشی سے مل رہی تھی، اس سے بوڑھی موڈی کے ذہن میں طرح طرح کے شکوک و شبہات بدستور جنم لیے جا رہے تھے لیکن اب تک وہ اس نتیجے پر پہنچ نہ سکی کہ آخر ایسا وہ کیوں کر رہی ہے، وہ اُس سے چاہتی کیا ہے؟

کچھ عرصے سے وہ جیسمن کا بلاگ پڑھنے لگی تھی۔ ایک رات جب اس نے ویب سائٹ کھولی تو اُس کا نیا بلاگ پوسٹ ہو چکا تھا۔

''میں بہت خوش ہوں۔ بہت جلد میں ایک زیادہ بڑی جگہ منتقل ہو جاؤں گی۔ مطلب ہے ایک بڑا اسٹوڈیو...... یقیناً!!! واقعی مجھے ایک بڑے اپارٹمنٹ کی ضرورت ہے...... ایک بڑا اپارٹمنٹ، مطلب کہ ایک بڑا اسٹوڈیو...... اور جب میں کہتی ہوں بڑا تو اس کا مطلب ہے بڑا...... واقعی بہت بڑا!''

بلاگ پڑھتے ہی موڈی کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جیسمن کی مہربانیوں اور گرم جوشی کے پیچھے پوشیدہ مطلب واضح ہو گیا تھا۔ اُسے اپنے تمام سوالوں کے جوابات صرف اسی ایک بلاگ سے مل گئے تھے۔ غصے سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ اس کا دماغ گھومنے لگا۔ ''اُس چڑیل کی نظریں میرے اپارٹمنٹ پر ہیں۔''

موڈی کا اس گھر سے جذباتی رشتہ تھا۔ وہ یہیں پیدا ہوئی تھی، یہیں اس کے والدین اور بہن نے آخری سانسیں لی تھیں اور اب وہ خود زندگی کی آخری سانس یہیں لینا چاہتی تھی۔ عرصہ ہوا، اسے ایک دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ یہاں سے بے دخل کر کے اولڈ ایج ہوم نہ بھیج دی جائے۔ وہ یہاں سے نکل کر صرف قبرستان جانا چاہتی تھی اور کہیں نہیں۔

موڈی بلڈ پریشر کے عارضے میں مبتلا تھی۔ بلاگ پڑھنے کے بعد شدید غصے کے دوران اسے اپنی حالت بگڑتی محسوس ہوئی، خود کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ دوا کھائی۔ وہ اپنے بڑھتے غصے کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ کس طرح چالاک جیسمن اس سے جذباتی کھیل کھیلتی رہی تھی۔

موسمِ خزاں شروع ہو چکا تھا۔ درختوں کا سبز لباس زرد ہو رہا تھا۔ ٹوٹے پتے تیز ہوا سے فضاؤں میں رقص کرتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا رہے تھے۔ موڈی کھڑکی سے لگی باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ ''طوفان آنے والا ہے۔'' اس نے تیز ہوا سے اندازہ لگا کر خود کلامی کی۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ وہ پلٹی اور اپنی آرام کرسی کی طرف بڑھی۔ وہ کچھ سوچنا چاہ رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج اگر جیسمن آئی تو چاہے کتنی ہی بار گھنٹیاں بجیں، پر وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں سے

لاؤنج میں بھی افسردہ سی سرخ مائل زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ روشنی کی جگہ اندھیرا لینے لگا۔ سارے گھر کی لائٹس آف تھیں۔ موڈی آرام کرسی پر پاؤں پسارے آنکھیں موندے جیسمن کی چال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

دروازے کی گھنٹی کی چنگھاڑتی آواز نے خاموشی توڑی تو موڈی نے بھی آنکھیں کھول کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں تھا ہی کون جو دکھائی دیتا۔ جو بھی تھا، اسے تو دروازے کے دوسری طرف ہونا تھا۔ موڈی اٹھنے کے بجائے بے حس و حرکت آرام کرسی پر پاؤں پسارے نیم دراز رہی۔ وہ جانتی کہ ایک بار اور، ایک بار اور، ایک بار اور...... گھنٹی بجتی ہی رہے گی۔ وہ دروازہ نہ کھولنے کے فیصلے پر قائم تھی۔

موڈی کی توقع کے برعکس گھنٹی صرف دو بار بجی، اس کے بعد جیسمن نے ہتھیار ڈال دیے۔ اسے لکڑی کے زینے پر جیسمن کے جاتے قدموں کی کھٹ کھٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے زوردار آواز سنی۔ یہ گراؤنڈ فلور کے عقب سے آئی تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی۔ اس نے چاہا کہ جھانک کر دیکھے کہ نیچے کیا ہوا۔ وہ اٹھی اور دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ شاید جیسمن کے شیشے سے بنے ٹیرس سے کوئی چیز ٹکرائی تھی یا کھلا دروازہ تیز ہوا سے دھڑ کر کے بند ہوا ہوگا۔ اسی دوران میں اسے بجلی کڑکنے کی آواز سنائی دی۔ اب اسے اندھیرے سے کچھ خوف محسوس ہو رہا تھا۔

جیسمن دولت مند تھی، وہ چاہتی تو کوئی بھی بڑا اپارٹمنٹ خرید سکتی تھی لیکن موڈی کے معاملے میں ایسا نہ تھا۔ اصل مالکان کا مدتوں سے کچھ اتا پتا نہ تھا۔ خود اس کے پاس تو صرف یہاں رہائش رکھنے کا ہی قانونی اختیار تھا۔ وہ پچھلے اٹھاسی برس سے اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔ اس کی عمر اور یہاں پر گزارا ہوا عرصہ ایک جتنا ہی تھا۔ ایسے میں جیسمن کے حوالے سے اور اس کا بلاگ پڑھنے کے بعد تو صاف ظاہر تھا کہ وہ اپارٹمنٹ خریدنا نہیں بلکہ ہتھیانا چاہتی تھی۔ بوڑھی موڈی کے لیے یہی بات نہایت تشویش ناک تھی۔

موڈی کا خیال تھا کہ یا تو وہ اپارٹمنٹ ہتھیانا چاہتی ہے، یا اسے اپنے چھوٹے اپارٹمنٹ سے تبدیل کرنا چاہتی ہے۔ وہ خود کئی بار کہہ چکی تھی کہ اس کا چھوٹا اپارٹمنٹ اب اور چھوٹا پڑ گیا ہے۔ یہ دو باتیں نہ ہوں تو پھر وہ ہاؤسنگ ایسوسی ایشن کے ساتھ مل کر کوئی چال چل رہی ہوگی۔ ویسے بھی ایسوسی ایشن موڈی سے تنگ تھی کہ وہ نہایت قیمتی جگہ پر مفت میں قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔

اسے سب سے خطرناک بات جیسمن کی طرف سے سیڑھیاں اتر کر اُس کے اپارٹمنٹ دیکھنے کی دعوت لگی تھی۔ موڈی بہت ضعیف ہو چکی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ اسے سیڑھیوں سے دھکا دے کر، حادثے کی شکل میں قتل تو نہیں کرنا چاہتی کہ میدان بالکل صاف ہو جائے۔

سب باتیں ایک طرف، اس کا آخری خدشہ اس وقت تک برقرار رہنے والا تھا جب تک جیسمن سے اس کا تعلق نہ ٹوٹ جاتا۔ یہی سوچ کر اس نے تین چار ماہ کہیں اور گزارنے کا فیصلہ کیا تاکہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے لیکن یہ سوچ کر رک گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی غیر موجودگی میں ایسوسی ایشن بورڈ اور جیسمن مل کر کوئی چکر چلا دیں اور جب وہ لوٹے تو معاملہ 'چڑیاں چگ گئیں کھیت' جیسا ہو۔ یہ بات اسے کسی صورت قابلِ قبول نہ تھی۔ ساری زندگی آزادی اور اپنی مرضی سے گزارنے کے بعد، اب وہ باقی بچے چند سالوں کو اولڈ ایج ہوم کے اصولوں میں جکڑ کر آزادی کھونا نہیں چاہتی تھی۔

اپنی طویل زندگی میں پہلی بار موڈی خود کو بے حد کمزور اور مجبور محسوس کر رہی تھی لیکن کچھ دیر بعد اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ اس کا بوڑھا دماغ پوری قوت کے ساتھ کام کرنے لگا تھا۔ اس نے بہت سارے بحرانوں کا سامنا کیا تھا اور ہر بار اس کے دماغ نے نمٹنے کے لیے بھرپور ساتھ دیا۔ کافی دیر تک ہر زاویے سے اچھی طرح سوچنے کے بعد آخر اس نے جیسمن کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے ایک منصوبہ بنا لیا تھا۔ اس نے فوراً عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب جیسمن کے گھر جانے کا وقت آ چکا تھا۔ وہ جتنا جلد ہو سکے، اس معاملے کو ختم کر کے اپنا چین سکون واپس لانا چاہتی تھی۔

کچھ دیر بعد، وہ اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے جا رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لٹکے سیاہ شاپنگ بیگ میں کچن کا کچرا تھا جبکہ بغل میں پرانے اخبارات کا ڈھیر تھا۔ اس نے کچرے کے ڈبے میں تھیلا ڈالا اور 'ری سائیکل اشیا' والے ڈبے کا ڈھکن کھول کر اس میں ردی اخبار پھینک دیے۔ اس کے بعد وہ جیسمن کے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھی اور دروازے پر رک گئی۔ وہ اطراف کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہی تھی۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔

جیسمن کے اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ نیا اور کافی

مضبوط لگ رہا تھا۔ اسے لگا کہ دروازہ ڈبل لاک والا ہے۔ اس نے قدم آگے بڑھایا اور ڈور بیل کا بٹن دبا دیا۔ ہلکی سی ڈنگ ڈونگ سنائی دی۔ موڈی کو ڈور بیل کی آواز چرچ کے گھنٹے جیسی لگی۔ وہ مسکرا دی۔ بچپن سے ہی اسے چرچ کے گھنٹے کی آواز سننا بہت پسند تھا۔

بھاری دروازہ تھوڑا سا کھلا اور جیسے ہی جیسمن کی نظر موڈی پر پڑی، اس نے جھٹ سے پورا دروازہ کھول دیا اور ایک قدم آگے بڑھایا۔ ''آخر تم آ ہی گئیں۔'' وہ اسے اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ''اندر آؤ......'' وہ ایک طرف ہوتے ہوئے بولی۔

اُسے لگا کہ جیسمن اسے دیکھ کر سچے دل سے خوش ہو رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہ کہیں وہ اسے سمجھنے میں کوئی غلطی تو نہیں کر بیٹھی۔

''آؤ نا......'' جب موڈی نے قدم آگے نہ بڑھائے تو جیسمن نے بڑے اصرار سے کہا۔ ''میرا اپارٹمنٹ بہت شاندار، آرام دہ اور جدید ہے۔ تمہیں بہت خوشی ہوگی...... آؤ نا۔''

موڈی کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔ اس کا خلوص دیکھ کر جیسمن کے ذہن میں چلنے والے سارے خدشات ہوا ہو چکے تھے۔ وہ گڑبڑا چکی تھی کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اس نے سوچا کچھ تھا، اب ہو کچھ اور رہا تھا۔

''اندر آؤ نا......'' ایک بار پھر جیسمن نے اصرار کیا۔

''معاف کرنا......'' موڈی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کچرا پھینکنے آئی تھی تو اس طرف آ گئی ورنہ سیڑھیاں اترنا چڑھنا محال ہوتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں......'' جیسمن مسکرائی۔ ''اندر آ جاؤ۔''

''کہیں میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا ہے؟'' موڈی نے آگے بڑھنے کے بجائے وہیں کھڑے رہ کر پوچھا۔

''ارے بالکل بھی نہیں، میں تو بہت خوش ہوں تمہیں یہاں دیکھ کر۔ میں تو خود تمہیں یہاں آنے کی دعوت دیتی رہی ہوں۔''

''افسوس کہ اچانک آ گئی، کچھ لا نہ سکی تمہارے لیے۔'' موڈی بدستور دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ لگ رہا تھا کہ وہ اندر جانے سے ہچکچا رہی تھی۔

''اوہ...... کوئی بات نہیں، اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم آئی ہو یہی بڑی بات ہے۔''

''نہیں...... وہ پہلی بار تمہارے گھر آ رہی ہوں نا۔''

''تم بھی کیا بات لے بیٹھی ہو۔'' جیسمن کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''یہی بات کچھ کم ہے کہ تم میرے دروازے پر ہو۔''

اس نے ایک بار پھر ارد گرد احتیاط سے نظر ڈالی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ موڈی تیزی سے چھڑی ٹیکتی آگے بڑھی۔ اگلے لمحے وہ گھر کے اندر تھی۔ جیسمن نے داخلی دروازہ بند کر دیا تھا۔

ہال وے کافی بڑا تھا۔ دیوار سے مختلف قد آدم تصاویر لٹک رہی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ شیشے کا سلائڈنگ ڈور تھا۔ کمرے میں بہت مدھم روشنی تھی۔ ایسے میں کمزور نگاہوں والی موڈی ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ دو چار قدم آگے بڑھی۔ جیسمن نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اس نے بڑے پیار سے اسے اپنے سے دور کر دیا۔ ''اب اتنی بھی بوڑھی نہیں کہ چل پھر نہ سکوں۔'' اس کا لہجہ دوستانہ تھا۔

''چلو...... کچن میں چل کر کافی بناتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی کچن کی طرف بڑھی۔ وہاں زیادہ تر اسٹیل یا المونیم کا کام کیا گیا تھا۔ ریک اور الماریاں، سب اسی سے بنی ہوئی تھیں۔ صفائی بہت اچھی طرح رکھی گئی تھی۔ یہاں پر ایک کھڑکی تھی، جو عقبی حصے میں کھلتی تھی۔ ساتھ ہی شیشے کا ایک دروازہ تھا جو عقبی ٹیرس پر کھلتا تھا۔ جیسمن کافی بنانے کے ساتھ ساتھ اس سے باتیں بھی کیے جا رہی تھی۔ موڈی چوکنی تھی۔ وہ جیسمن کی پہنچ سے خود کو قدرے فاصلے پر رکھے ہوئے تھی۔ اس کے دماغ میں شک کے بگولے اُڑ رہے تھے۔

''میں گرمیوں میں کچن اور سردیوں میں ہمیشہ ٹیرس پر ناشتا کرتی ہوں۔'' جیسمن نے کہنا شروع کیا۔ ''ویسے یہ چولھا بہت شاندار ہے۔'' اس نے کیتلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''اتنی جلدی کھانا پک جاتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔'' وہ اچھی خاتونِ خانہ کی طرح ہمسائی پر اپنے گھر اور اس کی دوسری چیزوں کی خوبیاں گنوائے جا رہی تھی۔

موڈی کو چولھے کی خوبیوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اول تو مقامی اسٹور سے تیار کھانا خرید کر فریز کر دیتی اور جب ضرورت ہوتی اوون میں گرم کر لیتی تھی۔ کبھی کبھار کچھ پکانے کی ضرورت پڑتی تو وقت بچانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ چائے یا کافی بنانے کے لیے چولھا ٹھیک ٹھاک کام کرتا تھا۔ دوسری بات اس کے بھولنے کی عادت تھی، جس کی وجہ سے وہ چولھا جلانے سے گریز کرنے لگی تھی۔ کئی دفعہ ایسا

ہو چکا تھا کہ چولھا بند کرنا بھول گئی۔ ایک دفعہ تو اس نے انڈا فرائی کرنے کے بعد جلتے چولھے پر گھی والا فرائی پین رکھا چھوڑ دیا تھا، جس سے آگ بھڑک گئی تھی۔ تب سے وہ پکانے سے اجتناب کرنے لگی تھی۔

جیسمن بدستور اسی طرح کی عام باتیں کیے جا رہی تھی۔ موڈی نے عدم دلچسپی کے باوجود اسے ٹوکنے سے گریز کیا۔ کافی دیر بعد اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس پر مرکوز کرتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ ''ویسے کافی سلیقے سے گھر رکھا ہوا ہے تم نے۔''

''میرا کچن خوبصورت ہے نا۔'' جیسمن نے گرمجوشی سے کہا۔ ''بڑی آسانی سے صاف بھی ہو جاتا ہے۔'' اس نے چولھے پر چڑھی کیتلی اتاری۔

موڈی مسکرا کر رہ گئی۔ ''چلو...... ذرا اپنا باتھ روم تو دکھاؤ۔''

''آؤ......'' وہ فوراً آگے بڑھی۔ اس کے پیچھے پیچھے موڈی بھی ہال وے سے ہوتے ہوئے بیڈ روم کی طرف بڑھی۔

''دیکھو......'' یہ کہتے ہوئے جیسمن نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ موڈی پیچھے پیچھے تھی۔

باتھ روم بہت بڑا اور شاندار تھا۔ پورے باتھ روم میں سفید اور سیاہ رنگ کی چوکور ٹائلز لگی تھیں بالکل شطرنج کے چار خانوں جیسی۔ واش بیسن کے اوپر ایک بڑا سا آئینہ لگا تھا، جس کا فریم لوہے کا تھا اور اس پر سونے سے مشابہ رنگ کیا گیا تھا۔ چاروں طرف اس پر پھولوں کی سنہری بیل تراشی گئی تھی۔ ایک کونے میں سفید رنگ کا کنگ سائز باتھ ٹب تھا۔

''ہے نا شاندار......'' اس نے گرمجوشی سے کہا۔ وہ تعریف سننے کی خواہش مند تھی۔

''ہاں، ہاں......'' موڈی نے آہستہ سے کہا۔ وہ ایسا ظاہر کر رہی تھی جیسے یہ سب کچھ دیکھ کر بہت متاثر ہوئی ہو۔

باتھ روم سے نکل کر وہ بیڈ روم میں آ گئے۔ موڈی کو یہ کچھ خاص متاثر کن نہ لگا۔ پورا کمرا چمک دار سفید رنگ میں رنگا تھا۔ کمرے کے عین وسط میں بڑا سا بیڈ تھا، جس پر سیاہ رنگ کی بیڈ شیٹ بچھی تھی۔ لیونگ روم بھی لگ بھگ پورا خالی پڑا تھا، ماسوائے ایک کونے میں رکھے کنگ سائز صوفے کے۔ اس کے سامنے بیضوی شکل کی کافی ٹیبل رکھی تھی جو خام لوہے سے بنائی گئی تھی۔ اس پر موٹا سا شیشہ رکھا گیا تھا۔ موڈی کو وہ ٹیبل سے زیادہ کسی بھونڈے آرٹسٹ کا بنایا ہوا بدشکل فن پارہ زیادہ لگا۔ دیوار پر دو بڑی بڑی پینٹنگز لٹک رہی تھیں۔ ایک میں شراب کی مختلف اشکال کی بوتلوں اور ان کے لیبل کو پینٹ کیا گیا تھا، دوسرے میں بہت سارے مڑے تڑے لوہے کے پائپ ایک دوسرے میں الجھ کر تجریدی نظارہ پیش کر رہے تھے۔

''یہ ہے میرا اسٹوڈیو......'' جیسمن موڈی کو لے کر ایک اور کمرے میں پہنچی۔ ہر جگہ پھیلاوا تھا۔ ''یہاں میں کام کرتی ہوں۔''

موڈی نے چاروں طرف دیکھا۔ پلاسٹر آف پیرس اور سیمنٹ کی ملی جلی بو اس کی ناک سے ٹکرائی۔ ایک طرف قد آدم مجسمہ ادھورا پڑا تھا، اوک سے بنے چمک دار فرش پر جگہ جگہ رنگ کے ڈبے اور اسی طرح کا سامان بکھرا پڑا تھا۔

''اپنے اسٹوڈیو کا نام ٹاڈا رکھا ہے میں نے۔'' جیسمن جوش و خروش سے بولی۔ ''مجھے تو یہ نام بہت پسند ہے، تمہیں کیسا لگا؟''

موڈی نے مسکرا کر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔

کمرے میں ایک بڑا سا مجسمہ خام صورت میں چھت سے بندھی زنجیر کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ وہ کافی وزنی دکھائی دے رہا تھا۔ ''میں اسے پلاسٹر آف پیرس اور وائٹ سیمنٹ کے ساتھ بنا رہی ہوں۔'' موڈی کی اس میں دلچسپی دیکھ کر وہ بولی۔

''اوہ...... اچھا ہے۔'' موڈی نے دو لفظوں میں اس کے فنکارانہ کام کی بظاہر تعریف کی۔

''میں نے اس کا نام رکھا ہے خالی ہاتھ۔''

''اس کی وجہ......؟'' موڈی نے سوالیہ نگاہوں اُس کی طرف دیکھا۔

''دیو قامت مجسمہ ایک دنیا ہے اور اس میں سے نکلتے خالی ہاتھ......'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ مجسمے کے جسم سے انسانی ہاتھوں کے مشابہ بہت سارے ہاتھ بنائے گئے تھے۔ ''اس کا مطلب انسان کی طلب ہے جو کبھی پوری نہیں ہو پاتی۔ حتیٰ کہ جب وہ اس دنیا سے جاتا ہے تب بھی دونوں ہاتھ خالی ہی ہوتے ہیں۔''

جیسمن یوں سمجھا رہی تھی جیسے موڈی آرٹ کی کوئی طالب علم ہو۔ اس کا انداز فنکار سے زیادہ فلسفیانہ تھا۔

جیسمن کی گفتگو سن کر ایک بار پھر موڈی کے دماغ میں بہت سارے سوالات جنم لینے لگے تھے۔ وہ اسے ایک سچی فنکار سمجھنے لگی تھی لیکن اچانک ایک بار پھر اس کی اپنی بقا سب سوچوں پر حاوی ہو گئی۔ اب اس کا ذہن کسی اور طرف سوچ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح ہر شے کو شک کی نظر سے

دیکھے جا رہی تھی۔

''تو تم اسے نیچے کیسے اتارتی ہو یا اسٹول رکھ کر اوپر کام کرتی ہو۔'' موڈی نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی اسٹول نہ تھا۔

''بڑا آسان طریقہ ہے۔'' جیسمن نے چھت کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''پرانی اسٹیشن ویگن کے ایک بڑے ٹائر کی شکل میں لوہے کا بنا ایک پہیہ چھت سے لٹکا ہوا تھا۔ اسی سے مجسمہ بندھا ہوا تھا۔ ''جب مجھے مجسمے کو نیچے لانا ہوتا ہے تو اُس رسی کو ڈھیلی کرنا شروع کرتی ہوں۔ آہستہ آہستہ نیچے اتر آتا ہے۔''

موڈی نے دیوار کی طرف دیکھا۔ سفید رنگ کا ایک موٹا رسّا اس پہیے سے نکل کر چھت میں بنے ہُک سے گزر کر دیوار کی طرف آیا تھا، جسے لوہے کے ایک بڑے سے مضبوط ہُک میں دوسرے ہُک کی مدد سے پھنسا دیا گیا تھا۔ چھت پر، جہاں سے رسّا گزر رہا تھا، وہاں بڑے بڑے دو بیرنگ لگے تھے، جس کی مدد سے بھاری مجسمہ لمحوں میں نیچے اور اوپر کیا جا سکتا تھا۔ جیسمن بظاہر دبلی پتلی تھی لیکن بیرنگ کے سبب وزن کھینچنا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس میں جسمانی قوت سے زیادہ تکنیک کام کرتی تھی۔

موڈی جیسمن کی طرف پلٹی۔ ''بڑی تکنیک استعمال کی ہے۔''

جیسمن اپنی تعریف سن کر مسکرا دی۔

''میں سوچ رہی تھی کہ اتنی اونچائی پر جا کر کیسے کام کرتی ہوگی۔''

''دراصل اس طرح مجھے فرش پر کافی جگہ مل جاتی ہے، جب 'خالی ہاتھ' پر کام کرتی ہوں تو اسے نیچے اتار لیتی ہوں ورنہ وہ واپس لٹک جاتا ہے۔ ایسے میں مجھے فرش پر اچھی خاصی جگہ مل جاتی ہے، دوسرا کام کرنے کو۔''

موڈی نے اندازہ لگایا کہ فرش سے چھت تک کی بلندی سولہ فٹ ہوگی۔ اپارٹمنٹ کے تمام فلیٹوں میں فرش سے چھت تک کی اونچائی اتنی ہی تھی۔ ''ایک بات سمجھ نہیں آئی، کیا یہ سارا سیمنٹ ہے۔'' اس نے مجسمے کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں......'' جیسمن نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے دراصل بڑے پہاڑی پتھر کو ٹکڑوں میں کاٹ کر پلاسٹک آف پیرس کی مدد سے پہلے مجسمے کا خاکہ بنایا پھر اسے وائٹ سیمنٹ سے شکل دینا شروع کی۔''

''کب تک تیار ہو جائے گا یہ......''

''بس...... جلد از جلد کرنا ہے، پندرہ اکتوبر کو نمائش کا یہ ماسٹر پیس ہوگا۔'' جیسمن اسے یہ سب کچھ بتاتے ہوئے بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

''واقعی...... یہ گھر تو اب چھوٹا پڑنے لگا ہوگا۔'' موڈی نے بہت سوچ سمجھ کر یہ جملہ کہا تھا۔

''بالکل ٹھیک سمجھی ہو۔'' جیسمن مسکرائی۔ ''اب مجھے بہت جلد بڑی جگہ حاصل کرنا ہوگی۔''

یہ سنتے ہی موڈی کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

''کہیں دیکھا ہے کوئی اور......'' اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''ہاں......کوشش کر رہی ہوں۔''

موڈی کا دماغ بھک کر کے اُڑ گیا۔ کچھ دیر تک بظاہر وہ خاموشی سے مجسمے کے تلوے اور پنجوں کو دیکھتی رہی۔

جیسمن بھی خاموشی سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے مجسمے میں موڈی کی دلچسپی اور انہماک دیکھ کر اچھا لگ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد موڈی چند قدم پیچھے ہٹ کر دیوار کی طرف الٹے قدموں بڑھی۔ ''یہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' موڈی نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

''کیا......'' جیسمن نے اس سمت دیکھنے کی کوشش کی۔

''یہ......اِس طرف......'' موڈی ایک قدم اور الٹے پاؤں پیچھے ہٹی۔

اب جیسمن مجسمے کے بہت قریب تھی اور موڈی دیوار کی طرف ہو چکی تھی۔ وہ غور سے اس طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی، جہاں موڈی نے اشارہ کیا تھا۔

''ذرا غور سے اس کے پاؤں کی انگلیوں کی طرف سے دیکھتے ہوئے گھٹنے تک نظر لے جاؤ۔'' موڈی نے بھرپور نگاہوں سے جیسمن اور مجسمے کے زاویے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے وہاں......'' جیسمن پورے انہماک سے دیکھے جا رہی تھی۔

اچانک موڈی نے مجسمے کو تھامے رکھنے والے رسّے کو ہُک سے علیحدہ کیا۔ اس نے اتنی پھرتی سے یہ سب کیا کہ جیسمن کو اس کی طرف دیکھنے یا سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مجسمہ نہایت تیزی سے نیچے آیا اور تیز آواز کے ساتھ گرا۔ جیسمن اس کے دھکے سے نہ صرف نیچے گری بلکہ اس وزنی مجسمے نے اس کے سر پر بری طرح چوٹ لگا دی۔ وہ بے حس و حرکت فرش پہ پڑی تھی۔ اس کے سر سے خون بھل بھل کر کے بہہ رہا تھا۔ موڈی آگے بڑھی اور چھڑی کے سہارے جھک کر جائزہ لیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اس کی آنکھیں اوپر چڑھ چکی تھیں۔ چہرہ لہولہان ہورہا تھا۔

موڈی تیزی سے آگے بڑھی۔ اس نے گھر میں داخل ہونے کے بعد سے بہت احتیاط برتی تھی۔ کسی شے کو اپنے ہاتھوں سے نہیں چھوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پورے اپارٹمنٹ میں کہیں بھی اس کی انگلیوں کے نشانات نہیں ہوں گے۔ وہ باہر کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھی۔ اپنے سوئٹر کی لمبی آستین کو کھینچ کو ہاتھوں تک کیا اور بھاری دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔ پُرشور طوفانی ہوا ئیں چل رہی تھیں۔ بادل کڑک رہے تھے۔ وہ مطمئن تھی کہ بھاری مجسمہ گرنے سے پیدا ہونے والی آواز اس شور میں دب گئی ہوگی۔

باہر کوئی نہ تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلی۔ دروازہ کھینچا تو اسے ہلکی سی کلک سنائی دی۔ دروازہ لاک ہو چکا تھا۔ وہ اندھیرے میں چھپتی چھپاتی ڈسٹ بن کے قریب سے ہوتی ہوئی اپنے اپارٹمنٹ کو جانے والی سیڑھوں کی طرف بڑھنے لگی۔ جس طرح اسے کسی نے جیسمن کے اپارٹمنٹ میں جاتے نہیں دیکھا تھا، اسی طرح وہ بنا کسی اور کے دیکھے واپس اپنے گھر میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے سوا آٹھ بج رہے تھے۔

اس نے چولھا جلایا، کافی بنائی اور آرام چیئر پر بیٹھ کر اپنے نروس زدہ اعصاب بحال کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

اس رات موڈی کو نیند بہت دیر سے آئی لیکن وہ خود کو یقین دلاتی رہی کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اب اسے آخری سانس تک کوئی بھی اس اپارٹمنٹ سے باہر نہیں نکال سکے گا۔ موڈی کی عمر اٹھاسی برس تھی، وہ اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی، یہیں اپنے والدین اور بہن کی طرح زندگی کی آخری سانس اپنے بستر پر لینا چاہتی تھی لیکن جیسمن نے اسے دہلا دیا تھا۔ ''اب فکر کی کوئی بات نہیں، خطرہ ٹل چکا ہے۔'' اس نے خود کلامی کی اور کروٹ بدل لی۔

دوسرے دن صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ موڈی آرام چیئر پر بیٹھی تھی، نظریں کھڑکی پر لگی تھیں۔ اسے کسی بات کا انتظار تھا۔ اچانک اس کے کانوں میں پولیس کار اور ایمبولینس سائرن کی آواز پڑی۔ وہ اٹھی اور پردہ تھام کر کھڑکی کے ایک کونے سے نیچے کی طرف جھانکا۔ دو پولیس کار اور ان کے ساتھ ایک ایمبولینس پہنچے، عین جیسمن کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر آکر رک رہی تھیں۔

کچھ دیر میں پولیس والے اور طبی عملہ اندر جارہا تھا۔ موڈی کا دل دہلے جارہا تھا۔ تقریباً آدھا گھنٹے بعد طبی عملہ اسٹریچر لیے باہر آیا۔ لیٹے شخص پر سر سے پاؤں تک سفید چادر پڑی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ جیسمن اب دنیا سے جا چکی ہے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس والے بھی چلے گئے۔

موڈی واپس آرام کرسی کی طرف پلٹی۔ جیسمن کی وجہ سے مدتوں بعد اس کے گھر کا سناٹا دور ہوا تھا۔ اُس کے چلے جانے کا سوچ کر اُسے کچھ دکھ محسوس ہوا لیکن اگلے ہی لمحے وہ نہایت سفاکی سے مسکرائی۔ ''اب مجھے کوئی اس گھر سے نہیں نکال سکتا۔'' وہ خود کلامی کر رہی تھی۔

دوسرے دن کے اخبارات میں جیسمن کی موت کا تذکرہ تھا۔ پولیس نے اسے 'حادثہ' قرار دے دیا تھا۔ موڈی کے لیے یہ خبر اہم نہ تھی۔ اس نے دوسری خبروں پر نظر ڈالی۔ جیسمن کے بارے میں مقامی آرٹ گیلری کے مالک کا بیان تھا۔ موڈی جیسے جیسے خبر پڑھتی گئی، اُس کے چہرے کا رنگ بدلتا چلا گیا۔

''جیسمن نے آرٹ گیلری کا عقبی ہال خرید لیا تھا اور وہ بہت جلد اُسے اسٹوڈیو بنانے والی تھی۔'' گیلری مالک آئزن اسمتھ کا مزید کہنا تھا کہ ''جیسمن اپنے اپارٹمنٹ کو صرف گھر کے طور پر ہی رکھنا چاہتی تھی۔ وہ کام اور گھر، دونوں کو الگ الگ کر کے بطور آرٹسٹ اور خاتونِ خانہ کی زندگی بسر کرنے کی خواہش مند تھی۔''

یہ پڑھتے ہی اس کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ کر نیچے گرا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ جیسمن کے حوالے سے جسے وہ اپنی 'غلطیاں' قرار دیتی تھی، سب اسے اپنی بدترین حماقتیں محسوس ہورہی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ سکتے کی کیفیت میں رہی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا۔ کنپٹیوں پر خون کا بڑھتا دباؤ محسوس ہورہا تھا۔ اچانک اسے دل میں درد کی ایک لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو سنبھالتی درد کی ایک اور تیز لہر آئی۔ وہ دل تھامے ہوئے کرسی پر ڈھ گئی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہورہی تھیں۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ رہی تھیں۔ اس کے لبوں پہ ہلکی سے مسکراہٹ تھی۔ دھندلاتے منظر میں موڈی کو سامنے کھڑی جیسمن صاف نظر آرہی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔

ستر برس کے قبضے کے بعد موڈی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپارٹمنٹ چھوڑ کر جانے والی تھی۔ قانونی معاہدہ غیر موثر ہونے کا وقت قریب آگیا تھا۔

آوارہ گرد

قسط:34

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ
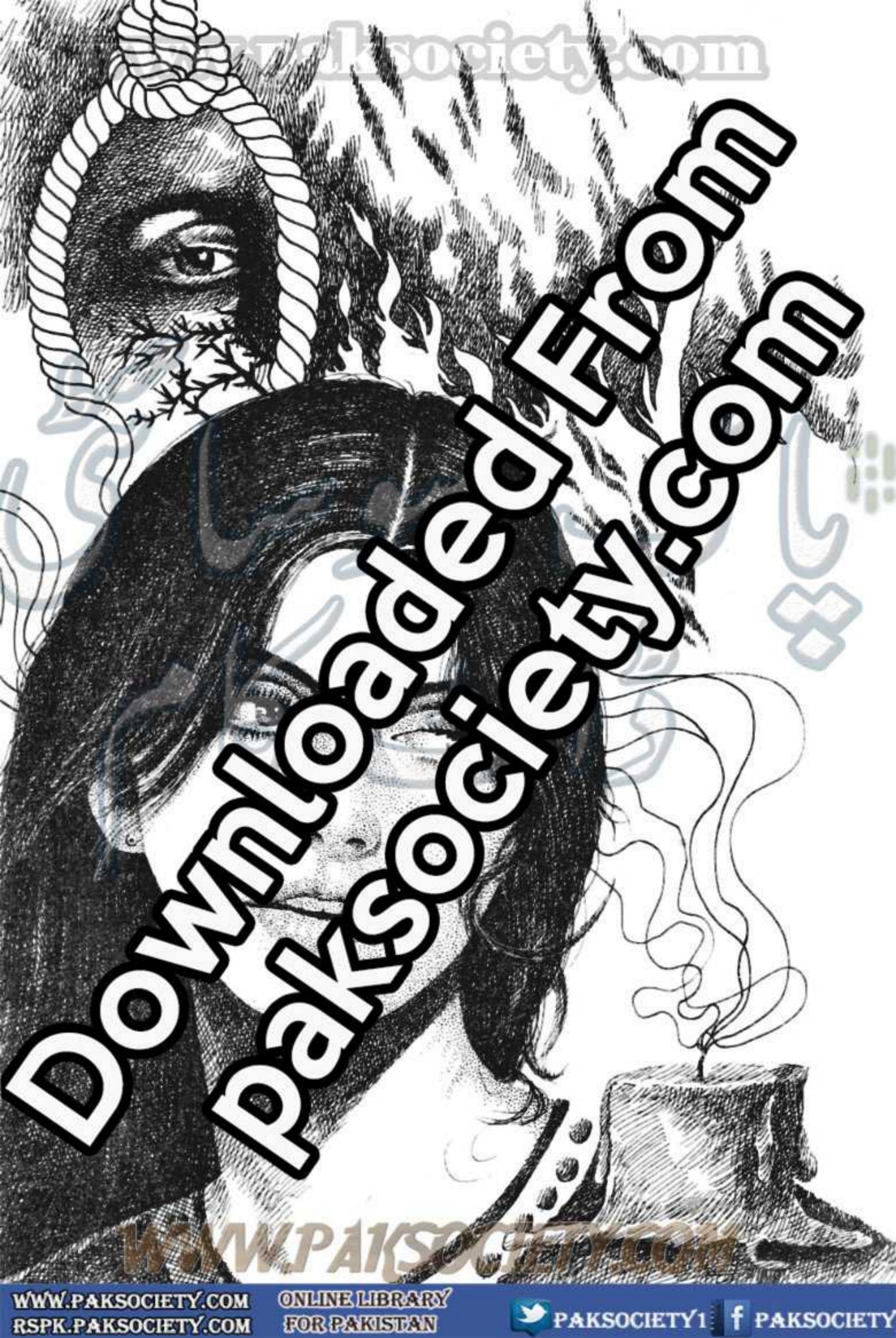
شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو ان کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو مصلحتاً ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید ساپنچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھنگری سے ہوتی ہے جو بھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹکسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ وہاں سے فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے

بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پر فریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ گوہارا اور چندرناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھگوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تمسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھگوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھگوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کپیل داوا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھگوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھگوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھگوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ ناناشکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کورنیلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کورنیلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد تولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے۔ پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کپیل داوا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس خبیث کی آواز مجھے اپنی کنپٹی پر گولی کی طرح لگی تھی۔

میں ایسی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا کہ ٹوپی ہٹانے سے وہ مجھے پہچان نہیں پائے گا۔ یہ تو میں نے فوری طور پر کسی کی نظروں میں نہ آنے اور ممکنہ حد تک بچتے اور اپنی مہم کو تھوڑا آگے بڑھانے کے لیے کر جھکا رکھی تھی۔ یہی نہیں میرے پاس دیال داس سے حاصل کیے ہوئے شناختی کاغذات بھی تھے۔

دیال داس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک بین الاقوامی این جی او "سروائیول انٹرنیشنل" سے تعلق رکھتا ہے، وغیرہ۔ مگر میں نے اس کی اس بکواس پر بالکل بھی اعتبار نہیں کیا تھا۔

رتن لال اور اس کے ساتھیوں کو اپنی پڑی ہوئی تھی اور اسی لیے وہ اب تک مجھ پر کوئی خاص توجہ نہیں دے پائے تھے پھر میں نے اس ہوشیاری اور موقع محل کے مطابق دیال داس کا روپ بھر رکھا تھا۔

اس کے باوصف میں نے اپنے چہرے پر خراشیں بھی ڈال رکھی تھیں لیکن مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا اور اب شاید وہی وقت آچکا تھا۔

ایسے ہی وقت میں میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا، میرے پاس تاخیر کرنے کے لیے ایک پل کا بھی وقت نہ تھا، ورنہ یہ خبیث مزید شبہے میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ میں نے دانستہ بوکھلانے کی اداکاری کی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی ٹوپی

کی طرف ہاتھ ابھی بڑھایا ہی تھا کہ اچانک کسی نے آگے بڑھ کر بلراج سنگھ کی ٹانگیں پکڑ لیں اور گڑگڑانے لگا۔

میری آنکھیں پھیل گئیں۔ یہ کوڑھی کا بھیس بھرے ہوئے کبیل دادا کی حرکت تھی۔ میں اسے جاں نثارانہ حرکت ہی کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ بلراج جیسے سفاک انسان سے اس بات کی پوری توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ جو ''چھوٹے سرکار'' کی صورت میں یہاں کا ''اَن داتا'' بنا ہوا تھا، وہ کسی کو بھی بے دریغ گولی مار دینے کا مجاز تھا۔

''ہم...... ہم...... ہم...... ہم...... موں موں...... ہوہو......''

کبیل دادا کسی گونگے کی طرح اپنے منہ سے بے ربط آوازیں نکال رہا تھا اور اس نے بلراج کی ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں۔

اگر وہ مجھے بچانے کے لیے ایسا کر رہا تھا تو یہ اس کی چال بازی کی بہترین اداکاری تھی مگر اس میں اس کی جان کو بھی خطرہ تھا۔

بلراج سنگھ کی میری طرف سے توجہ ہٹی اور پھر اس نے کبیل دادا کو انتہائی حقارت سے اپنے ایک پاؤں کی ٹھوکر ماری۔ کبیل دادا اسی طرح کی بے ربط آوازیں نکالتا ہوا دور جا پڑا۔

بلراج سنگھ کے ہاتھ میں ہنوز پستول دبا ہوا تھا۔ اسی وقت کچھ دیگر قبائلی کبیل دادا کو کھینچ کر دور لے گئے کہ کہیں وہ اسے بھی اس الم نصیب عورت کی طرح گولی نہ مار دے۔

میرا دل بے اختیار مچل اُٹھا تھا کہ میں کبیل دادا کے پاس جا کر اس کے گلے لگ جاؤں...... تاہم تسلی تھی کہ میرے محبوب ساتھی زندہ تو تھے۔ اب یہی تسلی انہیں بھی کبیل دادا کی صورت ملنے والی تھی کہ میں بھی زندہ سلامت یہاں پہنچ چکا تھا۔

''چھوٹے سرکار......! ہمیں بھولا ناتھ کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ یہ ہمارے لیے مشکلیں کھڑی کرسکتا ہے، دشمنوں کے بہت سے گروپ یہاں قدم جمانے لگے ہیں۔'' رتن لال نے کہا۔

بلراج سنگھ اس کی طرف متوجہ ہوا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''تم نے اب تک بھاڑ ہی جھونکی ہے، ایک بھی دشمن کو تم پکڑ نہیں سکے ہو اب تک...... میں یہاں کے معاملات دیکھوں یا تمہارے جیسے نکمے انسان کے ساتھ جنگلوں کی خاک چھانتا پھروں...... جی تو چاہتا ہے تمہیں اِدھر ہی گولی مار دوں...... دفع ہو جاؤ میری نظروں سے......''

وہ بکتا جھکتا ہوا اپنے ساتھیوں سمیت اسی طرف کو بڑھ گیا جہاں سے نمودار ہوا تھا۔

اس خبیث کو جاتے دیکھ کر بے اختیار میرے سینے کے پنجر میں اٹکی ہوئی سانس کسی بے چین پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر آزاد ہوئی تھی۔ کبیل دادا اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بلراج سنگھ کا دھیان میری طرف سے ہٹانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

''چلو اوئے...... تم لوگ کیا میرا منہ تک رہے ہو...... اپنی چھولداری کی طرف چلو۔'' معاً رتن لال نے کہا اور ہم سب جیپ میں سوار ہوگئے۔

اس دوران میں نے کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا... جہاں کبیل دادا کو اس کے دیگر قبائلی ساتھی لیے ایک طرف کو ہٹ گئے تھے۔ میں نے دیکھا کبیل دادا مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا، فرطِ محبت اور عقیدت سے میرا جی بھر آیا تھا، میں نے بھی جیپ میں سوار ہوتے وقت اس کی طرف ٹوپی جھاڑنے کے انداز میں اپنا ہاتھ ہلا کر جوابی اشارہ کردیا۔

کبیل دادا میرے لیے لائقِ احترام تھا۔ وہ میرا نہیں، میرے مرحوم بھائی لئیق شاہ کا جاں نثار ساتھی رہ چکا تھا اور کئی مواقع پر وہ اپنی جان پر بھی کھیل کر اس کے کام آتا رہا تھا اور اب میرے بھی کام آرہا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کس طرح ان کی قید سے رہا ہو کر ان جنگلیوں کے ساتھ گھل مل گیا تھا، تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے بڑی ہوشیاری سے یہ سب کیا ہوگا اور اب بھی وہ اپنے باقی دونوں ساتھیوں کو آزاد کرانے کے لیے کسی خفیہ منصوبے یا مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔ مجھے دیکھ کر یقیناً اس کی ہمت بھی بڑھی ہوگی۔ تاہم تقدیر ساتھ دے رہی تھی تو ہمیں بھی محتاط ہو کر اس سارے خطرناک گورکھ دھندے سے نمٹنا تھا، جس کی کوکھ میں جانے کیا کچھ چھپا ہوا تھا۔

یہ کیا کم تھا کہ ایک طرف کبیل دادا اپنی مہم میں مصروف تھا اور دوسری جانب میں بھی یہاں ان کے ساتھیوں کے بھیس میں آچکا تھا۔ تاہم کبیل دادا کے مقابلے میں میری یہاں پوزیشن کچھ زیادہ اُمید افزا نہیں ہوسکتی تھی۔

ایک ماتحت کی حیثیت سے میرا بلراج سنگھ کے ساتھ دوبارہ سامنا بھی ہوسکتا تھا، یہی نہیں اصل دیال داس، اگر زندہ تھا تو وہ بھی لوٹ کر یہاں آسکتا تھا اور میرا بھانڈا پھوڑ سکتا تھا۔ مجھے سخت پچھتاوا ہونے لگا کہ مجھے دیال داس کو ہلاک ہی کر دینا چاہیے تھا مگر میں ان حکم کے غلاموں کی

جان لینے سے احتراز ہی برتنے کی کوشش کیا کرتا تھا مگر جہاں ضروری ہوتا انہیں زندہ بھی نہیں چھوڑتا تھا۔

بہرحال مجھے اب جلد از جلد کوئی اور بہروپ بھر لینا چاہیے تھا، کبیل دادا کا بہروپ نسبتاً مجھ سے زیادہ محفوظ اور بہتر تھا۔

جیپ دھول اُڑاتے راستوں پر آہستہ روی سے چلتی ہوئی ایک بڑی سی چھولداری کے سامنے آن رکی۔ میرے دل کو ہنوز دھڑکا لگا ہوا تھا۔

ان کے ساتھیوں میں دیال داس کا کوئی قریبی ساتھی مجھے "ڈمی" ساتھی کی صورت میں پہچان سکتا تھا۔ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا اور مجھے اس سے پہلے اپنا کوئی اور بندوبست کر لینا چاہیے تھا جس کی سبیل سر دست مجھے سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

جیپ کے رکتے ہی ہم سب کدکڑے مار کر نیچے اُتر آئے۔ جب ہم چھولداری کی طرف بڑھنے لگے تو رتن لال نے ہانک لگا دی۔

"اوئے...... دیالے! تُو اندر کیا گھاس کھانے کا جا رہا ہے؟ جا اپنی ڈیوٹی سنبھال جا کر......"

میں رک گیا تاہم شش و پنج کا بھی شکار ہونے لگا کہ نجانے میری کہاں اور کیا ڈیوٹی تھی؟ اگرچہ چھولداری میں جانے سے میں خود بھی کترا رہا تھا مگر یہاں میرے لیے ایک اور مشکل کھڑی ہو گئی تھی کہ مجھے کہاں جانا تھا؟ جلد ہی یہ مشکل آسان ہو گئی۔ جب رتن لال نے میرے ساتھ ہی ایک اور ساتھی سے بھی یہی کہا اور میں اس کے پیچھے لگ گیا۔

وہ سر جھٹکتا ہوا ایک طرف کو ہو لیا اور میں بھی اس کے ساتھ ہی چل دیا۔ میرے ساتھ چلنے والے ساتھی کو رتن لال نے وجے کے نام سے پکارا تھا۔

"یار وجے! میں تو یہاں کی ڈیوٹیوں سے تنگ آچکا ہوں...... کیا تم خوش ہو؟"

میں نے کسی مقصد کے تحت اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اپنی بات کے ردعمل کے طور پر کن انکھیوں سے اس کے چہرے کی طرف بھی دیکھا تو وہاں مجھے کسی بیزاری کے بجائے حیرت کے آثار نمودار ہوتے دکھائی دیے اور وہ اسی لہجے میں بولا۔ "کیا تم اس شہنشاہی ڈیوٹی سے بیزار ہو گئے ہو؟ کیوں؟"

مجھے اچانک محتاط ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں جنرل کے اپل ایڈوانی یا بلراج سنگھ کے آدمی یا ملازم کس طرح کی زندگی گزار رہے تھے؟ جیسا کہ میں نے ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ایڈوانی گروپ کے زیادہ تر آدمی جو یہاں موجود تھے وہ اُجرتِ خاص پر "ہائر" کیے گئے تھے اور جو اس کے قریبی اور کار پردازِ خاص کہلاتے تھے، جیسے بلراج سنگھ وغیرہ، وہ ان پر حکم چلانے کے لیے مسلط کیے گئے تھے۔

تاہم جنہیں اچھی تنخواہوں پر ہائر کیا گیا تھا انہیں ضرور یہاں اچھی سہولیات بھی میسر تھیں مگر حیرت کی بات تو یہ تھی کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی کے فن سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور ہر طرح کا اسلحہ چلانا بھی جانتے تھے، جس کا ایک ہی مطلب نکلتا تھا کہ یہ لوگ انڈیا ہی کے کسی جرائم پیشہ گروہ سے حاصل کیے گئے ہوں گے۔ یہ کام جنرل ایڈوانی نے بلراج سنگھ کے ذریعے ہی کروایا ہوگا۔

میں نے فوراً ہی بات بناتے ہوئے کہا۔ "کچھ خاص نہیں، بس یار! شہر سے دور ہے یہ جگہ...... جنگل، جانگلی اور بس یہ پسماندہ بستیاں...... کبھی کبھی من گھبراتا ہے یہاں سے...... ورنہ تو ظاہر ہے جنرل صاحب نے یہاں ہماری سہولیات کے لیے کیا کچھ نہیں کر رکھا ہے......"

"ہوں...... میں تمہارے اندر کے خوف سے اچھی طرح واقف ہوں۔" معاً ہی وجے نے اسرار بھرے لہجے میں کہا اور میں اندر سے دھڑک اُٹھا کہ نجانے اس نے میری کون سی چوری پکڑلی تھی۔

"کیا مطلب؟" بے اختیار میں نے پوچھ لیا۔

ہم دونوں چلتے ہوئے سیاہ رنگت والی ٹیکریوں کے قریب آ گئے۔ یہاں مجھے ریت اور مٹی کی قدرے اُونچی اُونچی خودساختہ ڈھیریاں بھی نظر آئیں۔ یہاں کھپریل کی ڈھلوانی چھت والی ایک چھوٹی سی مڑھی تھی۔ ہم اس کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

میری نظریں گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ مڑھی کے قریب ہی مجھے ایک چھوٹا سا تقریباً ایک ہزار واٹ کا جنریٹر رکھا دکھائی دیا۔ اس کے اُوپر ایک چھتری سی بنائی گئی تھی، یہ درحقیقت "سولر پینل" تھا جو دھوپ کی تمازت میں خوب چمک رہا تھا۔ گویا یہاں شمسی توانائی کے استعمال کو بھی ذریعہ بنا رکھا تھا۔

ایک چھوٹا سا مین سوئچ بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اگرچہ یہ جنریٹر پیٹرول پر بھی تھا۔ ایک دو بجلی کی تاریں بھی مجھے مڑھی کی ڈھلوانی چھت کے اُوپر سے اندر جاتی نظر آئیں، ان کا کنکشن اندر ہی کیا گیا تھا۔

اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالا اور اسے سلگاتے ہوئے بولا۔ "تم شاید بھول رہے ہو...... دیال

داس! تم اکثر میرے سامنے اپنے ایک خوف کا اظہار کرتے رہے ہو۔" اس نے ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔ میں اندر سے ایک بار پھر کھٹک سا گیا۔ جانے اس کم بخت دیال داس نے اور کیا کیا اس سے اپنے متعلق کہہ رکھا تھا جواب میرے گلے بھی پڑ سکتا تھا۔ البتہ یہ بات میرے لیے ذرا حوصلہ افزا تھی کہ دیال داس یہاں کا سب سے نیا اور تازہ کار ملازم تھا اور ظاہر ہے کم ہی لوگوں کا دیکھا بھالا بھی ہوگا۔

میں نے اسے بولنے کا موقع دینے کی غرض سے خاموشی اختیار کرلی تھی، تاکہ یہ خود ہی اُگل دے کہ آخر دیال داس نے اس کے سامنے اپنے کس خوف کا اظہار کیا تھا؟

میری خاموشی پر وہ خود ہی ترنگ میں (شاید سگریٹ کے ترنگ میں) ایک اور گہرا کش لگاتے ہوئے بولا۔ "ویسے یار دیالے! تم نے ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا، بعد میں جب میں نے تمہاری اس بات پر غور کیا تو ماں قسم! خود مجھے بھی ایسا لگا تھا کہ ہم ملازم نہیں بلکہ ان جاوا قبائلیوں کی طرح قیدی بن چکے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ رام گوپال اور اجے سنگھ کا بھی یہی خیال ہے کہ ہم جنرل ایڈوانی کے زرخرید نہیں بلکہ اس کے غلام بن چکے ہیں۔ اشوک اور مہترا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب انہوں نے یہاں سے واپس جانے کی بات کی تھی تو وہ غائب کر دیے گئے یا حادثاتی طور پر مارے گئے۔"

"شش......" میں نے فوراً اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے اسے چپ رہنے کا اشارہ دیا۔

اپنی حالات گزیدہ زیرک دماغی اور زود فہمی سے میں پل کے پل سمجھ گیا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہو سکتا تھا، اس کے منہ سے "جاوا قبیلے" کا سن کر ہی مجھے احساس ہو چلا تھا کہ یہاں جو ستم رسیدہ نظر آنے والے قبائلی جنگلی تھے وہ کسی صورت میں بھی کلی متجارین نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ پہلے ہی مجھے ان سے مختلف لگے تھے۔

"دوست! اسی لیے تو میں نے اب تک اپنے اندر کا خوف دبا رکھا ہے، اگر چھوٹے یا بڑے سرکار کے کسی حواری کو اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو سمجھو اپن بھی...... اشوک اور مہترا کی طرح گئے......"

میں نے ہولے سے کہا۔ وجے اب مجھ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا تھا۔ شاید میں نے بھی اس کے دل کی بات چھیڑ دی تھی اور یہ میرے لیے سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ میرا رازدار بن سکتا تھا اور میں چالاکی سے اس کے منہ سے بہت کچھ اُگلوا سکتا تھا۔

"آؤ...... دیالو! ایک چکر ٹیکری کا لگاتے ہیں پھر اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، تم کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔" وہ بولا اور ٹیکری کی طرف چلا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہولیا۔ ٹیکری پر چڑھ کر وجے نے تو گرد و پیش میں بس سرسری سی نگاہ دوڑائی تھی مگر میں نے ذرا غور سے جائزہ لیا تھا۔

تپتا ہوا آگ اُگلتا سورج جیسے عین آسمان کے بیچ ٹکا ہوا تھا۔ میرے سامنے اور دائیں بائیں حدِ نگاہ تک ریگ زار کا میدان سا دکھائی دیتا تھا جہاں کہیں ٹنڈ منڈ درخت اور سوکھے برساتی کھالے نظر آجاتے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں ہماری کیا ڈیوٹی تھی؟

اس کے بعد ہم نیچے اُتر آئے۔ وجے نے پہلے جنریٹر کا تھروٹل کھینچ کر اسے اسٹارٹ کیا پھر میرے ساتھ مڑھی کے اندر داخل ہو گیا۔ مڑھی میں داخل ہوتے ہی مجھے غیر معمولی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ باہر کی تیز چلچلاتی دھوپ اور غضب ناک گرمی جھیلنے کے بعد مڑھی کی ٹھنڈک اور بھی زیادہ خوشگواریت کا احساس دلانے لگی۔

مڑھی زیادہ کشادہ تو نہیں تھی مگر دو افراد کے لیے کافی تھی اور میں یہ دیکھ کر حیران ہی رہ گیا تھا کہ اندر روزمرہ سہولیات کی تقریباً سب ہی اشیا موجود تھیں۔ آرام دہ دو میٹریس جو زمین پر دیواروں کے دائیں بائیں بچھے ہوئے تھے۔ قریب ہی مچھر دانی بھی لپٹی پڑی نظر آئی، ایک چھوٹا فریج، الیکٹرک اسٹوو اور ایئرکنڈیشن کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے چھوٹے سائز کا پلاسٹک باڈی والا روم ایئر کولر بھی دھرا پڑا تھا۔ دو کرسیاں تھیں۔ وجے نے اپنی گن ایک طرف رکھ دی اور کرسی پر تھکے تھکے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یار......! ذرا ٹھنڈی بیئر کی بوتلیں نکال لینا......"

میں نے بھی اپنی گن ایک طرف رکھی اور فریج کی طرف بڑھا۔ اسے کھولا تو اندر مجھے کھانے پینے کی بہت سی اشیا رکھی دکھائی دیں۔ ان ساری چیزوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایڈوانی نے باہر کی دنیا سے رابطہ بھی جوڑے رکھا تھا، یوں بھی یہ علاقہ پورٹ بلیئر سے کتنا دور تھا۔ جبکہ ان کے پاس آمدورفت کے لیے ہیلی کاپٹر سے لے کر گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ رسد و رسل کا انتظام و انصرام ان کے لیے کیا مشکل تھا۔

میرا خود بھی بھوک سے زیادہ پیاس سے بُرا حال تھا۔ فریج میں بیئر کی بوتلوں اور کین کے علاوہ پانی کی بھی بوتلیں

تھیں۔ بیئر ساری الکوحلک تھیں، ان میں ایلومینیم کی چپٹی بوتلیں بھی تھیں، ان میں بھی شراب ہی تھی۔

میں نے اس کے لیے بیئر کاٹن اور اپنے لیے صرف ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لی اور بیئر کاٹن وجے کی طرف بڑھا دیا جبکہ پانی کی بوتل اپنے منہ سے لگاتے ہوئے کرسی پر براجمان ہوگیا۔ اسے ختم کرنے کے بعد میں نے وجے کی طرف دیکھا جو کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ میں نے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑتے ہوئے کسی خیال سے کہا۔

''اب دیکھوناں یار! آخر ہمارے پیارے بھی ہیں، ان سے بھی ملنے کو جی کرتا ہے...... کب تک ہم ان سے دوری برداشت کرتے رہیں گے؟''

اس نے ایک عجیب سی مسکراہٹ سے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر خود ہی اُٹھ کر فریج کی طرف بڑھا۔ اس نے شراب کی ایک چپٹی بوتل نکالی اور دوبارہ کرسی پر آبیٹھا۔ آب خبیثہ کا ایک گھونٹ بھرنے کے بعد وہ اب ایک نئی ترنگ میں بولا۔

''تم نئے ہوناں، اسی لیے تمہیں معلوم نہیں، میرے ساتھ بھی رہتے ہوئے تمہیں بھلا عرصہ ہی کتنا ہوا ہے! بہ مشکل ایک یا دو دن، اس میں بھی تمہاری ڈیوٹی ایک دن کے لیے میرے ساتھ اس پکٹے میں لگی ہے۔ پہلے دن تو رات میں تمہیں دیکھا تھا اور افراتفری میں ایک خطرناک مہم پر جانا پڑا، سچ کہوں تو مجھے تمہاری صورت بھی اچھی طرح یاد نہیں رہی تھی۔'' وہ اپنی کہے جارہا تھا، لگتا تھا جیسے آج وہ اپنے اندر کا کوئی دبا دبا غبار باہر نکالنے کی کوشش چاہ رہا تھا۔

''یا پھر تمہیں انہوں نے بتایا ہی ہوگا کہ مہینے میں ایک بار ہمیں ایک گاڑی لے جاتی اور ہمارے گھر چھوڑ دیتی ہے۔ وہاں صرف تین دنوں کا قیام ہی ممکن ہوتا ہے اور پھر واپسی...... بس! یہی بات مارے ڈالتی ہے کہ چھٹیاں کم دیتے ہیں یہ لوگ......''

''اور اگر کوئی وہاں سے، میرا مطلب ہے اپنے گھر سے واپس ہی نہ آنا چاہے تو......؟'' میں نے کسی خیال پر اُسے اُکسانے کی غرض سے پوچھا تو وہ چٹکی بجا کر بولا۔

''پھر اس کی ہمیشہ کے لیے چھٹی...... اس کا اُوپر کا ٹکٹ کٹ جاتا ہے، یا پھر اس کے گھر والوں کو عذاب ناک موت سے دوچار کردیا جاتا ہے۔''

اس کی بات پر مجھے اچانک سوشیلا کی وہ بات یاد آگئی جب جنرل کے ایل ایڈوانی نے اپنے سفاک اور بے رحم گماشتے بلراج سنگھ کے ذریعے اس کی بڑی بہن اور بچوں اور شوہر کو بڑی بیدردی سے ہلاک کروا دیا تھا۔ جس کا انتقام لینے کے لیے سوشیلا خود یہاں تک آپہنچی تھی، مگر اب اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔

''تم نے صحیح کہا دوست!'' میں نے بھی اسی کے لہجے میں کہا۔ کچھ اس طرح کہ آج ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے رازدار بنے اپنے دلوں کے پھپھولے پھوڑ رہے ہوں۔

''اب دیکھوناں...... بھگوان نہ کرے گھر پہ کوئی بیمار ہوجائے، کسی قسم کی ایمرجنسی ہوجائے تو کیا پتا چلے؟ کون ان بے چاروں کی مدد کو آئے۔ رابطہ بھی تو نہیں کرنے دیتے ہوں گے یہ لوگ؟''

''ہفتے میں صرف ایک بار......'' وہ استہزائیہ ہنسی سے بولا۔ مگر اس کی ہنسی میں چھپا ہوا درد اپنے غالب عنصر کا پتا دیتا تھا۔

وہ شراب پی کر نشے کی ترنگ میں بولے جارہا تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہ اس سے یہ بھی لگے ہاتھوں پوچھ لوں کہ آخر ان لوگوں (جنرل کے ایل ایڈوانی اور بلراج وغیرہ نے) ان لوگوں کو کس بنیاد پر کیسے اور کہاں سے ''ہائر'' کیا ہے؟ نیز ان کا مقصد کیا تھا؟ مگر یہ سوال اسے میری طرف سے چونکا سکتا تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے میں بھی تو دیال داس کی صورت میں ایک ہائر شدہ ملازم تھا۔

مجھے یہ سوال اس سے گھما پھرا کر کرنا تھا کہ اسے مجھ پر کسی قسم کا شبہ بھی نہ ہوتا۔ بے شک وہ نشے کی ترنگ میں تھا، باوجود اس کے میں اپنا (کمیل دادا کا بھی) کھیل بگاڑنا نہیں چاہتا تھا، اسی لیے جلد بازی سے کام لیے بغیر میں ہنسا پھر استفساریہ انداز میں بولا۔

''غلطی ہماری ہے وجے! ہم ان کے ملازم ہی کیوں بنیں، بڑی تنخواہوں کے لالچ نے شاید ہمیں یہاں پھنسا دیا۔'' درمیانے انداز کی بات میں تاریکی کے پھینکے ہوئے میرے اس تیر نے اپنا ہدف ضائع نہیں جانے دیا تھا۔ وہ ہنس کر بولا۔

''ہاں! تم نے ٹھیک کہا دیالے! ہم ہی زیادہ پیسوں کے لالچ میں اس کم بخت بلراج سنگھ کے شکنجے میں پھنس گئے۔ مگر یار! ہم سب مجبور بھی تو تھے۔ ممبئی کی اندھیری گلیوں اور رات کے ویران ٹھٹھرتے فٹ پاتھوں پر راہ چلتوں کو لوٹنے کے علاوہ ہماری اور کیا زندگی تھی، تیسرے درجے کے مجرم ہی تو تھے ہم......''

میں سمجھ گیا اور اسے مزید بولنے پر اکسانے کی غرض کہا۔ ''میں بھی ایسا ہی ایک تیسرے درجے کا اسٹریٹ اسنیچر تھا...... لیکن حیرت کی بات ہے، ان لوگوں نے کیسے ایسے

لوگوں کو چن چن کر لیا کہ ہم ان کے نرغے میں آ گئے؟''

''ہاہا...... ہاہا......'' وہ ہنسا۔ شراب کی چپٹی بوتل اپنے منہ سے لگا کر ایک اور گھونٹ بھرا اور بولا۔ ''یہ کام اس مردود بلراج سنگھ کے انہی حواریوں نے ہی تو کیا تھا۔ وہ آج بھی ہم جیسے لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ عموماً ان کا شکار ایسے ہی اسٹریٹ اسنیچر ہوتے ہیں، جو راہ چلتے ہوؤں کو لوٹنے کے دوران پکڑے جاتے ہیں اور پھر یہ لوگ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ یوں ہم بھی ان کے جال میں پھنس گئے۔''

''حیرت ہے کسی نے یہاں سے، میرا مطلب ہے، ان کے چنگل سے بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کی؟''

''کی ہوگی، بتایا نا ابھی میں نے تجھے، اشوک اور مہترا کے بارے میں......''

''ہاں! مگر یار سچی بات کہوں، تمہیں تو معلوم ہو شاید یہ بات کہ تم پرانے ہو، مگر میں نیا ہوں، آخر ہمیں یہاں لانے کا مقصد کیا ہے ان کا؟ بس! یہی ڈیوٹی کرنا ہے، مورچا سنبھالتے رہنا ہے، بس؟''

میں نے یہ آخری اور اہم سوال جو اپنی جگہ بڑا احساس اور نازک اور خطرناک بھی تھا، اس سے نہایت محتاط انداز میں کر ہی ڈالا اور اپنی دھڑکتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

اس نے اس بار بڑے سکون سے چپٹی بوتل کو اپنے منہ سے لگا کر شراب کا ایک گھونٹ اپنے معدے میں منتقل کیا ایسے میں اسے ایک ٹھسکا بھی لگا اور وہ کھانسنے لگا۔

''آرام سے یار......! پانی دوں؟'' میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور دوبارہ گھونٹ بھرا، پھر بوتل کو اپنے چہرے اور سرخ پڑتی آنکھوں کے سامنے لاتے ہوئے لڑکھڑاتے لہجے میں بولا۔

''یہ سالی بھی بڑی اسٹرانگ ہوتی ہے، بالکل ناراض محبوبہ کی طرح...... ایک دم تیکھی سی...... آہ...... ظالم شراب نے کیا یاد دلا دیا...... سانوری...... کہاں ہوگی اب وہ؟ میرا انتظار کرتے کرتے اس نے بھی کسی اور کی راہ پکڑ لی ہوگی۔''

سانوری شاید اس کی کوئی چیتر قسم کی محبوبہ تھی۔ میں بے چینی سے اس کے اصل جواب دینے کا منتظر رہا۔ درمیان میں محبوبہ کو یاد کر کے وہ شاید میرا سوال ہی بھول گیا۔ مجھے سخت کوفت ہونے لگی۔ میں نے کہا۔

''اچھا چل چھوڑ یار! میرے سوال کا تو جواب دے ناں......؟''

''کون سا سوال؟'' اس نے پھر گھونٹ بھرا۔

''یہی کہ...... آخر ان کا ہمیں یہاں لانے کا اصل مقصد ہے کیا؟ تم پرانے ملازم ہو یہاں کے...... شاید تمہیں پتا ہو، میں تو نیا ہوں، میں ابھی تک نہیں جان سکا۔''

''ہاہا...... ہاہا...... مقصد......'' اس نے پھر ایک بدمست سا قہقہہ لگایا اور میں ڈرا کہ کہیں پھر اس کم بخت شرابی کو ٹھسکا نہ لگ جائے اور میرا سوال پھر اُدھورا رہ جائے۔ شکر تھا کہ اس بار ایسا کچھ نہیں ہوا، وہ بولا۔

''مقصد، کیسا مقصد یار دیالے......؟ یہ تو آج تک ہمیں بھی نہیں پتا چلا۔ جب سے یہاں لائے گئے ہیں، بس یہی ڈیوٹی دیتے آ رہے ہیں، پہرا یا دشمنوں کے ساتھ مارا ماری......''

مجھے اس کا جواب سن کر سخت مایوسی ہوئی اور فوراً مجھے دیال داس کی وہ بات یاد آ گئی جب اس نے میرے ہاتھوں زدوکوب ہوتے وقت بھی یہی بتایا تھا کہ وہ لوگ صرف حکم کے غلام تھے اور انہیں کچھ نہیں پتا تھا۔

پھر دفعتاً ہی میرے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا، کبیل دادا...... ہاں! وہ اگر کسی کوڑھی کا بھیس بھرے ہوئے تھا تو یقیناً اس نے اپنی اب تک کی مہم جوئی کے دوران یہاں ہونے والے ''گھن چکر'' کے بارے میں بہت کچھ پتا چلا لیا ہوگا، لہٰذا اب میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ میں سب سے پہلے کبیل دادا کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اپنے قدم یہاں دشمنوں کے گڑھ میں مضبوطی سے جمالوں اور پھر ان کے درمیان رہتے ہوئے ان کی بیخ کنی کروں، جبکہ کبیل دادا ابھی میرے ساتھ تھا۔ اس کی موجودگی بلاشبہ میرے لیے بڑے حوصلے کی بات تھی۔

چنانچہ اب میری پہلی کوشش یہی تھی کہ جلد از جلد کبیل دادا سے ''بالمشافہ'' رابطے میں آ جاؤں تب ہی ہم کوئی مشترکہ پلاننگ کر پائیں گے۔ کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں ان جاوا قبائلیوں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ اپنی جھونپڑیوں تک ہی محدود تھے۔ یہی سبب تھا کہ میں از خود کبیل دادا سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا، جب ہم رتن لال کے ساتھ جیپ میں بستی میں داخل ہو رہے تھے تو اسی وجے نے ہی ان قبائلیوں میں سے کسی ایک حبشن کو جسے اس نے ''بلیک کوئین'' کا نام دیا تھا، دیکھ کر مجھے ہلکا سا ٹہوکا مارا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ خوب صورت اور تیکھے نقوش والی عورت ان کے ساتھ (وجے اور دیال داس کے ساتھ) ناجائز خفیہ

سمبندھ رکھے ہوئے تھی۔ کچھ سوچ کر میں نے وجے کو دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یار وجے! اُس بلیک کوئین سے دوبارہ ملنے کو جی چاہ رہا ہے۔ تم کیا کہتے ہو؟''

میں نے شاید اس کی دکھتی رگ چھیڑ دی تھی، وہ فوراً چہک کر اور اپنی ایک آنکھ معنی خیز انداز میں میچ کر بولا۔ ''لگتا ہے، تجھ پر بھی اس سیاہ ناگن کے حسن و شباب کا نشہ چڑھ گیا ہے۔ دھیرج...... رات تو ہو لینے دے...... آج چلیں گے اس طرف......''

وہ نشے کی ترنگ میں ہنسنے لگا اور مزید بولا۔ ''یاد ہے، پچھلی بار تو اس کے ساتھ جونک کی طرح چمٹ ہی گیا تھا، میری باری ہی نہیں آنے دے رہا تھا۔ مشکل سے اور زبردستی اندر گھس کر میں نے تجھے اس حسین ناگن سے علیحدہ کیا تھا۔'' اس کی یاوہ گوئی پر میں دانستہ جھینپی جھینپی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

''ہاں یار، وجے! وہ سالی شے ہی ایسی ہے، ایک دم تیز تاڑی کی طرح، چڑھتی ہے تو اُترنے کا نام نہیں لیتی۔ چل ناں یار! سالی کی قربت یاد آرہی ہے۔'' مجبوراً مجھے بھی عامیانہ پن کی سطح پر اُترنا پڑا تو وہ مجھے ایک دم گھورتے ہوئے بولا۔

''کہا ناں...... دیالے! ذرا دھیرج رکھ...... رات کو چلیں گے......''

''کاش! وہ خود ہی ادھر آجائے۔'' اس کے منہ سے کچھ مزید اس قسم کا اُگلوانے کے لیے میں نے کہا تو وہ چونک کر بولا۔

''مروائے گا ہمیں...... یہاں ڈیوٹی کی جگہ پر ہم ایسا کچھ نہیں کر سکتے، رتن لال کے کسی حواری نے دیکھ لیا ناں تو کوڑے پڑ جائیں گے، اس قسائی بلراج سنگھ کے سامنے بھی پیش کیا جا سکتا ہے ہمیں...... میں تو اس مردود کا سامنا کرنے سے بھی گھبراتا ہوں۔''

''ہاں، یار! اس بات کا ڈر تو مجھے بھی ہے۔''

''چنتا نہ کر...... پہلے کی طرح ہی کریں گے۔'' وہ ازراہِ تشفی بولا۔ ''پہلے میں جاؤں گا تُو ادھر ہی رہنا، پکٹے پر۔ اس کے بعد تُو ہو آنا......''

''یار! اس طرح جانے سے مجھے بھی ڈر لگتا ہے، اگر وہاں رتن لال یا کسی قبائلی کی نگاہ ہم پر پڑ گئی تو...... وہ سب جنگلی کہیں غیرت میں آ کر ہم پر ٹوٹ ہی نہ پڑیں......'' ایسی باتیں پوچھ کر در اصل میں اس سے یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ وہاں کے اندرونی معاملات کس نوعیت کے ہو سکتے تھے۔

''ہاہا...... ہاہا......'' اس نے پھر ترنگ میں ایک آزاد منش قہقہہ اُگلا اور بولا۔ ''غیرت اور ان جنگلیوں کو...... کیا بات کرتا ہے یار دیالے! باریہہ...... ہماری مشکل خود ہی آسان کر دیتی ہے۔ بس آم کھانے سے مطلب رکھ...... باقی سردرد اس کے لیے چھوڑ دے۔''

باریہہ...... شاید اسی حبشن عورت، بلیک کوئین کا ہی نام تھا۔ جبکہ ادھر میں کبیل دادا سے ملنے کو بے چین تھا اور باریہہ کے بہانے ہی یہ ممکن ہو سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ میں چونک پڑا۔

''جا یار! کیری آگئی ہے، بھوجن لے آجا کر......''

اس نے کہا اور میں نے قدرے طمانیت کی سانس لی اور مڑھی سے باہر آگیا۔

لگتا ایسا ہی تھا کہ یہ وجے ''سینیارٹی'' کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے دیال داس پر اسی طرح حکم چلایا کرتا تھا۔

باہر ایک کیکڑا ٹائپ جیپ کھڑی تھی۔ جس کے پیچھے بہت بڑا ڈالا نصب تھا۔ اس پر ایک بڑی دیگ رکھی ہوئی تھی اور ایک موٹا سا کالا بھجنگ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے سر کی ٹوپی قدرے جھکائی اور اس طرف بڑھا، وہ تب تک بڑی سی دیگ کا ڈھکن کھول کر اس کے اندر پورا جھک گیا تھا، جب اندر سے برآمد ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی پوٹلی تھی، وہ اس نے میری طرف بڑھا دی۔ اس کے بعد ڈھکن زور سے بجا دیا۔ اس کیکڑا ٹائپ کیری کے ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ دھول اُڑاتی ہوئی اگلے پکٹے کی طرف بڑھ گئی۔ میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچتا ہوا پلٹا اور مڑھی کے اندر آیا تو چونک پڑا۔

وجے کرسی پر لیٹا لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ گود میں اور دوسرا کرسی کے ہتھے سے نیچے جھول رہا تھا اور خالی چپٹی بوتل فرش پر گری پڑی تھی۔

میں نے سر جھٹکا اور کھانے کی پوٹلی ایک طرف رکھ دی۔ نیند مجھے بھی آرہی تھی۔ پوٹلی اُٹھا کر میں نے کھولی تو اس کے اندر اُبلے ہوئے چاول، گوشت اور ایک عجیب سے سیال سے بھری ہوئی ربڑ کی بوتل تھی۔

میں نے سوائے چاولوں کے کسی شے کو ہاتھ نہیں لگایا، وہ زہر مار کرنے کے بعد میں فریج کی طرف بڑھا اس میں فروٹ کے نام پر جو کچھ تھا وہ کھایا اور میٹرس پر آ کر دراز ہو گیا۔

☆☆☆

کسی کے زوردار ٹھوکر مارنے پر میری آنکھ کھلی اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ پھروجے کو دیکھ کر میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ میرے قریب ہی میٹریس پر بیٹھ کر چپڑ چپڑ کھانے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے شاید وہیں بیٹھے بیٹھے ہی میری طرف لات چلائی تھی۔ مجھے اس کا یہ انداز ناگوار لگا مگر میں برداشت کر گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہنسا۔

''کب کی نیند نہیں کی ہوئی ہے تو نے جو اس طرح گدھے گھوڑے بیچ کر بے سدھ پڑا سوتا رہا تھا؟''

وہ اب نشے کی پینگ میں نہیں تھا، اسی لیے مجھے احتیاط کا دامن تھامے رکھنا تھا، اُلسائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سویا تو بہت تھا...... مگر جانے کیا بات ہے...... نیند کچھ زیادہ ہی آگئی۔''

''اچھی بات ہے...... آج رات کو ویسے ہی جاگنا ہے۔'' وہ حسبِ عادت ایک آنکھ میچ کر بولا۔ ''اچھا جا اُوپر ذرا ایک چکر پکٹے کا ہی لگا آ...... میں بھوجن کر کے بلیک کوئین کی طرف جاتا ہوں، میرے لوٹنے کے بعد تُو چلے جانا، سن...... سگریٹ بیڑی دھیان سے پینا اور پکٹے کا پورا خیال رکھنا۔ آج کل حالات خطرناک ہیں......''

میں نے خاموشی سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور اپنی گن اُٹھائی، سگریٹ کی ڈبی اور لائٹر اس نے میری طرف اُچھال دیا۔ میں مڑھی سے باہر آ گیا۔

میری نظروں کے سامنے جیسے ایکا ایکی ایک اسرار بھرا سا خوابناک منظر چھا گیا۔ ہماری مڑھی چونکہ اس پکٹے نما ٹیکری کی ڈھلانی سمت پر واقع تھی، اسی لیے سامنے اور اطراف کا جھکا جھکا سا منظر کسی لینڈ اسکیپ کی طرح میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ رات اپنی تمام تر اسراریت کے ساتھ جگی ہوئی تھی۔ اُوپر کھلے آسمان پر ''سپر مون'' کا منظر دیتا پورا چاند، ایک بڑے سے سنہرے اُرتھ کی طرح نکا دمک رہا تھا، جس کی طلسماتی اور چٹکی ہوئی چاندنی اطراف کے جنگلاتی ماحول کو بیک وقت ایک عجب سی آسیبی اور پُرفریب چادر میں ڈھانپے ہوئے تھی۔ دور کہیں ہلکی سی روشنی کسی جگنو کی طرح چمکتی تو یوں لگتا جیسے جنگل نے اپنی آنکھ تھوڑی دیر کے لیے نیم واہ کی ہو۔ ہر سو گہرے سناٹے کا راج تھا۔

میں نے اُوپر پکٹے کی طرف دیکھا اور پلٹ کر آگے بڑھا۔ ٹیکری کے سرے پر مورچا سا بنا ہوا تھا۔ میں وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ تو میں کبھی کبھار ہی پیا کرتا تھا، ورنہ اس کی مجھے کوئی خاص طلب نہیں ہوتی تھی اور پھر وجے نے بھی مجھے اس سلسلے میں احتیاط برتنے کا کہا تھا اسی لیے میں نے بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ میرا دھیان ابھی تک کمبل دادا اور یہاں کے گورکھ دھندے پر اٹکا ہوا تھا۔

ذرا دیر بعد میں نے وجے کو بھی مڑھی سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا، وہ کسی ہیولے کی طرح ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پہلے وہیں کھڑے کھڑے مجھے ہاتھ کا اشارہ کیا اور جواب میں، میں نے بھی ایسا ہی اشارہ دیا تو وہ آگے بڑھ گیا۔

وہ اسی بلیک کوئین سے ملنے جا رہا تھا۔ میں گردن موڑے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ چند ہی سیکنڈوں میں اس کا ہیولا اسرار بھری تاریکی نے نگل لیا۔ میں گردن موڑ کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں اب سامنے جمی ہوئی تھیں۔ جہاں ریگ زار سا میدان پھیلا ہوا تھا اور وہاں ایستادہ ٹنڈ منڈ سے درخت، چٹکی ہوئی چاندنی میں بڑے پُراسرار سے نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے بدروحیں، اپنی جٹاؤں جیسے سوکھے بالوں والے سر جھکائے اُداس سی کھڑی ہوں...... اور ابھی چیختی چلاتی ہوئی میری طرف لپکیں گی۔ دل میں عجیب سی ہیبت طاری کرتا منظر تھا میری نظروں کے سامنے۔ یہ بستی کا شاید کوئی سرحدی علاقہ تھا۔

اندیشناک اور وسوسہ انگیز لمحوں کی دھمک دیتا ہوا وقت، کسی بھاری سل کی طرح سرک رہا تھا کہ اچانک مجھے کہیں قریب ہی ایک آہٹ کا احساس ہوا۔ میں بے اختیار چونکا اور ایک اندازے سے آواز کی سمت دیکھا۔ آواز میرے عقب سے ابھری تھی۔ میری دھڑکتی نظروں نے مڑھی کی سمت جاتی ڈھلوان کی طرف دیکھا اور یک بیک ہی میرا دھڑکتا دل جیسے رک سا گیا۔ وہ کوئی لمبا تڑنگا شخص تھا اور لنگڑا کر چلتا ہوا ڈھلان سے اُوپر آ رہا تھا۔ ہلکے سے لنگ کے ساتھ وہ تھوڑا جھکا جھکا چل رہا تھا۔

''کمبل دادا......'' میرے ذہن میں ابھرا اور میرا دل کیا روح تک میں سرشاری اُتر آئی، میں وفورِ جذبات تلے اپنی گن وہیں پھینک تیزی سے نیچے ڈھلوان اُترنے لگا، اسی لمحے شاید فرطِ جوش تلے میرا پاؤں رپٹا اور میں منہ کے بل گرتا، لڑھکتا ہوا سیدھا کمبل دادا کے قریب جا گرا۔

''ہولے...... میرے یار......! ہولے......'' کہتے ہوئے اس نے فوراً جھک کر مجھے تھام لیا۔ ہم دونوں ہی گر پڑے۔

اب پتا نہیں جذبات کی شدت تلے ہانپنے لگے تھے یا اور کوئی وجہ تھی، مگر اتنا میں ضرور کہہ سکتا تھا کہ مجھ سے تو کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میں بس یک ٹک اپنے اُوپر جھکے

ہوئے گبیل دادا کا کھردرا اور بردبار سا بھاری چہرہ تکے جا رہا تھا۔ وہی چہرہ جس سے مجھے اپنے بڑے بھائی لئیق شاہ کی خوشبو آتی تھی، وہی چہرہ تھا یہ جس سے ہزار اختلافات اور کئی مواقع پہ دست و گریبان ہونے کے باوجود میرے دل میں آج تک اس کے لیے نفرت کا ایک بیج تک نہیں پڑا تھا۔ دوست تو بے بدل میرا اول خیر بھی تھا، مگر گبیل دادا کی بات اور تھی۔ اول خیر کے انداز میں اگر کھلنڈرا پن تھا تو گبیل دادا کا انداز بردبارانہ تھا۔ اول خیر یار باش تھا تو گبیل دادا کا انداز ناصحانہ ہوتا۔ اول خیر کی شخصیت میں بے باک پن تھا تو گبیل دادا کی شان میں ایک بزرگانہ وقار محسوس ہوتا تھا مجھے۔ اول خیر کی یاری میں، بے نیازی تھی تو گبیل دادا کی دست گیری میں ایک قسم کا احترام محسوس ہوتا تھا مجھے گبیل دادا کی چھاؤں میرے لیے شفیق تھی تو اول خیر کا ساتھ حوصلہ افزا تھا۔

گبیل دادا کی پُرفکر اور یک ٹک نظریں میرے چہرے پر جمی رہ گئی تھیں، جبکہ میری آنکھیں گلے میں اُترنے والی رقت تلے بھیگنے لگی تھیں...... آہ! ایک عرصے بعد کوئی اپنا ملا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے کسی پُرشفیق بزرگ کا تحفظ بھرا سایہ آنصیب ہوا تھا۔ ایک طویل اور اپنے پیاروں سے دوری میں آبلہ پائی کا یہ سفر کٹھن تو تھا ہی، مگر ان کی جدائی میرے لیے اب تک جاں گسل بھی بنی رہی تھی۔ ایک کی قربت پاتے ہی میرے شکستہ و ریختہ وجود کو جیسے نخلِ امید کی ٹھنڈک نے آن لیا ہو۔

”گگ...... گبیل دادا...... ! یار...... ! میں بہت تھک گیا ہوں......“ بہت ٹوٹا، شکستہ اور لرزاں لہجہ تھا میرا۔

”لل...... لیکن یار...... گبیل! میں نے آج تک حالات کے آگے سپر نہیں ڈالی، پر یار...... ! تیرے جیسے پیاروں کی جدائی میرے لیے بڑی اذیت ناک ثابت ہوتی رہی ہے۔“

گبیل دادا نے مجھے تھامے رکھا تھا۔ ہم دونوں ٹیکری کی ڈھلوانی زمین پر گرے پڑے انداز میں بیٹھے تھے اور دونوں ہی اب ایک دوسرے کے ساتھ بغل گیر ہو گئے تھے۔ شفاف چاندنی میں گبیل دادا کا سیاہی رنگت مائل چہرہ دمک رہا تھا۔ رنگ تو اس کا ویسے سانولا ہی تھا مگر شاید قبائلیوں اور کوڑھی کے بھیس میں اس نے اپنی سانولی رنگت کو سیاہ کر رکھا تھا۔ تاہم مجھے وہ خاصا کمزور نظر آیا تھا۔

اس کے چہرے پر بھی ایک آسودہ سی مسکراہٹ دمک رہی تھی۔ وہ میرے سر پر بڑی محبت اور شفقت سے اپنا ایک ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

”شہزی! میرے یار! میرے بھائی! سنبھال خود کو اور حوصلہ کر...... تو بہت ہمت والا انسان ہے، ایسی شکستہ باتیں نہ کر...... تیری جدائی ہمارے لیے بھی کسی تازیانے سے کم نہیں تھی۔ پر تقدیر کے آگے کس کی پیش چلی ہے بھلا۔ شکر ہے کہ ہم ایک بار پھر یکجا ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم سب خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ چل، اُٹھ! کسی محفوظ مقام پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں......“ اس نے کہا اور میں نے ہولے سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ میرے ساتھ ہنوز لنگڑا کر چلنے لگا تو میں نے اس کی ٹانگ کی طرف دیکھا، جہاں لکڑی کی پھٹی نما ایک کھپچی سی بندھی ہوئی تھی۔

”یار گبیل! کیا تو واقعی......؟“ میرے لہجے میں تشویش اُتر آئی تھی۔

”ہاں!“ وہ بولا اور میرے اندر دکھ کی لہر سی اٹھی۔

”کہا ناں...... کہیں بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔ مگر میں کوڑھی نہیں ہوں۔“ میں نے اسے فوراً سہارا دے دیا۔

”ادھر ہی بیٹھ جاتے ہیں...... میرا ایک ساتھی، میرا مطلب ہے ان کا ساتھی، وجے بھی ادھر ہی میرے ساتھ ہوتا ہے، وہ ابھی آ جائے گا، ویسے اتنی جلدی اس کے آنے کی اُمید نہیں ہے۔“

مڑھی سے ذرا ہی فاصلے پر اس کی آڑ لیے ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے کچھ کھانے پینے کو پوچھا۔ مڑھی کے اندر سب کچھ موجود تھا۔ اس نے نفی میں اپنا سر ہلا دیا، مجھے... اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا، بہت سے سوالات تھے، یہاں سے متعلق بھی اور وہاں ”بیگم ولا“ سے متعلق بھی۔

وہ ایک محتاط سی نظر گرد و پیش پر ڈالتے ہوئے بولا۔

”مجھے تیرا انتظار تھا یہاں پہنچنے کا......“

میں اس کی بات پر چونکا۔ ”کیا مطلب؟ تجھے کیسے پتا چلا کہ میں......“

”اس مردود بلراج سنگھ اور اس کے حواریوں کی باتیں سن کر...... وہ بار بار تیرا نام لے کر پریشان ہوتے تھے۔ یہاں تک بھی تذکرہ کیا تھا انہوں نے کہ تم اس منحوس جزیرے میں داخل ہو چکے ہو......“

”اوہو......“ میرے منہ سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ”تو تم نے مجھے پہچان کیسے لیا؟ پھر عین وقت پر تم نے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال کر مجھے بلراج سنگھ کی نظروں میں آنے

سے بھی بچالیا......"

میری بات پر وہ بڑے گہرے دوستانہ لہجے میں مسکرایا اور بولا۔ "ارے یار! میں تو تیرا سایہ بھی دیکھ لوں تو تجھے پہچان لوں...... ویسے میں شش و پنج کا شکار تو تھا، مگر جب تو نے میری طرف دیکھ کر مجھے اشارے کے ساتھ آنکھ ماری تھی اور اپنی ٹوپی اُونچی کی تھی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین آیا تھا۔ پر یار شہزی! شاید بلراج سنگھ بھی تجھے پہچان لے گا، مجھے اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا رہا تھا کہ اس کا اور تیرا آپس میں کئی بار زوردار ٹکراؤ ہوتا رہا ہے۔"

"ہاں! اس کا خدشہ تو مجھے بھی ہے۔ اسی لیے میں اس سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ویسے میں نے انہی کے ایک ساتھی دایال داس کا بہروپ بھر رکھا ہے جو یہاں نیا نیا بھرتی ہوا تھا اور کم ہی لوگوں کا دیکھا بھالا تھا۔ اس کا لباس اور شناختی کاغذات میرے پاس ہیں۔ اس کا ڈیل ڈول اور قد بت مجھ سے ہی ملتا تھا۔ چہرے کی بھی مماثلت ایک حد تک شائبہ دیتی تھی، باقی کی کسر میں نے اپنے چہرے کو تھوڑا زخمی کر کے پوری کر لی۔ لب و لہجہ اس کا عام سا تھا جس کا اندازہ میں نے اس سے باتوں کے دوران کر لیا تھا۔"

میں نے کہا اور پھر اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرف دیکھ کر تفکر آمیز تشویش سے پوچھا۔ "تیری یہ ٹانگ کیسے ٹوٹی؟"

میری بات پر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "بلراج سنگھ نے توڑی تھی۔ اسی وجہ سے تو میں بچ سکا ہوں۔ پھر میں نے ایک کوڑھی معذور کا بہروپ بھر لیا، قبیلے کی ایک مہربان عمر رسیدہ عورت نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا اور اسی نے میرا یہ بہروپ بھرا اور میری ہڈی جوڑ کر اس پر یہ کھپچی باندھ دی، فکر نہ کر، یہ دو ایک روز میں اپنی جگہ آجائے گی...... اس کے بعد میں ان قبائلیوں میں شامل ہو گیا، مگر افسوس ابھی تک مجھے اول خیر اور شکیلہ کو ان کی قید سے چھڑانے کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ پر اب تو بھی آ گیا ہے تو ان کے لیے کچھ کرتے ہیں...... مل کر......"

"یہ بتا کبیل! کیا اس حرام زادے بلراج سنگھ کو معلوم ہے کہ تم تینوں میرے ساتھی ہو؟"

اس نے ذرا دیر کے لیے اپنے ہونٹ بھینچے اور ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔ "پہچان لیتا تو ہم آج زندہ کہاں ہوتے، وہ ہمیں کھڑے کھڑے گولی مار دیتا۔ بس! ہم عام قیدیوں کی طرح ان کی گرفت کا شکار ہو گئے تھے۔ تاہم ہر لمحے یہ خدشہ ایک خطرناک لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح ہمارے سروں پہ معلق رہتا تھا کہ وہ کبھی بھی ہماری حقیقت جان لینے کے بعد ہمیں ختم کر سکتا ہے۔ بہت ظالم اور سفاک آدمی ہے یہ مردود بلراج سنگھ......"

اس کی بات پر میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ پھر بڑی بے چینی سے پوچھا۔ "تم لوگ ان کے ہتھے کیسے چڑھے تھے؟ اگرچہ سی جی بھجوانی کو جہنم واصل کرنے سے پہلے مجھے معلوم ہو چکا تھا اور زہرہ بانو سے بھی میری فون پر بات ہوئی تھی کہ تم تینوں بلیوٹکسی والوں کے ہتھے چڑھ چکے تھے۔"

"ہاں!" وہ ایک نظر گردوپیش میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "تمہارے فون کے بعد ہم سب بے چین ہو گئے تھے۔ تم سے کسی قسم کا رابطہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ تم انڈیا میں ہو ہم تینوں نے پاکستان سے انڈیا روانگی کا مشترکہ پروگرام بنایا تھا مگر ممبئی کے ائرپورٹ پر ہی ہم بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

"وہاں سے ہمیں بلیوٹکسی کے ہیڈکوارٹر پہنچا دیا گیا۔ یہاں بھی ہمیں کچھ ایسی اطلاعات ملتی رہتی تھیں کہ تم نے بلیو ٹکسی اور کرنل سی جی بھجوانی کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اس ڈرپوک اور بزدل بھجوانی نے اس خوف سے کہ کہیں تم ہمیں ان کی گرفت سے چھڑا نہ لو...... ہم تینوں کو اپنے تحفظ کے لیے اور تمہیں جھکانے کے لیے ہی اس نے اپنے قیدیوں کو یعنی ہمیں محفوظ کرنے کی غرض سے اپنے ایک تین رکنی گروپ، جس کی کمانڈ کوریلا نامی ایک ٹاپ ایجنٹ کے سپرد کی گئی تھی، کے ساتھ ہمیں اس منحوس جزیرے انڈمان پہنچا دیا گیا تھا۔

"اس بدبخت سی جی بھجوانی کے ممبئی کے ایک انڈرورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے ساتھ بھی خفیہ دوستانہ تعلقات تھے۔ اس کا وہاں بھی ایک بڑا گروہ سرگرم تھا۔ اسی کی مدد سے ہمیں وہاں پہنچا دیا گیا اور ایک دورافتادہ علاقے میں ہمیں قید کر دیا گیا جہاں بھولا ناتھ کے مخالفین گروہ کے اور بھی بہت سے اہم ساتھی ایک عرصے سے قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہاں ہم پر مستقل نظر رکھنے کے لیے کوریلا نامی اسی ایجنٹ کو بھی مستقل تعینات کر دیا گیا تھا۔ ایک روز کچھ لوگ ان سے کسی بات پر مذاکرات کرنے وہاں آئے۔ بھولا ناتھ کے اس نجی قید خانے کا نام "ڈیول کیج" تھا جس کا انچارج بھی کسی شیطان سے کم نہ تھا۔ اس کا نام...... آلوک شرما تھا۔ قیدیوں کے ساتھ وہ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتا تھا۔ وہاں اسی کا حکم چلتا تھا۔ بھولا ناتھ نے اپنے اس

شیطان صفت گماشتے کو ہر قسم کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی مگر ہمارے سلسلے میں خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں کہ ہم پر ایک تو کڑی نگرانی کی جائے دوسرے یہ کہ ہماری جانوں کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ باقی اس نے ہم پر ناروا سلوک اور ہر قسم کے جسمانی تشدد کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی تاکہ ہم قابو میں رہیں اور یہاں سے فرار ہونے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لائیں۔

میں تمہیں سارا قصہ سناتا ہوں اس طرح شاید تمہیں زیادہ آسانی سے ساری بات سمجھ میں آئے کیونکہ تم بھی کسی حد تک ان حالات سے صرف غائبانہ طور پر واقف ہو...... میری ساری کتھا سننے کے بعد تمہیں بھی اب تک کے یہاں کے حالات کا بہتر طور پر اندازہ ہو سکے گا۔ میں اپنی کہانی ڈیول کیج سے شروع کروں گا۔“

یہ کہتے ہوئے کیبل داو نے چند ثانیے کے لیے توقف کرنے کے بعد اپنے اور اول خیر وغیرہ کے اب تک کے پیش آمدہ حالات کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

☆☆☆

انڈیمان کے اس دور اُفتادہ گوشۂ جزائر میں بنے اس قید خانے ”ڈیول کیج“ پر رات بھی بڑی لرزتی ہوئی اُترتی محسوس ہوتی تھی۔

تقریباً دو ہزار مربع گز کے وسیع و عریض قطعۂ اراضی پر یہ عمارت کنکریٹ کی بنی ہوئی تھی۔ سنگ دلی اور بے حسی اس کے ٹھوس در و دیواروں سے آہوں اور سسکیوں کی صورت ٹپکتی محسوس ہوتی۔

اصل عمارت کے گرد تقریباً نو فٹ اُونچی باؤنڈری وال بنائی گئی تھی جس کے اُوپر خم دار فولادی بریکٹوں کے ساتھ تین رویہ آہنی خاردار باڑھ لگائی گئی تھی۔ اس خوفناک سا تاثر دیتی دیواروں کے اندر وہ مربع عمارت اپنے لوہے کے مین گیٹ سے پیچھے کو سرکی ہوئی محسوس ہوتی تھی، جس کی وجہ سے عمارت کے عقبی حصے کی باؤنڈری وال اور عمارت کی عقبی دیوار کے درمیان صرف تین چار فٹ کا خلا ایک تنگ سی گلیاری کا منظر پیش کرتا تھا، جبکہ دائیں بائیں اسی طرح کا فاصلہ باؤنڈری وال سے قریباً پندرہ سولہ گز کا بنتا تھا جہاں اس شیطانی قید خانے کے عملے کی رہائشی بیرکس بنائی گئی تھیں۔ آلوک شرما بھی ایسی ہی کسی ایک بیرک میں رہتا تھا۔

یہاں ہمہ وقت ایک ٹرک دو جیپیں اور تین چار پرانے ماڈل کی مگر ہیوی بائکس کھڑی رہتی تھیں۔ جبکہ عمارت کے مرکزی دروازے پر جو بادی النظر میں کسی بڑے سے گودام کے ”شٹر ڈاؤن“ دروازے کا منظر پیش کرتا تھا، اس کے اندر تھوڑے فاصلے پر ہی عمارت کے سائز جتنا ہی بڑا سا لوہے کی سلاخوں والا پنجرہ نما قید خانہ تھا اور اس کے اندر بھی لگ بھگ بارہ اسکوائر فٹ کے الگ الگ کمرا نما سلاخ دار قید خانے بنائے گئے تھے جس کے اندر قیدیوں کو ٹھونسا ہوا تھا۔

ان کے سلاخوں والے دروازے بھی الگ الگ سمتوں میں کھلتے تھے، یوں ایک ہی جگہ سب کے اجتماع سے اندر گرمی، گھٹن، ناگوار بدبو اور گندی سیلن ہر وقت رہتی تھی۔ شاید اسی لیے اسے ”ڈیول کیج“ کہا جاتا تھا۔

روشندان بھی بنے ہوئے تھے جہاں سے تازہ ہوا آتی تو تھی مگر وہ ناکافی ہوتی۔ پنجروں سے باہر کی دیواروں پر اُونچائی میں جو روشندان بنے ہوئے تھے، ان میں موٹی موٹی لوہے کی گریلیں نصب تھیں۔ یوں بھی یہ روشندان آدم گزار نہیں تھے۔

ہم تینوں کو بھی ایک ایسے ہی ”کیج“ میں مقید کر رکھا تھا۔ چونکہ ہم تینوں یہاں کے خاص قیدی تھے، اس لیے شکر تھا کہ اس ”پنجرے“ میں صرف ہم تینوں کو ہی رکھا گیا تھا۔ ...... چونکہ باقی دیگر ”پنجرے“ بھی آمنے سامنے ہی تھے اور اس پر مستزاد یہ سب مرد قیدی تھے، جبکہ شکیلہ کی صورت میں عورت قیدی ایک ہی تھی، جس کے باعث ہماری اکثر دوسرے قیدیوں کے ساتھ بدمزگی ہوتی رہتی تھی۔ وہ شکیلہ کو دیکھ کر فحش اشارے کرتے اور نازیبا جملے کستے تھے۔

یہ بات اول خیر کو بُری طرح کھلتی تھی اور وہ آپے سے باہر ہو کر ان کی ماں بہن ایک کرنے لگتا۔ وہ سب اس پر بے ہنگم قہقہے لگایا کرتے تھے اور پنجرے الگ الگ ہونے کی وجہ سے اول خیر بے بسی کے مارے محض اپنے دانت کچکچا کر رہ جاتا تھا۔ میں اسے سمجھاتا کہ کوئی فائدہ نہیں ان حرام زادوں کے منہ لگنے کا خاموشی بہتر ہے۔ پھر شکیلہ بھی اسے سمجھاتی اور وہ خاموش ہو جاتا۔

میں جانتا تھا کہ یہ سب چھٹے ہوئے بدمعاش تھے جو بھولا ناتھ نامی ڈان کے مخالف گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ان قیدیوں کے ذریعے اپنا کوئی مطالبہ منوانے کی کوشش کرتے ہوں گے یا پھر بھاری تاوان کا تقاضا کرتے ہوں گے، بیشتر قیدیوں کو آلوک شرما جیسے جلادنگراں کے ہاتھوں میں نے بیدردی سے مرتے ہوئے بھی دیکھا تھا جنہیں چھوڑنا مقصود ہوتا تھا اُنہیں یہاں سے نکال لیا جاتا تھا۔

آزاد ہونے والے خوش نصیب قیدیوں کی آنکھوں

پر پٹی باندھ دی جاتی تھی، اسی سے یہ بات عیاں ہوتی تھی کہ انہیں اب چھوڑا جا رہا تھا، ہمیں بھی یہاں آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا تھا۔

وہ رات نصف پہر میں تھی۔ ہمیں فرش پر بیٹھنے اور لیٹنے کے لیے گندے سندے گودڑ... نما بستر دیے ہوئے تھے۔

شکیلہ کو میں نے اس کونے پر لٹایا ہوا تھا جو حصہ عمارت کی بیرونی دیوار کی طرف تھا، یعنی اس سمت میں کوئی پنجرہ نہ تھا۔ اول خیر اس سے ذرا پرے لیٹا تھا، میں درمیان میں پڑا تھا۔

دیگر پنجروں کے بیشتر قیدی بے سدھ سوئے ہوئے تھے، ان کے بے ہنگم خراٹے فضا میں گونج رہے تھے۔ ہمیں یہاں لائے ہوئے آج پانچواں روز تھا مگر یہاں آکر تو ہماری ایک ہی دن میں حالت غیر ہونے لگی تھی اور بہ قول اول خیر کے...... ہم بڑے بُرے پھنسے تھے۔

کچھ قیدی جاگ رہے تھے۔ مجھے نیند نہ آئی تو میں بھی اُٹھ کر ایک طرف کونے میں سلاخ دار دروازے کے ساتھ پشت لگائے سیلن زدہ فرش پر بیٹھ گیا۔

میں سخت بے چینی اور پریشانی کا شکار تھا۔ بار بار ایک ہی پچھتاوا میرے دل و دماغ میں گردش کرنے لگتا تھا کہ شہزی کی تلاش میں ہم نے شاید جوش اور جلد بازی سے کام لیا تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ ان دنوں بھارت اور پاکستان کے داخلی و خارجی حالات تناؤ کا شکار تھے، ہمیں محتاط ہو کر بھارت میں داخل ہونا چاہیے تھا، ایسے میں جبکہ بلیو تلسی کا ایک گھاگ ایجنٹ سندرداس سکسینہ بھی پاکستان میں پکڑا جا چکا تھا اور بلیو تلسی کے ساتھ شہزی کی ٹسل بھی چل رہی تھی، ہمیں کم از کم اپنی شناخت چھپا کر آنا چاہیے تھا۔ جبکہ ہم یوں ہی وزٹ ویزے پر منہ اُٹھائے چلے آئے تھے۔ اگرچہ بیگم صاحبہ (زہرہ بانو) کے مشورے کے مطابق ہی ہم بجائے پاکستان کے، دبئی اور عرب امارات کے راستے ہی انڈیا میں داخل ہوئے تھے۔ مگر پہلے شک کی بنا پر اور بعد میں بھارتی خفیہ ایجنسی اور بلیو تلسی کی کڑی نگرانی کی وجہ سے پورے پورے دھر لیے گئے تھے۔ آئے تو ہم شہزی کی مدد کو تھے مگر اب اُلٹا اس کے لیے مصیبت ہی بننے والے تھے۔

رات دبے پاؤں سرک رہی تھی...... قید خانے کی بیشتر بتیاں گل تھیں، کوئی اِکا دُکا جل رہی تھیں۔ میں ژولیدہ سا بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا، کئی بار میں نے یہاں سے فرار کا سوچا تھا مگر بس! صرف سوچ کر ہی رہ گیا تھا۔ ایک تو ہمیں باہر نہیں نکالا جاتا تھا، دوسرے یہ کہ عملے کے لوگ مسلح ہوتے تھے اور بہت اشد ضرورت پڑتی، مثلاً دنگا فساد یا آپس میں لڑنے جھگڑنے والے قیدیوں کو سدھارنا ہوتا تو تب ہی مسلح عملہ اندر داخل ہوتا تھا، وہ بھی اکیلا نہیں، ان کے ساتھ کئی مسلح افراد ہوتے تھے۔

میں ابھی اسی ادھیڑبن میں تھا کہ اچانک کسی نے مجھے ہولے سے پکارا۔ میں نے قدرے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہ ایک قیدی ننکو تھا، ہمیں اس نے یہی نام بتایا تھا۔ وہ میرے بائیں ہاتھ والے پنجرے میں قید تھا۔ اس کے ہمراہ چار قیدی اور بھی تھے۔ وہ سب فرش پر بے سُدھ پڑے سو رہے تھے۔ ننکو سے ہمارے تعلقات اچھے بلکہ دوستانہ تھے۔ باقی زیادہ ہم اس کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ دوستی بھی ہماری بس بات چیت کی حد تک ہی تھی۔ یوں بھی ہم نے کسی سے زیادہ راہ و رسم نہیں رکھی تھی۔ ننکو ذرا تمیز کے دائرے میں رہتا تھا اسی لیے اس سے میں اور کبھی کبھار اول خیر تھوڑی بہت باتیں کر لیا کرتے تھے۔

''کیا ہوا دوست! نیند نہیں آ رہی ہے؟'' اس نے مجھے جاگتے دیکھ کر پوچھا۔ اس کے لہجے میں عجیب قسم کا بوجھل پن محسوس ہوتا تھا مجھے۔ وہ جوان سا مرد تھا۔ قد کا چھوٹا تھا اور صحت و شخصیت بھی بس واجبی سی ہی تھی۔ رنگت خاکستری۔ چہرے پر بائیں جانب کے گال پر ایک چیرے کا نشان اسے تیسرے درجے کے بدمعاشوں کی قطار میں کھڑا کرتا تھا۔ مگر وہ مجھے کیا یہاں موجود کسی بدمعاش کو بھی گینگسٹر نہیں لگتا تھا، بعد میں اس نے میرے اس سوال پر مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے مخالف گروہ کے لیے مخبری کا کام کرتا تھا۔ اُسے پورا یقین تھا کہ وہ اپنے گروہ کے لیے غیر اہم تھا اور بہت جلد اسے بھی ایسے دوسرے غیر اہم قیدیوں کی طرح باہر کہیں لے جا کر ایک دن گولی ماردی جائے گی۔

مگر میرا آج اس سے بھی باتیں کرنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں آج کچھ زیادہ ہی پریشان، بے چین اور قنوطیت کا شکار ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی اسی بے دلی اور بیزاری سے جواب دیا۔

''ہاں یار! بس، نیند ہی نہیں آ رہی آج......''

''ایک اہم خبر ہے میرے پاس...... سنو گے تو پھڑک اُٹھو گے......'' وہ سرگوشی میں رازداری سے بولا۔ میں متاثر ہوئے بغیر بولا۔

''کیا ہمیں آزاد کیا جانے والا ہے؟''

''ایسی تو فی الحال کوئی بات نہیں۔'' وہ بولا۔ ''لو......

یہ سگریٹ پیو، پھر بتاتا ہوں۔'' اس نے اپنے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ نکال کر میری طرف بڑھائی۔ میں نے کچھ بولے بغیر سر کے خفیف اشارے سے انکار میں سر ہلا دیا۔

''سمجھ گیا......'' وہ سر دھن کر بولا اور اپنی جیب سے پیکٹ نکال کر سلاخوں کے پیچھے سے میری طرف اُچھال دیا۔ پیکٹ میرے سامنے گرا تو میں نے اُٹھالیا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں داب لیا۔ اس نے لائٹر بھی میری طرف پھینکا۔

سگریٹ سلگانے اور ایک گہرا کش لینے کے بعد میں نے خاموش مگر مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ لوگ ہمارا سودا کرنا چاہ رہے ہیں......''

''کیا مطلب؟ کھل کر بات کرو......'' میں نے اب بھی غیر دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے، کیسے عجیب آدمی ہو تم؟ ایک ذرا سا چونکے بھی نہیں...... یا تو تم بہت زیادہ مایوسی اور پریشانی کا شکار ہو یا پھر تمہارا مزاج ہی ایسا ہے۔'' ٹنگو نے جز بز ہو کر میرے بارے میں تبصرہ کیا۔ میرے ہونٹوں پہ بے تاثر سی مسکراہٹ ابھری اور پھر اسی لہجے میں بولا۔

''ہاں! میرا ایسا ہی مزاج ہے، تم آگے بات کرو......''

''ارے بھائی! ہمیں خریدا جا رہا ہے......'' اس نے مجھے چونکانے کی غرض سے گویا انکشاف کیا۔

''اچھا! کون ہے خریدار ہمارا......؟''

''کچھ نا معلوم لوگ......''

''وہ یہاں تک پہنچے کس طرح؟''

''یہی تو کھلبلی مچی ہوئی یہاں......'' وہ بولا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''پہرے دار آپس میں باتیں کر رہے تھے، صرف میں نے ان کی بات سنی تھی، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی...... سب کو بتا دوں تو سارے قیدیوں میں کھلبلی مچ جائے گی، اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا ادھر......'' وہ اپنے لہجے اور بات پر زور دینے کے انداز میں بولا۔ اس بار مجھے اس کی بات نے واقعی تھوڑا چونکنے پر مجبور کر دیا۔

بات واقعی اہم تھی۔ میں بھی تو چاہتا تھا کہ یہاں تھوڑی بہت حرکت ہونی چاہیے۔ تاکہ ہمیں بھی کچھ کرنے کے لیے خاطر خواہ موقع مل سکے۔ جبکہ اس قید میں یکسانیت اور ایک جمود تھا۔

''کیا باتیں کر رہے تھے وہ پہرے دار آپس میں......؟'' میں نے بالآخر اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے سرگوشی میں ہی پوچھا۔ ''تھوڑی تفصیل تو بتاؤ تاکہ کچھ اندازہ لگا سکوں میں؟''

اس پر ٹنگو نے مجھے کچھ مزید باتیں بتائیں جس پر مجھے یہاں کچھ گڑبڑ ہونے کے امکانات نظر آنے لگے، ایسی گڑبڑ جس سے ہم بھی فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ ٹنگو آگے بتانے لگا تو اچانک وہ کہتے کہتے رک گیا کیونکہ اسی وقت میرے بائیں ہاتھ والے پنجرے سے ایک غراتی ہوئی آواز ابھری۔

''یہ کون رات کے اس وقت بک بک کر رہا ہے...... نیند خراب ہو رہی ہے میری۔ منہ بند کرو اپنا......'' میں نے تیز سی نظروں سے اس طرف دیکھا۔

وہاں ایک سلاخ دار دروازے کے قریب ہی وہ مسٹنڈا سا بدمعاش داور لیٹا ہوا تھا۔ سیاہ رنگت اور گنجے سر والا یہ بیل جیسا موٹا تازہ بد ہیئت شخص خود کو یہاں قیدی لیڈر کہلوانے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔ شکیلہ کو یہی بدمعاش سب سے زیادہ تنگ کرتا تھا۔ میں اس کے منہ کم ہی لگتا تھا۔ لگتا بھی تو کیسے، اس کا منہ آزاد تھا اور ہم قید۔ پنجرے بھی الگ الگ تھے، اول خیر تو اس رذیل پر بری طرح اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ دونوں کے درمیان بڑی پکی گالیوں کا تبادلہ بھی ہوتا رہا تھا۔

داور خود کو مخالف گروہ کا نمبر دو کہتا تھا اور خوب اکڑ کر کہتا تھا کہ میرے سرغنہ اسے بھاری تاوان دے کر چھڑا لیں گے اور یہی نہیں وہ اس کی خاطر ان کا ہر مطالبہ بھی مان لیں گے۔

''اچھا بھائی! سوری...... نہیں کرتے باتیں، تم سوتے رہو۔'' میں نے معاملہ فہمی سے کہا تو وہ مزید اکڑ گیا۔ مجھے ایک گندی گالی دیتے ہوئے پُرطیش لہجے میں بولا۔

''سوری کی ماں کی...... اور تیری بھی...... بند کر منہ اپنا اب۔''

مَیں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ہم دونوں ہی الگ الگ پنجروں میں بند تھے۔ ایک جگہ ہوتے تو میں نہ صرف اس کی ساری نمبر دو والی اکڑفوں ناک کے راستے نکال دیتا بلکہ ایسا سبق بھی سکھاتا کہ یہ آئندہ مجھ سے بات تک کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ اسی لیے میں نے اس کتے کا زیادہ منہ کھلوانا پسند نہیں کیا اور اپنے اندر کے اُبال پر قابو پائے چپ ہی رہا۔ پھر بہت ہولے سے ٹنگو سے کہا۔

''اچھا ٹنگو! کل بات کریں گے۔''

اس بے چارہ کان دبائے چپ ہو گیا۔۔۔ وقت

گزرتا رہا اور میں شنگو کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ رات کے کسی آخری پہر میری آنکھ لگی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو شور کا بم چیخ پھیلا ہوا تھا اور کوئی مجھے جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ شکیلہ تھی۔ دیکھا تو اول خیر سلاخوں کے ساتھ اس قدر چپکا ہوا اس بدمعاش داور کے ساتھ منہ ماری اور گالم گلوچ میں لگا ہوا تھا کہ جیسے اس کا بس چلے وہ سلاخوں کے درمیان سے نکل کر داور کی گردن دبوچ لے۔

''تیری تو...... تُو سمجھتا کیا ہے خود کو کالے بیل کی شکل اور ڈھول جیسے پیٹ والے کالے بھارتی سئور......'' یہ اول خیر کے الفاظ تھے۔ اس کی جوابی کارروائی پر داور بھی کسی وحشی سانڈ کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اُتری ہوئی تھی اور اس کے چڑھے ہوئے تیور بتاتے تھے کہ اگر یہ فولادی سلاخیں اس کے راستے میں حائل نہ ہوتیں تو وہ اول خیر کو اُدھیڑ کر رکھ دیتا۔ اِدھر داور بھی بپھرے ہوئے لہجے میں اول خیر سے کہہ رہا تھا۔

''دعا کر ابے...... سالے! (ایک گندی گالی)...... ان سلاخوں کو، جو داور عرف بزو کا راستہ روکے ہوئے ہے، ورنہ تیرا وہ حشر کرتا کہ تیرے اپنے بھی تجھے پہچاننے سے انکار کر دیتے...... تُو نہیں جانتا میں کون ہوں......''

''ابے جا سالے تیسرے درجے کے لونڈے...... بزو کے کی اولاد! تیری دو ٹکے کی اوقات تیری شکل سے ظاہر ہے...... تُو کیا میرا بگاڑے گا۔'' اول خیر نے بھی سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ اُسے جواب کھڑکا دیا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''دادا! اول خیر کو روکو۔'' مجھے خاموش دیکھ کر شکیلہ نے مجھ سے منت کی۔

اسی وقت میں نے دیکھا اس بدذات داور نے انتہائی نازیبا حرکت کی۔ اور ہماری طرف منہ کر کے ہر طرف اپنی غلاظت پھیلا دی۔

اول خیر کی حالت پتلی ہو گئی۔ ہمارے پنجرے میں ہونے والی غلاظت سے ناگواری بُو پھیلنے لگی۔ مجھے اب بجائے داور کے اُلٹا اول خیر پر غصہ آ گیا جواب داور کی اس حرکت پر بے بس سی ہونق نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی غصے سے اپنے دانت پیستے ہوئے آگے بڑھ کر اول خیر کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا، وہ چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ اس کے چہرے پر پہلے حیرت اس کے بعد ندامت کے آثار اُبھرے تھے، اسے شاید اب کہیں جا کر میری بات سمجھ میں آئی تھی۔

''کتنی بار تجھے سمجھایا تھا کہ اس کتے کی اولاد کے منہ مت لگ...... کر دی ناں ہماری جگہ ناپاک......''

''ہاہاہا...... ہاہا......'' داور سمیت سارے قیدی اوباشانہ انداز میں قہقہے لگانے لگے اور جو چند قیدی اس کے پنجرے میں اس کے ساتھ قید تھے وہ شکیلہ کی طرف دیکھ کر بڑے ہی فحش جملے کسنے لگے۔ میں پہلے ہی اس عذاب ناک جیل خانے سے اُکتایا ہوا اور پریشان تھا اُوپر سے یہ مصیبت مجھے ہلکان کر گئی۔ میں سلاخوں سے لگ کر گلا پھاڑ کر چلّانے لگا اور عملے کے آدمیوں کو پکارنے لگا۔

بے بسی اور ذلت کے مارے میں اپنا سر سلاخوں پر بھی مارنے لگا۔ تب ہی اول خیر نے آ کر مجھے سنبھالا اور سہارا دے کر...... ایک طرف کھڑا کر دیا۔

اول خیر جو آج تک کسی کے سامنے نہیں جھکا تھا۔ وہیں کھڑا اس بدذات داور کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''معاف کر دے بھائی! ہمیں معاف کر دے...... تُو جیتا ہم ہارے۔ ہماری وہ سطح نہیں جو تیری ہے۔ اب بس کر دے...... جس کو تُو مانتا ہے اس کی قسم ہے تجھے۔''

داور مکروہ ہنسی ہنستا ہوا ہماری طرف دیکھنے لگا، اس کے ایک چمچے نے اس کی پیٹھ ٹھونک کر اسے ایک سُلگتی ہوئی سگریٹ پیش کی۔

اول خیر میری طرف پلٹا تو میں اس کا ہاتھ جھٹک کر دور جا کھڑا ہوا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ سلاخوں کا سہارا لیے ہوئے تھے۔ اول خیر میرے پیروں پر بیٹھ گیا اور رقت بھرے لہجے میں بولا۔

''دادا...... مجھے معاف کر دے...... تُو نے صحیح کہا تھا کہ یہ ہماری سطح کے نہیں ہیں...... بس! میں اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ اس کمینہ خبیث نے ہمارے لیے بڑے گندے الفاظ استعمال کیے تھے اور...... اور شکیلہ کو...... اس نے ہماری......''

اُس نے اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔ میرا اپنا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ یہ میرے لیے ایسے کٹھن اور عذاب ناک لمحات تھے کہ خود مجھے اپنا آپ ہی نہیں اچھا لگ رہا تھا۔ شکیلہ بھی بے چاری سسکتی ہوئی ہمارے قریب آ گئی تھی۔ وہ خنزیر نسل اب بھی وہیں کھڑا ہمیں حقارت آمیز انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر کی شیطانیت ابھی سوئی نہیں تھی وہ پھر لغو بیانی کرنے لگا۔

''بس...... ! اتنا دم تھا...... ابھی تھوڑی دیر پہلے بڑی ڈینگیں مار رہا تھا، خوب بول رہا تھا، اتنی جلدی تیری بولتی بند ہوگئی۔''

میرے دماغ کی نسیں پھٹنے کے قریب ہونے لگیں تو میں نے دانت بھینچ کر قریب کھڑے اول خیر کی طرف دیکھے بغیر اپنا سر جھکائے جھکائے اس سے کہا۔ ''اول خیر! اس کو چپ کرادے...... ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔''

اول خیر پھر اس کی جانب گھوما تو شکیلہ نے اسے روک دیا اور خود آگے بڑھ کر داور سے لجاجت آمیز انداز میں بولی۔ ''میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں...... بھائی! بس! اب خاموش ہوجاؤ اور گندگی مت پھیلاؤ...... ہم پہلے ہی پریشان ہیں...... تم لوگوں کو تو چھڑانے والے ہیں مگر ہمارا کوئی نہیں سوائے خدا کے۔''

شکیلہ کی داد و فریاد پر اُس خبیث کی آنکھوں میں شیطنت کی چمک ابھر آئی، وہ بولا۔ ''اری شہزادی! یہ بات ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتی ان کنگلوں کو...... تیرے جیسی حسین عورت کو تو میں اپنے دل میں بٹھا کر رکھوں گا۔ آجا...... میرے ساتھ سمبندھ کرلے۔ یہاں سے میرے ساتھ تجھے بھی جلدی مکتی مل جائے گی۔''

''شکیلہ......'' میں نے شکیلہ کو آواز دی۔ اس قدر زور سے کہ میری آواز بھی پھٹ گئی۔ ''ادھر آجا......'' وہ بےچاری روتی ہوئی ایک طرف کو پلٹ گئی۔

اسی وقت عملے کے دو افراد ہاتھوں میں خاردار ہنٹر لیے وہاں آن دھمکے۔ ''کس بات کا شور مچارکھا ہے تم لوگوں نے......؟'' وہ سیدھے ہمارے ہی پنجرے کی طرف بڑھے تھے۔ ایک نے تحکمانہ انداز میں پوچھا تھا، پھر شاید کسی نے ہماری طرف خاموش سا اشارہ کردیا۔ وہ اس طرف آئے تو اول خیر نے آگے بڑھ کر انہیں اصل بات بتا دی۔ میں خاموش مگر اپنی آنکھیں سکیڑے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دونوں رذیل پہرے دار بجائے داور پر گرم ہونے کے اُلٹا اول خیر پر برہم ہونے لگے۔ ایک نے اس سے کرخت لہجے میں کہا۔

''ضرور اس میں تمہارا ہی کوئی قصور ہوگا...... ابھی دیکھتا ہوں میں......'' وہ یہ کہہ کر داور کے پنجرے کی طرف گھوما، جو بڑے آرام سے پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ کندھا لگائے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

''اوئے...... موٹے سانڈ! یہ کیا حرکت ہے؟''

''کیا حرکت ہے؟ میں تو آرام سے کھڑا سگریٹ پی رہا ہوں......'' اس نے بے پروا انداز میں جواب دیا تو دوسرا اکڑ کر اس سے بولا۔

''یہ کہہ رہے ہیں کہ تو نے ان کے ساتھ پھڈا کیا ہے اور ان کے پنجرے میں پیشاب کردیا ہے؟''

''اسی بات پر تو میرا جھگڑا تھا ان سے...... کہ یہاں کرنے کی کیا ضرورت تھی باہر چلے جاتے، اسی پر یہ دونوں مجھ پر گرم ہوگئے۔''

''یہ جھوٹ بول رہا ہے...... یہ گندی حرکت اسی نے کی ہے۔ تم بے شک ان سب سے پوچھ لو......'' اول خیر بولا۔ مگر میں نے دیکھا کسی نے بھی ہمارے حق میں گواہی نہ دی، حتیٰ کہ ٹنگو بھی اپنے کان دبائے ایک طرف لاتعلق سا کھڑا رہا۔ صاف لگتا تھا کہ داور خاصے اثر و رسوخ والا قیدی تھا۔

اول خیر، پہرے داروں سے بحث کرنے کے پورے موڈ میں نظر آرہا تھا مگر وہ اس کی کوئی بات ماننے سے انکاری تھے۔ میں نے اول خیر کو خاموش کرادیا اور ان دونوں پہرے داروں سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''ہم سے غلطی ہوگئی...... آئندہ ایسا نہیں ہوگا...... مگر اب یہاں صفائی تو کروادو۔''

''تمہارے باپ کے نوکر نہیں ہیں ہم، گندگی تم پھیلاؤ اور صاف ہم کریں۔''

وہ دونوں پہرے دار ہمیں غصیلی نظروں سے گھورتے اور سرزنش کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

''چچ چچ چچ چچ......'' ان ہنٹر بردار پہرے داروں کے پلٹتے ہی داور ہماری طرف تاؤ دلانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے ہمارا تمسخر اُڑانے لگا۔

ہماری کوئی پیش و پیش نہیں چل رہی تھی۔ پنجرے میں اس مردود داور کی پھینکی ہوئی غلاظت کی ناگوار بو پھیل گئی تھی جس نے ہم تینوں کو ایک جگہ پر محصور ہونے پر مجبور کرڈالا تھا۔ پہلے ہی یہ قفس نما قیدخانہ زیادہ بڑا نہ تھا اب اس میں بھی ایک کونے پر ہم محدود ہوکر رہ گئے تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے بڑی خونی نظروں سے داور کو گھورا تھا۔ میرے پورے وجود میں اُس رذیل کے لیے نفرت کا ایک طوفان اُنڈا ہوا تھا...... مگر بےبس تھا، ورنہ اگر یہ باہر تو کیا ہمارے ہی قفس خانے میں ہوتا تو میں اس کی بوٹیاں نوچ ڈالتا۔

وہ قہقہے لگانے لگا تو باقی قیدی بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ جبکہ اس کے ''ہم قفس'' اس کی مٹھی چاپی میں بھی لگ

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

گئے تھے۔

بڑی جاں گسل اور عذاب ناک گھڑیاں بتا رہے تھے ہم تینوں اس ذلالت بھرے قید خانے میں...... جہاں ہمیں مفر کی کوئی راہ تک سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ دل و دماغ بری طرح جھلایا ہوا تھا۔ اول خیر سے زیادہ مجھے شکیلہ کی فکر ہوتی تھی۔ وہ عورت ذات تھی اگرچہ ایسی مشکلات کی عادی تھی، لیکن یہ معاملہ ہم تینوں کے لیے ہی مختلف تھا۔ ایک بے بسی سی بے بسی تھی یہاں میری وجہ سے ان دونوں بے چاروں کو کچھ حوصلہ تھا ورنہ تو یہ دونوں بھی کبھی کبھی بے حوصلگی کا شکار ہونے لگتے تھے۔

''واوا! لگتا ہے اس بار بڑے بُرے پھنسے ہیں...... مفر کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی......'' اول خیر ہولے سے مگر پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ جگہ مزید تنگ ہونے کے بعد ہم تینوں ساتھ اور قریب قریب کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے نیچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ اس کی دیکھا دیکھی شکیلہ نے بھی کلس کر کہا۔

''اس سے تو ہزار درجہ بہتر ہوتا کہ ہم اس کمینے سی جی بھجوانی کی قید میں ہی ہوتے...... یہاں تو جیسے واقعی ماضی کے کالے پانی کی خوں رنگ داستان دہرائی جا رہی ہے ہمارے ساتھ......''

میں انہیں حوصلہ دینے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔ اول خیر کسی خیال کے تحت بولا۔ ''ایک بات سمجھ نہیں آتی۔ اگر اپنا شہزی کاکا...... اس رذیل بھجوانی کے ہتھے نہ چڑھ سکا تو پھر ہمارا کیا ہوگا؟ کیا اسی طرح ہم ادھر ہی پڑے رہیں گے، جب تک شہزی کاکا ان کے ہتھے نہیں چڑھ جاتا؟''

''خدا نہ کرے کہ شہزی بھجوانی کے ہتھے چڑھے...... یہ تم کیسے بدفعل اپنے منہ سے نکال رہے ہو اول خیر؟'' شکیلہ نے اسے گھورتے ہوئے بے اختیار کہا۔ ''مرد ہو کر تم ابھی سے اتنے پریشان ہو گئے ہو کہ اب شہزی کے پھنسنے کی دعا کرنے لگے......؟'' اس پر اول خیر نے بھی اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

''بی بی! میں شہزی کے پھنسنے کی بھلا کیوں دعا کروں گا۔ جبکہ مجھے تو خود بھی اس بات کا اندازہ ہے کہ اگر شہزی کو جلد یا بہ دیر اس حقیقت کا علم ہو بھی جائے کہ ہم تینوں بھجوانی کے نرغے میں ہیں تو وہ میرا جی دار یار...... ہماری رہائی کے سلسلے میں فوراً ہی بھجوانی سے اپنے بدلے میں ہماری رہائی کے لیے کوشاں ہو جائے گا۔ رہی بات میرے یہاں پریشان ہونے کی تو اس کی اصل وجہ تم ہو......''

''میں......؟'' شکیلہ کڑے تیوروں سے اس کی طرف گھورنے لگی۔

''اور کیا...... تمہاری ہی وجہ سے ہمیں غیرت میں آ کر بار بار اس خبیث شیطان داور سے منہ ماری کرنا پڑ رہی ہے اور اب اس نے کیا قبیح حرکت کر ڈالی ہے۔ یہ بھی تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

شکیلہ کو بھی اس کا احساس تھا وہ بے چاری اپنا دل مسوس کر رہ گئی اور بھنچی بھنچی سی سسکتی ہوئی آواز میں اتنا ہی کہہ سکی...... ''میرے لیے غیرت میں آنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں......''

میں نے اول خیر کو ڈانٹا۔ ''اول خیر! ایسا مت کہو...... اس میں تمہارا بھی قصور ہے...... تم کیوں بار بار اس کمینے داور کے منہ لگتے ہو؟ کیا یہ غیرت صرف تمہارے ہی اندر ہے، میں نہیں محسوس کر رہا اس بات کو...... مگر جانتا ہوں کہ یہ ایک گٹر ہے، اس میں گند صاف کرنے کے نام پر جتنا ڈنڈا گھماؤ گے اُتنا ہی تعفن اُٹھے گا...... اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔''

پھر میں نے قریب کھڑی دھیرے دھیرے سسکتی ہوئی شکیلہ کے سر پر شفقت بھرے انداز میں اپنا ہاتھ پھیرا...... ''دل چھوٹا مت کرو اپنا...... شکیلہ! سب ٹھیک ہو جائے گا، میں اور اول خیر ہیں ناں تمہارے ساتھ۔''

میری بات پر شکیلہ کو حوصلہ ہوا۔ اس پر اول خیر کو بھی کچھ شرمساری کا احساس ہوا اور اس نے بھی ہولے سے کہا۔ ''او کا کی...... ! مجھے معاف کر دینا، میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا...... بس! تمہارے لیے یہ کمینہ داور گندے گندے جملے بکتا تھا...... اسی لیے میں آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔''

شکیلہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور ہولے سے بولی۔ ''معلوم ہے مجھے تمہارا کہ تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو......''

''شاباش! یہی زندہ دلی قائم رکھو اور میری بات سنو......'' میں نے کہا اور پھر انہیں ہلکی سرگوشی میں ٹنکو والی بات بتا دی۔ شکیلہ کے چہرے پر کچھ اُمید چمکتی نظر آئی مگر میں نے دیکھا کہ اول خیر کچھ زیادہ مطمئن نہ ہوا، بولا۔

''کیا ضروری ہے کہ ہم اس کھوکھلی اُمید پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، یہاں موجود قیدیوں کی جو نوعیت ہے وہ ہم سب ہی جانتے ہیں، ممکن ہے وہ لوگ اپنے کسی قیدی

ساتھیوں کی بات کرنے آئے ہوں......"

"اگر نگو مجھے یہ نہیں بتا تا کہ ان لوگوں کے ساتھ ان کی گرما گرمی بھی ہوئی ہے تو میں بھی پہلے یہی سمجھے ہوئے تھا۔ اُسے یہاں عنقریب کسی بڑی گڑبڑی کی بو آرہی ہے۔"

میں نے کہا تو اول خیر میرا اشارہ بھانپ کر کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے ان دونوں کو پورے ہوش وحواس میں رہنے اور اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے کی تلقین بھی کر دی۔

دوپہر کے کھانے میں پتلی دال اور چاول دیے گئے۔ وہ ہم نے وہیں کھڑے کھڑے ہی زہر مار کیے۔

ہم گندگی سے بچنے کے لیے کب تک کھڑے رہتے...... ایک کونے میں چھوٹی سی جگہ بنا کر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

وقت گزرتا رہا...... مایوسیوں کے اندھیروں میں ایک چھوٹی سی چمکتی اُمید بھی ٹوٹے اور شکستہ انسان کے لیے حوصلے سے کم نہیں ہوتی۔ اسی کے سہارے وقت بیتا چلا گیا۔ رات آئی تو دو سوکھی روٹیاں اور ایک گتے کی پلیٹ میں باسی سا سالن دیا گیا جس میں ایک بوٹی اور آلو کا ٹکڑا تیر رہا تھا۔ اس کے بعد سلور کے ٹیڑھے میڑھے مگوں میں مردار سی چائے دی گئی۔

داور اپنے ساتھیوں کے ساتھ دائرہ بنائے تاش کھیلنے میں مگن تھا اور سگریٹ کے کش بھی لگا رہا تھا، وہ گاہے بہ گاہے ایک تمسخرانہ مسکراہٹ سے ہمارے پنجرے کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ مگر ہم اس خبیث سے نظریں ملانے سے ہی کترا رہے تھے۔

گندگی ہونے کی وجہ سے مچھروں کا زور بڑھنے لگا، یہ ایک نیا عذاب کھڑا ہو گیا تھا ہمارے لیے۔ اب نیند کسے آتی۔

کافی وقت اور سرک گیا...... قیدیوں کی تاش بازی چلتی رہی، ہنسی ٹھٹول بھی ہوتا رہا...... بیشتر قیدی سو گئے تھے، ان کے خراٹوں کی سمع خراش آوازیں گونج رہی تھیں۔ معاً میں چونکا۔

چست لباس میں ملفوف وہ چار افراد پنجروں کے درمیانی خلا میں جگہ بناتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتے، ہماری طرف ہی آرہے تھے۔ انہیں دیکھ کر یک دم میرے اعصاب تن گئے۔ یہ ہمارے شناسا تھے۔

میری یک ٹک سی نظریں انہی پر جم کر رہ گئی تھیں اور میں نے اسی دوران اول خیر کو ہلکے سے ٹھوکا دے دیا۔ وہ

بھی چونکا اور میری نگاہوں کے تعاقب میں اس طرف دیکھا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''اوخیر...... دادا! یہ چنڈال چوکڑی اس وقت کیا کرنے آرہی ہے ہمارے پاس؟ ضرور کوئی خاص وجہ ہے۔''

یہ چاروں ہمارے شناسا تھے، جو بلیو ٹلسی کے وہی ایجنٹ تھے جن کی لیڈر ایک تیز طرار اور سرو قد حسینہ تھی۔ جس کا نام ہمیں کورینلا معلوم ہوا تھا۔ کرنل سی جی بھجوانی نے ہمیں انہی کے سپرد کر کے، یرغمالی بنا کر بھولا ناتھ کے ذریعے ''ڈیول کیج'' جیسے اس منحوس قید خانے میں بھیجا تھا اور درحقیقت ہم انہی کی سپرویژن میں تھے۔ ان چاروں کو بھی اسی جگہ رہائشی کوارٹر دے رکھا تھا۔

وہ سب سے آگے تھی اور باقی اس کے تینوں ساتھی پیچھے چلے آرہے تھے۔ اس کے قریب پہنچنے تک میں نے کورینلا کے چہرے سے ٹپکتی ایک تفکر آمیز پریشانی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ مجھے کچھ ''گڑبڑ'' کا احساس ہونے لگا اور میرا دل یکبارگی تیزی سے دھڑکنے لگا۔

وہ ہمارے ''پنجرے'' کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ کورینلا نے ایک اُچٹتی سی نگاہ ہم تینوں پر پھینکی اور پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''کدھر رہ گئے یہ لوگ......؟''

''میں بُلا لاؤں میڈم؟'' اس کے ایک ساتھی نے مؤدبانہ انداز میں اس سے کہا۔

''جاؤ منوہر! دیکھو ان کو کہاں رہ گئے ہیں یہ لوگ.....'' کورینلا نے اپنے ہونٹ بھینچ کر اسی سے کہا تو اچانک دوسرا ساتھی بولا۔

''لو...... میڈم! وہ آرہے ہیں......''

ان سمیت، بیک وقت میری دھڑکتی ہوئی نظریں بھی اسی جانب اُٹھ گئیں جدھر یہ چاروں دیکھنے لگے تھے، جہاں ڈیول کیج کا جلاد صفت انچارج...... آلوک شرما اپنے دو اسلحہ پوش ساتھیوں کے ساتھ تیز تیز قدموں سے اسی سمت چلا آرہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر بھی کچھ تفکر آمیز پریشانی اور اُلجھن کے آثار دیکھے تھے۔

آلوک شرما۔ پچاس، پچپن برس کی عمر کا ایک ہٹا کٹا شیطان صفت آدمی تھا۔ چہرہ گول تھا اور رنگ سیاہی مائل۔ چہرے پر جابجا گڑھے پڑے ہوئے تھے، جو بھی اس کی چیچک کی بیماری کے چھوڑے ہوئے ہی معلوم ہوتے تھے۔ قدو دراز تھا۔ اس کے موٹے تازے جسم پر خاکی پینٹ شرٹ تھی جو بادی النظر میں کسی شکاری لباس کا پتا دیتی تھی۔

''نکالو انہیں باہر......'' کورینلا نے انچارج آلوک شرما کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اس پر مجھے وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آنے لگا اور کورینلا سے بولا۔

''میڈم! میں آپ کو ایک بار پھر تسلی دیتا ہوں...... ایسا کچھ نہیں ہوگا، آپ چنتا نہ کریں، میں نے ابھی ابھی باس (بھولا ناتھ) سے بات کی ہے کہ وہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے خود ہی پہنچنے والے ہیں۔''

''لیکن، ہمیں ان لوگوں کے تیور کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دے رہے ہیں۔'' کورینلا نے بارعب لہجے میں آلوک شرما سے کہا۔

اب پتا نہیں ''ان لوگوں'' سے اس کی مراد ہم تینوں، یعنی میں (کمبل دادا)، اول خیر اور شکیلہ تھے یا پھر کوئی اور......

تاہم میں بڑے غور سے ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو سُن رہا تھا۔

لگتا تو کچھ ایسا ہی تھا کسی معاملے پر ان لوگوں کے درمیان کوئی اچانک سے فیصلے ہوئے ہیں، جن میں کچھ ابہام پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اب آپس میں اسی بات پر بحث کر رہے تھے۔

''لیکن ہم اپنے چیف (کرنل سی جی بھجوانی) کے آرڈر سے روگردانی نہیں کر سکتے۔'' کورینلا بولی۔

''آپ کا کہنا بجا ہے میڈم! ہمارے باس کے لیے بھی آپ کے چیف صاحب کا حکم سر آنکھوں پر ہے۔ مگر ابھی ایسی کوئی خطرے والی بات ہے ہی نہیں...... باس نے خود اس کی ضمانت دی ہے اور آپ کی تسلی کرانے کے لیے ہی وہ ادھر آرہے ہیں۔ اگر آپ کی تسلی ہو جاتی ہے تو ٹھیک، ورنہ جیسے آپ چاہیں گی بالکل ویسا ہی ہوگا۔'' آلوک شرما نے کہا تو کورینلا بولی۔

''لیکن ہماری تسلی سے زیادہ آپ کو چیف کو مطمئن کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی تو تعلقات خراب ہونے کا اندیشہ ہو جائے گا۔''

''باس کو بھی یہی چنتا ہے کہ آپ لوگوں سے ان کے تعلقات میں ایک بال برابر بھی فرق نہ آنے پائے۔'' آلوک شرما سے بولا۔ ''یہی وجہ ہے کہ وہ آپ کی پوری پوری مدد کرنے کی پُرزور اچھار رکھتے ہیں۔ وہ اس بات کو اپنی ہتک خیال کرتے ہیں کہ بھجوانی صاحب کے وہ ایک کام بھی نہ آسکے...... بلکہ......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ

اچانک ایک تیز بپ کی آواز اُبھری۔

دیگر پنجروں میں جاگے ہوئے قیدی ہماری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے میں محو تھے۔ مردود داور بھی تاش کی بازی چھوڑ کر اب کچھ اُلجھی ہوئی نظروں سے اسی طرف دیکھنے میں محو تھا۔ ہم تینوں بھی ان کے چہروں کی طرف تکتے ہوئے ان کی آپس کی باتوں کو بڑے غور سے سنے جارہے تھے۔

تیز بپ کی آواز اس فونک ڈیوائس کی تھی جو اس کی بیلٹ کے ساتھ ہی نتھی تھا، وہ اس نے نکالتے ہوئے پہلے کوریلا سے معذرت کی اور پھر کسی سے بات کرنے لگا۔

''یس باس! آپ آگئے ہیں، ہم ابھی پہنچتے ہیں...... کیا؟ او...... اچھا...... یہ تو بہت اچھا ہوا کہ آپ نے بھوانی صاحب سے بھی بات کرلی...... یہاں ان کے ساتھی اسی تازہ صورتِ حال سے پریشان اور فکرمند ہورہے تھے۔ ابھی پہنچتے ہیں ہم۔''

یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کرلیا۔ وہ یقیناً اپنے باس بھولا ناتھ سے ہم کلام تھا۔ پھر وہ کوریلا سے مخاطب ہوکر بولا۔

''لوجی میڈم! باس تشریف لاچکے ہیں اور اُنہوں نے بھوانی صاحب سے بھی بات کرلی ہے۔ تشریف لائیں، وہیں چل کر آرام سے گفتگو کرتے ہیں۔''

کوریلا اُلجھی ہوئی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکال کر کہیں اور لے جانے والی تھی۔ کہاں......؟ یہ وہی جانتی تھی یا اس کے ساتھی۔

بہرکیف وہ لوگ ہم سے بغیر کچھ کہے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم تینوں آپس میں کھسر پسر کے انداز میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ اس دوران میں نے کن انکھیوں سے داور والے پنجرے کی طرف دیکھا اور چونک سا گیا۔

وہ عملے کے کسی آدمی سے رازداری سے باتیں کرنے میں محو تھا اور اُس سے باتوں کے دوران اس کی نظریں ہمارے ''کیج'' پر ہی جمی ہوئی تھیں، جس سے لگتا ایسا ہی تھا کہ وہ ہمارے متعلق ہی اس سے کوئی بات کررہا تھا۔ ممکن تھا اس سے وہ ہمارے بارے میں پوچھ رہا ہو...... مگر میں نے اسی دوران ایک اور بات محسوس کی، وہ ہماری طرف کم مگر شکیلہ کی طرف زیادہ گھور رہا تھا۔

''تو کیا یہ خبیث اسی کے متعلق کوئی بات کررہا تھا؟'' میرے ذہن میں ابھرا۔ میں اندر سے کھٹکا۔ اس بدبخت نے یہاں کے پہرے داروں سے اچھی خاصی بنالی تھی۔

اس کی کچھ بھی وجہ رہی ہو، حقیقت یہی تھی جس کا ہم سب بھی کئی بار نمونہ دیکھ چکے تھے۔

جس قیدی کے ساتھ معاملہ داری کامیابی کے ساتھ نمٹائی جانے والی ہوتی اس کا زیادہ اور خاص خیال رکھا جاتا تھا اور داور عنقریب رہا ہونے والا تھا (اس مردود کی رہائی پر کم ازکم میں، شکیلہ اور اول خیر تو ضرور ہی سکھ کا سانس لیتے)

تھوڑی دیر بعد وہ پہرے دار اسے تسلی دینے کے انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے اور ایک کمینی سی نگاہ شکیلہ پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گیا تو میں چونکا۔ وہ پہرے دار جس رخ پر کھڑا تھا اس کے ساتھ ہی ٹنگو کا پنجرہ تھا، وہ بہ ظاہر ذرا قریب ہوکے لاتعلق سا کھڑا تھا مگر مجھے لگا تھا کہ اس نے ضرور ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ میں بے چین سا ہوگیا۔

ٹنگو اپنے گروہ میں بھی ایک مخبر کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ شاید یہاں بھی اپنی عادت سے مجبور ہوکر لوگوں کی باتوں میں کان لگانے کا عادی تھا۔ شکر تھا کہ میں نے ٹنگو سے اچھے تعلقات استوار کررکھے تھے۔

بعض لوگ فطرتاً بڑے یار باش قسم کے آدمی ہوتے ہیں، وہ بھی کچھ ایسی ہی فطرت کا مالک تھا۔ میں نے اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ دوستی گانٹھ رکھی تھی۔ البتہ اول خیر کو وہ جانے کیوں بُرا لگتا تھا۔

شام جھکنے لگی تھی، ڈیول کیج کی بتیاں جلنے لگی تھیں، مگر یہاں زیادہ روشنی نہیں کی جاتی تھی۔ ہلکا سا اندھیرا تو یوں بھی اس منحوس قید خانے کا مقدر ہی بنا رہتا تھا۔

میں بار بار کن انکھیوں سے داور کا چہرہ دیکھنے لگتا تھا۔ نظر مجھے یہی آرہا تھا کہ وہ کمینہ خبیث شکیلہ پر بُری طرح فریفتہ ہوگیا تھا اور پہرے دار کے ساتھ کسی سازش میں مصروف تھا۔

میں اس تلخ اور کریہہ حقیقت کو تسلیم کرچکا تھا کہ ہم تینوں اس شیطانی قید خانے میں بے بس پنچھی تھے جبکہ حالات ہمارے تصور سے بھی شاید زیادہ خراب۔

اگرچہ مجھے پوری اُمید تھی کہ ٹنگو آج رات میرے سامنے رازدارانہ گفتگو کے دوران بعض سنسنی خیز انکشافات کرنے والا تھا مگر مجھے بھی کچھ کرنا چاہیے تھا، میں اس شیطان صفت اور غلیظ آدمی داور کی شکیلہ پر بدنیتی کو تاڑ چکا تھا اور اب بغیر کسی شور شرابے یا ہنگامہ کرنے کے اس معاملے کو دیکھنا چاہتا تھا۔

تاہم زیادہ بہتر میں نے یہی سمجھا تھا کہ پہلے ٹنگو سے

بات کر لی جائے، دیکھوں تو وہ کیا کہتا ہے۔ یوں بھی مجھے اندرونی و بیرونی حالات کچھ خراب ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

رات ہوئی اور ننگو سے میری گفتگو کی ابتدا ہوئی۔ وہ جیسے موقع پاتے ہی مجھ سے بات کرنے کے لیے اپنے اور میرے پنجرے کی سلاخوں کے قریب آ گیا۔

''مشتری ہوشیار باش......!'' وہ میری طرف دیکھ کر محتاط لہجے میں بولا تو میں قدرے چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

''یہ کمینہ خصلت، داور تمہاری ساتھی (شکیلہ) کے خلاف کسی گھناؤنی سازش میں مصروف ہے۔''

اس نے نیچی آواز میں بتایا اور میرا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا، وہی ہوا جس کا مجھے اندازہ اور خدشہ تھا۔ تاہم بولا۔ ''یار ننگو! ذرا کھل کر بولو، کہنا کیا چاہتے ہو تم؟''

''داور یہاں سے جانے والا ہے اور اس کے گروہی ساتھیوں کے ساتھ بھاری مطالبے پر معاملہ سیٹ ہو گیا ہے، اسی لیے اس بدبخت کی یہاں زیادہ اُوپر ہو رہی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''اس نے اپنے ایک ہم راز پہرے دار کے ساتھ تمہاری ساتھی کے خلاف ایک سازش تیار کی ہے اور اپنے ساتھ یہاں کے شیطان صفت انچارج آلوک شرما کو بھی ملانے کی کوشش میں ہے۔''

''سازش کی نوعیت کیا ہے؟'' میں نے اس کی طرف سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

''نمبر ایک......'' وہ بولا۔ ''تمہاری ساتھی کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملانا۔ نمبر دو...... دوسری صورت میں (یعنی شکیلہ کے جھانسے میں نہ آنے کی صورت میں) اسے زبردستی اغوا کرنا اور مجبور کر کے جھکانا......''

یہ سن کر میرے پورے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ غیظ و غضب کی ایک طوفانی لہر تھی جو اچانک ہی میرے اندر سے اُٹھی تھی۔ میں نے اپنے اندر کے غبار پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''کیا ضروری ہے کہ آلوک شرما اس معاملے میں اس کا ساتھ دے؟ کیونکہ ہم اصل میں اس کے قیدی نہیں ہیں اور جن کے قیدی ہیں وہ لوگ (کوریلا اور اس کے تین ساتھی ایجنٹ) بھی یہاں رہائش پذیر ہیں۔''

وہ میری اس بات پر ایسے ہنسا جیسے میں نے کوئی بچوں والی بات کہہ ڈالی ہو۔ بولا۔ ''ارے بھائی! کس دنیا میں رہتے ہو، جس طرح جنگ اور محبت میں سب جائز ہے اسی طرح جرائم کی دنیا میں بھی سب چلتا ہے اور پھر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ یہ ڈیول کیج ہے یہاں ہر کام شیطانی ہوتا ہے۔ بہت سے بہانے ہیں ان کے پاس۔ بھولا ناتھ صرف ممبئی کا ہی نہیں اکھا بھارت کا بھی بڑا ڈان ہے۔ بلکہ ایک پورے براعظم کی زیر زمین دنیا کا بے تاج بادشاہ کہلاتا ہے۔ بڑی بڑی شخصیات کے لیے اگر یہ کام کرتا ہے تو ان کی کمزوریاں بھی رکھتا ہے۔ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' وہ چند ثانیوں کے لیے رکا اور دوسرے کیج کی طرف دیکھنے لگا جہاں داور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں مگن تھا۔

مجھے ننگو کی کسی بات سے اختلاف نہ ہو سکا۔ بھارت کی خفیہ ایجنسی بلیو تلسی اگر بھولا ناتھ سے خفیہ تعلقات رکھے ہوئے تھی تو بھولا ناتھ بھی ان کا رازداں تھا۔ بھولا ناتھ کا کوئی ساتھی اگر اپنی مطلب برآری کے لیے خلافِ اُصول حرکت کرتا بھی تھا تو کون اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

ننگو کی بات کا صاف مطلب یہ تھا کہ مجھے اس خوش فہمی میں نہیں پڑنا چاہیے تھا کہ ہم بلیو تلسی کے قیدی تھے اور ان کے مفادات کی حد تک محفوظ بھی بلکہ اصل حقیقت یہ تھی ہم ڈیول کیج میں مقید تھے اور صرف بھولا ناتھ کے قیدی تھے اور آلوک شرما کے مکمل اختیار میں۔

میں ان ساری باتوں کا ادراک کر کے اندر سے لرز سا گیا۔ جلدی سے بولا۔ ''یار ننگو! تُو واقعی بہت یار باش اور یاروں کا یار آدمی ہے۔ تیرا یہ احسان میں ساری زندگی نہیں بھول سکتا کہ تُو نے مجھے باخبر رکھا، مجھے تو واقعی پریشانی اور تشویش سی ہونے لگی ہے۔''

''چنتا مت کر تُو......'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''ایک اور ٹھن چکر بھی درمیان میں چل پڑا ہے۔'' میں اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ آگے بولا۔ ''کل ہی تو بتایا تھا میں نے تجھے، کیا بھول گیا؟ وہی دونوں پہرے داروں کی آپس کی ہونے والی گفتگو میں نے سنی تھی۔ کچھ باہر کے لوگوں سے ہم قیدیوں کا سودا بھی ہونے والا ہے...... بہرحال۔'' وہ اپنی بات ختم کر کے سگریٹ سلگانے لگا اور مجھے بھی پیشکش کی مگر میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''تجھے میں نے یہ سب بتا دیا، اب تُو جان اور تیرا کام...... میں چلا اس طرف......'' وہ یہ کہہ کر دوسرے کونے میں کھسک گیا اور سگریٹ پیتے ہوئے کوئی پرانا فلمی گیت

گانے لگا۔

دنیا میں کتنا غم ہے
تیرا غم کتنا کم ہے
لوگوں کا غم دیکھا تو، میں اپنا غم بھول گیا......

اول خیر اور شکیلہ میرے قریب قریب بیٹھے تھے۔ وہ مجھے ننگو کے ساتھ دھیمی آواز میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ میں ان کی طرف سرک گیا۔

میرا چہرہ جوش اور تشویش سے بیک وقت پریشان کن تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ داور کی شکیلہ کے خلاف اس قبیح سازش کے آشکارا ہوتے ہی میں زیادہ دیر اس خوش فہمی کا شکار ہونے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کہ یہ قبیح سازش شکیلہ کے لیے جاں سوز معصیت اور میرے اور اول خیر کے لیے غیرت کی آگ میں خاکستر شدہ ہونے کا سبب بن سکتی تھی۔

''کیا ہوا دادا......؟ تم اس سے ننگو جاسوس سے بات کر کے ایک دم پریشان سے نظر آنے لگے ہو؟'' اول خیر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے ایک بھینچی بھینچی سی ہنکاری خارج کرتے ہوئے، دھیمی دھیمی آواز میں انہیں سب بتا دیا، جسے سن کر نہ صرف اول خیر بلکہ شکیلہ بھی اس بار غصے سے سرخ ہوگئی۔

عورت چاہے شکیلہ ہی ہو، اپنے بارے میں اس طرح کی ناپاک سازش کا سن کر یہی ردعمل ظاہر کرتی ہے۔ بے شک اس غصے کی تہ میں تشویش اور پریشانی کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے اور شکیلہ تو یوں بھی ایک مردبار اور جنگجو عورت تھی۔ لیکن موجودہ حالات میں تو ہم جیسے بھی پریشان ہی تھے۔

''مت گھورو اس کمینے کی طرف...... وہ شک میں پڑ جائے گا۔''

تاش کھیلتے داور کی طرف پرطیش نظروں سے گھورتے دیکھ کر میں نے اول خیر اور شکیلہ کو سرزنش کی تو اول خیر دانت پیس کر خود کلامیہ بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ ''اس کتے کی نسل کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی ہے اب تک، کاش! میں کسی طرح اس کے پنجرے کے اندر پہنچ جاؤں، پھر میں اس کا حشر کیا کرتا ہوں......''

''خود پر قابو پائے رکھو اول خیر! یہ وقت جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینے کا ہے۔ شیر پنجرے میں بند ہو تو اُس پر گیدڑ بھی چلاتا ہے اور ہم پنجرے میں بند ہیں جبکہ داور ایک گیدڑ کی صورت ہم پر چلا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک طرح سے آزاد ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں دادا! مگر ہمیں کچھ کرنا ہوگا، ننگو کی باتوں سے یہی لگتا ہے کہ......''

''تم میری بات غور سے سنو......'' میں نے اچانک اس کی بات کاٹتے ہوئے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ وہ دونوں ہی میری بات پر خاموشی سے گوش برآواز ہو گئے۔

''اول خیر......! میں شکیلہ سے کوئی بات کرنے والا ہوں...... خبردار، تم زیادہ اُونچی آواز میں مت بولنا اور اپنا دھیان اسی طرف ہی رکھنا۔''

میرے اچانک اس طرح کے پُراسرار انداز نے اول خیر کو کچھ چونکا سا دیا تھا جبکہ شکیلہ بے چاری کچھ پریشان سی نظر آنے لگی تھی۔ تاہم دونوں پُرغور انداز میں میری ہی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے بات کرنے کی ابتدا کی اور انداز اپنا ایسا ہی رکھا جو عام سا ہوتا کہ کسی کو چونکا دینے کا سبب نہ ہو، بالخصوص داور کو، جس کی شکرے جیسی نظریں ہمہ وقت ادھر ہی اٹکی رہتی تھیں۔

''جیسا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہیں بتایا کہ یہ کمینہ مردود...... داور، شکیلہ کے خلاف کوئی شیطانی منصوبہ بندی میں مصروف ہے، مجھے یہ بات ننگو نے بتائی ہے اور وہ غلط بھی نہیں ہے، کیونکہ میں خود بھی داور کو ایک پہرے دار کے ساتھ راز و نیاز کرتے دیکھ چکا ہوں، وہ بار بار شکیلہ کی طرف اشارہ کر کے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں کھسر پسر کر رہے تھے۔''

''کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے دادا؟'' اول خیر نے بے تابی سے پوچھا۔

''سنتے رہو...... وہی بتانے لگا ہوں......'' میں نے اسے ٹوک دیا۔ اس بار میں نے براہ راست شکیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا اور نیچی آواز میں بولا۔

''شکیلہ......! یہ کام تمہارے کرنے کا ہے...... اور ابھی کرنا ہے۔ اب میری بات غور سے سنو......!''

میں چند سیکنڈ تک اسے اچھی طرح اپنی منصوبہ بندی سمجھاتا رہا۔ جسے اس نے فوراً ذہن نشین کر لیا۔

وہ یہ ''کام'' بڑی خوبی کے ساتھ کرنے کے لیے تیار تھی۔ مگر اول خیر کو اس پر اعتراض تھا، وبے دبے سے لہجے میں بولا۔

''دادا......! اس میں بڑا رسک ہے۔''

''اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔'' میں نے گہری متانت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہارے ذہن میں اس سے اچھا کوئی اور لائحہ عمل ہے تو تم بتا

دو......'' میری بات پر وہ محض سوچتا رہ گیا۔ اُسے بھی احساس تھا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ موجودہ حالات میں چارہ پھینکے بغیر کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

''میں تیار ہوں دادا......!'' شکیلہ نے پورے اعتماد اور جوش سے کہا اور اس کے بعد میں نے منصوبے کے مطابق ان دونوں کو گرین سگنل دے دیا۔

اسی وقت اول خیر اور شکیلہ کے درمیان کسی بات پر گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں انہیں بیزارکن انداز میں ہاتھ ہلا کر خاموش رہنے کی تلقین کرنے لگا۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے، میں اب بیزار ہو چکی ہوں...... اُکتا گئی ہوں تم سے......'' شکیلہ نے اول خیر سے یہ الفاظ خاصے زوردار لہجے میں کہے تھے کہ قریب کے پنجرے میں تاش کھیلتا ہوا داور چونک پڑا اور بہت دلچسپی سے ان کی بحث کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اپنا قصور میرے سر مت تھوپو تم...... تم خود ہمارے لیے مصیبت بن چکی ہو۔'' اول خیر نے بھی غصے سے شکیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ اتنے میں مجھے اُٹھنا پڑا اور ان دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے لگا تو شکیلہ مجھ سے بھی بھڑ گئی۔

''سارا کیا دھرا تمہارا ہے، تم نے ہم سب کو پھنسوایا ہے۔''

مجھے بھی اس کی بات پر غصہ آگیا اور اس پر برہم ہو کر بولا۔ ''بکواس بند کرو اپنی...... اصل مصیبت ہی تم ہو۔ تم ہمارے ساتھ نہ ہوتیں تو آج یہ مصیبت ہمیں نہ بھگتنی پڑتی۔ اب خاموش ہو جاؤ اور مجھے سونے دو...... ورنہ پیٹ ڈالوں گا تمہیں۔''

میں نے کہا اور ایک کونے میں سلاخوں سے پشت لگا کر سوتا بن گیا۔ اس طرح کہ میں ادھ کھلی آنکھ سے شکیلہ کو بھی دیکھتا رہوں۔ اول خیر بھی اپنا سر جھٹک کر ایک طرف کو جا بیٹھا اور اُونگھنے کے انداز میں جماہیاں لینے لگا۔

اس ڈرامے کا دورانیہ ہم نے مختصر رکھا تھا۔ تاکہ زیادہ شور شرابا نہ ہو اور کہیں پہرے دار ہی یہاں نہ آن دھمکیں۔

منصوبے کے مطابق شکیلہ ہم سے تھوڑے فاصلے پر جا کھڑی ہوئی اور ہولے ہولے سسکنے لگی۔

میں نے ادھ کھلی آنکھوں سے داور کی طرف دیکھا، اس کے مکروہ چہرے پر گہری سوچ اور معنی خیز مسکراہٹ جیسے تاثرات مچل رہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں تاش کے پتوں کا پنکھ تھا جو اس نے فرش پر پھینک دیا۔

اس خبیث کی نظریں ایک طرف کھڑی سسکتی ہوئی شکیلہ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا تو اس کے ساتھیوں نے اعتراض کیا مگر اس نے گیم سے ہاتھ کھینچ لیا اور انہیں اپنا کھیل جاری رکھنے کو کہا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگے۔

ذرا دیر بعد میں نے دیکھا کہ داور آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا شکیلہ کی سلاخوں کے قریب آگیا۔ دونوں پنجروں کے درمیان فاصلہ تقریباً تین چار فٹ کا تھا۔

کیج میں اب خاموشی چھا گئی تھی۔ داور نے ایک نظر مجھ پر اور اول خیر پر بھی ڈالی تھی، جبکہ ہم دونوں سوتے بن گئے تھے۔

تاہم میں نے دانستہ اپنا فاصلہ شکیلہ سے کم رکھا تھا تاکہ ان کی آپس میں ہونے والی ''متوقع'' گفتگو سن سکوں۔

''میں نے تو پہلے ہی تجھ سے کہا تھا کہ تیرے یہ دونوں ساتھی نکمے اور بے کار ہیں، اپنی زندگی اور کب تک ان کے ساتھ خوار کرے گی؟''

داور نے موقع پا کر اپنے پنجرے کی سلاخوں سے ٹیک لگا کر ہلکی آواز میں شکیلہ سے کہا۔ شکیلہ نے ایک غمگین سی نگاہ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا، پھر ذرا اپنی گردن گھما کر ہم دونوں پر بھی ڈالی، اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے اور پھر وہ داور سے بولی۔

''تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو...... ان دونوں کے ساتھ میں بھی بری پھنسی ہوں، اب کرتے کچھ نہیں ہیں اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کسی غیبی امداد کے انتظار میں ہیں۔ ہنہ......''

میں نے اپنی ادھ کھلی آنکھ سے دیکھا کہ شکیلہ کی بات پر داور کے بدہیئت ہونٹوں پہ ایک ذرا مکروہ مسکراہٹ اُبھری، پھر اس سے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''اب بھی وقت تیرے ہاتھ میں ہے جانم! میرے ساتھ مل جا...... چھوڑ دے ان کا ساتھ...... میرا یہاں رعب تو تُو نے بھی اب تک دیکھ ہی لیا ہے ناں...... عنقریب جانے والا ہوں یہاں سے...... بہت اہم ہوں میں اپنے ساتھیوں کے لیے۔ تجھے بھی ساتھ لے جاؤں گا اپنے......''

اس کی بات پر شکیلہ کے ستے ہوئے چہرے پر ایک دم رونق اُتر آئی اور وہ بولی۔ ''تمہاری بات تو ٹھیک ہے ویسے میں نے خود بھی دیکھا ہے کہ یہ پہرے دار تم سے بہت احترام سے بات کرتے ہیں، لیکن کیا تم سچ کہہ رہے ہو......

کہ میں تمہارے ساتھ شامل ہو کر آزاد ہو سکتی ہوں؟ لیکن...... لیکن یہ کیسے ممکن ہوگا؟ بہت مشکل ہے۔"

"کیا مشکل ہے؟ کیا تم ان دونوں سے ڈرتی ہو؟ میں جو ہوں...... کیا بگاڑ لیں گے بھلا میرا یہ دونوں۔" داور نے اپنا سینہ پھلا کر کہا۔

"وہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ دونوں بھلا تمہارا کیا بگاڑ لیں گے، یہ تو خود اپنے لیے کچھ نہیں کر پا رہے ہیں...... مگر یہ پہرے دار اور آلوک شرما...... مجھے تمہارے ساتھ بھلا کہاں جانے دیں گے؟"

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو جانم!" وہ اس کی طرف مخمور سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

شکیلہ بڑی کامیابی کے ساتھ میری منصوبہ بندی پر عمل کرتے ہوئے اسے بے وقوف بنا رہی تھی۔ اب داور کسی بھی وقت اپنی سازش کے تاروپود اس کے سامنے ظاہر کرنے والا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ بس...... میرا ساتھ دو اور میری ساتھی بن جاؤ۔"

"لیکن ایسا میں نہیں چاہتی۔" شکیلہ نے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ کچھ ایسا ہو جائے کہ انہیں پتا بھی نہ چلے کہ میں نے ان سے غداری کی ہے، بلکہ تم زبردستی مجھے اپنے ساتھ......" شکیلہ نے بڑی مکاری سے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو داور نے چٹکی بجا کر کہا۔

"یہی کام تو میں کر رہا ہوں جانم! چنتا مت کرو، تم یوں بھی عنقریب میرے ساتھ ہی جانے والی تھیں۔" اس کی بات پر شکیلہ چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس خبیث کی بات پر وہ بے چاری بھی ایک لمحے کو اندر سے لرز گئی ہوگی۔ جبکہ خود میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اب ترپ چال شکیلہ کے ہاتھ میں تھی کہ وہ کیسے داور کے منہ سے "سچ" اُگلواتی ہے؟

شکیلہ نے ایک دم اپنی گھبراہٹ آمیز پریشانی پر مسرت کا پرتو چڑھا کر کہا۔ "کک...... کیا واقعی تم سچ کہہ رہے ہو......؟ مگر کیسے، کب کرو گے یہ سب؟"

"بس! تم دیکھتی جاؤ جانم!" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

"نہیں، پھر بھی، مجھے بتاؤ تو آخر تمہاری پلاننگ کیا ہے؟ تاکہ مجھے بھی تسلی ہو کہ تم نے کیا چالاکی چلی ہے......"

اس کی بات پر میں نے داور کو تذبذب کا شکار ہوتے دیکھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ کچھ بتانے سے گریزاں تھا۔ اس پر شکیلہ نے چالاکی سے اپنا منہ پھلا کر کہا۔

"میں سمجھ گئی، تم بھی مجھے میرے ساتھیوں کی طرح صرف بہلانا چاہتے ہو، وہ بھی اب تک میرے ساتھ یہی کرتے رہے ہیں......" یہ کہہ کر شکیلہ اس کی طرف سے پرے ہٹنے لگی تو وہ بول پڑا۔

"ارے جانم! ناراض کیوں ہوتی ہو...... میں تو اس لیے...... اچھا سنو، مگر اپنے تک ہی محدود رکھنا یہ بات......"

"میں بھلا اپنے پاؤں پہ کلہاڑی کیوں ماروں گی۔"

اس نے شکیلہ کو بیج کے آخری سرے کی طرف سرکنے کو کہا اور پھر اُسے اپنے سازشی منصوبے کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔

میری پلاننگ کامیاب گئی تھی اور "آپس کی لڑائی" کا ڈراما بھی اور ڈرامے کے بغیر اس میں شاید وہ رنگ نہ بھرتا۔

بہرکیف تھوڑی دیر تک شکیلہ اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔ اس کے بعد سونے کا بہانہ کر کے ہٹ گئی۔ میں نے دیکھا اس خبیث داور نے اس کا گال چھونے کی کوشش کی تھی مگر وہ بڑی مکاری سے اسے طرح دے گئی تھی۔

جب ہم نے دیکھا کہ داور بھی اپنے بیج کے ایک کونے میں جا بیٹھا اور اُونگھنے لگا ہے تو شکیلہ ہماری طرف کھسک آئی۔ ہم نے احتیاط کا دامن تھامے رکھا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ بیج قریب قریب بنے ہونے کی وجہ سے ہم سب ایک دوسرے پر نگاہ رکھ سکتے تھے، اسی لیے ہم تینوں ایک دوسرے کے قریب قریب ہو کر بظاہر اس طرح لیٹ گئے جیسے سونے لگے ہوں، مگر آنکھیں موندے بغیر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے، دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔

"اس خبیث نے یہاں کے دو پہرے داروں کو ساتھ ملا کر مجھے اغوا کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔"

"مگر اس نے خود اپنے منہ سے تمہیں، تمہارے ہی اغوا کا کیسے بتا دیا؟" اول خیر نے اُلجھے ہوئے لہجے میں فوراً سوال کیا تو وہ بولی۔

"ظاہر ہے اب وہ صاف تو میرے سامنے اغوا کا لفظ استعمال نہیں کرے گا، اس نے اشارتاً کہا تھا، پہلے پوری بات سن لو۔" چند ثانیے توقف کرنے کے بعد اس نے کہا۔

"اس نے مجھے اپنا احسان اور اپنی مجھ سے دوستی جتانے کے لیے یہی بتایا تھا کہ وہ دو پہرے داروں کی مدد سے مجھے آج رات ہی کے آخری پہر یہاں سے نکالنے کا (اغوا کرنے کا) ارادہ کیے ہوئے تھا۔ کیونکہ اس کے

آدمیوں کے ان کے ساتھ کسی معاملہ داری پر کامیاب مذاکرات ہو چکے ہیں اور آج رات داور کو یہ لوگ آزاد کرنے والے ہیں۔ میرے سلسلے میں یہ خبیث آلوک شرما کو بھاری رشوت کی بھی پیشکش کر چکا ہے۔''

''تم نے اپنا کیا ردِعمل اس پر ظاہر کیا تھا؟'' میں نے شکیلہ سے گہری سنجیدگی سے پوچھا تو وہ بولی۔

''ظاہر ہے، میں یہ سب سننے کے بعد اندر سے بری طرح کھول کر رہ گئی تھی، مگر میں نے اس پر یہ سب ظاہر نہیں کیا تھا بلکہ اُلٹا اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا اور اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی تھی۔ وہ مردود اپنا کام یوں آسان ہوتے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔''

''اول خیر......'' شکیلہ کی پوری بات سننے کے بعد میں نے اچانک گمبھیر سے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''ہاں دادا! بولو...... کیا کرنا ہے اب......؟'' اول خیر جلدی سے بولا۔ اس کے لہجے سے بھی پریشانی اور تشویش ظاہر ہونے لگی تھی۔

''اس مردود کا علاج کرنا ہوگا اب...... یہ ہماری غیرت کو للکار رہا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ میں ابھی تک اس کی غلاظت پھیلانے والی قبیح حرکت پر ہی بُری طرح جلا بیٹھا تھا...... اب جو اس کی نئی سازش سامنے آئی تو میں نے اس کا حتمی علاج کرنے کا سوچ لیا تھا۔

ہمیں کیا کرنا تھا وہ میں نے اول خیر اور شکیلہ کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ یہ سب رات کے آخری پہر میں ہونا تھا، جب داور کو یہاں سے نکالا جانے والا تھا کیونکہ تاوان وغیرہ اور بھاری رشوت کے عوض، اب داور کو اس ڈیول کیج سے رہائی ملنے والی تھی۔

آخری پہر سے تھوڑی دیر پہلے ہی میں اور اول خیر سوئے سوئے سرکتے ہوئے کیج کے دروازے تک آ گئے اور بظاہر آڑے ترچھے لیٹ گئے تھے، جیسے نیند میں ادھر اُدھر جا پڑتے ہیں۔ ہمیں اپنی ''کارروائی'' کا ادھر سے ہی آغاز کرنا تھا۔ شکیلہ بھی قریب تھی۔ وہ داور کے ساتھ بنائے گئے منصوبے کے مطابق جاگ رہی تھی۔ تیز وہ اب داور کو محبت بھرے اشارے کنایئے کرنے میں مصروف ہو گئی۔

رات کافی سے زیادہ بیت چکی تھی اور تقریباً سب ہی قیدی گہری نیند میں خراٹے لے رہے تھے، میں اور اول خیر بھی اسی طرح خراٹے لینے میں مصروف تھے۔

کبھی کبھی کوئی پہرے دار آ کر گشت کرتا گزر جاتا تھا۔ ہمیں یہاں لانے والے بلوتکسی کے ایجنٹ یعنی کوریلا کے ساتھی بھی ہمارے کیج کا ایک چکر لگا کے اور مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔

منصوبے کے مطابق شکیلہ نے داور کی طرف مسکرا کر ایک ہوائی بوسہ اُچھال دیا۔ اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں، وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس کی سلاخوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

شکیلہ نے اس سرگوشی میں کہا۔ ''اب میں زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکتی، تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں۔ یوں بھی ہم تھوڑی دیر میں آزاد ہونے والے ہیں۔''

داور نے فوراً ہلکی سی سیٹی بجا کر پہرے دار کو بلایا اور اس سے کچھ کہا۔ وہ اسی وقت پلٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں انہی دونوں پہرے داروں میں سے ایک وہاں آ گیا، جن سے داور نے پہلے ہی سے خفیہ ساز باز کر رکھی تھی۔ وہ اس سے بولا۔

''یہ میری ساتھی بن چکی ہے، اور اپنے دونوں ساتھیوں سے سخت بیزار ہو چکی ہے، ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ اسے نکال کر میرے کیج میں ڈال دو......''

میں نے پہرے دار کو کہتے سنا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے، مگر یہاں معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے......''

میں اس کی بات پر چونکا اور شنگو کی وہ بات یاد آنے لگی جو اس نے پہلے ہی مجھے خدشے کی صورت میں بتائی تھی کہ یہاں کچھ اندر ہی اندر گڑبڑ چل رہی ہے۔

''کیسی گڑبڑ......؟'' میں نے داور کو چونک کر پہرے دار سے یہ کہتے ہوئے سنا۔ ''ہماری تو سودے بازی ہو چکی ہے۔ آدھی رقم بھی میرے ساتھیوں نے تم لوگوں کو دے دی ہے؟''

''تمہاری بات نہیں ہے۔'' پہرے دار سرگوشی میں بولا۔ ''کچھ لوگ آلوک شرما سے ان سارے ہی قیدیوں کا منہ مانگے داموں سودا کرنا چاہتے ہیں...... وہ شاید انہیں ہمیشہ کے لیے اپنا قیدی بنانا چاہتے ہیں، ان سے کوئی بیگار لینا چاہتے ہوں گے۔ مگر آلوک شرما نے صاف انکار کر دیا تھا کہ ان قیدیوں کی نوعیت کچھ اور ہے، تب ان کے زیادہ دباؤ پر آلوک شرما نے بھولا ناتھ سے بات کی اور اُسے بھی منہ مانگے داموں کی پیشکش کی تو بالآخر یہی طے پایا کہ ایسے قیدی جن سے سودے بازی کی اُمید نہیں رکھی جا سکتی اور جنہیں ان کے گروہی ساتھی نہیں پوچھتے، اُنہیں اب ہلاک کرنے کے بجائے، ان لوگوں کو بیچ دیا جائے۔''

''ہاں تو ٹھیک فیصلہ کیا ہے تمہارے باس نے، پھر کیا

گڑبڑ ہے؟'' داور نے کہا۔

''ٹھیک تو ہے مگر آلوک شرماجی کو نجانے کیوں کسی خطرے کی بو آنے لگی ہے کہ وہ لوگ نیت میں فتور رکھتے ہیں اور سودے بازی کے بجائے کچھ اور کرنا چاہتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے حملہ؟''

''ہاں۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا، یہ تمہارے آلوک شرماجی کا محض وہم ہے۔'' داور ہنسا۔ ''ویسے وہ لوگ ہیں کون؟''

''پتا نہیں، ہوں گے کوئی ہمارے ہی جیسے لوگ۔'' پہرے دار نے کہا تو داور بیزاری سے بولا۔

''اچھا چھوڑو اب یہ باتیں۔'' اس نے شکیلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب اسے اغوا کرنے کی ضرورت نہیں رہی، یہ خود ہی میرے پاس آنے پر تیار ہوگئی ہے، تم اس کا پنجرہ کھول کر اسے میرے پنجرے میں ڈال دو......''

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیونکہ اب میرے اور اول خیر کے حرکت میں آنے کا وقت آچکا تھا۔ پہرے دار نے تھوڑے تذبذب کے بعد اس کی بات مان لی اور پھر میں نے اس کے قدموں کی سرسراہٹ سنی۔

میں اور اول خیر پہلے ہی منصوبے کے مطابق سرک کر دروازے کے قریب آن پڑے تھے۔ پھر جیسے ہی میں نے فرش پر پڑے پڑے ادھ کھلی آنکھ سے دروازہ کھلتے دیکھا تو ایک دم بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا۔ میری فوراً ہی تقلید اول خیر نے بھی کی تھی۔

میں نے کھلتے دروازے کو لیٹے لیٹے ایک زوردار لات رسید کی تو وہ بڑے زور سے پہرے دار کی پیشانی پر ''وج'' گیا۔ اس کے لیے یہ سب غیر متوقع اور اچانک تھا اسی لیے مار کھا گیا۔ وہ اپنے حلق سے ایک کراہ آمیز چیخ خارج کر کے، داور والے کیج کی سلاخوں سے جا ٹکرایا اور اول خیر نے باہر نکل کر اس کی گردن دبوچ لی اور میں نے چابیوں کا گچھا اس سے جھپٹ لیا۔

''اے...... اے...... یہ کیا کر رہے ہو تم دونوں......''

داور جو اب تک یہ سب کچھ ایک سکتے کی سی کیفیت میں دیکھنے میں محو تھا، چلایا مگر میں تب تک اس کے کیج کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوگیا اور زخمی شیر کی طرح اس پر جھپٹا۔

اس وقت میرا رواں رواں آگ بنا ہوا تھا۔ داور جیسے خبیث نے ہمیں بہت ستایا تھا، میں اب اسے کہاں چھوڑنے والا تھا۔ وہ بھی مجھے اس طرح لال بھبوکا دیکھ کر ایک لمحے کو دہشت زدہ سا ہو گیا تھا، مگر دوسرے ہی لمحے حرکت میں آیا، تب تک میں خوف ناک غراہٹیں خارج کرتا ہوا اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اس نے اپنی لات چلانی چاہی تھی مگر میں نے وہی لات اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر موڑ ڈالی، وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ گھومتا چلا گیا۔ میں نے دانت پیس کر اس کی گدی دبوچ کر اس کا سر دوسری طرف کی سلاخوں میں دے مارا اور پھر گھما کر اسے کیج سے باہر دھکیل دیا۔ تب تک اول خیر اس پہرے دار کو ناک قبیل کر چکا تھا۔

اس ہلکی سی اُٹھاخ پٹاخ میں چند قیدی جاگ پڑے تو اول خیر نے انہیں اس شیطانی اور منحوس قید خانے سے آزادی کے نام پر خاموش رہنے پر مجبور کر ڈالا۔

اب ہم دونوں ہی داور پر پل پڑے اور مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اس کے بعد بے ہوش پہرے دار اور داور کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر انہیں ان کی شلواروں کے ازاربند سے رسن بستہ کرنے کے بعد اپنے کیج میں پھینک کر بند کر دیا۔

جو قیدی جاگ گئے تھے' وہ حیرت اور خوشی کے مارے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھے جا رہے تھے، ہم نے انہیں بدستور خاموش رہنے کی تلقین اور دروازے کی طرف سرک گئے۔

افسوس اس بات کا تھا کہ پہرے دار کے پاس سے ہمیں اسلحہ نام کی کوئی شے نہیں مل سکی تھی۔ ہم آزاد تھے مگر ابھی خطرے کی چھاؤں تلے تھے۔ ہم تینوں محتاط روی کے ساتھ مرکزی دروازے کی طرف سرکنے لگے۔ اس شیطانی قید خانے سے رہائی کا جذبہ ہمارے دل و دماغ پر بری طرح سے حاوی تھا، شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ ہم نے یہاں بہت کڑے اور عذاب ناک دن کاٹے تھے۔ اگرچہ قید و بند کے یہ ایام مختصر سہی مگر ایک ایک دن سو دن پر بھاری گزرا تھا ہم پر یہاں۔

ہم دیوار کے ساتھ چپکے ہوئے نہایت محتاط روی کے ساتھ چلتے ہوئے مرکزی دروازے تک پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کوئی پہرے دار نہ تھا۔ اس طرف کے کیج میں چند قیدی جاگ رہے تھے اور پریشان سے نظر آرہے تھے، اندر کی گڑبڑ کا انہیں بھی اندازہ ہو چکا تھا اور ہمیں دیکھ کر وہ ہماری منتیں کرنے لگے کہ ان کا پنجرہ بھی

کھول دیا جائے۔ مگر ہمارے پاس ایسا کچھ نہیں تھا کہ ان کا تالا کھولتے۔ تاہم ہم نے انہیں تسلی دی کہ ہم سب کو آزاد کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ ایک قیدی نے انکشاف کرنے کے انداز میں ہم سے کہا۔

''وہاں بھی کوئی گڑ بڑ ہوئی ہے۔ یہاں موجود پہرے دار ایک دم یہاں سے غائب ہوئے ہیں اور اندر......''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ گولیوں اور دھماکوں کی گرج ابھری۔ ہم دروازے پر ہی رک گئے۔ میں خود تھوڑا سا حواس باختہ ہو گیا کہ نجانے یہ کیا معاملہ تھا۔ ابھی میں پیش قدمی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اچانک میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں ایک عجیب سی آواز ٹکرائی اور دوسرے ہی لمحے اندر سفید رنگ کا دھواں بھرنے لگا۔

''گیس'' میرے ذہن میں ابھرا تھا اور میرے اوسان خطا ہوئے، میں اسی انداز میں چلایا۔

''میرے ساتھ آگے بڑھو......'' یہ کہتے ہی میں دروازے کی طرف بڑھا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے رکنا پڑا۔ وہاں چست لباسوں میں ملبوس اور کافی سے زیادہ تنگ دھڑنگ وحشی کھڑے دکھائی دیے، چست لباس والوں کے ہاتھوں میں جدید ہتھیار تھے جبکہ ننگ دھڑنگ وحشیوں نے بھالے اور تیر تفنگ تھامے ہوئے تھے۔ ایک عجیب سی گاڑی کی جھلک بھی مجھے نظر آئی جو ایک جیپ کے ساتھ نتھی تھی، اس پر بڑے بڑے دو سلنڈر رکھے ہوئے تھے اور گیس اس کے ذریعے ایک فائر کینن کے ساتھ اندر پھینکی جا رہی تھی۔ یہ بہت سریع الاثر گیس تھی جس کے باعث ہمیں بھی چکر آنے لگے اور پھر ہمیں کوئی ہوش نہ رہا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو ہم نے خود کو جانوروں کے کسی ریوڑ کی طرح ایک بڑے سے میدان میں پایا۔ اس طرح کہ ہمارے پیروں میں زنجیریں بندھی ہوئی تھیں۔ میدان کے گرد تیز نکیلے سرکنڈوں کے بانسوں کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ ہم سب کے ایک ایک پیروں میں لوہے کے بڑے کڑے ڈال رکھے تھے اور ان میں زنجیریں باندھی گئی تھی، جن کے دوسرے سرے دوسرے قیدی کے کڑے سے منسلک تھے اس طرح یہ سلسلہ ایک قیدی سے دوسرے قیدی تک چلا جاتا تھا۔ گویا ہم سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہوا تھا۔

ہمارے اردگرد جنگل، اونچے درخت اور جنگلی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں جن کے پار ہمیں مخروطی چھتوں والی کھپریل کی جھونپڑیوں کی جھلک بھی نظر آ رہی تھی۔

ڈیول کیج میں بے ہوش کر دینے کے بعد ہم سب بکھر چکے تھے۔ میں نے اول خیر اور شکیلہ کو اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ قیدیوں کا ایک ازدحام سا تھا میرے گرد اور یہ سب شور مچا رہے تھے۔ دفعتاً ہی زوردار آواز میں ڈھول پیٹے جانے کی آواز گونجی اور چست لباس میں ملبوس چند مسلح افراد جن کے ہمراہ ننگ دھڑنگ وحشی بھی تھے۔ وہاں آن موجود ہوئے اور ایک ہوائی برسٹ فائر کر کے ہمیں خاموش کرایا۔

مجھے لگتا ایسا ہی تھا کہ ہمارے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوا ہے۔ ہم ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں آ چکے تھے۔ تاہم یہاں کی حالت اس ڈیول کیج جیسے منحوس قید خانے سے لاکھ درجے بہتر تھی۔

اس کے بعد کسی نے ہم سے خطاب کیا کہ ہم سے یہاں ایک عارضی مدت تک بیگار لی جائے گی اس کے بعد آزاد کر دیا جائے گا بلکہ جو جہاں کہے گا اُسے وہاں پہنچا دینے کا بھی بندوبست کر دیا جائے گا، مگر شرط صرف یہ ہوگی کہ انہیں یہاں جو کام سونپا جا رہا ہے اُسے پورا کیا جائے۔

میں جانتا تھا کہ یہ محض بہلاوا تھا تاکہ ہم کوئی گڑبڑ پیدا نہ کریں اور نہ ہی یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کریں۔ تاہم ہمیں یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کے خطرناک نتائج کے بارے میں بھی بتا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

کمیل دادا نے اپنے اور اول خیر وغیرہ کے پاکستان سے آنے تک کے حالات سے مجھے تفصیلی آگاہ کیا اور اس کے بعد اس نے وہی کچھ بتایا جس کا مجھے بھی اندازہ ہو ہی چکا تھا۔ جس کے مطابق وہ یہاں بیگار کاٹنے لگے، کچھ لوگوں نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش بھی چاہی تھی، وہ یا تو مار دیے گئے یا پھر غائب ہو گئے۔ اس دوران شکیلہ اور اول خیر بھی اس سے مل گئے تھے۔ کمیل دادا نے سرِدست انہیں فرار کی ایسی کسی کوشش سے باز رکھا تھا اور خود اس کے عوامل پر دن رات غور کرنے لگا، ساتھ ہی وہ عملی طور پر بھی یہ پتا لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ آخر یہاں کون لوگ یہ سب کر رہے ہیں۔ ضرور اس سارے گورکھ دھندے میں ان کا کوئی خاص مقصد ہی ہو سکتا ہے، یوں تھوڑا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے معلوم ہوا کہ جنہوں نے بیک وقت دو وحشی قبائل کو اپنا تابع اور ایک کو دوستی کے جھانسے میں اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ وہ درحقیقت کسی بھارتی ریٹائرڈ جنرل کے ایل ایڈوانی کا گروہ ہے، جس کی کمانڈ اس کے مقربِ خاص کارپرداز بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ خود جنرل ایڈوانی زیادہ تر اِدھر ہی رہتا تھا البتہ کبھی کبھی وہ اپنے ذاتی پلین میں ممبئی بھی چلا جاتا تھا۔

اس کا یہاں مستقل ٹھکانا بنانے کا ایک مقصد تھا جو بڑا ہی گھناؤنا تھا۔ وہ روس اور چین کے دو جرنیلوں کے ساتھ مل کر پوری دنیا کو تیسری عالمی جنگ کے دہانے میں دھکیلنے کے منصوبے پر عمل پیرا تھا، تاکہ دنیا ان کے تابع ہو جائے اور وہ یعنی یہ تینوں جنونی جرنیل پوری دنیا کو صرف تین براعظموں میں تقسیم کر کے اپنی حکومت قائم کر سکیں۔ اپنے اس گھناؤنے منصوبے کا نام انہوں نے ''ورلڈ بگ بینگ'' رکھا ہوا تھا۔

ان کے ساتھ اور لوگ بھی شامل تھے۔ جو تین بڑے سپر پاورز ملکوں، امریکا، روس اور چین کے اہم اور کلیدی عہدوں پر فائز تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایسے ہی اور سربرآوردہ لوگوں کو بھی اپنا ہمنوا بنانے میں مصروفِ کار تھے۔ سب سے پہلے یہ لوگ جنوبی ایشیا میں جنگ کے بادل تیار کرنے میں مصروف تھے، ان میں امریکا، اسرائیل اور بھارت کی مقتدر شخصیات ان کا خفیہ طور پر ساتھ دے رہی۔ جنگ کی ابتدا یہ لوگ پاک بھارت سے کرنا چاہتے تھے، جس کے بعد لامحالہ ان کے حلیف، چین ایران اور ترکی اور اُدھر، سری لنکا، برما اور مالدیپ وغیرہ کو بھی لپیٹ لیا جاتا۔ کیونکہ وہ ان کے حلیف تھے اور ان کے مفادات ایک دوسرے کی بقا سے وابستہ تھے۔ یہ ایک عالمی بساط تھی اور خفیہ مہروں کو اس پر بڑی مہارت سے سرکایا جا رہا تھا۔

دنیا اس خوفناک سازش سے بے خبر تھی، مگر زیرک دماغ مبصر جو عالمی رائے عامہ اور حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے، وہ اشاروں کنایوں میں ایسی کسی سازش کی بو سونگھ رہے تھے، جو افغانستان، مصر، عراق، شام، فلسطین، کشمیر اور اب پاک بھارت کشیدہ صورتِ حال کو مدِنگاہ رکھے ہوئے تھے۔

جنرل ایڈوانی یہاں اپنے مشن اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے باقاعدہ ایک عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کا نام اس نے ''ڈارک کیسل'' رکھا تھا۔ اس کی بنیادیں پڑ چکی تھیں، جبکہ اس کے اخراجات بیرونی خفیہ ہاتھوں بھی اسے موصول ہو رہے تھے اور یہ خود بھی خود انحصاری کے اصول پر چلتے ہوئے یہاں کی معدنیات اور قدرتی وسائل کو بروئے کار لا رہا تھا۔ جس کے لیے اس نے پہلے کلی منجارو قبیلے کے سردار نیکابوغ سے معاملت داری کی اور اسے نجانے کیسے اپنا ہمنوا بنا لیا جبکہ جاوا قبیلہ پہلے ہی کلی منجارو کا محکوم تھا، جو

طاقت میں ان سے کم تھا۔ تاہم اُنہوں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا، مگر جنرل ایڈوانی نے اس سلسلے میں کلی منجارو کی مدد کی اور وہ جاوا قبیلے پر اپنا غاصبانہ قبضہ قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ اب بھی جاوا قبیلے کے اصل جنگجو مفرور تھے، کہا جاتا تھا کہ وہ ایک نئی طاقت بن کر دوبارہ حملہ کرنے والے تھے۔ ان میں جاوا قبیلے کے سردار موغا کا جوان بیٹا شنگرال اور بیٹی نتالیہ شامل تھے، جس کے باپ کو کلی منجارو اور اس کے حلیف جنرل ایڈوانی نے ہلاک کر ڈالا تھا۔ جاوا قبیلے کا یہ مٹھی بھر جنگجو گروپ کہیں روپوش تھا۔ اگرچہ اس کی بھی تلاش جاری تھی تاکہ انہیں دوبارہ متحد ہونے اور اپنی طاقت کا اجتماع کرنے کا موقع نہ دیا جا سکے۔

کلی منجارو زیادہ وحشی قبیلہ تھا جو ان کا حلیف تھا جبکہ جاوا قبیلہ ان کی مصلوب رعایا کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کا اندازہ جاوا قبیلے کی ایک سیاہ فام عورت کے ساتھ کسی بہانے بات چیت پر ہوا تھا اور اسی نے کبیل دادا کو یہ ترکیب بتائی تھی کہ اگر کسی طرح کوڑی کا بھیس بھر کے ان کے ساتھ (محکوم جاوا قبیلے) مل جاؤں تو کسی حد تک وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر سکتا ہے۔

یہ وہی بدنصیب عورت تھی جو مجھے یہاں آتے ہوئے نظر آئی تھی اور اپنے گود کے بیمار بچے کو لے کر ہماری (رتن لال کی) جیپ کے سامنے فریاد کرتی ہوئی آ گئی تھی۔ اس کا بچہ بیمار تھا اور وہ اس کا علاج چاہتی تھی۔ مگر سنگ دل بلراج سنگھ نے اسے گولی مار دی تھی۔ اسی عورت نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر کبیل دادا کو کوڑھی کے بھیس میں اور جاوا قبیلے کے فرد کے روپ میں یہاں سے نکال لیا تھا۔ پہرا سخت تھا اسی لیے ابھی کبیل دادا اسی عورت کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ عورت کے ساتھ اس کی اشاروں کی زبان میں بات ہوتی تھی جو ایک طرح ''بین الاقوامی'' بولی کا ہی درجہ رکھتی ہے۔ اس مہربان جاوا عورت نے اپنے اور کبیل دادا کے سر پر دونوں ہاتھ رکھے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اب بھائی بہن ہیں۔ عورت کا شوہر کچھ ہی دن پہلے ایک خطرناک دماغی بیماری میں مبتلا ہو کر مر چکا تھا۔

کبیل دادا کی زبانی یہ ساری کتھا سننے کے بعد میں نے اسے اپنے بھی حالات سے مختصر لفظوں میں آگاہ کیا اس کے بعد اسے جنرل کے ایل ایڈوانی کے بارے میں اور اس طلسم نو ہیرے کے بارے میں بھی بتایا پھر میں نے اسے سوشیلا اور بشام چھلگری سے متعلق بھی بتایا۔ کبیل دادا یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔

''یار یہ کیسے پاگل اور جنونی لوگ ہیں......'' وہ بولا۔ ''کیا یہ نہیں جانتے کہ اگر اس طرح پوری دنیا کو جنگ کے دہانے میں دھکیلیں گے تو پھر خود کس سیارے میں رہیں گے؟''

اس کی بات سُن کر میں تلخی سے مسکرایا بولا۔ ''ہٹلر بھی اسی طرح جوع الارض کی حرص میں مبتلا تھا۔ کتنے لوگوں کو اس نے جنگ کی آگ میں جھونکا۔ لگتا ہے ان تینوں جنگی جرنیلوں کے اندر بھی ہٹلر کی روح حلول کر گئی ہے۔ ویسے یار کبیل دادا! انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ طویل عرصے تک آرام سے نہیں بیٹھ پاتا، یا پھر کائنات کا اُصول تغیر و تبدل کہ کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ جنگ تو پھر جنگ ہے...... رکی رہتی ہے تو برسوں امن رہتا ہے، ہوتی ہے تو اس کا سلسلہ نہیں رکتا......''

یہ کہہ کر میں رکا اور پھر پوچھا۔ ''یار......! یہ تو بتا تُو نے اب تک یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کیوں نہ کی؟ یا تجھے موقع نہ مل سکا؟''

''یہی سمجھ لے شہزی!'' وہ بولا۔ ''مجھے اپنی اور اول خیر وغیرہ کی رہائی کی فکر تھی اور یہاں سے فرار ہونا بہت مشکل ہی نہیں بلکہ جان لیوا بھی تھا۔ ان کلی منجارو حشیوں نے جگہ جگہ ایسے خطرناک ٹریپ نصب کر رکھے ہیں کہ مفرور وہاں جاتے ہی کسی اندھے جال یا ٹریپ کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اسی لیے میں دوسرے طریقے پر غور کر رہا تھا، جو ابھی سردست میرے دماغ میں نہیں آسکا تھا۔''

''تم فکر نہ کرو دادا......! شکر ہے خدا کا کہ ہم آپس میں مل گئے ہیں۔ اب کچھ سوچ سمجھ کر کوئی قدم اُٹھاتے ہیں۔ مجھے پہلے پتا چلانا ہوگا کہ آخر یہ جنگی جنونی ایڈوانی یہاں کر کیا رہا ہے؟ اور مجھے اس کے قبضے سے ہیرا بھی برآمد کرنا ہے جو ہمارے وطن کی امانت ہے۔''

میری بات پر کبیل دادا مسکرا کر بولا۔ ''تمہارے ملنے کے بعد تو مجھے بھی اُمید ہو چلی ہے کہ اب ہم جلد بہ دیر یہاں سے نکل ہی جائیں گے، مگر پھر بھی میرا مشورہ یہی ہوگا کہ ہمیں کسی قسم کی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ کیونکہ ابھی ہمارے لیے یہی بڑی کامیابی ہے کہ ہم بظاہر اب بھی ان کے قیدی ہیں، مگر یہاں سے نکلنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ہمیں ایک تحفظ تو ملا ہوا ہے کہ ہم نے مختلف بھیس بھر رکھا ہے۔ اسی میں رہتے ہوئے ہم آئندہ کوئی لائحہ عمل ترتیب دے سکتے ہیں۔'' وہ چند لمحے رکا پھر ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

''کاش! وہ مہربان جاوا عورت زندہ ہوتی تو ہمارے

بہت کام آسکتی تھی مگر...... افسوس۔''

اس کی بات پر اچانک میرے ذہن میں اس جاوا عورت کا بھی خیال ابھرا جس کا نام وجے نے باریہہ بتایا تھا اور وہ ہماری دوست تھی۔ میں نے کبیل دادا کو جب اس کے بارے میں بتایا تو وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''اگر ایسا ہے تو پھر تمہیں اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسانا چاہیے، وہ یقیناً ان کے راز سے بھی واقف ہوگی۔''

''وہ میرا پول بھی کھول کر مجھے کسی خطرے میں ڈال سکتی ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں یہ تو ہے، اس کے لیے تمہیں احتیاط سے اُسے شیشے میں اُتارنا ہوگا۔''

''میں اسی کوشش میں ہوں...... مگر میں باریہہ سے سامنا نہیں کرنا چاہتا، ابھی تھوڑی دیر میں وجے آجائے گا تو میری اس کے پاس جانے کی باری ہوگی مگر یار کبیل! ایسا نہیں ہوسکتا کہ تُو کسی طرح میری اول خیر اور شکیلہ سے ایک ملاقات کرا دے...... میری آنکھیں ترس گئی ہیں انہیں دیکھنے کو اور پھر یقیناً مجھے دیکھ کر انہیں بھی کافی حوصلہ ملے گا۔''

''تمہارے پاس آنے کا یہی تو میرا مقصد تھا۔ وجے آجائے تو چلیں گے۔'' کبیل دادا بولا۔

وقت گزرتا رہا۔ رات اپنے آخری پہر کی جانب گامزن تھی۔ اس کے ذرا دیر بعد ہی میں نے وجے کو آتے دیکھا جو ٹارچ کی روشنی لیے لڑکھڑاتے قدموں سے مڑھی کی جانب آرہا تھا۔ میں نے کبیل دادا کو ایک جانب کھسکا دیا اور خود پکھٹے پر جا چڑھا۔

جب وجے قریب آیا تو اس کے دوسرے ہاتھ میں ادھ بھری شراب کی بوتل تھی۔ ''جا اوئے...... اب تُو جا تیری باری ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں اس پر ایک عدد لعنت بھیجی اور بظاہر خوشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں تو خود اس کالی ملکہ کے پاس جانے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں یار! پر تُو نے خاصی دیر لگا دی۔''

وہ بدمست قہقہے لگاتا ہوا مڑھی کے اندر چلا گیا اور میں ٹارچ لیے آگے بڑھ گیا۔ گن میری پشت کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ میں کبیل دادا سے جا ملا، جو ذرا پاس ہی کی جھاڑیوں میں میرے انتظار میں دبکا بیٹھا تھا ہم آگے بڑھ گئے۔

کبیل دادا کو راستوں کا اندازہ تھا اور یہ بھی کہ کون سا راستہ زیادہ محفوظ تھا۔ وہ ایسے راستے پر مجھے لیے ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں ایک وسیع قطعہ اراضی پر بڑی بڑی چھولداریاں بنائی گئی تھیں۔ یہاں برائے نام پہرا نظر آتا تھا۔ اس کے بارے میں کبیل دادا نے مجھے یہی بتایا تھا کہ مفرور قیدیوں کے بھیانک انجام کے بعد ان قیدیوں نے فرار ہوکر مرنے کے بجائے بیگار کاٹنا اور رہائی کی اُمید لگا کر وقت گزارنا زیادہ بہتر سمجھا تھا، یوں بھی اندر وہ سب ڈنڈا بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

بہرحال کبیل دادا مجھے چھپتا چھپاتا ہوا ایک چھولداری میں لے آیا۔ اندر گھسے تو دیکھا سب ہی جانوروں کی طرح ادھر اُدھر پڑے ہوئے بے سدھ سو رہے تھے۔

''کیا شکیلہ کو بھی ان مردوں کے درمیان رکھا ہوا ہے؟'' میں نے بڑے کرب سے پوچھا۔

''نہیں...... وہ اس کے ساتھ والی چھولداری کے ایک ایسے گوشے میں ہے جہاں کچھ اور عورتیں بھی ہیں۔'' کبیل دادا نے بتایا اور میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔

اس وقت وہ مجھے اول خیر سے ملانے آیا تھا۔

''دادا......! ہمیں دیکھ کر کوئی قیدی جاگ کر شور ہی نہ مچادے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، یہ بے چارے سارا دن کے تھکے ہوئے ہوتے ہیں اور بے ہوش والی نیند سوئے ہوتے ہیں۔''

''لیکن یار! اول خیر اور شکیلہ کے لیے بھی کوئی ایسا بندوبست کردے کہ ان بے چاروں کو یہ سخت مشقت کاٹنا نہ پڑے......'' میں نے کہا۔

''ہاں! کل تک میں ان کا کچھ ایسا ہی بندوبست کرنے والا ہوں...... مگر مسئلہ یہ ہے کہ پہلے قیدیوں کی گنتی نہیں ہوا کرتی تھی۔ اب ہونے لگی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

چھولداری کے اندر بڑی گھٹن تھی۔ کہیں کسی مشعل کی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی، پورا ماحول ہی کسی جانوروں کے ریوڑ کا منظر پیش کرتا تھا۔ کبیل دادا اور میں سینے اور گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے ایک کونے میں آگئے اور وہاں میں نے اول خیر کو گول مول ہوکر ایک کھال نما لحاف لپیٹے سویا ہوا پایا تو بے اختیار میرا دل بھر آیا۔

''خود پر قابو پائے رکھنا شہزی! زیادہ جوش میں آنے کا مطلب آوازوں کا شور ہوگا جو باہر اُونگھتے ہوئے کسی پہرے دار کو اس طرف متوجہ کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔'' کبیل دادا نے مدھم سی روشنی میں میرے چہرے پر کرب نما کے آثار اُمڈتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

اس کے بعد اس نے اول خیر کا کھال والا لحاف

آہستگی سے ہٹایا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے جگا دیا۔ وہ کسمسا کر جاگا اور کبیل دادا نے سرگوشی میں اس سے کچھ کہا۔ وہ اپنی آنکھیں مسلتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ میری چھلکتی ہوئی نظریں اپنے یارِ بے بدل پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی متحیر سی نظریں مجھ پر۔ وہ بس یک ٹک مجھے دیکھے چلا گیا۔

''اول خیر......! کوئی آواز مت نکالنا...... یہ ہمارا شہزی ہے...... دیکھ خدا کی قدرت اور تقدیر کا تماشا......'' کبیل دادا نے ہولے سے اس سے کہا اور بس......اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ چکے تھے۔ ہمارے بدن جذبات کی شدت سے لرز رہے تھے۔ ہم منہ سے کچھ نہیں بول رہے تھے مگر ہمارے جسموں کی لرزتی ہوئی جنبش سے محبت و بے غرض دوستی کی جو لہریں پھوٹ رہی تھیں، وہ بہت سے ایسے حوالوں کا پتا دیتی محسوس ہوتی تھیں کہ میرے اور اول خیر کے درمیان کیسا رشتہ تھا۔

''او...... خیر...... کاکے......!'' میں نے اپنے کان میں جہاں اس کا چہرہ دبا ہوا تھا اس کی مخصوص آواز سنی اور میرا دل بھر آیا، میرا ابھی چہرہ اس کے ایک کاندھے پر کان کی سمت رکھا ہوا تھا، میں نے ہلکی سی لرزتی سرگوشی میں کہا۔

''جیو میرے یار......! تمہارے اس جملے کو سننے کے لیے تو میرے کان ترس گئے تھے۔''

کبیل دادا نے ہمیں بہت دھیرے سے ایک دوسرے سے الگ کیا اور بیک وقت دونوں کو ہی مخاطب کرتے ہوئے اپنے مخصوص ناصحانہ انداز میں بولا۔ ''اس گھڑی کو بہت جانو اور اچھے وقت کی اُمید اب مضبوط رکھو...... سب ٹھیک ہو جائے گا مگر اس کے لیے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے اور اس سے زیادہ احتیاط کی، ہم درندوں کی بستی میں موجود ہیں۔''

میں اور کبیل دادا تھوڑی دیر وہاں اول خیر کے پاس ٹھہرے رہے، اس کے بعد کبیل دادا مجھے لے جانے لگا تو اول خیر تڑپ کر بولا۔ ''یار دادا......! اتنی جلدی، ابھی تو اپنے شہزی کاکے کو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں ہے، ایک تو کم بخت روشنی بھی کم ہے پر اس کی خوشبو ہی میرے لیے بہت ہے، تھوڑا اور ٹھہر جا۔''

اس کی بات سن کر میرے ستے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سی پھسل گئی، تب کبیل اُسے حوصلہ دیتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ ''ہمت پکڑ یار، خیرے! شہزی اب ہمارے درمیان ہے، جانتا ہے ناں اپنے اس یار کو...... کیا شے ہے یہ...... اب آ گیا ہے، سمجھو سب ٹھیک ہو گیا۔'' اس کی بات پر اول خیر نے کچھ حوصلہ پکڑا۔

''ہم سب ایک دوسرے کے لیے حوصلے کا ہی درجہ رکھتے ہیں...... کوئی کسی سے کم نہیں، کبیل دادا نے بھی یہاں کچھ کم پالا نہیں مارا ہوا...... ان کے درمیان رہتے ہوئے ان کی بیخ کنی میں لگا ہوا ہے، انشاء اللہ ہم سب مل کر اپنا مشن انجام تک پہنچائیں گے۔'' میں نے کبیل دادا کی بات کے جواب میں یہ کہنا ضروری سمجھا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اول خیر اور کبیل دادا کے ملتے ہی خود میری اپنی ہمت سوا ہوئی تھی، بہت حوصلہ بڑھا تھا میرا۔

''میں اسے شکیلہ سے ملوانے لے جا رہا ہوں تاکہ اس بے چاری کو بھی کچھ حوصلہ ہو...... رب راکھا۔'' کبیل دادا نے کہا پھر ہم دونوں اس چھولداری سے باہر نکل آئے۔ ہر سو گہرے سناٹے اور خاموشی کا راج تھا۔ ہم دونوں چھولداریوں کے بیچ تنگ بل کھاتی سی جگہ پر رینگتے ہوئے ایک اور چھولداری کے پاس آ گئے، یہاں کبیل دادا نے پہلے ہی سے ایک چور سی جگہ بنا رکھی تھی، جو احاطے کے دور افتادہ کونے میں اور جنگل کے نسبتاً قریب تھی۔ اس طرف سرکنڈوں کے نکیلے بانسوں کی باڑ تھی۔ چھولداری کے نیچے کی جگہ تھوڑی کھدی ہوئی تھی اور ایک آدم گزار سا سوراخ بنا ہوا تھا۔ ہم دونوں باری باری اسی کے اندر رینگ گئے تھے۔

چھولداری کا یہ گوشہ نسبتاً چھوٹا تھا۔ کبیل دادا پہلے بھی ان کے پاس آتا جاتا رہا تھا۔ شکیلہ اسی سوراخ کے قریب ہی لیٹی ہوئی تھی۔

وہاں اریب قریب میں اور بھی عورتیں بے سدھ سی لیٹی ہوئی تھیں، ان سب نے کھالوں کے لحاف اوڑھ رکھے تھے۔

میں نے بڑی دکھ زدہ سی نظروں سے شکیلہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھال اوڑھے بے سدھ سی لیٹی ہوئی تھی۔ کبیل دادا نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے اسے جگایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لحاف ہٹایا اور کبیل دادا کے ساتھ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ مجھے پہچانی ہی نہیں، مگر جب کبیل دادا نے اس کے کان میں کچھ کہا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

وہ بھی خاصی کمزور نظر آ رہی تھی۔ کڑے اور کٹھن حالات اور جاں گسل لمحات میں اپنے آپ کو اب تک زندہ رکھے ہوئے شکیلہ نے بھی ہمت اور حوصلے کا دامن تھامے رکھا تھا۔ اس کے جسم پر کھال جیسا ہی کوئی ڈھیلا ڈھالا لباس تھا، جو گھٹنوں سے ذرا ہی اُوپر تھا۔ اس کے بال جو بھی دراز

اور ریشم کی طرح ملائم ہوا کرتے تھے، اب کھچڑی سے نظر آرہے تھے۔ چہرے پر کبھی شفق رنگ پھوٹا کرتے تھے، اب وہاں ایک اُداس چاند کی سی زردی پھیلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پھول سے ہونٹوں پہ کبھی لالی شوخ رنگ لیے ہر وقت دمکتی رہتی تھی وہاں اب ایک اُجاڑ سے کھنڈر میں گونجنے والی آہ و بکا کا منظر دکھاتی محسوس ہوتی تھی۔

''شش...... شہزی! ی ی...... تم ...... تم ہو...... تم ہی ہوناں......'' اس کے سوکھے لبوں پر ایک آہ سے مشابہ لرزتی آواز برآمد ہوئی تھی۔

اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ میں نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ میرے فراخ سینے پر اپنا سر رکھے رو پڑی۔ میں پیار اور شفقت بھرے انداز میں اس کے کھچڑی سے بالوں پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر اسی جذبات تلے اس کا گال چوما اور پیشانی پر بھی بوسہ دیا۔ وہ سسکے جارہی تھی۔ مجھے خود سے بھینچ کر روئے جارہی تھی۔ میں نے حوصلہ دیا اور کبیل دادا نے بھی اسے صبر اور ہمت کی تلقین کی، ساتھ موجودہ حالات کی نزاکت سے بھی اسے آگاہ کیا۔ بڑی مشکل سے شکیلہ نے خود کو سنبھالا تھا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن سی نظر آنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر تک سرگوشیوں ہم باتیں کرتے رہے پھر وہاں سے واپس ہولیے۔

کبیل دادا مجھے لیے آبادی والے حصے میں آ گیا، وہاں اس کی جھونپڑی تھی۔ ہم اس میں داخل ہو گئے۔ اندر ایک چربی کے تیل کا چراغ جل رہا تھا جس کی روشنی دانستہ دھیمی رکھی گئی تھی۔

کبیل دادا نے مجھے پانی پلایا اور کچھ کھانے کو بھی دیا۔ اول خیر اور شکیلہ سے ملنے کے بعد میرے دل و دماغ کو ایک بے چینی سی کھا گئی تھی۔ میں نے کبیل دادا سے کہا۔

''کبیل دادا! اب بہت جلد سے جلد ہم دونوں کو ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میں اول خیر اور شکیلہ کو مزید اس حالتِ زار میں نہیں دیکھ سکتا۔''

وہ میری بات سُن کر بولا۔ ''جی تو میرا بھی اپنے ساتھیوں کو اس حالت میں دیکھ کر کڑھتا ہے، حالانکہ تُو دیکھ ہی رہا ہے کہ خود میری اپنی کیا حالت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بے چارہ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھنے لگا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور چپ ہو رہا۔ میں نے اس سے اماں جی اور بابا جی کا حال لیا اس کے بعد زہرہ بانو کے بارے میں پوچھا۔

زہرہ بانو کے ذکر پر وہ میری طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں ہنسا اور بولا۔ ''میری بھی کیا تقدیر ہے یار شہزی! جب تُو نے میری برسوں پرانی خواہش پر عمل کرنے کا سوچا تو تقدیر نے ہمیں اتنے بڑے کٹھن چکر میں ڈال دیا اور یہ اہم بات اپنی جگہ ہی رہ گئی، پوری نہ ہو سکی، پھر سوچتا ہوں کہ اچھا ہی ہوا کہ یہ حقیقت بیگم صاحبہ (زہرہ بانو) کے کانوں تک نہیں پہنچی، وگرنہ وہ کہیں مجھ سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہی نا ہو جاتیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے منڈلانے لگے۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ زہرہ بانو سے اس کی خاموش اور یک طرفہ اُلفت کو دیکھتے ہوئے اور اس کے دل سے اپنے لیے غلط فہمی کو دور کرنے کی غرض سے میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ زہرہ بانو کی شادی کبیل دادا سے ہو جانی چاہیے، یوں زہرہ بانو کی تنہائی کا بھی حل نکل جاتا اور اماں جی کی خواہش بھی پوری ہو جاتی۔ کیونکہ میری طرح وہ بھی زہرہ بانو کو خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

بہرکیف میں نے ازراہ تسلی اس کے شانے کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''فکر کیوں کرتے ہو دادا......! شہزی نے تم سے اس کا وعدہ کر رکھا ہے۔ تقدیر ہمیں یہ نیک کام کرنے کا بھی ایک دن موقع ضرور دے گی...... بس، ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ تُو اپنا دل چھوٹا نہ کر اور بتا مجھے وہاں پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟ وزیر جان پکڑا گیا؟ اُس بھارتی جاسوس سندر داس سکینہ کا کیا ہوا؟ چوہدری ممتاز وغیرہ...... اور زبیر خان عرف خان جی صاحب...... ایڈووکیٹ خانم شاہ......؟ بہت سے لوگ ہیں کن کن کے نام لوں......'' میں جوش تلے کہتا چلا گیا اور ساتھ ہی۔ کبیل دادا کا چہرہ تکنے لگا جہاں مجھے ایکا ایکی گہری سنجیدگی کے آثار اُمڈتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ یک دم تاریک سا پڑنے لگا، یوں لگتا تھا جیسے وہ ان کے متعلق کوئی اہم خبر اپنے سینے میں رکھے ہوئے تھا، پھر میری طرف دیکھ کر گھٹے گھٹے اور بہت عجیب سے لہجے میں بولا۔

''شہزی......! تمہیں چوہدری ممتاز خان کی بیٹی...... نوشابہ یاد ہے......؟''

نجانے کیوں کبیل دادا کے اس انداز سے پوچھنے پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ہملٹن برگٹ کی نظریں جھاڑیوں پر پڑی ہوئی عورت کی لاش پر سے ہوتی ہوئی اس شخص پر چلی گئیں جو سوئمنگ پول کے گرد بنی ہوئی اینٹوں کی دیوار پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بازو دو چھوٹی بچیوں کے گرد ڈال رکھے تھے جن کی عمریں پانچ اور سات سال ہوں گی۔ وہ اس کے گھٹنوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اٹلانٹا پولیس ڈپارٹمنٹ کے سراغ رساں ڈیریس ڈیون پورٹ نے ان کے بارے میں بتایا۔ ”یہ لوگ ٹین کے ڈبے جمع کررہے تھے جب اس آدمی

رقابت اور انتقام کو کوئی بھی روپ دیا جائے... اس کے حتمی نتائج تباہی کی صورت میں ہی سامنے آتے ہیں... قتل کی ایسی ہی ایک واردات کا ماجرا... واقعات اور جزئیات اسے خودکشی ظاہر کررہے تھے... مگر سراغ رساں کی سوچوں کا دائرہ مختلف سمتوں میں گھوم رہا تھا...

قدرت اور حقیقت کے بھیدوں میں مقید کہانی کے اسرار و رموز...

قدرت کا انعام

جمال دستی

نے یہ لاش دیکھی۔ تم جانتے ہو کہ ڈبوں میں بند اشیا غریبوں کے لیے ہوتی ہیں۔“
ہملٹن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ان بچوں کو امید ہے کہ کرسمس کے موقع پر انہیں اچھے خاصے ڈبے مل جائیں گے۔“
ایک بار پھر ہملٹن کے سینے میں درد کی لہر اٹھی۔ گو کہ اب ایسا بہت کم ہوتا تھا لیکن کرسمس کوٹ پہنی ہوئی بڑی لڑکی کو دیکھ کر اسے نو برس پہلے کا کرسمس یاد آ گیا جب وہ اپنی بیٹی ماریا کے کمرے میں یہ دیکھنے گیا تھا کہ وہ اب تک بیدار کیوں نہیں ہوئی حالانکہ گھر میں وہی سب سے پہلے یہ دیکھنے کے لیے اٹھ جاتی تھی کہ سانتا اس بار کیا لے کر آیا ہے۔ اس نے ان دردناک یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور ایک آنسو اس کے گال پر بہہ نکلا۔
ڈیون پورٹ نے کہا۔ ”یہ تمہارا کیس ہے۔“
ہملٹن کا دھیان کسی اور جانب تھا، وہ بولا۔ ”کیا؟“
ڈیون پورٹ نے جھاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ عورت لاپتا تھی؟“
”سرکاری طور پر تو نہیں۔ یہ میری بیوی کی شاگردوں میں سے ایک ہے۔ جب وہ جمعے کی شب کلاس میں نہیں آئی تو میری بیوی نے اس کا پتا کرنے کے لیے کہا۔ میں نے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میری بیوی کا کہنا ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ کچھ مسائل تھے۔ اس کا نام سارہ ٹروڈ ہے۔ عمر چھبیس سال اور یہ اپنی ماں کے ساتھ بک ہیڈ میں رہتی تھی۔“
ہملٹن کا تعلق اٹلانٹا پولیس کے لاپتا افراد کے شعبے سے تھا۔ اسے ایک نوجوان افسر کی خدمات حاصل تھیں۔ لیکن وہ تمام تفتیش خود ہی کیا کرتا تھا۔ اس شعبے میں اس کا تبادلہ ایک چھ سالہ لڑکی کی جان بچانے پر ہوا تھا جس پر اسے ایوارڈ بھی ملا۔ اس کی ریٹائرمنٹ زیادہ دور نہیں تھی اور وہ لاپتا افراد کے پچانوے فیصد کیس حل کر چکا تھا جنہیں اس نے بغیر کوئی نقصان پہنچے بازیاب کرا لیا تھا لیکن سارہ ان پچانوے فیصد خوش نصیبوں میں شامل نہیں تھی۔
اب ہملٹن کی نظریں لاش سے ہٹ کر عمارت کی بالائی منزل پر مرکوز ہو گئیں۔ یونیورسٹی گارڈنز اپارٹمنٹ کی یہ عمارت چھ منزلہ تھی اور ہر اپارٹمنٹ میں اپنی ایک الگ بالکونی تھی۔ ”تمہارا اندازہ ہے کہ یہ وہاں سے گری ہے؟“
”ان جھاڑیوں کی ٹوٹ پھوٹ سے تو یہی لگتا ہے کہ یہ کافی بلندی سے نیچے آئی ہے۔ ڈیون پورٹ بولا۔ ”فوری طور پر ہم یہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ چھٹی منزل سے نیچے گری ہے۔ ہم یہاں سے بھی دیکھ سکتے ہیں کہ بالکونی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔“ پھر وہ ہملٹن کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس عمارت میں طالب علم رہتے ہیں۔ زیادہ تر کا تعلق جارجیا اسٹیٹ ٹیکنالوجی اور ایموری یونیورسٹی سے ہے۔ اس منزل پر رہنے والی ایک عورت نے بتایا ہے کہ اس اپارٹمنٹ کی کرائے دار ایک ہفتے پہلے چلی گئی تھی اور اس کا خیال ہے کہ غالباً وہ اپنے والدین کے پاس کرسمس منانے گئی ہے۔ منیجر نے بھی یہی بتایا ہے کہ زیادہ تر کرائے دار چھٹیاں منانے اپنے گھروں کو گئے ہوئے ہیں۔“
”شاید اسی لیے ابھی تک کسی نے اس کی لاش نہیں دیکھی۔“ یہ پیر کی شب تھی اور سارہ جمعے سے غائب ہے۔ میڈیکل ایگزامنر کا کہنا ہے کہ اسے مرے ہوئے کئی دن ہو گئے ہیں۔“
”ہم نے مالک مکان سے کہہ دیا تھا کہ وہ سیکیورٹی وجوہات کی بنا پر بالکونی کے کھلے ہوئے دروازے کو بند کر دے اور ہم اس کے ساتھ دیکھنے گئے تھے کہ وہ محفوظ ہے۔“
ڈیون پورٹ نے کہا۔ ”ایک چھوٹی میز بالکونی کے ساتھ رکھی ہوئی تھی اور فرش پر ایک ٹوٹا ہوا گلاس پڑا ہوا تھا۔ شاید اس میں تھوڑی سی روسی شراب تھی۔ ہم نے کچن کے کاؤنٹر پر ووڈکا کی بوتل اور کریم کا کارٹن بھی دیکھا۔“
ہملٹن نے سب سے اوپر کی بالکونی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کیا منیجر موجود ہے؟ مجھے تو اب بھی وہ جگہ غیر محفوظ لگ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ ہمیں دوبارہ چیک کرنے کے لیے ایک بار پھر اوپر جانا پڑے۔“
منیجر کے کہنے کے مطابق چھٹی منزل پر واقع اپارٹمنٹ کی کرائے دار کا نام کیرولین مائیکل تھا اور یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ وہ راک اینڈ رول کی دیوانی تھی۔ دیواروں پر راک کنسرٹ کے عجیب و غریب تشہیری پوسٹرز لگے ہوئے تھے۔ لیونگ روم کی ایک دیوار پر اوپر سے نیچے تک فریم شدہ تصویروں کی قطاریں تھیں جن میں ایک نوجوان عورت رابرٹ پلانٹ اور ریڈ جیسے اسٹارز کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ دوسری تصویروں میں نوجوان مردوں کے ساتھ تھی جنہیں ہملٹن نہیں پہچانتا تھا لیکن اس کا اندازہ تھا کہ وہ بھی موسیقار ہوں گے۔
ہملٹن، ڈیون پورٹ اور منیجر کے ساتھ بالکونی میں کھڑا ہوا تھا۔ ڈیون پورٹ بولا۔ ”تمہارا کہنا ہے کہ اس کے کچھ مسائل تھے؟“

"یہ میری بیوی نے بتایا تھا۔" ہملٹن بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اسے ڈپریشن تھا لیکن میرے پاس ابھی تک اس کی تفصیل نہیں ہے۔ اس کی ماں کو تھوڑا بہت جانتا ہوں کیونکہ وہ میری بیوی کی دوست ہے لیکن اس کی بیٹی سے کبھی نہیں ملا۔"

"ممکن ہے اس نے چھلانگ لگائی ہو۔" ڈیون پورٹ نے برابر میں رکھی ہوئی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "شاید اس پر کھڑے ہو کر۔"

اپارٹمنٹ کا منیجر بولا۔ "شاید وہ نشے میں تھی اس لیے بالکونی سے گر پڑی۔"

ڈیون پورٹ نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن فی الحال کچھ کہنا مشکل ہے۔ موت کے بعد الکحل کی مقدار کا درست اندازہ نہیں ہوتا۔ خاص طور پر کچھ دن گزرنے کے بعد۔" پھر وہ ہملٹن سے بولا۔ "تم جائے وقوعہ کے معائنے سے مطمئن ہو؟"

ہملٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ریلنگ پر جھکا ہوا ایک نئی عمارت پر ہونے والا چراغاں دیکھ رہا تھا۔ اس کی ماریا کو بھی کرسمس کی روشنیوں سے بڑی عقیدت تھی۔

"ہملٹن، تم آرہے ہو؟" ڈیون پورٹ نے سلائڈنگ ڈور کے پاس کھڑے ہو کر منیجر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ اپارٹمنٹ کو تالا لگانا چاہ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں۔" ہملٹن نے کہا۔ جب وہ کچن کے پاس سے گزر رہے تھے تو وہ ایک بار پھر رک گیا اور ووڈکا کی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تم یہ یہیں چھوڑ کر جا رہے ہو؟"

ڈیون پورٹ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ کرائے دار کی ہیں۔ وہ انہیں رکھنا چاہتی ہوگی۔"

ہملٹن اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ واپس کچن میں گیا اور ردی کی ٹوکری میں جھانکنے لگا۔ اسے وسط شہر میں واقع ایک شراب کی دکان کی رسید مل گئی۔ اس کے مطابق یہ بوتلیں گزشتہ جمعہ خریدی گئی تھیں۔ یعنی جس دن سارہ غائب ہوئی تھی اور اس کے کئی دن بعد کرائے دار شہر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ہملٹن نے وہ رسید اپنی جیب میں رکھ لی۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی ٹوری نے اس کے لیے گرم چاکلیٹ بنائی ہوئی تھی۔ اس نے بیوی کے افسردہ چہرے کو دیکھا اور ماحول کی کشیدگی کم کرنے کے لیے کہا۔ "لوگوں نے دل کھول کر چراغاں کیا ہے۔ دیکھ لینا، اس بار بجلی کا بل کتنا زیادہ آئے گا۔"

ٹوری اپنی آنکھ سے بہتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ "لوسی تو یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائے گی۔"

ہملٹن نے بیوی کی طرف دیکھا۔ لوسی ٹروڈ مرنے والی لڑکی کی ماں تھی اور اس کی بیوی ٹوری، جارجیا اسٹیٹ یونیورسٹی کے فلم اور ویڈیو ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر تھی اور ہفتے میں دو مرتبہ اٹلانٹا اکیڈمی تھیٹر کے لیے ایکٹنگ کلاس لیتی تھی۔ لوسی ابتدا سے ہی اس کلاس کی طالب علم تھی اور اس طرح ان میں دوستی ہوگئی تھی۔ وہ اکثر کلاس شروع ہونے سے پہلے ڈنر یا بعد میں کافی کے دوران ملا کرتی تھیں۔

لوسی اکثر اپنی چھبیس سالہ بیٹی سارہ کے حوالے سے پریشانیوں کا ذکر بیان کرتی رہتی تھی۔ چار سال پہلے سارہ روحانیت کی طرف مائل ہو کر اس سے دور ہوگئی تھی۔ اس نے اٹلانٹا کے چڑیا گھر میں جز وقتی ملازمت حاصل کرلی تھی اور وہ ایموری یونیورسٹی کے بزنس اسکول سے ڈگری حاصل کرنا چاہ رہی تھی جبکہ لوسی گزشتہ دو سال سے کوشش کر رہی تھی کہ وہ ایکٹنگ کلاس میں داخلہ لے لے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس طرح وہ اپنے خول سے باہر آجائے۔ دو ہفتے قبل وہ غائب ہوگئی۔ اس کی ماں حیران تھی کہ جب وہ ایکٹنگ کلاس میں داخلہ لینے پر رضامند ہوگئی تھی تو وہاں کیوں نہیں پہنچی۔

ٹوری نے کہا۔ "تمہارے خیال میں یہ ایک حادثہ ہے؟"

"یہ ایک حادثہ ہو سکتا ہے یا اس نے خود ہی چھلانگ لگائی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نے اسے دھکا دیا ہو۔"

"قتل؟ میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔ وہ اتنی افسردہ تھی کہ میں اس کے بارے میں پریشان رہنے لگی تھی۔ ضرور کوئی اور بات ہوگی۔"

"فی الحال تو ہم امکانات پر ہی غور کر رہے ہیں۔"

"بے چاری لوسی۔" ٹوری نے منہ بنایا اور بولی۔ "تمہیں معلوم کرنا ہوگا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا؟"

ہملٹن جانتا تھا کہ اپنی دوست کے بارے میں اس کی بیوی کی پریشانی حقیقی ہے لیکن اس کا دکھ زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ ٹوری اور ہملٹن بھی اپنی بیٹی سے محروم ہو چکے تھے اور اتنے برس گزر جانے کے باوجود بھی انہیں ماریا کے مرنے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ ٹوری نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ اگر وہ اپنی بیٹی پر زیادہ توجہ دیتی تو اس کی جان بچائی جا سکتی تھی۔ اس نے اس احساس سے نجات حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کی تھی اور ہملٹن کو ڈر تھا کہ سارہ کی موت جن غیر یقینی

حالات میں ہوئی، اس سے یہ دبا ہوا جرم ایک بار پھر ظاہر ہو جائے گا۔

''کیا سارہ کسی سے مدد لے رہی تھی؟''

''تمہارا مطلب مشاورت سے ہے، نہیں۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے فیملی ڈاکٹر نے ڈپریشن کے لیے کچھ دوائیں تجویز کی تھیں۔ وہ کیتھولک ہیں اور لوسی کا کہنا ہے کہ سارہ کافی وقت پادری کے ساتھ گزارتی تھی۔''

ہملٹن نے اپنی پیالی اور خالی جگ اٹھایا اور بولا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ کل تم لوسی سے ملوگی لیکن صبح اس سے فون کر کے پوچھنا کہ سارہ کس چرچ میں جاتی تھی۔''

سینٹ انٹیئس، جنوب مغربی اٹلانٹا میں واقع ایک کیتھولک مشن تھا۔ جس میں سات عمارتیں تھیں اور سب سے بڑی وسطی عمارت میں چرچ بنایا گیا تھا۔ صدر دروازے پر آویزاں عبارت سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مشن کی عارضی عمارت ہے جبکہ مستقل عمارت کی تعمیر نو کا کام جاری تھا۔

فادر پی بوڈی بید کی بنی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے والی میز پر بہت سی فائلیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی داڑھی کہیں کہیں سے سفید ہو رہی تھی۔ ہملٹن نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر ساٹھ ستر کے لگ بھگ ہوگی۔

اس نے سارہ کی موت کی خبر سن کر آنکھیں بند کر لیں پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہوا تھا؟''

ہملٹن نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور بولا۔ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ تمہیں اس کی موت کا سن کر حیرت نہیں ہوئی۔ تم اتنے پُرسکون لگ رہے ہو جیسے تمہیں اس کی توقع تھی۔''

پادری نے اپنی پلکیں جھپکائیں اور اپنا سوال دہراتے ہوئے بولا۔ ''اس کی موت کس طرح واقع ہوئی؟''

''یہی تو میں بھی معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' ہملٹن نے جائے وقوعہ کا منظر بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ماں کا کہنا ہے کہ چند برس قبل اس میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ وہ الگ تھلگ اور افسردہ رہنے لگی اور بظاہر اسے تمہارے پاس سکون ملتا تھا۔''

پادری نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے کوئی مشورہ نہیں دیا بلکہ میں پادری ہوں اور یہ اعتراف گاہ ہے۔''

کیتھولک چرچ کے بارے میں ہملٹن کی معلومات محدود تھی لیکن وہ اعترافِ گناہ کے بارے میں جانتا تھا۔ اس نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ''میری بیوی سارہ کی ماں کو جانتی ہے۔ ہم اسے اپنا ذاتی دکھ سمجھتے ہیں۔ ہماری بیٹی سات سال کی عمر میں اس دنیا سے چلی گئی تھی۔ میں نے کرسمس کی صبح ماریا کو اس کے بستر میں مردہ پایا۔ کوئی نہیں بتا سکا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی۔ میری بیوی نہیں چاہتی کہ سارہ کی ماں بھی اسی کرب سے گزرے۔ میرا مطلب ہے کہ اسے اپنی بیٹی کی موت کی وجہ معلوم ہونا چاہیے۔ سارہ کی ماں کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

فادر اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔ ''معافی چاہتا ہوں۔''

''اعترافی بیان کے علاوہ کوئی بات تمہارے علم میں ہو؟''

''میں کوئی اشارہ نہیں دے سکتا۔''

''میں تم سے یہ نہیں کہہ رہا۔ میں کسی ایسی عام گفتگو کی بات کر رہا ہوں جو کسی پسندیدہ شخص کے بارے میں نہ ہو۔'' پادری نے پھر بھی کچھ نہیں کہا تو ہملٹن اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اسے اپنا کارڈ دیتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمہیں کچھ معلوم ہو جائے تو مجھے ضرور بتانا۔''

جب وہ دروازے کی طرف جانے لگا تو اس نے پادری کو کہتے ہوئے سنا۔ ''ایک بات ضرور ہوئی تھی۔'' ہملٹن کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ اس لمحے کو ضائع کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

''اعتراف گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ہماری دو مرتبہ گفتگو ہوئی تھی۔ موسیقی اور راک اینڈ رول کے بارے میں۔ یہاں آنے سے پہلے ساٹھ کے عشرے میں خود بھی روڈی ہوا کرتا تھا۔ وہ پرانی موسیقی کی دلدادہ تھی اس وجہ سے ہمارے درمیان ایک طرح کا تعلق قائم ہو گیا۔''

ہملٹن کو کیرولین مائیکل کا خیال آیا جس کے اپارٹمنٹ کی دیواریں پرانے گلوکاروں کی تصاویر سے بھری ہوئی تھیں اور اب پادری بتا رہا تھا کہ سارہ بھی پرانی موسیقی کی دیوانی تھی۔ ممکن ہے کہ باہمی دلچسپی کی بنا پر وہ دونوں دوست ہوں اور سارہ اسی تعلق کی بنا پر اس کے اپارٹمنٹ میں گئی ہو۔ اس تعلق کے بارے میں جاننے کے لیے اسے کیرولین مائیکل سے بات کرنا ہوگی لیکن اس سے پہلے وہ اس کے اپارٹمنٹ میں جانا چاہ رہا تھا۔

وہ ابھی اپنی انیس سو پچاسی ماڈل کی کیمارو میں سوار ہوا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری جانب سے اس کا دفتری معاون بل رابرٹ بول رہا تھا۔ ''کرک وڈ میں رہنے والا چار سالہ ہسپانوی لڑکا گم ہو گیا ہے۔ فی الحال مزید تفصیلات نہیں معلوم ہو سکیں۔ پولیس وہاں پہنچ چکی ہے۔''

ہملٹن نے اسٹیئرنگ وہیل پر انگلیاں جماتے ہوئے کہا۔ ''جائے وقوعہ پر موجود اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ تمہیں تازہ ترین صورت حال سے مطلع کرتے رہیں۔ جب تمہیں یہ معلومات مل جائیں تو مجھے بتا دینا۔''

بل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

ہملٹن اس کی ہچکچاہٹ کا مطلب سمجھ گیا۔ دراصل وہ خود جائے وقوعہ پر فوراً پہنچا کرتا تھا اگر کسی بچے کا معاملہ ہو۔ اس نے کہا۔ ''دیکھو بل، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دراصل میں کسی اور کیس پر کام کر رہا ہوں۔''

''تمہارے پاس ایک اور کیس بھی ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں۔''

ہملٹن یہ وضاحت نہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ سارہ کو کیوں تلاش کر رہا ہے جبکہ وہ مر چکی تھی۔ چنانچہ اس نے کہانی کا صرف ایک حصہ سنانا ضروری سمجھا۔ ''وہ گزشتہ جمعہ لاپتا ہوئی تھی اور وہ میری بیوی کی دوست کی بیٹی ہے لیکن ابھی یہ کیس سرکاری طور پر مجھے نہیں ملا۔''

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اس نے سراغ رساں ڈیون پورٹ کو فون کر کے پوچھا کہ کیا اس کی کیرولین سے بات ہو گئی ہے۔ اس نے جواب میں کہا۔ ''میں نے آج صبح پہلا کام یہی کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے سارہ ٹروڈ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ گزشتہ بدھ سے اپنے ہائی اسکول کے کچھ دوستوں کے ساتھ سینٹ سیمسن آئی لینڈ گئی ہوئی تھی۔ وہ جگہ یہاں سے چھ گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ وہ گزشتہ رات ہی میکون میں واقع اپنے والدین کے گھر واپس آئی ہے۔ اگر اس کے دوست تصدیق کر دیں تو جائے وقوعہ سے اس کی غیر موجودگی ثابت ہو جائے گی۔ لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہم اس حادثے کو خودکشی یا نشے کی حالت میں گرنا سمجھ رہے ہیں۔''

''تم نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا؟'' ہملٹن نے پوچھا۔

ڈیون پورٹ نے گنوانا شروع کیا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ جائے وقوعہ سے کوئی ہتھیار نہیں ملا۔ دوسرے یہ کہ مرنے والی کی لاش پر کوئی مہلک زخم نہیں ہے۔ سوائے اس ٹوٹ

شیخیاں

تین لڑکے اپنے اپنے والد کے تیزی سے کام کرنے کی شیخی بگھار رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''میرے ڈیڈی جب کسی نشانے پر تیر چلاتے ہیں تو تیر کے اس تک پہنچنے سے پہلے وہاں جا پہنچتے ہیں۔''

دوسرے نے کہا۔ ''میرے ڈیڈی سو گز کے فاصلے سے ہرن کو گولی کا نشانہ بناتے ہیں اور ہرن کے گرنے سے پہلے اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔''

تیسرا بولا۔ ''میرے ڈیڈی سرکاری ملازم ہیں اور ان کے آفس کا وقت ساڑھے چار بجے ختم ہوتا ہے لیکن وہ پونے چار بجے گھر پہنچ جاتے ہیں۔''

کراچی سے منال خان کا تعاون

پرانی کاروں کا ڈیلر گاہک سے: ''یہ کار بہت ہی کم چلی ہے۔ اس کا مالک اسے صرف اسی وقت چلاتا تھا جب یہ اسٹارٹ ہوتی تھی۔''

لاہور سے نگہت پروین کا تعاون

پھوٹ کے جو بلندی سے نیچے گرنے میں ہو سکتی ہے۔ تیسری بات یہ کہ اس کی ماں کے کہنے کے مطابق وہ لڑکی افسردگی کا شکار تھی۔ اس لیے اس نے چھلانگ لگا دی یا نشے کی حالت میں گر گئی۔''

ہملٹن نے کہا۔ ''میں ایک بار پھر کیرولین کے اپارٹمنٹ میں جانا چاہتا ہوں۔ تم منیجر کو فون کر کے اس کا انتظام کر دو اور مجھے بھی بتاؤ کہ کس وقت وہاں جا سکتا ہوں۔''

ایک لمحے خاموشی رہی پھر ڈیون پورٹ بولا۔ ''میں نے ابھی ابھی ایک بچے کی گمشدگی کے بارے میں سنا ہے۔''

ہملٹن نے اپنے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔ ''میں اس پر بھی کام کر رہا ہوں۔ تم منیجر کو فون کر دو۔''

''اسے فون کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ ہمیں وارنٹ کے بغیر دوبارہ اپارٹمنٹ میں نہیں جانے دے گا۔''

''ٹھیک ہے پھر میں کرائے دار سے اجازت لیتا ہوں، اس کا نمبر بتاؤ۔''

ڈیون پورٹ نے اسے کیرولین مائیکل کا نمبر دے دیا لیکن ہملٹن نے اسے فوراً ہی فون نہیں کیا بلکہ گمشدہ بچے کے بارے میں جاننے کے لیے کرک وڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے معاون بل رابرٹ کو فون کر کے وہاں کا پتا اور محل وقوع دریافت کیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو بچہ مل چکا تھا۔ دراصل اس کی ہسپانوی ماں اور اینگلو امریکن پڑوسی کے درمیان زبان کی وجہ سے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اس لیے پڑوسی نے عجلت سے کام لیتے ہوئے پولیس کو اطلاع دے دی۔

ہملٹن واپس اپنی کار میں آ کر بیٹھ گیا اور کیرولین کا نمبر ملایا۔ وہ ناراض ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں پہلے ہی سراغ رساں کو بتا چکی ہوں کہ سارہ ٹروڈ نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتی اور مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ وہ میرے اپارٹمنٹ میں کیوں آئی ہوگی۔''

''میں سمجھتا ہوں۔ میں نے تمہیں اس لیے فون نہیں کیا ہے۔''

''پھر؟''

''میں تمہارے اپارٹمنٹ میں گیا تھا اور بتا سکتا ہوں کہ تمہیں موسیقی سے بہت لگاؤ ہے۔''

''کیا یہ کوئی جرم ہے؟''

''دیکھو، اس معاملے کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کم از کم فی الحال نہیں لیکن اگر تم تعاون کرنا نہیں چاہتیں تو میں اپنا ذہن تبدیل کر سکتا ہوں۔ میں صرف ایک بار اور تمہارا اپارٹمنٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے وارنٹ بھی لیا جا سکتا ہے لیکن اگر تم مجھے اجازت دے دو گی تو میرا وقت بچ جائے گا۔''

وارنٹ والی بات محض اسے بے وقوف بنانے کے لیے کہی گئی تھی لیکن وہ اسے سمجھ نہ سکی اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''میں وہاں موجود رہنا چاہتی ہوں۔''

''تمہیں اتنا طویل فاصلہ طے کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اپنے منیجر سے کہہ دو کہ وہ مجھے اپارٹمنٹ میں جانے دے۔''

کیرولین نے کہا۔ ''میں سات بجے تک وہاں پہنچ جاؤں گی۔''

ہملٹن کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اپنے لیے کرسمس کی خریداری کر سکے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا۔ کیرولین نے اپنی گاڑی اسٹریٹ لائٹ کے نیچے پارک کی۔ وہ بالکل اپنی تصویروں کے مانند نظر آ رہی تھی۔ پانچ فٹ دو انچ قد۔ ایش براؤن بال۔ وہ ہالی ووڈ اداکارہ میگ ریان سے بے حد مشابہت رکھتی تھی۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی لہٰذا وہ گاڑی سے کوٹ نکال کر پہننے لگی۔ ہملٹن اچانک ہی اس کے سامنے آ کر بولا۔

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم کیرولین مائیکل ہو؟''

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم وہی پولیس والے ہو؟''

''ہاں، وہ میں ہی تھا۔ ہملٹن برگٹ۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا بیج دکھایا۔

وہ اسے گھورتے ہوئے عمارت کی طرف بڑھ گئی۔

لفٹ کے ذریعے وہ چھٹی منزل تک پہنچے لیکن وہ اپنے دروازے پر نہیں گی بلکہ دو دروازے چھوڑ کر دیوار کے وسط میں لگے ہوئے ایک پینل پر گئی۔ اس کا دروازہ کھولا اور اس میں سے ایک چابی نکال لی۔ ہملٹن نے دیکھا کہ دروازے پر لفظ کیبل لکھا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ ''تم اپنی چابی یہاں بھول گئی تھیں؟''

''میں کبھی چابی اپنے ساتھ نہیں رکھتی۔ ورنہ کہیں پھینک دوں گی۔''

''تم کب سے یہ چابی یہاں رکھ رہی ہو؟''

''جب سے یہاں آئی ہوں۔''

''تمہیں یہاں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟''

''تمہارے لیے یہ جاننا کیوں ضروری ہے؟''

''تم کالج کی طالب علم ہو اور تمہیں اتنا ذہین تو ہونا چاہیے کہ میں یہ کیوں معلوم کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ چار سال پہلے۔''

کیرولین نے دروازہ کھولا۔ اس کی نظر ووڈکا کی بوتل اور کریم کے جار پر گئی تو وہ بولی۔ ''یہ چیزیں میری نہیں ہیں'' پھر وہ ہملٹن کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں انہیں اپنے پاس رکھ سکتی ہوں۔''

''ابھی نہیں۔ جب ہمارا کام ختم ہو جائے تو یہ سب تمہاری ہی ہوں گی۔''

کیرولین کا منہ بن گیا تو ہملٹن نے کہا۔ ''میں یہاں کی ہر چیز دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمام کمرے، فرنیچر، الماریاں اور دروازے وغیرہ۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

وہ خاموش کھڑی رہی۔ ہملٹن پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اس لڑکی کا سارہ کی موت سے کوئی تعلق نہیں۔ کچن کے

کاؤنٹر پر رکھی ووڈکا کی بوتل اور کریم دیکھ کر اس کی حیرانی مصنوعی نہیں تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ وہ اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی کے بارے میں کیے گئے سوالات کے جواب کیوں نہیں دینا چاہ رہی تھی۔ وہ اس کے خوف کو محسوس کرسکتا تھا چنانچہ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''میں صرف یہ معلوم کرنا چاہ رہا ہوں کہ سارہ کے ساتھ کیا گزری۔ جن چیزوں کا سارہ کی موت سے کوئی تعلق نہیں، انہیں مکمل طور پر نظرانداز کردوں گا۔''

ہملٹن کو اپارٹمنٹ میں اپنی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں ملی۔ چھوٹی میز ابھی تک الٹی ہوئی تھی اور اس کے برابر میں وہی شیشے کا گلاس ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ کیرولین کا کہنا تھا کہ یہ گڑبڑ اس کے جانے کے بعد ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بالکونی پر کوئی اور غیر معمولی چیز یا نشانات نظر نہیں آئے۔ اندر آکر اس نے بند کرنے کے لیے سلائڈنگ ڈور کھینچا لیکن راستے میں پڑی ہوئی ایک چیز دیکھ کر رک گیا۔ وہ دھات یا پلاسٹک کا بنا ہوا کوئی ٹکڑا تھا۔ اس نے قریب ہوکر دیکھا لیکن وہ کوئی اور چیز تھی۔ اس نے کیرولین سے کہا۔ ''تمہارے پاس کوئی چمٹی ہوگی؟''

وہ سر ہلاتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ہملٹن نے جیب سے فون نکال کر اس چیز کی کئی تصویریں بنائیں پھر چمٹی سے پکڑ کر اسے اٹھالیا اور بولا۔ ''بریسلیٹ کی طرح لگ رہا ہے۔ یہ تمہارا تو نہیں؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرے پاس ایسا کوئی بریسلیٹ نہیں ہے۔''

''کیا تم مجھے ایک لفافہ دے سکتی ہو؟''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''تمہاری تیاری مکمل نہیں ہے۔ کیا تم واقعی سراغ رساں ہو؟''

ہملٹن کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔ ''ان دنوں میں لاپتا افراد کی تلاش پر مامور ہوں اور اس میں اس طرح کی تحقیقات کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

وہ ایک لفافہ لے کر آئی اور ہملٹن نے وہ بریسلیٹ اس میں رکھ کر لفافہ سربمہر کردیا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارے تعاون کو سراہتا ہوں۔ تم واقعی......''

''ایک منٹ......'' وہ دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یہ تصویریں بہت پسند ہیں اور میں انہیں ہر وقت دیکھتی رہتی ہوں۔ ان میں ایک کم ہے۔'' وہ نچلی قطار کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''وہ میری اور گریگ ایلمین کی تصویر ہے۔''

ہملٹن کو گریگ ایلمین کی شکل یاد نہیں تھی۔ اس لیے وہ صرف اچھا ہی کہہ سکا۔ وہ کچھ دیر سر پکڑے بیٹھی رہی پھر زور سے بولی۔ ''ہولس بیکر!''

''یہ کون ہے؟''

''ہاں، میری ہولس بیکر کے ساتھ تصویر تھی۔ کسی نے وہ چرالی۔''

اگلی صبح ہملٹن اور ٹوری اپنے گھر کے دفتر میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ جس پر ایک تصویر نظر آرہی تھی جو کیرولین مائیکل کی دیوار سے چرائی گئی تھی۔ اسے یہ بات بہت بُری لگی کہ کسی نے اس کی چیزوں کے ساتھ چھیڑ خانی کی تھی۔ اس کے پاس اس تصویر کی کاپی اس کے لیپ ٹاپ میں محفوظ تھی جو والدین کے گھر رکھا ہوا تھا۔ اسے اپنے بھائی سے کہنا پڑا کہ وہ یہ تصویر ہملٹن کو ای میل کردے۔

ہملٹن کے سامنے یہ ایک بہت بڑا سوال تھا کہ کوئی اس کی تصویر کیوں چرائے گا۔ یہ تصویر کیرولین کی دیوار پر لگی ہوئی دوسری تصویروں سے مختلف تھی۔ زیادہ تر تصویروں میں وہ کسی موسیقار کے ساتھ کیمرے کے سامنے منہ کیے ہوئے مسکرا رہی تھی لیکن یہ ایسی تصویر تھی جو عام طور پر کسی البم کے سرورق کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس میں لوگ ایک خیمے میں پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی کھڑا اور کوئی بیٹھا ہوا تھا۔

ٹوری نے پوچھا۔ ''ان میں تمہاری دوست کون سی ہے؟''

اس نے کیرولین کی جانب اشارہ کیا پھر اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص کے بارے میں کہا۔ ''جو کچھ اس نے بتایا ہے۔ اس کے مطابق یہ ہولس بیکر ہی ہوگا۔''

''یہ تو کوئی آوارہ شخص لگتا ہے۔''

''تم اسے جانتی ہو۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''نہیں، میں نے کبھی اس کا نام نہیں سنا۔''

کیرولین نے بھی اسے آوارہ ہی کہا تھا۔ ہملٹن نے کہا۔ ''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''اپنے تجربے کی بنیاد پر۔ اس کی آنکھیں اور چہرے پر پھیلی ہوئی غلیظ مسکراہٹ دیکھو۔ اس کا بازو کہاں ہے، تمہاری دوست خوش نہیں لگ رہی۔''

ہملٹن دل ہی دل میں اس کے مشاہدے کا قائل ہو گیا۔ اچانک ٹوری نے اس کا کندھا جھنجوڑا اور بولی۔

''اوہ، میرے خدا، یہ تو وہی ہے۔''

’’کون؟‘‘ ہملٹن چونکتے ہوئے بولا۔
’’یہ جو سیدھے ہاتھ پر پکنک ٹیبل پر جھکی ہوئی ہے۔ ٹیٹو والی عورت کے برابر میں۔ اس کے بال اس وقت کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے لیکن بیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد لوگوں میں بہت تبدیلیاں آجاتی ہیں لیکن یہ سارہ ٹروڈ ہی ہے۔‘‘
سارہ اس تصویر میں تھی جو کیرولین مائیکل کی دیوار سے غائب ہوگئی تھی۔ اس طرح ہملٹن کو اپنے سوال کا جواب مل گیا کہ کوئی اس تصویر کو کیوں چرائے گا۔ وہ اس بارے میں مزید جاننا چاہ رہا تھا۔ لہٰذا اس نے کیرولین کو فون کیا۔ اس نے کہا کہ وہ میکون واپس جارہی ہے اور وہاں پہنچ کر بات کرے گی۔
ہملٹن نے اپنی بیوی کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ’’بہترین بات معلوم ہوئی ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔‘‘
وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ’’معلوم کرو کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا۔ لوسی کو یہ جاننا چاہیے۔‘‘
کیرولین مائیکل کے ہاتھ میں وہ تصویر تھی جس کا پرنٹ ہملٹن نے اپنے کمپیوٹر سے نکالا تھا۔ جب اس نے سارہ کی جانب اشارہ کیا تو کیرولین بولی۔ ’’میں اب بھی اسے نہیں جانتی۔‘‘
’’مجھے اس تصویر کے بارے میں بتاؤ۔ یہ دوسروں سے مختلف کیوں ہے؟‘‘
کیرولین نے بتایا کہ یہ تصویر اس کے دوست جیسن ٹیلر نے کھینچی تھی۔ وہ ایک پیشہ ور فوٹوگرافر ہے اور موسیقاروں کی تصویریں خاص طور پر البم اور ویڈیو کے سرورق بنانے میں مہارت رکھتا ہے۔ چار سال پہلے اٹلانٹا کے مڈ ٹاؤن میوزک فیسٹیول میں اس سے سامنا ہوا تھا۔ منتظمین نے اس کی خدمات ایک کتاب کے لیے تصویریں بنانے کی غرض سے حاصل کی تھیں جس کے ذریعے تقریب کی پروموشن اور فنڈ اکٹھا کیا جائے۔ وہ رضا کارانہ طور پر اس کی مدد کررہی تھی۔ جیسن کو نزدیکی پہاڑی پر ایک خیمہ نظر آیا۔ ہولس بیکر اور اس کے دوست بھی قریب ہی موجود تھے چنانچہ جیسن نے انہیں تصویر بنوانے کے لیے آمادہ کرلیا اور ان سے کہا کہ سب لوگ اپنا ایک ساتھی چن کر مناسب جگہ پر کھڑے ہوجائیں۔ یہ سن کر بیکر تیزی سے اس کی جانب آیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے بھوسے کی گانٹھوں کی طرف لے گیا۔ وہاں بمشکل دو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ کیرولین کا کہنا تھا کہ وہ مسلسل اسے دیکھ رہی تھی کیونکہ اس کی شکل کچھ جانی پہچانی تھی لیکن اس کا نام معلوم نہیں تھا جب جیسن ٹیلر تصویریں بنارہا تھا تو بیکر نے کیرولین کی کمر پر ہاتھ پھیرنا شروع کردیا۔ اس کی یہ حرکت کیرولین کو پسند نہیں آئی لیکن وہ جیسن کے تخلیقی کام میں رکاوٹ ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ جب وہ آخری تصویر لے رہا تھا تو بیکر کا ہاتھ کمر سے ہوتا ہوا نیچے کی طرف جانے لگا پھر وہ اٹھا اور قہقہے لگاتا ہوا دوستوں میں چلا گیا۔
کیرولین نے کہا۔ ’’اگر وہ اب ایسی حرکت کرتا تو میں اسے مزہ چکھا دیتی لیکن اس وقت میں صرف سترہ سال کی تھی اور اس سے لڑنے کی مجھ میں صلاحیت نہ تھی۔ اس لیے اسے قہقہے لگاتا اور اپنی جانب اشارے کرتا دیکھتی رہی پھر مجھے یاد آگیا کہ وہ جانا پہچانا کیوں لگ رہا تھا۔ میں گرمیوں کے آغاز میں ایک میلہ دیکھنے گئی تھی۔ وہاں اس کا بینڈ بھی تھا۔
’’وہ موسیقار ہے۔ شاید اسی لیے تم نے اس کی تصویر اپنی دیوار پر لگا رکھی تھی۔‘‘
’’بالکل نہیں۔ اس کا بینڈ یونہی عام سا ہے اور اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ خود بھی فضول قسم کا انسان ہے۔ میں نے یہ تصویر صرف اس لیے لگا رکھی تھی کہ اسے جیسن ٹیلر نے کھینچا تھا۔ مجھے اس کے فن سے محبت ہے۔ بہرحال میں ہولس بیکر کو بھول گئی جب تک یوٹیوب پر اس کی ویڈیو مشہور نہیں ہوئی۔ اس کے نتیجے میں اسے ایک اچھا ریکارڈنگ کنٹریکٹ مل گیا اور مجھے لگتا ہے کہ اب وہ بڑا آدمی بننے والا ہے۔‘‘
’’گویا وہ سارہ کو بھی جانتا تھا۔‘‘ ہملٹن نے کہا۔
’’مجھے نہیں معلوم کہ کون کسے جانتا تھا لیکن اگر وہ عورت سارہ ٹروڈ ہے تو وہ اس مجمع میں شامل تھی جسے جیسن نے مدد کے لیے بلایا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ کسی کو جانتی ہوگی۔‘‘
ہملٹن کی نظریں دیوار پر لگی ہوئی ایک دوسری تصویر پر گئیں۔ یہ بھی دوسری تصویروں سے مختلف تھی۔ ہملٹن نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ تمہارے سوئمنگ پول کی ہے؟‘‘
’’ہاں۔‘‘
اس نے دیوار کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’اس میں سب موسیقار ہی ہیں؟‘‘
’’ہاں، موسیقار، ان کے دوست اور میں۔‘‘ پھر وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔ ’’یہ تصویر گزشتہ موسم بہار میں

ایک کنسرٹ کے خاتمے پر لی گئی تھی، وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میرا ایک دوست کچھ لوگوں کو جانتا تھا۔ کنسرٹ ختم ہونے پر ہم سب اسٹیج کے پیچھے جمع ہو گئے۔ سورج نکلنے پر کسی نے سوئمنگ پول میں نہانے کی تجویز پیش کی لیکن اس وقت ہوٹل کا سوئمنگ پول بند تھا چنانچہ میں نے انہیں اپنے سوئمنگ پول میں نہانے کی پیشکش کی۔ راستے میں ایک جگہ رک کر ہم نے ناشتا لیا اور یہاں آ گئے۔ اس کے بعد سب لوگ نہانے چلے گئے۔"

اس تصویر میں بارہ افراد تھے جن میں سے صرف دو کے چہرے واضح تھے۔ ہملٹن نے پوچھا۔ "تم ان سب لوگوں کو جانتی ہو؟"

"نہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی نہیں۔" پھر وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولی۔ "البتہ اس عورت کو جانتی ہوں جو مجھے اسٹیج کے پیچھے ملی تھی لیکن اس کا نام یاد نہیں رہا۔ ہمارا ایک مشترکہ دوست تھا اور ایک مرتبہ اس سے پارٹی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔"

"کیا ہولس بیکر بھی وہاں موجود تھا؟"

"نہیں، میں ایسا نہیں سمجھتی۔ ممکن ہے کہ وہ وہاں موجود ہو اور میں اسے نہ پہچان سکی ہوں۔ اس وقت وہ اتنا مشہور نہیں ہوا تھا۔"

"میرا اندازہ ہے کہ اگر سارہ اس گروپ میں ہوتی تو تمہیں وہ بھی یاد نہیں ہوتی۔"

کیرولین نے نفی میں سر ہلایا تو ہملٹن نے کہا۔ "وہ سب تمہارے ساتھ اپارٹمنٹ آئے اور انہوں نے تمہیں پینٹنگ میں سے چابی نکالتے ہوئے دیکھا؟"

کیرولین کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے دیکھا ہوگا۔"

"کیا تم فیس بک پر ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو ہملٹن نے سوئمنگ پول والی تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تصویر بھی تمہارے کمپیوٹر میں محفوظ ہوگی؟"

"ہاں، یہ فیس بک پر ہے۔"

"اس کی ایک کاپی چاہیے، کیا تم مجھے بھیج سکتی ہو؟"

"بالکل، کیوں نہیں۔"

"اس کے علاوہ ایک بات اور...... مجھے ہولس بیکر کا پتا چاہیے۔ میں خود بھی معلوم کر سکتا ہوں لیکن اس میں دیر لگے گی۔ کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتی ہو جو بتا سکے کہ ہولس بیکر کہاں رہتا ہے؟"

"شاید۔"

"جیسے ہی تمہیں معلوم ہو، مجھے فون کر دینا۔"

وہاں سے رخصت ہو کر وہ ایک بار پھر چرچ پہنچا۔ اس مرتبہ پادری عبادت گاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ "سارہ کے سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوئی؟"

"کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ابھی بہت کچھ معلوم کرنا باقی ہے اور اسی لیے یہاں آیا ہوں۔"

"میں نہیں جانتا کہ تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

ہملٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اعتراف گاہ میں آنے سے پہلے بھی وہ تم سے ملتی رہی ہے۔ کیا اس نے ہولس بیکر نامی کسی شخص کا ذکر کیا تھا؟"

پادری کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ تیزی سے پلکیں جھپکنے لگا۔ کچھ دیر توقف کرنے کے بعد وہ بولا۔ "نہیں، جیسا کہ میں نے کل بتایا تھا، ہم زیادہ تر ساٹھ اور ستر کی دہائی کی موسیقی اور اس دور کے موسیقاروں کے بارے میں بات کرتے رہے، ہولس بیکر اس زمانے کا موسیقار نہیں تھا۔"

ہملٹن چونکتے ہوئے بولا۔ "گویا تم نے اس کے بارے میں سن رکھا ہے؟"

پادری کی پلکیں جھپکنے کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔"

"تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

پادری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جس سے ہملٹن نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ ہولس بیکر کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتا جتنا کہ سارہ نے اپنے اعترافی بیان میں بتایا ہوگا اور جو کچھ اس نے بیکر کے بارے میں کہا وہ یقیناً اہم ہے اور اسی لیے ہولس بیکر کا نام سن کر پادری نے پلکیں جھپکانا شروع کر دی تھیں۔

ہملٹن کھڑا ہو گیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے بات کرنے کا شکریہ فادر۔"

پادری نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہاری زیادہ مدد نہ کر سکا۔" پھر اس نے اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے مجھے اپنے لکھے ہوئے گانوں کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے بھی اپنی شاعری دکھائے لیکن وہ نہیں لائی۔ شاید شرما رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے کسی کو بھی اپنی شاعری نہیں دکھائی۔"

ہملٹن نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس

جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ پادری نے اسے روک لیا اور بولا۔ ”میں بالکل بھول ہی گیا۔ بیٹھ جاؤ، مجھے تم سے ایک اور بات کرنا ہے۔“

”کیا سارہ سے متعلق کچھ کہنا ہے؟“ وہ بے دلی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ وہ سارہ کے گھر جانے اور اس کی شاعری دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

”نہیں۔“ پادری بولا۔ ”مجھے تمہاری بیٹی کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔“

ہملٹن کے پاس پادری کی بات سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بیس منٹ بعد وہ چرچ کی عمارت سے باہر آیا تو کافی مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پادری کے دیے ہوئے نمبر پر فون کیا اور مخاطب سے گفتگو کرنے کے بعد یہ طے پایا کہ وہ شخص رات کو ہملٹن کے گھر آئے گا۔ ہملٹن اپنی بیوی کو فی الحال اصل بات نہیں بتانا چاہ رہا تھا۔ اس نے ٹوری کو فون کر کے بتایا کہ اس نے ایک اور انشورنس پالیسی لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک شخص رات کو ان کا طبی معائنہ کرنے اور خون کے نمونے لینے کے لیے آئے گا۔ اس سے پہلے کہ ٹوری مزید کوئی سوال کرتی، اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہملٹن نے سارہ کا گھر گزشتہ سنیچر کو دیکھا تھا جب ٹوری نے اسے وہاں جانے پر مجبور کیا کیونکہ لوسی نے فون کر کے اپنی دوست کو بتایا تھا کہ سارہ گزشتہ روز گھر واپس نہیں آئی۔ اس وقت ہملٹن نے زیادہ توجہ سے گھر کا معائنہ نہیں کیا تھا کیونکہ سارہ کو گئے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایک چھبیس سالہ لڑکی کے حوالے سے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن اب معاملہ مختلف تھا۔ وہ مر چکی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اسے کس چیز کی تلاش ہے۔

دس منٹ کی کوشش کے بعد وہ سارہ کی الماری کی چھت میں ایک خفیہ خانہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جس میں ایک لفافہ رکھا ہوا تھا اور اس میں سارہ کی شاعری پر مشتمل تیس صفحات تھے۔ ہملٹن نے انہیں پڑھنا شروع کیا۔ اس کی تمام شاعری المیہ تھی جس میں جگہ جگہ دکھوں، آنسوؤں، مصنوعی مسکراہٹوں اور کبھی نہ ختم ہونے والے درد کا ذکر تھا۔ ان صفحات کو پڑھنے کے بعد ہملٹن کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس لڑکی کے ساتھ کوئی افسوسناک واقعہ پیش آیا تھا۔ البتہ شاعری کا وہ حصہ غیر واضح تھا جس سے زیادتی کرنے والے شخص کی نشاندہی ہو سکتی۔

وہ اپنی کار کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اسے کیرولین نے فون پر ہولس بیکر کا پتا بتا دیا۔ سارہ کی شاعری پڑھنے کے بعد اس کا بالکونی سے چھلانگ لگانا سمجھ میں آرہا تھا لیکن دوسرے امکانات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہولس بیکر ایک آوارہ مزاج شخص تھا جسے عورتوں کو جنسی طور پر ہراساں کر کے تسکین ملتی تھی چنانچہ اس نے فوری طور پر اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہولس بیکر کا گھر ایک تنگ سڑک پر واقع تھا۔ اس نے ریکارڈنگ کنٹریکٹ حاصل کرنے کے بعد بھی گھر تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہملٹن نے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا البتہ دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ ہملٹن نے کہا۔ ”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“

بیکر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں نہیں جانتا۔ تم کون ہو؟“

”ہملٹن برگٹ۔ میرا تعلق اٹلانٹا پولیس سے ہے۔“ اس نے اپنا بیج دکھاتے ہوئے کہا۔

”اندر آ جاؤ۔“ اس نے بھویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں لیونگ روم میں بیٹھ گئے تو بیکر نے کہا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“

”میں سارہ ٹروڈ کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔“

اچانک صوفے کے عقب میں گھومنے والا دروازہ کھلا اور کچن کی جانب سے ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گل دان تھا۔ وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ ”ہولس، یہ دیکھو۔“ پھر ہملٹن کو دیکھ کر رک گئی اور بولی۔

”معاف کرنا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہے۔“

بیکر نے ہملٹن کا تعارف کرایا اور اس عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ این ہے۔“

ہملٹن اسے دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ این نے وہ گل دان ایک چھوٹی میز پر رکھا اور بیکر کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ بیکر نے پوچھا۔ ”تم سارہ کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟“

ہملٹن نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، وہ مر چکی ہے۔“

ہولس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”کیسے؟“

این نے اپنا بازو ہولس کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ ہملٹن نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے بازو پر ٹیٹو بنا ہوا

تھا۔ ہملٹن نے ایک بار پھر اپنی نظریں ہولس پر جمائیں اور اسے بتانے لگا کہ سارہ کی موت کس طرح واقع ہوئی پھر اس نے اپنا فون نکالتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ گفتگو ریکارڈ کروں گا۔''

''تمہارے خیال میں میرا اس معاملے سے کوئی تعلق ہے؟''

''تم جمعے کی شب کہاں تھے؟''

''یہیں، ہمیں کافی عرصے بعد ویک اینڈ پر فرصت ملی تھی۔''

ہملٹن نے این سے پوچھا۔ ''کیا تم بھی یہیں تھیں؟''

اس کے بجائے ہولس نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں یہاں اکیلا تھا۔''

ہملٹن نے پوچھا۔ ''تم دونوں کی شادی ہو چکی ہے؟''

ہولس نے کہا۔ ''نہیں، البتہ ہم کچھ عرصے سے ساتھ رہ رہے ہیں۔''

''پوری بات بتاؤ۔'' این بولی۔ ''کچھ عرصہ نہیں۔ بلکہ اس جولائی میں چار سال ہو جائیں گے۔''

''تم اپنے اور سارہ کے تعلق کے بارے میں بتاؤ۔'' ہملٹن نے ہولس سے کہا۔

''میں اسے زیادہ نہیں جانتا۔ ہماری ملاقات ایک موسیقی کے پروگرام میں ہوئی تھی۔''

''مڈ ٹاؤن؟''

ہولس حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، اس کے بعد ہم نے دو دن اکٹھے گزارے تھے۔''

''اور یہ چار سال پرانی بات ہے۔'' ہملٹن نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی تمہیں اس کا نام یاد ہے۔''

ہولس کے ہونٹ بھنچ گئے اور اس نے کچھ کہنے کے بجائے کندھے اچکا دیے۔ عام حالات میں ہملٹن اس کے ساتھ سختی کر سکتا تھا لیکن سارہ نے شاعری میں اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا تو ذکر کیا لیکن ہولس بیکر کا نام نہیں لیا تھا، ایسی صورت میں اس کے ساتھ سختی کرنا نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنا فون اٹھایا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ وہ دروازے کی طرف پہنچ کر پلٹا اور بولا۔ ''میں ایک بات کہنا بھول گیا۔ کرسمس میں چند روز باقی رہ گئے ہیں اور میرے پاس خریداری کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ کیا تم یہ گل دان میرے ہاتھ فروخت کرتا

چاند یا سورج

دو شرابی گھر جانے کے لیے شراب خانے سے نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد پہلے شرابی نے کہا۔

''کتنی خوب صورت رات ہے۔ چاند کی طرف دیکھو، کتنی اچھی روشنی دے رہا ہے۔'' اس پر دوسرے شرابی نے رک کر کہا۔

''تم غلط کہہ رہے ہو یہ چاند نہیں سورج ہے۔''

اس پر دونوں اپنی بات پر اڑے رہے کہ یہ چاند ہے، سورج نہیں۔ اتنے میں تیسرا شرابی وہاں سے گزر رہا تھا۔ دونوں نے تیسرے شرابی کو روک کر کہا۔

''جناب کیا اتنی مہربانی کر کے بتائیں گے کہ ہم دونوں کے درمیان یہ بحث چل رہی ہے کہ آسمان پر کیا چیز چمک رہی ہے سورج یا چاند؟ اس کا فیصلہ کر کے بتائیں۔''

تیسرے شرابی نے آسمان کی طرف غور سے دیکھا اور دونوں سے مخاطب ہوا۔

''معاف کرنا بھائی میں یہاں خود اجنبی ہوں اس لیے مجھے نہیں پتا کہ یہ کیا چیز ہے۔ کسی مقامی سے معلوم کرو۔ جو جانتا ہو یہ کیا چیز ہے یہاں کی۔''

کاشان عباس۔ مانسہرہ

پہلا آپریشن

آپریشن سے پہلے ڈاکٹر نے پھولوں کی پتیاں اور ہار منگوائے۔

مریض دیکھ کر۔ ''یہ کس لیے منگوائے ہیں؟''

ڈاکٹر کہنے لگا۔ ''آج میرا پہلا آپریشن ہے اگر کامیاب ہو گیا تو مجھے پہنائے جائیں گے اور نا کام ہو گیا تو...... آپ کو۔''

پیاری بات

ساری دنیا کا شہد جمع کر لو لیکن زبان کا شہد اس سے بھی زیادہ میٹھا ہوگا۔

ساری دنیا کا زہر جمع کر لو لیکن زبان کا زہر اس سے بھی کڑوا ہوگا، اس لیے زبان کو دکھ دینے والی باتوں سے پاک رکھو اور اپنے اعلیٰ اخلاق اور خوش گفتاری سے ساری دنیا کا دل جیت لو۔

عبدالجبار رومی انصاری کی چوہنگ سٹی لاہور سے پیاری بات

پسند کرو گی۔ میری بیوی کو ایسی چیزیں بہت پسند ہیں۔"

ایلن یہ سن کر خوش ہو گئی۔ اس نے گل دان کی منہ مانگی قیمت مانگی لیکن اس نے بیس ڈالر کے تین نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھے اور گل دان اٹھا کر چل دیا۔ یقیناً وہ صحیح خطوط پر کام کر رہا تھا اور اسے اپنے شبہے کو ثابت کرنے کے لیے کئی ثبوت درکار تھے۔ وہاں سے نکل کر وہ سیدھا بلیون وائن اینڈ اسپرٹ، کی دکان پر پہنچا۔ اسے ووڈکا اور کریم کی خریداری کی رسیدیں دکھائیں اور منیجر سے کہا کہ وہ متعلقہ کلرک سے بات کرنا چاہتا ہے۔ جب ہملٹن نے اس کلرک سے سارہ کا ذکر چھیڑا تو اسے وہ لڑکی فوراً یاد آ گئی اور اس نے کہا۔ "میں نے تقریباً اسے شراب دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے وہ لڑکی کچھ عجیب سی لگی۔ اس لیے نہیں کہ وہ نشے میں تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک طرح کا خالی پن تھا جیسے اس کا کوئی گھر نہ ہو لیکن اسے بوتلیں پکڑنے اور رقم گننے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر کہنے لگی۔ "اس کے ساتھ کیا ہوا؟"

"کچھ اچھا نہیں ہوا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ تم نے اسے جو شراب فروخت کی۔ اس کی وجہ سے کوئی مسئلہ ہوا ہو گا۔"

کلرک پُرسکون ہو گئی کیونکہ اگر نامناسب لوگوں کو شراب فروخت کر دی جائے تو اس کی ذمے داری کلرک پر ہی عائد ہوتی ہے۔ ہملٹن نے پوچھا۔ "کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟"

"نہیں لیکن وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔"

ہملٹن نے چھت سے لگے ہوئے سیکیورٹی کیمروں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ کام کرتے ہیں؟"

کلرک نے اثبات میں سر ہلایا تو ہملٹن نے منیجر سے کہا کہ اسے گزشتہ جمعے سے اب تک کی ریکارڈنگ فراہم کی جائے۔ جیسے ہی وہ اسٹور سے باہر آیا۔ اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری جانب اس کا معاون بل رابرٹ تھا جس نے یہ پیغام دیا کہ لوئس کوتلی اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ اٹلانٹا کی ایک بڑی شخصیت تھی اور شہر میں ہونے والے ہر بڑے واقعے یا سرگرمی میں اس کا ہاتھ ہوتا تھا لیکن وہ پسِ پردہ رہ کر کام کرتا تھا۔ اس کا نام کبھی سامنے نہیں آیا۔ وہ پبلسٹی سے پرہیز کرتا تھا۔ ہملٹن کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ لوئیس اس سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہ رہا ہے لیکن جب اس سے رابطہ ہوا تو ہملٹن کا شک درست نکلا۔ اب اسے اس شک کو درست کرنے کے لیے ثبوت درکار تھا۔

اس نے کیرولین مائیکل کو فون کر کے دو کام بتائے۔ اس نے پندرہ منٹ بعد فون کر کے ہملٹن کو مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔ ہملٹن نے دوسرا فون اپنے دوست مارک برگر کو کیا جو فلٹن کاؤنٹی میڈیکل ایگزامنر کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ اس نے دو گھنٹے بعد فون کر کے بتایا کہ ہملٹن کی خواہش پر سارہ ٹروڈ کی لیبارٹری رپورٹوں کے سلسلے میں کام تیز کر دیا گیا ہے لیکن اس میں مزید دو دن لگ سکتے ہیں۔ ہملٹن نے اپنی ایک جاننے والی سراغ رساں سے بھی درخواست کی کہ وہ کیس میں اپنے طور پر چھان بین کرے۔ اس نے اسے کیرولین کا فون نمبر بھی دے دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک بار پھر لوئس کوتلی سے رابطہ کیا اور ہملٹن نے اسے جو کچھ کہا وہ اسے کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ پھر اس نے سراغ رساں ڈیون پورٹ اور سارہ کی ماں لوسی کو فون کیے۔ ان تمام سرگرمیوں سے فارغ ہونے کے بعد اب اسے صرف انتظار کرنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان سب فون کالز کا جواب آنے میں دو دن لگ جائیں گے جس کا مطلب تھا کہ اسے کرسمس کی شام کو بھی انتظار کرنا ہو گا۔

تاہم کرسمس سے ایک روز پہلے ہی نتیجہ سامنے آ گیا۔ میڈیکل ایگزامنر اور سراغ رساں کی رپورٹیں غیر تسلی بخش تھیں لیکن ان سے زیادہ مدد نہ مل سکی۔ ڈیون پورٹ البتہ کچھ جاننے میں کامیاب ہو گیا لیکن وہ رپورٹ بھی مبہم تھی۔ کسی رپورٹ میں بھی اس امکان کو خارج نہیں کیا گیا کہ سارہ نے خودکشی کی تھی لیکن ہملٹن کے دل و دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا جس کے لیے اسے ٹھوس ثبوت کی ضرورت تھی۔ سب سے اہم ٹیلی فون رسل ویلس کا تھا جس کا ذکر پادری پہلے کر چکا تھا۔ جب رسل نے بتایا کہ وہ اس کی بیٹی ماریا کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہے تو اس نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔

کرسمس کی سہ پہر ہملٹن نے ہولس بیکر کے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر ہولس نے دروازہ کھولا اور اسے اندر لے گیا۔ اس بار ہملٹن ریکارڈنگ کے لیے فون کے بجائے اپنے محکمے سے ضروری آلات لے کر آیا تھا۔ ہملٹن نے کہا۔ "جانتے ہو، میں یہاں کیوں آیا ہوں کیونکہ تم نے مجھے پوری بات نہیں بتائی تھی۔"

"میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

"بعض اوقات کوئی بات چھپانا جھوٹ بولنے کے

برابر ہی ہوتا ہے۔ تم جانتے تھے کہ میں کیا معلوم کرنا چاہ رہا ہوں لیکن تم نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"شاید میں خوف زدہ تھا۔ اسی لیے میں نے کسی اور سے بات کرنے کی ضرورت محسوس کی۔"

"اب تم نے صحیح جواب دیا۔" ہملٹن جانتا تھا کہ اس نے کس سے بات کی ہوگی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا پھر اس نے پوچھا۔ "این کہاں ہے؟"

ہولس نے بیڈروم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی خوف زدہ ہے اور ڈر رہی ہے کہ میں مشکل میں ہوں۔"

"اسے بھی یہاں ہونا چاہیے۔"

ہولس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کا سارہ کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔"

"اس کی یہاں موجودگی تمہارے مفاد میں ہے۔ تمہیں اس کی تائید کی ضرورت ہوگی۔"

ہولس نے این کو آواز دے کر بلایا اور وہ اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گئی۔ ہملٹن نے کہا۔ "ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے این۔" پھر فوراً ہی بولا۔ "ہولس کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

ہولس آگے کی طرف جھکا اور ہملٹن سے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں سچ بتانا چاہتا ہوں۔ چار سال پہلے میں نے سارہ کو روفی (نشہ آور گولی) دی اور......" اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ "اس کے ساتھ زیادتی کی۔"

ہولس کا اعتراف این کے لیے حیران کن نہیں تھا اور نہ ہی ہملٹن کو کوئی حیرت ہوئی۔ این بولی۔ "جارجیا میں اس جرم کی زیادہ سے زیادہ سزا چار سال ہے اور اس کو سرزد ہوئے چار سال سے زیادہ ہوچکے ہیں۔"

"شاید تم نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ عصمت دری کی سزا پندرہ سال ہے۔" ہملٹن نے ہولس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہولس نے این سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے یہ جرم کیا ہے اور اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔" پھر وہ ہملٹن سے بولا۔ "لیکن تم اس وجہ سے تو یہاں نہیں آئے؟"

"نہیں۔" ہملٹن نے لفافے میں سے ایک تصویر نکالتے ہوئے کہا۔ "اسے پہچانتے ہو؟"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔"

"سارہ چھٹی منزل کے اپارٹمنٹ کی بالکونی سے نیچے گری۔ اس اپارٹمنٹ کی کرائے دار نے یہ تصویر دیوار پر لگا رکھی تھی۔ کسی نے یہ تصویر چرالی اور حقائق چھپانے کی کوشش کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تصویر چرانے کا مقصد کیا تھا؟ اس نے ہولس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "شاید اس لیے کہ سارہ کے قتل سے اس کا تعلق نہ جوڑا جاسکے۔"

ہولس نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں کبھی اس اپارٹمنٹ میں نہیں گیا اور نہ ہی یہ تصویر چرائی۔ اگر میں نے سارہ کو قتل کیا ہوتا تو تصویر چرانا حماقت ہوتی۔ اس طرح میں لوگوں کی نظروں میں آجاتا۔"

"میں نے کبھی نہیں کہا کہ یہ تصویر تم نے چرائی تھی۔" پھر اس نے این کو تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے غور کیا کہ سارہ کے برابر میں کون ہے۔"

این نے تصویر کی طرف سے منہ پھیر لیا تو وہ بولا۔ "میں نے فوٹوگرافر سے اس دن کی تمام تصویریں منگوا کر دیکھیں۔ ان میں صرف دو افراد کے سوا سب خوش نظر آرہے تھے۔ ایک کیرولین اور دوسری این۔ کیرولین اس لیے خوش نہیں تھی کہ ہولس اسے تنگ کررہا تھا اور این تم بھی ہر تصویر میں سارہ کو دیکھ رہی ہو اور خوش نظر نہیں آرہیں۔"

ہولس نے کہا۔ "سارہ کے ساتھ میرا تعلق صرف ایک رات کا تھا اور این کو بھی ایک سال پہلے تک یہ بات معلوم نہیں تھی۔"

ہملٹن کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "میں نے صرف یہ کہا ہے کہ این ان تصویروں میں خوش نظر نہیں آرہی بلکہ ناراض لگ رہی ہے۔" پھر اس نے لفافے میں سے ایک اور تصویر نکالی اور بولا۔ "یہ گزشتہ موسم بہار میں اس وقت لی گئی تھی جب تم سب لوگ موسیقی کے پروگرام کے بعد کیرولین کے گھر ناشتا کرنے اور اس کے سوئمنگ پول میں نہانے گئے تھے۔ جب میں نے یہ تصویر کیرولین کو دکھائی تو اس نے این کو پہچان لیا کہ یہی سب لوگوں کو اسٹیج کے پیچھے لے کر گئی تھی۔" پھر اس نے این کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم کیرولین کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ گئیں اور دیکھ لیا کہ وہ اپنی چابی کہاں رکھتی ہے پھر اس پارٹی کے ختم ہونے کے بعد تم نے اس سے فیس بک پر دوستی کرلی۔ دوسرے لوگوں کی طرح کیرولین بھی فیس بک پر بہت کچھ پوسٹ کرتی رہتی ہے۔ گزشتہ ہفتے اس نے فیس بک پر لکھا کہ وہ چھٹیاں منانے گھر جارہی ہے اور اپنا پروگرام بھی بتادیا اور تم نے سب سے پہلے اسے "لائیک" کیا۔"

ہملٹن نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا لفافہ نکالا اور بولا۔ ”جب میں پہلے یہاں آیا تو میں نے تمہاری کلائی پر ایک بریسلیٹ دیکھا تھا۔“ وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”کیا میں وہ دیکھ سکتا ہوں۔“

این نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ران کے نیچے دبا رکھے تھے۔ ہولس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو کھینچ لیا۔

ہملٹن بولا۔ ”بہت دلچسپ بریسلیٹ ہے۔ اس پر بڑے خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے ہیں لیکن لگتا ہے کہ اس میں کوئی چیز کم ہے۔“ پھر اس نے لفافے میں سے ایک ٹکڑا نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اس کا ڈیزائن اور میٹریل سب کچھ تمہارے بریسلیٹ جیسا ہے۔“

ہولس اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو دریائی گھوڑا ہے۔“

”بتا سکتے ہو کہ یہ میرے پاس کیسے آیا؟“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں اس روز کیرولین کے اپارٹمنٹ میں گئی تھی۔ اس وقت سے ہی گم ہو گیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں مل گیا۔“

ہملٹن کو اس کے فوری جواب پر حیرت ہوئی لیکن اس سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ کیرولین کے اپارٹمنٹ میں گئی ہوگی۔ اس نے این سے کہا۔ ”میں نے تمہارے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کے مطابق تمہارا تعلق کولمبیا سے ہے اور تم چند ہفتے قبل بوگوٹا گئی تھیں۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“

ہملٹن نے اس سوال کو نظر انداز کر دیا اور بولا۔ ”کولمبیا کی دو چیزیں کافی اور کیلے مشہور ہیں لیکن وہاں منشیات بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بہت ہی خطرناک چیز ہے اور حکام اس کے بارے میں وارننگ جاری کر چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کسی نے سارہ کے پانی، چائے یا مشروب میں یہ زہر ڈال دیا تھا۔ مجھے سارہ کی ماں نے بتایا تھا کہ جب سے اس کا علاج شروع ہوا اس نے شراب نوشی ترک کر دی تھی لیکن یہ منشیات لینے کے بعد وہ ایک بار پھر اس جانب مائل ہو گئی۔ جس کسی نے بھی اسے منشیات دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی چھلانگ یا خودکشی کی وجہ کثرت شراب نوشی ہی سمجھی جائے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ سارہ نے بیلوان وائن اینڈ اسپرٹ، سے شراب خریدی تھی۔ میرے ایک سراغ رساں دوست نے اس دکان کے سیکورٹی کیمرے کی ویڈیو دیکھی ہے۔ اس میں سارہ تنہا نظر آ رہی ہے لیکن اسٹور سے نکلنے کے بعد وہ سیدھی ایک عورت کے پاس گئی۔ گرم کپڑوں کی وجہ سے اس کا چہرہ پوری طرح نظر نہیں آ سکا لیکن اس کے بازو پر بنا ہوا ٹیٹو صاف نظر آ رہا ہے۔“

جب ڈیون پورٹ نے ہملٹن کو وہ تصویر دکھائی تو وہ ٹیٹو کو دیکھ کر پُرجوش ہو گیا۔ این کے بازو پر ایسا ہی ٹیٹو بنا ہوا تھا لیکن اس نے ہولس اور این سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ ”کسی نے وہ تصویر اپارٹمنٹ کی دیوار پر دیکھی اور پریشان ہو گیا۔ اس کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا اور وہ اس تصویر کو وہاں چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔“ پھر وہ ہولس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا اگر وہ تصویر وہاں سے غائب نہ ہوتی......“

”تم کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔“ یہ آواز این کی تھی۔

ہملٹن یہ سن کر سکتے میں آ گیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ گو کہ اس نے گل دان پر سے این کے فنگر پرنٹس لے لیے تھے جو اسی سے خریدا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس کی رضاکارانہ مدد کرنے والے سراغ رساں نے کیرولین کے اپارٹمنٹ کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا تھا کہ ووڈکا کی بوتل اور کریم کے جار پر ملنے والے نشانات اس کے فنگر پرنٹس سے نہیں ملتے۔ ہملٹن کو اس پر حیرت نہیں ہوئی کیونکہ شراب کی دکان کے باہر کھڑی ہوئی عورت نے دستانے پہن رکھے تھے۔ ڈیون پورٹ کو کوئی ایسا فرد نہیں ملا جس نے سارہ اور این کو ایک ساتھ یا الگ الگ اپارٹمنٹ میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس میں بھی حیرانی والی کوئی بات نہیں تھی۔ زیادہ تر مکین تعطیلات گزارنے اپنے آبائی گھروں کو جا چکے تھے۔ اسی لیے این، سارہ کو بہ آسانی عمارت میں لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔ لیبارٹری سے ملنے والی ابتدائی رپورٹ میں بھی زہریلی منشیات کے کوئی آثار نہیں ملے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ منشیات استعمال نہیں ہوئی لیکن اس کا سراغ نہیں ملا جو کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اگر لاش دیر سے ملے تو ایسا ہو جاتا ہے۔

کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملنے کے باوجود ہملٹن کو یقین تھا کہ این نے ہی سارہ کو مارا ہے اور وہ اعتراف کرنے کے قریب ہے۔ اس نے اپنے فون پر ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ ”ہم تیار ہیں۔“

عین اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ہملٹن

نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ”اندر آجاؤ۔“
ڈیون پورٹ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ایک ہاتھ میں بیج اور دوسرے میں لفافہ پکڑا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”ہم تلاشی لینے آئے ہیں۔ اس کے پیچھے پولیس کی وردی میں ملبوس دو مرد اور ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔
این نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔“
ہملٹن نے ہولس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ جگہ تم نے کرائے پر لے رکھی ہے۔ کیا تمہیں کوئی مسئلہ ہے؟“
ہولس نے کوئی جواب نہیں دیا تو ہملٹن نے کہا۔ ”ہمیں تلاشی لینے کے لیے تمہاری اجازت چاہیے۔“
ہولس نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن این ایک بار پھر بولی۔ ”نہیں۔“
ہملٹن نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”غور سے سنو این۔ میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے لیکن اگر تم ہم سے تعاون کرو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“
این نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولی۔ ”وہ سب کچھ تباہ کرنے والی تھی۔“
ہولس حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم کس کے بارے میں بات کر رہی ہو؟“
این نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ وہ ایک دن تم سے ملنے آئی تھی اور جانتی ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ ان عورتوں میں سے ہے جو پیسوں، شہرت اور ٹیلی ویژن پر کام حاصل کرنے کی خاطر تم جیسے مردوں کی زندگی میں آتی ہیں۔ تمہارا خیال تھا کہ مجھے چار سال پہلے ہونے والا واقعہ معلوم نہیں ہوگا لیکن میں جانتی تھی لیکن وہ چلی گئی اور میں تمہارے مشہور ہونے کا انتظار کرنے لگی پھر وہ تمہاری شہرت کو تباہ کرنے کے لیے واپس آگئی لیکن میں نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔“
ہولس حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ سارہ کچھ بھی تباہ کرنے نہیں آئی تھی۔ وہ صرف اس لیے مجھ سے ملنے آئی تھی کیونکہ میں نے اس سے کہا تھا۔ میں اپنے کیے پر پشیمان تھا اور اس سے معافی مانگنا چاہ رہا تھا۔“
ہملٹن کے لیے یہ نا کافی تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”این! تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟“
وہ اپنی جگہ سے اچھلتے ہوئے بولی۔ ”میں نے اسے روک دیا۔“

ہولس نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کیا کیا؟“
وہ چلّاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے سب کچھ تمہاری خاطر کیا۔ اسے شراب پلائی اور اسے وہاں لے جا کر بالکونی سے نیچے گرا دیا۔“ وہ زور زور سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”یہ میں نے تمہاری خاطر کیا۔“
ہملٹن نے ٹیپ ریکارڈر ڈیون پورٹ کو دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارے لیے ہے۔“
ڈیون پورٹ نے این کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔
ہملٹن کو اطمینان تھا کہ وہ سارہ کی موت کا معما حل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ورنہ عام حالات میں پولیس اسے خودکشی یا حادثہ سمجھ کر کیس بند کر دیتی۔ اسی شام رسل ویلس اس سے ملنے آیا اور اسے بتایا کہ اس کی بیٹی ماریا کو دل کی تکلیف تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ ایسی بیماری ہے جو کسی ایکسرے یا دوسرے ٹیسٹ میں ظاہر نہیں ہوتی۔ اور مریض کی اچانک موت واقع ہو جاتی ہے۔
”تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“ ٹوری نے پوچھا۔
”اس روز انشورنس کے نام پر جو خون کے نمونے لیے گئے تھے۔ وہ اسی مقصد کے تحت تھے لیکن تم سے یہ بات چھپائی گئی کیونکہ ہم تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔“
رسل نے کہا۔ ”یہ ایک موروثی بیماری ہے اور تمہارے شوہر کے خون میں اس کے جراثیم ملے ہیں لیکن وہ خطرے سے باہر ہیں۔ البتہ احتیاطاً انہیں ایک گولی روزانہ لینی چاہیے جو انہیں کسی خطرے سے محفوظ رکھے گی۔“
اس کے جانے کے بعد ہملٹن نے کہا۔ ”ہمارا کوئی قصور نہیں تھا گو کہ ہم اپنی بیٹی کو کبھی نہیں بھلا سکتے لیکن ہمیں اس احساس سے نجات حاصل کر لینی چاہیے کہ ہم نے اپنی بیٹی کا خیال نہیں رکھا۔“
ٹوری نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ ہم ساری عمر اسی بوجھ تلے دبے رہیں گے کہ ہماری غفلت کی وجہ سے ماریا کی موت ہوئی۔“
ہملٹن سوچ رہا تھا کہ یہ قدرت کا انعام ہے جو اسے سارہ کی موت کی وجہ معلوم کرنے کے عوض ملا ہے ورنہ سارہ کی ماں بھی ساری عمر بے سکون رہتی اور اسے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ اس کی بیٹی کی موت کیسے واقع ہوئی۔

فاش غلطی

ارشد بیگ

اپنی زندگی کو قریب ترین اور اہم ترین رشتوں کے چراغوں سے روشن رکھا جاتا ہے... لیکن کبھی کبھی یہ چراغ اس طرح ٹمٹماتے ہیں کہ ان کی روشنی کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو جاتی ہے... گھر کے ایسے ہی چراغوں کے بجھ جانے کا دل گداز ماجرا... جو وقت گزرنے کے ساتھ دل کی نارسائی اورکرب کو بڑھا رہا تھا۔

ایک مہا فنکار کا قصہ جس کی فنکاری دھری رہ گئی

سراغ رساں چیف انسپکٹر ایلن جونز لاش پر جھکا اس کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا گو کہ صبح کا وقت تھا لیکن اس کے باوجود ایک چھوٹا سا مجمع کھیت کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ لوگ زرد ٹیپ کے باہر کھڑے گردنیں اچکا کر دیکھنا چاہ رہے تھے کہ کیا ہو رہا ہے جبکہ مقامی پولیس افسران انہیں جائے واردات سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سراغ رساں انسپکٹر اینی کوبالٹ اور سارجنٹ ڈسن جیک مین پہلے سے ہی مجمع سے پوچھ گچھ کر رہی تھیں۔ جونز نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور آہستہ سے مرنے والے کے جبڑوں اور گردن کو چھوا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہ پتھر کی طرح سخت تھے۔ وہ جانتا تھا کہ چہرے کے اعضا مرنے کے دو تین گھنٹے بعد اکڑ جاتے ہیں۔ وہ ایک گرم رات تھی جس کی وجہ سے یہ عمل تیز ہو گیا اور لاش کی حالت دیکھ کر جونز نے اندازہ لگایا کہ اس کی موت کو چار سے چھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے گویا اس کی موت نصف شب کے قریب ہوئی تھی۔ اس میں ایک گھنٹے کی کمی بیشی کا امکان تھا۔ جونز یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے اسی جگہ قتل کیا گیا یا اس کی لاش کو یہاں لا کر رکھا گیا تھا لیکن واقعات کی ترتیب بتا رہی تھی کہ اسے قتل کرنے کے بعد رات کی تاریکی میں یہاں لایا گیا تھا۔

اس لاش کو سورج طلوع ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی ایک وین ڈرائیور نے دیکھا جو مقامی نیوز ایجنٹ کے لیے صبح کے اخبار لے کر آیا تھا۔ اس نے مقامی پولیس آفیسر گیری ینگ کے دروازے پر دستک دی جس نے فوراً ہی اپنے قریب ترین ساتھی کو بلایا اور اسٹیویل پولیس ہیڈ کوارٹر کو بھی اطلاع دے دی۔ انہوں نے ہومی سائڈ اور کرائم اسکواڈ کے آنے سے پہلے اس جگہ کے چاروں طرف زرد فیتہ باندھ دیا۔ اس غیر معمولی سرگرمی کی وجہ سے گاؤں کے بہت سے لوگ علی الصباح بیدار ہو گئے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے جائے وقوعہ کا رخ کرنے لگے۔

جب انہوں نے لاش کے گرد کینوس کا پردہ تان دیا تو وہ اردگرد کے علاقے میں گھاس پر ثبوت تلاش کرنے لگے۔ پولیس فوٹو گرافر بھی جائے وقوعہ کی تصویریں لینے میں مصروف تھا۔ پولیس سرجن ڈاکٹر برنس ساڑھے چھ بجے کے بعد آیا۔ جونز کی مدد سے اس نے لاش کو نیچے اتار کر گھاس پر لٹایا اور جھک کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ کئی منٹ تک گھٹنوں کے بل جھک کر لاش کے مختلف حصے دیکھتا رہا پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''موت کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی اور ان زخموں کا پتا بھی پوسٹ مارٹم سے ہی چلے گا۔ تم خود گھاس پر خون کے دھبے دیکھ سکتے ہو۔''

''ہاں۔'' جونز نے گھاس پر گھسیٹے جانے والے نشانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ کار کے ذریعے اس لاش کو یہاں منتقل کیا گیا اور پھر سڑک سے اس جگہ تک گھاس پر گھسیٹتے ہوئے لائے۔''

''مرنے کے فوراً بعد ہی اسے یہاں لایا گیا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''تم سیاہی مائل نیلاہٹ دیکھ سکتے ہو۔ دل کی دھڑکن بند ہونے کے بعد خون جم گیا تھا اور جب لاش دریافت ہوئی

تب بھی اس کی یہی پوزیشن تھی۔"
وہ ایک بار پھر لاش پر جھکا اور دوبارہ سر سے پاؤں تک اس کا معائنہ کیا۔ جب وہ کھڑا ہوا تو بولا۔ "اس نے ایک چیز دیکھی جو اسے پریشان کر رہی ہے۔"
"وہ کیا؟"
"اس کی زبان۔" ڈاکٹر برنس نے کہا۔ "اس کی زبان کٹی ہوئی ہے۔"
"سب سنو، سب دیکھو۔ کچھ مت کہو۔" جونز بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ اسے ایک پرانی کہاوت یاد آگئی تھی۔
ڈاکٹر برنس کے جاتے ہی سارجنٹ ونسن جیک مین کینوس کا پردہ ہٹا کر آئی اور گھاس پر پڑی برہنہ اور مسخ شدہ لاش کو دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ وہ ایک طویل قامت اور خوب صورت سیاہ فام عورت تھی۔ اس کے ساتھ جونز کی نائب انسپکٹر اینی کوبالٹ بھی تھی۔ اس کا رنگ گورا اور جسم متناسب تھا لیکن وہ اپنی خوش لباسی کی وجہ سے پُرکشش نظر آتی تھی۔ اس وقت اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔
"کچھ معلوم ہوا؟" جونز نے پوچھا۔
"نہیں، کسی نے کچھ دیکھا اور نہ سنا۔" ونسن نے جواب دیا۔
"میرا بھی یہی جواب ہے۔" اینی نے کہا۔ "گاؤں کے لوگ گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"
"لیکن جب ہم جائے وقوعہ پر پہنچے تو ان سب نے اٹھنے کا فیصلہ کرلیا اور لاش دیکھنے چلے آئے۔" جونز نے کہا۔
اینی کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "دیہاتوں میں عموماً لوگ جلدی بیدار ہو جاتے ہیں۔"
"کسی کو معلوم ہے کہ یہ کون ہے؟" جونز نے کہا۔
اینی سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں نے جن لوگوں سے بات کی۔ ان میں سے کوئی اسے نہیں جانتا۔ ویسے اگر میرا پڑوسی بھی اس حالت میں پڑا ہوتا تو میں اسے نہیں پہچان سکتی تھی۔ پولیس والے لوگوں کو قریب نہیں آنے دے رہے تھے۔ اس لیے کوئی اسے نہیں پہچان سکا۔"
جونز نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں مقامی پولیس سے بات کر کے اس کی تصویر لیتا ہوں یا پھر جلد از جلد کسی آرٹسٹ کو بلا کر اس کا تصویری خاکہ بنواتا ہوں۔"
"اب ہمیں کیا کرنا ہے؟" اینی نے پوچھا۔
"ہمیں ایک عارضی کمرے کی ضرورت ہوگی۔ اگر گاؤں میں کوئی ہال یا اس جیسی کوئی جگہ ہو، اس دوران تم اور ونسن گاؤں میں جاؤ اور کچھ دروازوں پر دستک دو۔ کسی نہ کسی

نے ضرور کچھ دیکھا ہوگا۔''

ایمی نے اسے سیلوٹ مارا اور ونسن کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ جونز انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر وہ لاش کی جانب مڑا۔ جونز کے اندازے کے مطابق مرنے والے کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ پتلے سیاہ بال، خشک انگلیاں، کٹے ہوئے ناخن، درمیانہ جسم اور قد۔ اس سے زیادہ وہ کچھ معلوم نہیں کرسکتا تھا۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص اسے پہچان لے۔

اس نے ایک بار پھر جھک کر لاش کا سر دیکھا۔ ایک گہری سانس لی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اب شاید وہ اور یانا کے ساتھ ویک اینڈ نہیں گزار سکے گا اور نہ ہی جھیل سے مچھلیاں پکڑ سکے گا کیونکہ اس کے سامنے ایک کٹی پھٹی لاش پڑی ہوئی تھی اور اس کے قاتل کا سراغ لگانا اس کی پہلی ترجیح تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کیا اس نے صحیح پیشے کا انتخاب کیا تھا۔

''اس کا نام میکس بیلنگ ہے۔'' مقامی پولیس آفیسر گیری ینگ نے بتایا۔ ''وہ اکاؤنٹنٹ تھا اور ہائی اسٹریٹ کے عقب میں واقع ایک شاندار مکان میں رہتا تھا۔''

''تم میری سراغ رساں انسپکٹر اور ایک ٹیم کے ساتھ دوپہر میں وہاں جا سکتے ہو۔'' جونز نے کہا۔ وہ اس وقت گاؤں کے ہال میں بیٹھے چائے پی رہے تھے گو کہ تمام دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اس کے باوجود ہال میں گرمی تھی۔

''کیا وہ کوئی دولت مند شخص تھا؟''

''ہاں، اس طرح کے یہاں کئی لوگ ہیں۔ جنہوں نے ریٹائر ہونے سے پہلے کافی پیسا بنایا۔ جیسے جارج ہیرس، اس کی اسٹیشنری کی دکانوں کی ایک چین ہے اور اسے مزید کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ پینتالیس سال سے زیادہ کا نہیں ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ولیم ہے۔ وہ بھی میکس بیلنگ کا ساتھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہارلے اسٹریٹ یا کسی اور جگہ پلاسٹک سرجری کرتا ہے۔''

جونز نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''بیلنگ کے بارے میں بدعنوانی یا حساب کتاب میں گڑبڑ کی افواہ تو سننے میں نہیں آئی؟''

پولیس آفیسر ینگ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے صرف یہ سنا ہے کہ اس نے اچھی خاصی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ اس کے نقصان کے بارے میں کسی نے نہیں بتایا۔''

''تم یہاں کب سے ہو گیری؟''

''چھ ماہ ہو گئے۔''

''تم سے پہلے کون تھا؟''

''ٹک وائس ہال۔ اس کا انتقال ہو گیا۔''

جونز کو یاد آگیا کہ ایک مقامی پولیس آفیسر کی موت کے بارے میں خبر شائع ہوئی تھی۔ ''سائیکل کا حادثہ، کیا یہ وہی ہے؟''

''جی ہاں۔ ٹور دی فرانس کے یہاں سے گزرنے کے بعد اسے سائیکل چلانے کا شوق ہوا۔ میں ذاتی طور پر اسے نہیں جانتا۔ اس کے انتقال کے بعد یہاں آیا تھا۔''

''کیا تم میکس بیلنگ کے بارے میں کچھ اور بتا سکتے ہو؟''

''نہیں، وہ اپنی ذات تک محدود تھا۔ اسے کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔''

''کیا وہ شادی شدہ تھا، بچے وغیرہ؟''

''نہیں جناب، وہ تنہا رہتا تھا۔ اس نے شادی کی تھی لیکن کچھ عرصے بعد ہی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کے قریبی دوست کون تھے۔ تم نے جارج ہیرس کا ذکر کیا تھا۔ یہ کون ہے؟''

''یہ انہی میں سے ایک ہے۔'' ینگ نے کہا۔ ''اس کے سارے دوست ہوپ این اینکر، میں ڈرنک کرتے ہیں۔ ان میں بیلنگ، ہیرس، ولیم، نیڈ ہوورڈ اور چند دوسرے شامل ہیں۔ یہ بار مارکیٹ کے مقابلے میں تھوڑا سا مہنگا ہے۔ اس لیے زیادہ تر سیاح قیمتوں پر ایک نظر ڈال کر دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔''

''اس لیے کہ عام لوگ وہاں نہ آسکیں۔''

''میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔''

جونز جب وہاں پہنچا تو کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہاں اداسی کا سماں تھا۔ شاید اس کی وجہ بیلنگ کی موت ہو۔ زیادہ تر کمرے بھرے ہوئے تھے۔ ایک بڑے کمرے میں اس نے تقریباً دس لوگوں کو مختلف میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس نے بار میڈ سے پوچھا کہ کیا جارج ہیرس اندر موجود ہے۔ اس نے ایک خوش وضع شخص کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ہونٹ پتلے، گھنی بھویں اور بالوں میں کہیں کہیں سفیدی اتر آئی تھی۔ اس نے سفید قمیص اور دھاری دار ٹائی لگا رکھی تھی۔ جونز نے اپنے لیے کوک کا ٹن خریدا اور ہیرس کے پاس پہنچ کر اپنا تعارف کروایا۔ ہیرس نے سر کو خم دے کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر گروپ کے دوسرے لوگوں سے اسے ملوایا۔

''میں ضرور کہتا کہ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' ان میں

سے ایک بولا۔ ’’لیکن ان حالات میں..... خیر جانے دو، مجھے ڈاکٹر اولیور ولیم کہتے ہیں۔‘‘ اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔

’’میں مقامی ڈاکٹر ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور بولا۔ ’’بیلنگ کے نام۔‘‘ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تقلید کی۔

ولیم ایک طویل قامت اور کسرتی بدن والا شخص تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ جونز نے سوچا کہ اگر اس گروپ کا کوئی لیڈر ہوتا تو یہ اعزاز ولیم کے حصے میں ہی آتا۔ وہ دیکھنے میں ہی ایسا لگ رہا تھا کہ اسے حکم دینے اور اس پر عمل کروانے کی عادت ہے۔

’’کیا تم میکس بیلنگ کو کافی عرصے سے جانتے تھے؟‘‘ جونز نے اس سے پوچھا۔

’’ہاں، کئی سال ہوگئے۔‘‘ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ’’میں یہاں اس وقت سے پریکٹس کر رہا ہوں جب پہلی بار انیس سو پچانوے میں جنرل پریکٹیشنر کے طور پر کام شروع کیا تھا۔ میکس اس کے دو سال بعد یہاں آیا۔ وہ میرا اکاؤنٹنٹ تھا۔‘‘

’’کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں سے آیا تھا؟‘‘

’’میرا خیال ہے کہ لندن سے آیا تھا۔‘‘

’’کیا وہ اب بھی کام کر رہا تھا؟‘‘

’’میرے حساب سے وہ آدھا ریٹائر ہو چکا تھا۔ اس کے کچھ پرانے کلائنٹ تھے لیکن اس نے نئے لوگوں کا کام لینا بند کر دیا تھا۔‘‘

’’وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ زندگی بہت مختصر ہے اور ہمیں اس کے ہر گھنٹے سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔‘‘ جارج ہیرس نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

’’تم میں سے کوئی کسی ایسے شخص کو جانتا ہے جس کے پاس میکس بیلنگ کو نقصان پہنچانے کی کوئی وجہ ہو؟‘‘

ان سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ’’میرا خیال ہے کہ تم یہ معلوم کر لوگے۔‘‘ ڈاکٹر ولیم نے کہا۔ ’’یہاں سب لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے۔‘‘

’’کیا وہ گاؤں سے باہر کے لوگوں کو بھی جانتا تھا؟‘‘

’’میرا یہی خیال ہے۔ وہ کبھی کبھار لندن یا دوسرے مقامات پر بھی جایا کرتا تھا۔ اسے اسکاٹش ہائی لینڈز بہت پسند تھا۔ اس کے علاوہ گولف کھیلنے کا بھی شوقین تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی جان پہچان والے شخص نے اسے قتل کیا ہے بلکہ مجھے یہ کسی راہ چلتے جنونی کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔‘‘

’’وہ کوئی آوارہ گرد بھی ہو سکتا ہے۔‘‘ جونز نے کہا۔

’’ایسے لوگ آج کل بہت کم پائے جاتے ہیں۔‘‘

’’کیا حالیہ دنوں میں یہاں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ ہیرس نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ہوورڈ نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔

’’کیا میکس بیلنگ کے رویے میں کوئی تبدیلی نظر آرہی تھی۔ وہ پریشان، بے چین یا اداس لگ رہا تھا؟‘‘

ان سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔ ’’نہیں۔‘‘

جونز نے محسوس کیا کہ وہ ان لوگوں سے مزید کچھ معلوم نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنا ٹن ختم کیا اور بار سے باہر آگیا۔ اس نے سوچا کہ ان لوگوں کو بعد میں کسی وقت انٹرویو کے لیے بُلانا بہتر رہے گا۔

اب اس کا رخ گاؤں کے ہال کی جانب تھا۔ وہ آدھے راستے میں ہی تھا کہ اس نے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو پیچھے ڈاکٹر ولیم کھڑا ہوا تھا۔

’’تمہیں زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں۔‘‘ ڈاکٹر نے کہا۔ ’’میں بار میں بات کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تم سمجھ رہے ہوگے۔ وہاں ایسا موقع نہیں تھا اور یقینا میری کوئی ایسی خواہش نہیں کہ مرنے والے کی برائی کروں۔‘‘

’’لیکن کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے بتانا چاہ رہے ہو؟‘‘

’’ہاں لیکن جانے دو۔ میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کیونکہ ان سب باتوں کے باوجود میکس میرا ساتھی تھا۔‘‘

جونز نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ’’اگر تم قاتل کو پکڑنے میں ہماری مدد کرو گے تو یقینا تمہارے دوست کی روح خوش ہوگی۔‘‘

’’اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو مجھے بتانے میں کوئی اعتراض نہیں۔ میرا خیال ہے کہ حالیہ دنوں میں میکس کا قریبی لوگوں سے ملنا جلنا بڑھ گیا تھا۔‘‘

’’یعنی وہ لوگ جو حساب کتاب میں گڑبڑ کرتے ہیں۔‘‘

ولیم نے تائیدی انداز میں کہا۔ ’’ہاں، اس کا یہی کام تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ نفع نقصان کا کھاتہ تیار کرنے جیسا آسان معاملہ نہیں تھا۔‘‘

’’پھر کیا تھا؟‘‘

’’تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ میں اس بارے میں کچھ

زیادہ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ محض میرا اندازہ ہے جس کی بنیاد میکس کی جانب سے ملنے والے اشاروں پر ہے۔ میرا خیال ہے یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں وہ یہاں آنے سے پہلے بھی جانتا تھا۔"

"اور تمہارا خیال ہے کہ وہ دوبارہ ان لوگوں میں شامل ہو گیا تھا؟"

"ہاں۔"

"تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟"

"جیسا کہ میں نے بتایا کہ اشاروں کی بنیاد پر۔ وہ پریشان، بے چین اور چڑچڑا رہنے لگا تھا۔ یہ وہ میکس نہیں تھا جسے میں برسوں سے جانتا تھا جن لوگوں میں وہ گھر گیا تھا، وہ زیادہ اچھے نہیں ہیں۔"

"مسٹر بیلنگ نے اس بارے میں کچھ کہا؟"

"اس نے براہِ راست تو کچھ نہیں کہا۔ سوائے اس کے کہ کاش وہ دوبارہ ان لوگوں سے نہ ملا ہوتا اور وہ اسے دوبارہ ان معاملات میں گھسیٹ رہے ہیں۔"

"کیسے معاملات؟"

ولیم اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ "منی لانڈرنگ، ٹیکس چوری اور آف شور اکاؤنٹس وغیرہ وغیرہ۔"

"اس نے خود تمہیں یہ بتایا تھا؟"

"کھل کر تو نہیں کہا لیکن اس کی باتوں سے یہی مفہوم نکلتا تھا۔ وہ اپنے کاروباری دوروں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا تھا اور اگر اس سے کچھ پوچھا جاتا تو ہمیشہ گول مول جواب دیتا۔ ایک دفعہ میں نے اسے لنگڑا کر چلتے ہوئے دیکھا۔ مجھے لگا جیسے اس پر کوئی کام کروانے کے لیے جسمانی تشدد کیا گیا ہو؟"

"اس نے کیا وجہ بتائی؟"

"یہی کہ وہ پھسل کر فٹ پاتھ کے کنارے پر گر گیا تھا۔"

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ قریبی لوگ کون ہو سکتے ہیں۔ تمہیں ان کے نام معلوم ہیں؟"

ولیم نے نفی میں سر ہلایا تو جونز نے پوچھا۔ "ان میں سے کسی کو تم نے یہاں آتے ہوئے دیکھا؟"

"نہیں، وہ اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔"

"بس تم یہی کچھ جانتے ہو؟"

"ہاں، دو دن قبل میں نے محسوس کیا کہ میکس کسی مسئلے کے بارے میں مجھے کچھ بتانا چاہ رہا ہے۔ اسے کوئی جسمانی تکلیف نہیں تھی لیکن وہ کچھ کہے بغیر ہی واپس چلا گیا اور میں اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ سن سکا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بات اسے پریشان کر رہی تھی۔"

"اور تم سمجھتے ہو کہ اس بات کا تعلق اس کے قتل سے ہے؟"

"یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا کوئی دشمن بن گیا ہو۔ کوئی بدنام کاروباری یا جرائم پیشہ۔ شاید وہ ایسا کام کرنے پر تیار نہ ہوا جو وہ اس سے کروانا چاہ رہے تھے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔ پچھلے چند ہفتوں سے وہ مجھے کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔ اب مجھے واپس جانا چاہیے۔"

اس کے جانے کے بعد جونز نے بھی ہال کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نے اسے سوچنے کے لیے بہت سا مواد دے دیا تھا۔ وہ بُرے آدمی میکس جیسے لوگوں کو سبق سکھانے کے لیے دوسری بار نہیں سوچتے۔ کون جانتا تھا کہ انہوں نے وہ رقم کہاں سے حاصل کی۔ اس کے بہت سے ذرائع ہو سکتے تھے جیسے منشیات کا کاروبار، انسانوں کی اسمگلنگ، اسلحہ کی خرید و فروخت، قحبہ خانے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ایسے منافع بخش کاروبار تھے جن کی خاطر کسی کو قتل کر دینا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ میکس بیلنگ کی معاشی سرگرمیوں پر بھی نظر ڈالی جائے۔

"میں اپنی فائلوں میں کوئی ایسی چیز تلاش نہیں کر سکی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ میکس بیلنگ منی لانڈرنگ یا آف شور بینکنگ میں ملوث تھا۔" ونسن نے جونز اور ایمی کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے کرائم انٹیلی جنس کے سراغ رساں انسپکٹر میکڈونلڈ سے بھی بات کی تھی لیکن وہ بھی کچھ نہیں بتا سکی۔ البتہ ابھی مجھے گہرائی میں جانے کا موقع نہیں مل سکا تاہم میں متعلقہ لوگوں سے رابطے میں ہوں اور وہ اس پر کام کر رہے ہیں۔"

"کھدائی جاری رکھو۔" جونز نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "اگر اس میں سے کچھ نکل آیا تو وہ ہمارے لیے بہت کارآمد ہوگا۔"

"میں آج صبح بیلنگ کے مکان میں تھی جب مقامی پولیس کے لوگ وہاں کام کر رہے تھے۔" ایمی نے کہا۔ "اور وہ مکان بالکل صاف حالت میں تھا۔ اگر اسے وہاں قتل کیا گیا ہے تو کسی نے وہاں کی صفائی بھی کر دی۔ پولیس کو وہاں سے کافی نقد رقم ملی۔ تقریباً تین ہزار ڈالر سے بھی زیادہ۔ وہ اس کی فائلیں اور کمپیوٹر بھی ساتھ لے گئے اب فارنسک کے ماہرین ان کا جائزہ لے رہے ہیں۔ شاید وہ جلد ہی ہمیں کچھ

بتاسکیں۔"

جونز نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک بہت ہی جرأت مندانہ اور ڈرامائی قتل ہے۔ کسی نے اس کی جان ہی نہیں لی بلکہ اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ اس کی آنکھیں، کان اور زبان کاٹ سکے پھر لاش کو کار میں ڈال کر گاؤں میں چھوڑنے کا خطرہ مول لے۔"

"نصف شب میں بہت زیادہ خطرہ نہیں ہوتا۔" اینی بولی۔ "خاص طور پر فورٹ فورڈ جیسے گاؤں میں جہاں لوگ جلدی سو جاتے ہیں۔"

"اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ قاتل خوش قسمت تھا۔" جونز نے کہا۔ "ورنہ گرمی کے موسم میں لوگ کھڑکیاں کھول لیتے ہیں۔ اس طرح کسی کی بھی نظر اس پر جا سکتی تھی یا کوئی شرابی گھر جاتے ہوئے اسے دیکھ سکتا تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں دیر تک گھر سے باہر رہتے ہیں۔ اب ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے کہ قاتل نے لاش کو مسخ کر کے ایسی جگہ پر کیوں رکھ دیا جہاں سے ہر گزرنے والے کی نظر اس پر پڑے۔"

"یہ دوسرے لوگوں کے لیے دھمکی بھی ہو سکتی ہے۔" اینی نے کہا۔

"یہ اچھا نکتہ ہے۔" جونز بولا۔ "لیکن اس نے کس کو دھمکی دی ہے اور کیوں؟"

☆☆☆

"یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا؟" دوسرے روز ڈنسن نے جونز سے کہا جب وہ گاؤں کے ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ "میں نے سوچا کہ تھوڑا سا وقت سابق پولیس آفیسر نک واکس ہال کو بھی دوں، اس کی موت صرف چھ ماہ پہلے ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ حادثہ بھی کل والے واقعہ کی طرح مشتبہ ہو سکتا ہے اس چھوٹے سے گاؤں میں اتنے تھوڑے عرصے کے دوران دو اموات کا ہونا شکوک پیدا کر سکتا ہے۔ بہرحال میں نے اس کی رپورٹس دیکھیں تو معلوم ہوا کہ اس کیس کی صحیح طرح تحقیقات نہیں ہوئی۔ یہ حادثہ گزشتہ موسم سرما میں بڑٹبس کے قریب پیش آیا تھا۔ دھند کی وجہ سے قریب کی چیزیں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں اور سڑک پر پھسلن تھی۔ ایک پولیس آفیسر نے سڑک پر ٹائروں کے پھسلنے کے نشانات دیکھے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس گاڑی کے تھے۔"

"اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی کار والا اسے ٹکر مار کر بھاگ گیا۔" جونز نے کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ پھر بیئے کا عرصہ زیادہ نہیں ہوتا۔ اگر میکس بیلنگ کسی ناجائز کاروبار میں شامل تھا تو اس سے پہلے بھی کسی غلط کام میں ملوث ہو سکتا ہے۔"

"یعنی تم یہ سوچ رہی ہو کہ نک واکس ہال کو کچھ شبہات تھے اور اس نے ان کا تذکرہ کسی اور سے کر دیا ہوگا؟"

"ہاں، اس کا امکان ہے کیونکہ مقامی پولیس ایسے جرائم کی تفتیش نہیں کرتی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ پولیس آفیسر گیری ینگ کو بیلنگ کی سرگرمیوں کا علم نہیں تھا۔" جونز نے کہا۔

"اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ بیلنگ نے شاید ہی اسے کچھ بتایا ہو، کیا نک واکس ہال کے بیوی بچے ہیں؟"

"ہاں، صرف اس کی بیوہ ہے۔"

"مجھے اس کا پتا دے دو۔ اس سے ملنے جاؤں گا۔"

☆☆☆

ہاویس تک کا سفر بہت شاندار رہا۔ سڑک کے دونوں جانب حدنگاہ تک سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک خوب صورت جگہ تھی جہاں سارا سال سیاحوں کی آمد و رفت رہتی۔ اس روز بھی توقع کے مطابق وہاں کافی سیاح آئے ہوئے تھے۔ جونز نے بورڈیب کے سامنے ہائی اسٹریٹ پر گاڑی کھڑی کی اور پیدل چلتا ہوا ایک تنگ سڑک میں داخل ہو گیا جہاں مینڈی واکس ہال رہا کرتی تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کا بیرونی لان بڑی خوب صورتی سے سنوارا گیا تھا۔ مینڈی نے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ لیونگ روم چھوٹا لیکن صاف ستھرا تھا۔ جونز ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور مینڈی اس کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ جونز کو امید نہیں تھی کہ وہ اس سے کچھ معلوم کر سکے گا لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج تھا۔

مینڈی ایک ٹرے میں چائے اور کچھ لوازمات لے کر آئی۔ وہ ایک پرکشش عورت تھی، اس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے پیالی میں چائے نکالتے ہوئے پوچھا۔ "میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں چیف؟"

"تم مجھے ایلن کہہ سکتی ہو۔" جونز نے کہا۔

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن مجھے نک کے ساتھ رہ کر پولیس کی زبان استعمال کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔"

"میں نک کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں، اگر تم مناسب سمجھو۔"

مینڈی پیچھے کی طرف جھکی اور اس نے اپنی لمبی ٹانگیں

آگے کی طرف پھیلا دیں۔ جونز کو محسوس ہوا کہ یہ کمرا اور یہ مکان اس کے لیے بہت چھوٹا ہے لیکن وہ اسی کی گنجائش رکھتی تھی کیونکہ ایک مقامی پولیس آفیسر کی پنشن کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔

''ایسے خوب صورت دن میں چھٹی کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔'' جونز نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''میں چھٹی پر نہیں ہوں بلکہ گھر پر کام کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں گرافک ڈیزائنر ہوں اور میرا اسٹوڈیو اوپر کی منزل پر ہے۔ اس وقت بھی میں کام ہی کررہی تھی۔''

''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں پریشان کیا۔'' جونز نے کہا۔

''گھر میں کام کرنے کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ لوگ ہمیں ہر وقت دستیاب سمجھتے ہیں لیکن تم اس سے غلط مطلب مت نکالنا۔ مجھے نک کے بارے میں تم سے بات کرکے خوشی ہوگی۔''

''میں تمہاری تعریف کرتا ہوں کہ تم نے میرے لیے وقت نکالا۔''

مینڈی تیوری چڑھاتے ہوئے بولی۔ ''وہ کیا بات ہے جو تم جاننا چاہتے ہو؟''

''میں خود بھی نہیں جانتا۔ اس کا انحصار تمہارے بیان پر ہے۔ تم نے فورٹ فورڈ میں ہونے والے قتل کے بارے میں تو سن لیا ہوگا؟''

''ہاں، میں نے صبح کی خبروں میں دیکھا ہے۔ بہت ہی دہشت ناک واقعہ ہے۔ وہ کیسے قتل کیا گیا؟''

''اب تک ہم نہیں جان سکے۔'' جونز نے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار ہے۔ کیا تم میکس بیلنگ کو جانتی تھیں؟''

''ہاں۔'' مینڈی نے کہا۔ ''ہاں، ہم ایک ہی چرچ میں جایا کرتے تھے۔ میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ وہ اچھا آدمی ہے۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جن کے ساتھ ہم نے بہت زیادہ وقت گزارا۔ وہ یقیناً ڈاکٹر ولیم کے گروپ میں شامل تھا۔''

''تم ڈاکٹر ولیم کو بھی جانتی ہو؟''

''ہاں، وہ ہمارا جنرل فزیشن تھا۔''

''اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''مغرور آدمی ہے وہ اور اس کے ساتھی سمجھتے ہیں کہ یہاں کا نظام وہی چلا رہے ہیں۔ وہ نک کو بھی مشورے دیا کرتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کس طرح نوکری کرنی ہے۔''

''اس کے ساتھیوں کے بارے میں کیا کہو گی؟''

''سب ایک جیسے ہیں۔''

''لیکن تم اسی ڈاکٹر سے علاج کرواتی تھیں؟''

مینڈی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ گاؤں میں وہی ایک ڈاکٹر تھا اور گاؤں میں سب لوگ اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک مرتبہ ہی اس سے علاج کروانے کی ضرورت پیش آئی۔ جب مجھے فلو ہوگیا تھا۔''

''نک کو جو حادثہ پیش آیا اس کے بارے میں کیا کہو گی؟''

''میں نہیں سمجھتی کہ وہ حادثہ تھا۔ مجھے غلط مت سمجھنا۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ جان بوجھ کر ایسا کیا گیا۔ نک، بٹر ٹبس سے نکل کر ٹین ہل کی طرف جارہا تھا۔ اس روز موسم بہت خراب تھا اور دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس نے سائیکل کی ہیڈ لائٹ جلا رکھی تھی اور ایک ایسی جیکٹ پہن رکھی تھی جو دور سے ہی اندھیرے میں چمکتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ برابر سے گزرنے والی گاڑی کا ڈرائیور اسے بروقت نہ دیکھ سکا یا اس کی توجہ ہٹ گئی۔ بدقسمتی سے وہ سڑک کے کنارے پر تھا اور وہاں کوئی نرم جگہ نہیں تھی۔''

''لیکن تم نے اس وقت کوئی شکوہ نہیں کیا؟''

''نہیں، میں جانتی تھی کہ تحقیقاتی افسر کو گاڑی کا پہیا پھسلنے کے نشانات ملے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کتنے پرانے تھے اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ لوگ کوشش کے باوجود یہ معلوم نہیں کرسکتے کہ یہ نشانات کس گاڑی کے ہیں۔ ٹکر مار کر بھاگنے والے ڈرائیوروں کا پتا لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ خود ہی ضمیر کی خلش سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو پولیس کے سامنے پیش کردیں۔ نک کے کیس میں ایسا نہیں ہوا۔ جہاں تک میرے علم میں ہے کسی شخص کے پاس نک کو مارنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لہٰذا مجھے بالکل بھی شک نہیں کہ کسی نے جان بوجھ کر اسے ٹکر ماری ہو۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کسی کے پاس کوئی وجہ ہو؟''

مینڈی نے بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''یہ محض قیاس آرائی ہے لیکن کیا کبھی تمہارے شوہر نے میکس بیلنگ اور منی لانڈرنگ یا اس جیسی کوئی بات کہی تھی؟''

''اوہ میرے خدا! نہیں، تم کیا اندازہ لگا رہے ہو؟''

''وہی جو مجھے معلوم ہوا ہے۔''
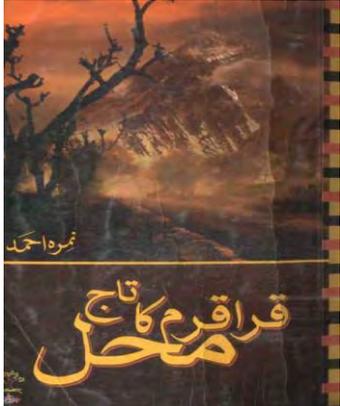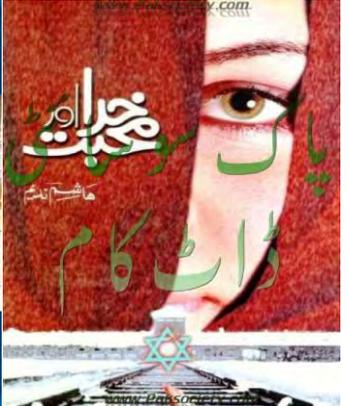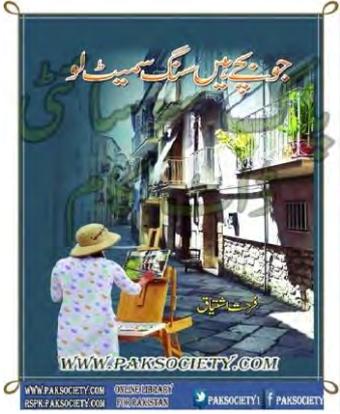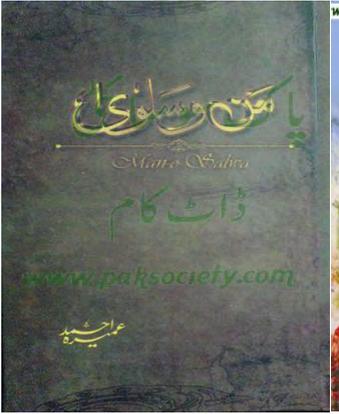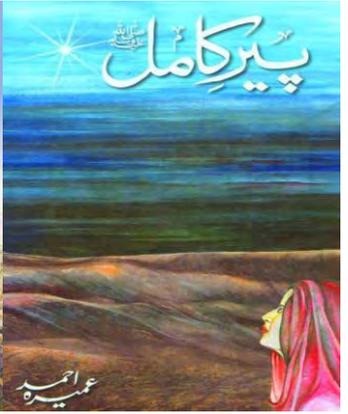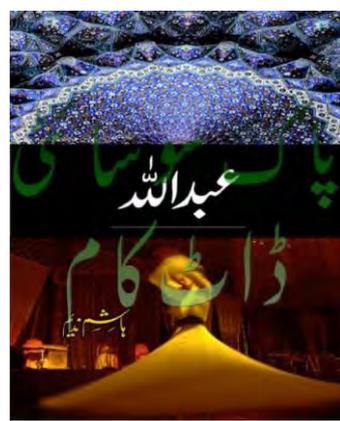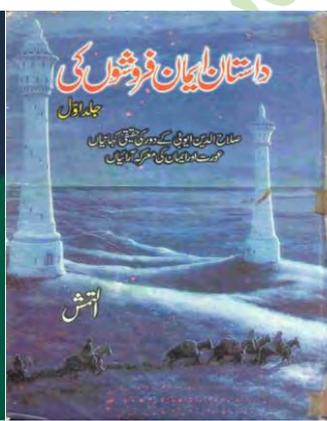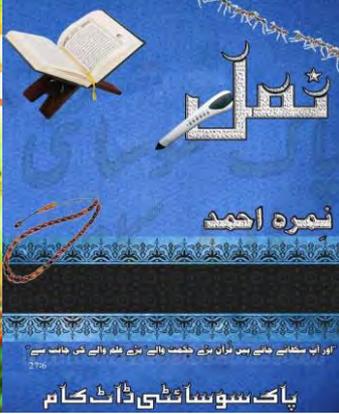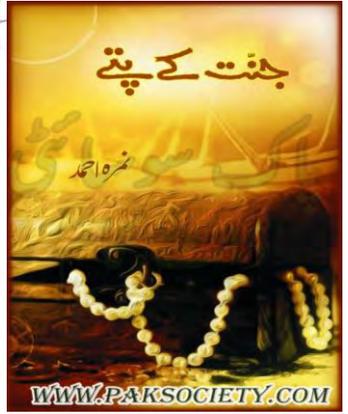
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

محبتوں کے حسین رنگوں سے مرصع فروری 2017ء کا دلربا پاکیزہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
شیریں حیدر کے نئے ناول کے ساتھ ساتھ رفعت سراج
اور انجم انصار کے دلچسپ ناول اگلی منزل کی طرف گامزن
سحر ساجد کی دل پذیر تحریر...... من جانبازم کا اگلا پڑاؤ
سیما رضا ردا نے افشا کیے کچھ نئے اسرار اپنے منی ناول ہم کو عبث بدنام کیا میں
ماضی کی معروف نیوز کاسٹر مہ پارہ صفدر
اور عالمی شہرت یافتہ براڈ کاسٹر صفدر علی ہمدانی
سے ایک خوب صورت ملاقات
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے انوار قرآن کا نیا سلسلہ
قانتہ رابعہ، نگہت اعظمی اور غزالہ عزیز کی خصوصی تحریریں
اس کے علاوہ
مایہ ناز قلم کاروں کے شاہکار افسانے...... جس میں شمیم فضل خالق، طیبہ عنصر مغل،
سیما بنت عاصم، فرح طاہر قریشی، روزی، ہما بیگ، بنت زہرا و دیگر شامل ہیں
اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ، معلومات افزا منفرد و مستقل سلسلوں کا امتزاج صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

"میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ کوئی ایسا کیوں کہے گا۔ میری نظر میں وہ ایک ایمان دار شخص تھا اور اس میں وہ تمام اخلاقی قدریں موجود تھیں جو آج کل بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔"

"لیکن تم اسے زیادہ نہیں جانتی تھیں اور جہاں تک گرجا جانے کا تعلق ہے تو میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو اپنے آپ کو اچھا عیسائی ظاہر کرتے تھے لیکن ان کے کرتوت...... خدا کی پناہ۔"

"یہ سچ ہے کہ ہمارے اس سے سماجی تعلقات نہیں تھے۔ ہم نے کبھی ساتھ ڈنر نہیں کیا اور نہ ہی کسی بار میں ایک ساتھ گئے۔"

"ٹھیک ہے۔" جونز نے کہا۔ "میں یہاں اپنے نظریات کی تصدیق نہیں بلکہ تمہارے خیالات معلوم کرنے آیا تھا۔"

"میں کبھی کبھی سوچتی ہوں......" مینڈی کہتے کہتے رک گئی۔

"بولو، رک کیوں گئیں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ "جن دنوں نک وہاں کام کر رہا تھا، ایک نوجوان لڑکی نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کا نام بیکی ہیرس تھا اور وہ جارج ہیرس کی بیٹی تھی جو ڈاکٹر ولیم کا دوست ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"دو سال ہو گئے۔ اس لڑکی نے بڑی مقدار میں اپنی ماں کی خواب آور گولیاں کھا لی تھیں۔ یہ واقعی ایک سانحہ تھا۔ والدین بدنام ہو گئے۔ ان کے درمیان علیحدگی ہو گئی اور اس کی ماں ڈورین یہاں سے چلی گئی۔"

"یہ کون سی عجیب بات ہے، نوعمر بچوں کی خودکشی اب عام ہو گئی ہے۔ خاص کر دور دراز کے دیہات میں۔"

"ہاں، میں جانتی ہوں لیکن اس میں ایک اور شخص بھی شامل تھا۔ نک نے اسے بیکی کے ساتھ ایک دو مرتبہ دیکھا۔ بظاہر وہ دونوں دوست لگتے تھے۔ نک کا کہنا تھا کہ وہ دیکھنے میں سیدھا سادہ لگتا ہے۔ میں نے بھی اسے گاؤں میں چند بار دیکھا۔ بظاہر وہ بے ضرر انسان تھا۔ گاؤں کے کچھ بچے اس سے تفریح لیتے تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟" جونز نے پوچھا۔

"وہ گاؤں سے چلا گیا۔"

"تمہیں اس کا نام یاد ہے؟"

"ٹونی، ٹونی بلیٹ وہ تنہا ہی رہتا تھا۔ کوئی نہ کوئی اسے جانتا ہوگا۔ اسی لیے نک اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔"

"اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"کوئی شخص اسے پوچھتا ہوا ہوپ اینڈ اینکر پر آیا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"سات مہینے یا اس کے لگ بھگ لیکن نک کے حادثے سے زیادہ پہلے کی بات نہیں ہے۔"

"اس لڑکے ٹونی کی عمر کتنی ہوگی؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن وہ ستائیس سال کا ضرور ہوگا۔"

"کیا وہ کوئی کام کرتا تھا؟"

"یہ میں نہیں جانتی گو کہ وہ مضبوط جسم کا مالک تھا اور اس نے کھیتوں میں مزدوری بھی کی لیکن وہ اپنے بارے میں زیادہ نہیں سوچتا تھا البتہ ہدایات پر پوری طرح عمل کرتا تھا۔"

"بیکی اور ٹونی کے درمیان کس نوعیت کا تعلق تھا؟"

"میں نہیں جانتی۔ سوائے اس کے کہ وہ آپس میں دوست تھے۔ وہ لڑکا گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا کیونکہ وہ بھی اسے پسند کرتے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ ذہنی لحاظ سے اس کے برابر تھے اور شاید وہ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے لیکن بچوں کے والدین کو یہ پسند نہیں تھا۔"

"کیا میکس بیلنگ کا ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی واسطہ پڑا؟"

"نہیں، جہاں تک میں جانتی ہوں گو کہ وہ جارج اور ڈورین کا قریبی دوست تھا۔ اس لیے بیکی کو بھی ضرور جانتا ہوگا۔ اسے یقیناً اس کی خودکشی پر افسوس ہوا ہوگا۔"

جونز نے ایک کاغذ پر کچھ نام اور تاریخیں لکھیں پھر مینڈی کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ جب وہ کار کی طرف جا رہا تھا تو اس کی نظر ایک ریستوران پر گئی۔ اس نے سوچا کہ لنچ کر لینا چاہیے۔ وہ ایک گرم دن تھا اور باہر کی میزیں تقریباً بھر چکی تھیں۔ بہرحال اسے ہال کے ایک کونے میں بہ آسانی جگہ مل گئی۔ اس کے دماغ میں ابھی تک مینڈی کی بتائی ہوئی باتیں گھوم رہی تھیں۔

☆☆☆

"اسے سکیائل کو لین دی گئی تھی۔ یہ اعصاب کو کچھ دیر سکون پہنچانے والی دوا ہے۔" اینی نے جونز کو راستے میں بتایا۔ وہ اس وقت ڈورین ہیرس کے پاس جا رہے تھے جو سلبی کے قریب واقع ایک گاؤں شیرین ان ایلمیٹ میں رہتی

تھی۔ ایمی کو تھوڑی دیر پہلے ہی پوسٹ مارٹم رپورٹ ملی تھی جس کے مطابق پیتھالوجسٹ نے میکس بیلنگ کے بائیں بازو پر سوئی کا نشان دیکھ کر معلوم کرلیا کہ اسے انجکشن کے ذریعے کون سی دوا دی گئی تھی۔ لیکن اس کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے اس کے جسم میں ایک اور دوا بھی داخل کی گئی جس کا پتا چلانا مشکل ہے۔ ایمی نے بتایا۔ ''ڈاکٹر کو یقین ہے کہ قاتل نے پوٹاشیم کلورائیڈ استعمال کیا ہے کیونکہ دل کو نقصان پہنچنے اور جسم میں پوٹاشیم کی سطح بڑھنے سے یہی معلوم ہورہا ہے۔''

جونز نے گاڑی ایک بڑے مکان کے سامنے کھڑی کی جس میں ایک گیراج اور بڑا سا باغ تھا۔ وہ جگہ بالکل ویران لگ رہی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے کئی سالوں سے وہاں کوئی نہ رہ رہا ہو۔ تاہم جونز نے بیرونی دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجا دی۔ کافی دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو وہ واپسی کے بارے میں سوچنے لگے۔ عین اسی وقت ایک عورت دروازے پر آئی۔ وہ تقریباً پینتالیس برس کی تھی۔ کچھ عرصہ قبل وہ پرکشش رہی ہوگی لیکن اب اس نے اپنی پروا کرنا چھوڑ دی تھی۔ اس نے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کے بلاؤز پر کھانے کا دھبا لگا ہوا تھا۔ بال بے ترتیب تھے اور آنکھوں میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

انہوں نے اپنا تعارف کروایا تو اس نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ کیے بغیر انہیں اندر بلالیا۔ اندر کافی گرمی تھی اور لگ رہا تھا جیسے کافی عرصہ سے وہاں ہوا کا گزر نہیں ہوا۔ فرش اور دیواروں پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی اور کھڑکیوں سے بہت کم روشنی اندر آرہی تھی۔ انہیں بھی ایک مدت سے صاف نہیں کیا گیا تھا۔ ڈورین نے اس خستہ حالی پر کوئی معذرت نہیں کی اور نہ ہی چائے یا کولڈ ڈرنک کے لیے پوچھا۔ جب وہ لیونگ روم میں بیٹھ گئے تو جونز نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''ہم تمہاری بیٹی کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں مسز ہیرس۔''

''میری بیٹی مرچکی ہے اور اب میرا نام گرینی ہے۔ شادی سے پہلے میرا یہی نام تھا لیکن تم مجھے ڈورین کہہ سکتے ہو۔''

''ہم جانتے ہیں کہ تمہاری بیٹی مرچکی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ اس موضوع پر بات کررہا ہوں۔ جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے تکلیف دہ ہوگا۔''

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''اس کی موت کو کافی عرصہ ہوگیا ہے۔''

''صرف دو سال۔'' جونز نے کہا۔ ''یہ کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہے۔''

''میں نہیں جانتی کہ تم نے دو سال بعد یہاں آنے کی زحمت کیوں کی۔ میری بیٹی نے خود اپنی زندگی کا خاتمہ کیا۔''

''یہ ہم جانتے ہیں۔'' جونز نے کہا۔ ''البتہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تمہارے خیال میں اس خودکشی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟''

''بیکی افسردہ رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس کے علاج کے لیے کسی ماہر کی مدد لینا ہوگی لیکن اس سے پہلے کہ ہم کوئی انتظام کرتے۔ اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔''

''وہ ڈاکٹر کون تھا؟''

''ڈاکٹر ولیم، وہ ہمارا فیملی ڈاکٹر اور ہیرس کا دوست ہے۔ وہ بیکی کو اسپیشل کلینک میں داخل کرنا چاہ رہا تھا لیکن اسے بہت دیر ہوگئی۔''

''یہ واقعہ کب پیش آیا۔ ٹونی بلیٹ کے جانے سے پہلے یا بعد میں؟''

''ٹونی بلیٹ، یعنی تم اس کے بارے میں بھی جانتے ہو، یہ واقعہ اس کے جانے کے بعد ہوا تھا۔''

''کیا بیکی اس کے چلے جانے سے پریشان تھی؟''

''وہ کیوں پریشان ہونے لگی؟''

''اس لیے کہ وہ دونوں دوست تھے۔''

''میں اس بارے میں بات کرنا نہیں چاہتی۔''

''کس بارے میں؟''

''تم جانتے ہو، ورنہ یہاں کیوں آتے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے الفاظ میں بتاؤ۔'' جونز جھوٹ بول رہا تھا۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس بارے میں بات کررہی ہے۔

ڈورین کچھ دیر خاموش رہی جیسے وہ سوچ رہی ہو کہ اسے بولنا چاہیے یا نہیں پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

''ٹونی نے اس کی عصمت دری کی تھی۔ جیسا کہ تم بھی جانتے ہو لیکن مجھ سے سننا چاہ رہے ہو۔ وہ ایک رات گھر آئی تو اس کے پورے جسم پر خراشیں تھیں اور خون بہہ رہا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ٹونی نے دریا کے کنارے واقع کھیت میں اس کی عصمت دری کی تھی۔ اس کے بعد وہ کبھی پہلے والی حالت میں نہیں آئی۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''جب وہ پندرہ سال کی تھی۔''

''تین سال پہلے۔ اس کے ایک سال بعد اس نے

خودکشی کرلی۔‘‘
’’ہم نے اسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔‘‘
’’کیا تم نے اس واقعے کی رپورٹ درج کروائی تھی؟‘‘
’’اس سے کیا ہوتا۔‘‘ ڈورین نے کہا۔ ’’سوائے اس کے کہ بیکی کو عدالت میں مزید بے عزتی اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ ٹونی رہا ہو جاتا یا اسے اصلاحی مرکز میں بھیج دیا جاتا ورنہ اسے چند سال کی سزا ہو جاتی۔ اس لیے ولیم نے کہا کہ پولیس میں رپورٹ کرنے کے بجائے ٹونی کو گاؤں سے نکال دیا جائے اور وہ کبھی واپس نہ آئے۔‘‘
’’یہ فیصلہ ولیم نے کیا تھا؟‘‘
’’یہ پورے گاؤں کا فیصلہ تھا۔ وہ جن بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔ ان کے والدین پہلے ہی اسے ناپسند کرتے تھے۔ اس واقعے کے بعد اور بھی خوف زدہ ہو گئے۔ سب کے گھروں میں لڑکیاں تھیں۔ کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔‘‘
’’وہ کہاں گیا؟‘‘
’’میں نہیں جانتی، ایک دن وہ خاموشی سے چلا گیا۔ مقامی کمپنی کے لوگ آئے اور اس کا سامان اٹھا کر لے گئے۔‘‘
جونز نے کمپنی کا نام پوچھا۔ وہ نیڈ ہوورڈ کی فرم تھی۔ اینی نے فوراً وہ نام نوٹ کر لیا۔ وہ کمپنی کے ریکارڈ سے اس کا پتا معلوم کر سکتے تھے۔
’’اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟‘‘
’’نہیں، اس کے جانے کے بعد بے چاری بیکی بالکل ہی تنہائی پسند ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیتی اور اگر باہر جاتی تو ہمیں معلوم نہ ہوتا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ پھر اس نے خودکشی کر لی۔ میرے اور جارج کے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اولاد کی جدائی سے ازدواجی زندگی کتنی متاثر ہوتی ہے۔ پھر میں یہاں چلی آئی۔ یہ میرے والدین کا گھر ہے۔ میں یہیں پلی بڑھی۔ مجھے یہ گھر ورثے میں ملا ہے۔ ہم اسے بیچنے والے تھے لیکن میں نے خود یہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح جہاں سے چلی تھی وہیں واپس آگئی۔‘‘
اس کے پاس کہنے کے لیے مزید کچھ نہیں تھا۔ اینی نے نوٹ بک بند کی اور جونز کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔
’’مجھے افسوس ہے کہ تمہیں زحمت دی۔ مجھے یقین نہیں کہ تم اس بارے میں جانتی ہو گی کہ میکس بیلنگ کا گزشتہ روز فورٹ فورڈ میں قتل ہو گیا اور ہم اس کی موت کی تحقیقات کر رہے ہیں۔‘‘
اس نے حیرت سے جونز کو دیکھا اور بولی۔ ’’اوہ میرے خدا! نہیں، وہی ایک شخص تھا......‘‘
’’رک کیوں گئیں، آگے بولو۔‘‘ جونز نے کہا۔
’’پورے گاؤں میں وہی ایک شخص تھا جو بیکی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی اطلاع پولیس کو دینے کے حق میں تھا۔ اس حادثے کے بعد جارج، ولیم اور نیڈ سمیت گاؤں کے دوسرے لوگ اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے گو کہ بعد میں وہ مان گیا لیکن اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔ تم چاہو تو جارج سے بات کر لو بلکہ تمہیں ایسا کرنا چاہیے۔‘‘
☆☆☆
اپنے محفوظ اور آرام دہ گھر میں جارج ہیرس گزشتہ روز کی نسبت زیادہ پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ گو کہ وہ ماضی کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن جیسے جیسے گفتگو آگے بڑھتی گئی، وہ کھلتا چلا گیا۔ جیسے اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہا ہو۔
’’ہم میکس بیلنگ کے قتل کی تحقیقات کر رہے ہیں جارج۔‘‘ جونز نے کہا۔ ’’تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو؟‘‘
’’میں نے یہ قتل نہیں کیا، اگر تم ایسا سوچ رہے ہو۔‘‘ ہیرس نے کہا۔
’’میں فی الحال کچھ نہیں سوچ رہا۔ صرف تمہاری کہانی سننا چاہتا ہوں۔‘‘
ہیرس دونوں ہاتھوں سے سر پکڑتے ہوئے بولا۔ ’’میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔‘‘
جونز نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’ہم تمہاری بات پر یقین نہیں کرتے۔ ہم نے تمہاری بیوی اور مینڈی ورکس ہال سے بات کی ہے اور ہمیں کچھ اشارے ملے ہیں۔ کس نے واکس ہال کو ٹکر ماری تھی۔ شاید تم ہمیں بتا سکو، کیا وہ تم تھے؟‘‘
’’نہیں، میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔‘‘
’’اولیور ولیم؟‘‘
’’میں نہیں جانتا۔ ممکن ہے وہی ہو۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اولیور کچھ بھی کر سکتا ہے یا پھر وہ نیڈ ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اس نے اپنی وین سے ٹکر ماری ہو۔‘‘
’’یہ کس کا آئیڈیا تھا کہ میکس بیلنگ کو مالی بدعنوانیوں میں الجھایا جائے۔ ہم نے اس کا پورا ریکارڈ چیک کیا ہے لیکن کوئی غلط بات نظر نہیں آئی۔‘‘

"میں نہیں جانتا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"میں دوبارہ اولیور ولیم کا نام لوں گا۔"

جارج نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کوئی شخص ٹونی کو ڈھونڈتا ہوا دوبارہ آیا تھا۔ اسی نے پہلے بھی نک واکس ہال سے بات کی تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس نے ہماری بات پر یقین کرلیا ہوگا کہ ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اسی لیے ہم نے سوچا کہ تمہاری توجہ لندن کی زیرِزمین دنیا کی طرف موڑ دی جائے۔"

"تاکہ ہم یہاں سے دور ہوجائیں۔" جونز نے کہا۔

"اگر تم پسند کرو تو شروع سے سب کچھ بتا دو۔ ہمارے پاس بہت وقت ہے۔"

ہیرس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں؟"

"سب سے پہلے اپنی بیٹی کے بارے میں بتاؤ۔"

"تم جانتے ہو، اس کے ساتھ کیا ہوا۔ میری سابقہ بیوی نے بتادیا ہوگا۔"

"اس نے بتایا ہے کہ ٹونی بلیٹ نے تمہاری بیٹی کے ساتھ زیادتی کی اور تم نے اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے اسے گاؤں سے نکال دیا۔ کیا ایسا ہی ہوا تھا؟"

ہیرس نے اثبات میں سر ہلایا تو جونز نے کہا۔ "کیا تم میں سے کسی نے بھی یہ نہیں سوچا کہ پولیس اس معاملے سے بہتر طریقے پر نمٹ لے گی اور تمہاری بیٹی کا بھی علاج ہو جائے گا۔"

"اولیور نے اس کی دیکھ بھال کی۔ تم اس کے بارے میں کچھ بھی کہو۔ وہ ایک اچھا ڈاکٹر ہے اور جہاں تک پولیس میں رپورٹ کرنے کا تعلق ہے تو ہمیں اس نظام پر بالکل اعتماد نہیں ہے۔ مجرم بری ہو جاتے ہیں یا انہیں بہت معمولی سزا ملتی ہے۔"

"اس لیے تم نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کرلیا؟"

"یہی سمجھ لو کیونکہ میں جانتا تھا کہ پولیس میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وکیل اور نفسیاتی ماہر سارا ملبا میری بیٹی پر ڈال دیں گے اور الزام میری بیٹی پر آجائے گا کہ اس میں اس کی خواہش بھی شامل تھی۔"

"تمہاری سوچ بہت غلط ہے۔" ایبی نے کہا۔ "کیا اس سے زیادہ بُرا ہو سکتا تھا جو تمہارے اور گاؤں والوں کے فیصلے کے بعد ہوا۔ ایک مقامی پولیس آفیسر مارا گیا اور اس کی موت کو حادثہ قرار دے دیا گیا۔ ایک نوجوان شخص گاؤں سے چلا گیا اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ تمہاری بیٹی نے خودکشی کرلی اور اب تمہارا ایک اچھا دوست قتل کر دیا گیا۔ کیا یہی انصاف ہے۔ میکس بیلنگ کے قتل سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ یہ گاؤں والوں کے لیے ایک وارننگ ہے جو کچھ جانتے ہیں یا انہیں کسی پر شبہ ہے۔ شاید کل تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے، وہ کون تھا جو دوسری بار ٹونی کو ڈھونڈتا ہوا آیا؟ کیا اس سے بھی زیادہ بُرا کچھ ہو سکتا ہے؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا......" جارج کہتے کہتے رک گیا پھر وہ انتہائی دھیمی آواز میں بولا۔ "ٹونی بلیٹ کہیں نہیں گیا۔ ہم نے اسے مار کر جنگل میں دفن کر دیا تھا۔"

☆☆☆

"اولیور، ہمیں تم پر شبہ ہے۔ اسی لیے تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔" جونز نے کہا۔

"وکیل کے آنے تک میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔"

ڈاکٹر اولیور ولیم نے کہا۔ وہ اس وقت ایسٹ ویل پولیس ہیڈ کوارٹر کے انٹرویو روم میں بیٹھا ہوا تھا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں فی الحال کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔" جونز نے کن انکھیوں سے ایبی کو دیکھتے ہوئے کہا جو اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ "میرا خیال ہے کہ جو کچھ مجھے مینڈی، ڈورین اور جارج نے بتایا ہے اور جو واقعات پیش آئے ہیں، ان کی مدد سے میں یہ کہانی مکمل کر سکتا ہوں اور جب میں تمہیں یہ سب کچھ بتا رہا ہوں۔ میری فارنسک ٹیم تمہارے گھر، کلینک اور کار کی باریک بینی سے تلاشی لے رہی ہوگی۔"

"انہیں کچھ نہیں ملے گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم نے کوئی نشان نہیں چھوڑا ہوگا لیکن پولیس کی نظروں سے کچھ نہیں چھپ سکتا، تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔" جونز نے کہا۔ "اب جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنو۔" تین سال پہلے ایک ذہنی پسماندہ نوجوان نے پندرہ سالہ بیکی ہیرس سے زیادتی کی جو تمہارے قریبی دوست کی بیٹی تھی۔ اس لیے تمہاری پریشانی فطری تھی۔ تم نے پولیس میں رپورٹ کرنے کے بجائے گاؤں والوں کو اس پر آمادہ کرلیا کہ ٹونی کو گاؤں سے نکال دیا جائے اور چند لوگوں کے ہمراہ اسے جنگل میں لے گئے۔ وہاں تم نے اس پر اتنا تشدد کیا کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا یا کسی اور طریقے سے اسے مار دیا گیا، پھر تم نے اسے کوئلے کی دلدل میں دفنا دیا۔ خوش قسمتی سے اس میں انسانی لاشیں محفوظ رہتی ہیں۔ مجھے اس بات

میں بالکل بھی شبہ نہیں کہ جب جارج ہیرس ہمیں وہاں لے کر جائے گا تو ہم اس کی موت کی اصل وجہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

ڈاکٹر ولیم نے جونز کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

''تم نے اپنے ایک دوست نیڈ ہوورڈ سے کہا کہ وہ ٹونی کا سامان اس کے گھر سے ہٹا دے تاکہ لوگ یہی سمجھیں کہ وہ گاؤں سے چلا گیا ہے۔ نیڈ باربرداری کا کام کرتا ہے اور وہ بھی اس کارروائی میں تمہارے ساتھ تھا چنانچہ اس نے سارا سامان ٹھکانے لگا دیا اور جب ہم نے اس سے بات کی تو وہ بالکل پاک صاف بن گیا۔ اس کے پاس اس سامان کی منتقلی کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ ٹونی کے مرنے کے ایک سال بعد بیکی ہیرس نے بھی خودکشی کر لی۔

''شاید اسے معلوم ہو گیا ہو جو کچھ تم نے ٹونی کے ساتھ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ ٹونی نے اس کے ساتھ زیادتی نہ کی ہو اور اس نے جھوٹ بولا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں دونوں کی رضامندی شامل ہو لیکن ٹونی نے دباؤ میں آ کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ شاید حقیقت کبھی ہمارے سامنے نہ آ سکے لیکن گاؤں کا مقامی پولیس آفیسر اس خودکشی اور ٹونی کی گمشدگی پر شک میں پڑ گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک شخص ٹونی کو تلاش کرتا ہوا یہاں آیا تھا جبکہ بنک کو بتایا گیا تھا کہ ٹونی گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ وہی شخص ایک ہفتہ پہلے دوبارہ آیا اور جب تم نے اسے بتایا کہ ٹونی کئی سال پہلے یہاں سے جا چکا ہے تو وہ مطمئن نہیں ہوا۔ ہم اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید تمہارے تصور میں بھی نہیں ہو گا کہ ٹونی کا کوئی پرانا دوست یا رشتے دار اس کے لیے بے چین ہو رہا ہے۔

''اس صورت حال سے میکس بیلنگ گھبرا گیا۔ ڈورین ہیرس نے ہمیں بتایا کہ وہ اس کے حق میں نہیں تھا اور پولیس میں رپورٹ درج کروانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس نے تم لوگوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ قانون کو ہاتھ میں نہ لیا جائے اور یقیناً اسے یہ جان کر گہرا صدمہ ہوا ہو گا کہ تم نے ٹونی کو گاؤں سے نکالنے کے بجائے مار ڈالا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ ایک نفیس شخص تھا۔ یہ بات اس کے لاشعور میں بیٹھ گئی کہ اس نے تمہارا ساتھ دے کر غلطی کی تھی۔ یہ میرا اندازہ ہے کہ وہ تمہاری مخبری کرنے والا تھا۔ ٹونی کے مرنے کے اٹھارہ مہینے بعد تم نے اس پولیس آفیسر کو بھی ٹکر مار دی جو اس کی موت کے بارے میں تحقیقات کر رہا تھا جبکہ تم ایسا نہیں چاہتے تھے اور اب ایک قریبی دوست تمہارے خلاف ہو رہا تھا چنانچہ اسے راستے سے ہٹانا ضروری ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کام تم نے ہی کیا ہے۔ اس کے بائیں بازو پر انجکشن کا نشان ہے اور تم ہی گاؤں کے واحد ڈاکٹر ہو۔ اس لیے یہ انجکشن تم نے ہی لگایا ہو گا۔ میکس ایک صحت مند دل کا مالک تھا لیکن اسے دل کا دورہ پڑا جو صرف پوٹاشیم کلورائیڈ کے انجکشن سے ہو سکتا ہے اور موت کے بعد اس کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا لیکن ہمارا پیتھالوجسٹ تمہاری سوچ سے زیادہ ہوشیار ہے۔

''تم نے اس کی لاش ایسی جگہ رکھ دی جو عام گزرگاہ ہے تاکہ سب لوگ دیکھ سکیں کہ مخالفین کا کیا انجام ہوتا ہے کیونکہ گاؤں میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ سب جانتے تھے یا انہیں شبہ تھا۔ لوگ تم سے خوف زدہ یا تمہارے زیر بار تھے۔ اس لیے خاموش ہو گئے۔ تم نے ہوشیاری یہ دکھائی کہ مجھے میکس کی مالی بدعنوانیوں کے بارے میں بتا کر غلط راستے پر ڈالنا چاہا جہاں سے شاید ہم کبھی واپس نہ آ سکتے لیکن ایک بات تم بھول گئے یا اس پر غور نہیں کیا کہ ڈورین ہیرس کو یہ پوری کہانی معلوم تھی۔ اسی طرح مینڈی واکس ہال بھی تم سے بہت دور تھی۔ تم اتنے ذہین نہیں ہو جتنا اپنے آپ کو سمجھتے ہو۔''

ولیم نے کچھ نہیں کہا اور دونوں ہاتھ باندھے بیٹھا رہا۔ جونز نے کاغذات سنبھالے اور اینی کو لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ ولیم کا وکیل تھوڑی دیر میں آنے والا تھا اور اب انہیں وہ تمام ثبوت اکٹھا کرنے تھے جن کا ذکر جونز نے اپنی گفتگو میں کیا تھا جن میں ڈاکٹر کی کار اور سامان کی فرانزک رپورٹ، ٹونی کی لاش، جارج ہیرس، نیڈ ہوورڈ اور ان لوگوں کے بیانات شامل تھے جو بالآخر ڈاکٹر کے خلاف ہو گئے تھے۔ جونز کو یقین تھا کہ وہ چند روز میں یہ ساری کارروائی مکمل کر لے گا اور ان مضبوط شواہد کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر عبرت ناک سزا سے نہیں بچ سکے گا۔ اس نے اینی سے کہا۔ ''ایک بار پھر یہ ثابت ہو گیا کہ مجرم خواہ کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو۔ کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔ اگر ڈاکٹر اپنے دوست کو قتل کرنے کے لیے انجکشن لگانے کے بجائے کوئی اور طریقہ اختیار کرتا تو شاید ہم اتنی آسانی سے اس تک نہ پہنچ پاتے۔''

''میں تو اسے فاش غلطی کہوں گی۔'' اینی نے مسکراتے ہوئے کہا اور مشروب کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

شکار

شبنم شفیق

کیسا سفر...... کہاں کا سفر...... جستجو عبث

رونقیں اور تبدیلیاں یقینی طور پر مثبت تغیرات... زندگی کے حسن کو بڑھاوا دیتے ہیں... خصوصاً خوب صورت اور منفرد مقامات کی سیرگاہیں... مزاج و شخصیت پر اثرانداز ہوتی ہیں... سفر در سفر اختیار کرنے والے شوقینوں کا دلچسپ اور دل لبھاتا سلسلہ... وہ سب مسافر تھے... اور زندگی کے ہر پل کو رنگین اور سنگین واقعات سے یادگار بنادینا چاہتے تھے... مگر اس سہانے اور رومانوی سفر میں اچانک ہی خون کی آمیزش نے سب کو بکھرا کر رکھ دیا... تلخ تجربے نے ان کے احساسات میں چبھن... کرب کی کرچیاں اور تلاطم بپا کر دیا... ہر شخص موت کے ہولناک گھیراؤ میں تھا... جینے کی خواہش لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی مگر قاتل کا جوش بھی اپنے عروج پر تھا...

مغربی وادیوں میں کھیلے جانے والے خونی کھیل کی خوفناک روداد......

اُس کے ڈیوٹی اوقات ختم ہو چکے تھے۔ وہ اسپتال کی واحد لفٹ سے انڈرگراؤنڈ پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف کافی تھکے ہوئے انداز میں بڑھی۔ گاڑی اسٹارٹ کی مگر گاڑی نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔

''شٹ۔'' اس نے اسٹیئرنگ پر زور کا ہاتھ مارا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ نکلنے سے پہلے اس نے اپنا پرس اور کوٹ اٹھالیا تھا۔

وہ کافی تھکی ہوئی تھی لیکن اسے اگلی صبح اپنے کچھ

دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے بھی جانا تھا۔ جہاں ان کا کچھ دن رکنے کا منصوبہ تھا۔ اسے ابھی اپنی پیکنگ بھی مکمل کرنی تھی لیکن فی الوقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جلد سے جلد اپنے فلیٹ پہنچ کر پہلے کچھ دیر آرام کرے۔ پرس سے اس نے موبائل فون نکالا اور اپنی ایک قریبی دوست کا نمبر ملانے لگی۔ اسے اپنا مطلوبہ پتا بتا کے وہ فون بند کر کے پلٹی ہی تھی کہ بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کے سامنے بھورے بالوں والا شخص کھڑا اس کی کیفیت سے جیسے محظوظ ہو رہا تھا۔ بلیک لیدر کی سلیولیس جیکٹ اور مضبوط بازوؤں پر خوفناک ٹیٹوز بنوائے موٹے سے نقوش والا یہ شخص اسے قطعاً پسند نہیں آیا تھا۔

''کون ہو تم؟'' وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔

''کولن ٹیڈ۔'' وہ لوفرانہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''آپ کو غالباً لفٹ چاہیے اگر مناسب لگے تو میری گاڑی حاضر ہے۔'' اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کا فون سن کر اپنی خدمات پیش کر رہا ہے۔

''تھینکس، میری دوست آرہی ہے مجھے لینے۔'' وہ خاصے محتاط انداز میں بولی۔ لاشعوری طور پر اسے اس شخص سے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔

''جیسے تم چاہو۔'' وہ بے پروائی سے کندھے اچکا کر قریب موجود اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ مشعل نے اس وقت تک اپنی سانس روکے رکھی جب تک کولن نامی شخص کی گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

دس منٹ کے انتظار کے بعد اس کی دوست علینہ کی گاڑی جیسے ہی پارکنگ میں پہنچی، وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کی جانب بڑھ گئی۔

''سوری تمہیں اس وقت تنگ کیا۔'' بیٹھتے ہی اس نے معذرت کی۔

''نہیں میں جاگ رہی تھی، پیکنگ ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔'' علینہ نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

''مجھے تو تم لوگوں نے زبردستی تیار کیا ہے اور میری کوئی خاص تیاری بھی نہیں ہے۔''

''مشعل بور مت کرو، یہ بتاؤ کتنی چھٹی لی ہے؟''

''صرف چار دن کی۔''

''تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ تم اس کو بڑھا لو کیونکہ واپسی کم از کم بھی دس دن سے پہلے نہیں ہونے والی۔''

''دس دن۔'' وہ بے ساختہ چلائی۔ ''تم مجھے لازمی نوکری سے نکلواؤ گی۔''

''تم اکیلی نوکری نہیں کرتی ہو، ہم سب کرتے ہیں مگر تمہاری طرح دڑبے میں بند نہیں رہتے، تمہارے پاس میڈیسن کی اعلیٰ ڈگری ہے ایک چھوڑ دس جگہ جاب مل جائے گی۔''

''مگر مجھے یہی جاب مناسب لگتی ہے، میرے فلیٹ سے قریب ہے اور سیلری بھی اچھی ہے۔''

''تو بس پھر زیادہ نہیں تو ایک ہفتے کی چھٹی تو لینا پڑے گی۔ پچھلے سال بھی تمہاری وجہ سے تین چار دن میں فرانس سے واپس آنا پڑا تھا لیکن اس دفعہ ایسا نہیں چلے گا۔ مزہ ادھورا رہ جاتا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔

''تو تم لوگ مجھے رہنے دو میں پھر کبھی چلی جاؤں گی۔''

''شٹ اپ۔'' علینہ قدرے بیزاری سے بولی۔

''مگر اتنی زیادہ پیکنگ کون کرے گا؟''

''میں صبح جلدی تمہاری طرف آجاؤں گی، ضرورت کی چیزیں ایک سائڈ پر رکھتی جانا میں پیک کر دوں گی۔'' علینہ نے ایک زبردست سی آفر کی تو اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ علینہ کی کچھ عرصہ پہلے ہی اپنے بوائے فرینڈ ڈیوڈ سے منگنی ہوئی تھی اور منگنی کے بعد یہ ان کی پہلی تفریح تھی جسے وہ کسی قیمت پر بھی چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ علینہ ایک مشہور فیشن بوتیک میں ڈریس ڈیزائنر تھی اور وہاں سے چھٹی لینا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

☆☆☆

سڈنی ائرپورٹ سے ٹیکسی لے کر وہ لوگ ہالی ڈے اِن پہنچے تو سورج ڈھلنے کو تھا۔ ہوٹل میں ان کے کمرے پہلے سے بک تھے۔ اس لیے ریسپشن پر اپنی آئی ڈی، پاسپورٹ وغیرہ چیک کرا کے وہ اپنے اپنے کمروں کی جانب ہو لیے۔ علینہ اور ڈیوڈ چونکہ منگیتر تھے اس لیے مشعل نے انہیں پرائیویسی دینے میں کھلے دل کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ علینہ نے اسے کہا تھا کہ وہ ایسا کوئی کام نہیں کریں گے نہ ہی ایسی کوئی حرکت جو مشعل نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو مگر مشعل کافی صاف گو تھی۔

''مرد اور عورت میں ایسا کچھ خفیہ نہیں جس کا مجھے علم نہ ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی جس پر علینہ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر محبت سے اس کے گلے لگ گئی۔ مشعل نے ایک ادا سے سر جھٹکا اور ایک گھنٹے بعد اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کرتی ہوئی ایک کمرا چھوڑ کر اسی سائڈ میں دوسرے کمرے

میں چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ گھنٹے سے پہلے وہ دونوں آنے والے نہیں تھے۔ اس لیے وہ اپنا سامان کمرے کے وسط میں پھینکتی گلاس وال کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ کمرا چونکہ چوتھی منزل پر تھا اس لیے وہ نیچے سڑک پر رواں دواں ٹریفک کو انہماک سے دیکھنے لگی۔ ساتھ ساتھ ایک انگلش گانا گنگناتے ہوئے وہ خود کو کپڑوں کی قید سے آزاد کرنے لگی۔ شدید تھکن کا واحد حل یہی تھا کہ وہ ایک گرما گرم شاور لے لے۔

شاور سے فارغ ہو کر اپنے گداز بدن کو ٹاول سے خشک کرتے ہوئے وہ اپنے سفری بیگ کو کھولنے لگی۔ وہ ایک ہلکا پھلکا ڈریس نکالنا چاہتی تھی تبھی ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹی تھی۔ آنے والا دراز قد، چوڑی چھاتی والا جوان مرد تھا۔ اندر آتے ہی اس نے آرام سے دروازہ لاک کیا مگر مشعل پر نظر پڑتے ہی بوکھلا گیا اور سرعت سے مشعل کے بدن سے نظریں پھیر کر کھڑا ہو گیا جبکہ مشعل ایک ٹک اُسے دیکھ رہی تھی۔

”ک......کون ہو تم؟“ اس نے کافی صاف انگریزی میں پوچھا تھا۔

”یہی سوال اگر میں تم سے کروں تو؟“ اسے اپنا لباس مل چکا تھا اور وہ تیزی سے پہنتے ہوئے بولی۔

”سوال کرنے کا حق مجھے ہے کیونکہ یہ میرا کمرا ہے۔“ وہ اب بھی اسی پوزیشن میں کھڑا تھا۔ مشعل اس سے کافی متاثر ہوئی۔ مکمل کپڑے پہننے کے بعد وہ اب اس کے سامنے تھی۔

”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو جبکہ یہ کمرا......؟“

”دیکھیں مس......“ وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”مشعل۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”او کے وہاٹ ایور...... مجھے ایک گھنٹا پہلے یہ کمرا ملا ہے جسے میں غالباً کھلا چھوڑ گیا تھا۔ تم الماری میں رکھا میرا سامان دیکھ سکتی ہو۔ کمرے کا نمبر 44 ہے اور میرے ہاتھ میں موجود چابی کا نمبر بھی یہی ہے۔ تمہارے پاس جو چابی ہے اس کا نمبر 45 ہے جسے دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے تم نے استعمال ہی نہیں کیا ورنہ غلطی سے میرے کمرے میں نہ آتیں۔“ بات کرتے ہوئے اس کی نظر سائڈ ٹیبل پر رکھی اس کی چابی پر پڑی تو وہ تیز لہجے میں بولا۔

”اب تم جا سکتی ہو کیونکہ مجھے اس طرح کی بے باک لڑکیاں بالکل پسند نہیں، تمہاری پہلی غلطی کو میں معاف کرتا ہوں۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔ وہ ایک غصیلی نظر اس پر ڈالتے ہوئے پلٹی اور اپنی چابی اور سامان اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ اسے عورتوں کی عزت نہ کرنے والے بے ہودہ لوگ قطعی پسند نہیں تھے۔ چاہے وہ کتنی ہی شاندار پرسنالٹی کے مالک ہوں۔

☆☆☆

سڈنی شہر میں چمکیلی صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہوٹل میں بوفے بریک فاسٹ تیار تھا۔ یہاں زیادہ تر سیاح آتے تھے۔ اس لیے انہیں پک کرنے ہر ایک گھنٹے کے وقفے سے ہوٹل کے باہر Shuttle bus service کا انتظام تھا۔ یہ سروس مختلف ٹورازم کمپنیوں کے ماتحت چلتی تھی جو مسافروں کو ان کی مرضی سے مختلف جگہوں کی سیر و تفریح کے لیے لے جاتی تھی۔ مشعل اور علینہ وغیرہ ناشتے سے فارغ ہی ہونے والے تھے کہ کل والا وہ لڑکا ناشتا لیے ہوئے ان کی قریبی میز پر آبیٹھا۔

”یہی ہے وہ روڈ مین۔“ مشعل کے بتانے پر علینہ کے ساتھ ساتھ ڈیوڈ نے بھی اس پر نظر ڈالی۔

”واؤ کافی شاندار ہے۔“ علینہ کی نظریں تو جیسے اس پر جم گئیں۔ ڈیوڈ کے ٹہوکا دینے پر وہ مسکرا کر معنی خیز نظروں سے مشعل کو دیکھنے لگی۔

”خبردار جو تم نے اس شخص سے فری ہونے کی کوشش کی۔“ وہ اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی مگر وہ علینہ ہی کیا جو کسی کی دھونس میں آئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ اس شخص کی ٹیبل پر اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

”آئی ایم علینہ۔“ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ پھیلا کر بولی۔ وہ کچھ لمحے اس کی جرأت پر حیران ہو کر دیکھتا رہا پھر اس کے پھیلے ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام لیا۔

”حداد بن طلال۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”مڈل ایسٹ؟“

”ہاں، جورڈن۔“

”شکل سے مصری لگتے ہو۔ مصریوں کا حسن مشہور ہے۔“ وہ بے باکی سے بولی تو وہ اپنی تعریف پر کھل کے ہنس دیا۔

”سیاحت کے لیے آئے ہو؟“

”آف کورس۔“ وہ کندھے اٹھا کر بولا۔

”ہم بھی، پتا ہے ہم ہر سال پلان کرتے ہیں۔ اس دفعہ آسٹریلیا آنے کی خواہش تھی۔ خطروں سے بھرپور کونٹی نینٹ ہے۔ آئی لو ایڈونچرز۔ ان سے ملو، میرا فیانسی ڈیوڈ اور مشعل برگس، پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہے لیکن خوب صورتی

میں ہالی ووڈ کی ہیروئن لگتی ہے۔ پچھلی رات اس کے حسنِ ہوشربا کا نظارہ تم بھی کر ہی چکے ہو، وہ تیز بولنے والی لڑکی تھی، سامنے والے کے تاثرات دیکھے بغیر۔ اس کی بات کے خاتمے پر اس نے گزشتہ رات والی لڑکی کو دیکھا، وہ واقعی خوب صورت تھی۔

کچھ دیر بعد وہ چاروں آپس میں بے تکلفی سے بات کر رہے تھے۔ ڈیوڈ ایک سافٹ ویئر انجینئر تھا جو حداد سے کافی گھل مل گیا۔ وہ خود تو ایک آرکیالوجسٹ تھا لیکن کسی زمانے میں اسے بھی انجینئر بننے کا بہت شوق تھا۔ ڈیوڈ جسامت کے لحاظ سے بہت ہی نازک سا لگتا تھا۔ حداد کے سامنے تو وہ ویسے بھی بچہ لگ رہا تھا۔ بہت زیادہ اسمارٹ اور درمیانے درجے کی ہائٹ کے ساتھ وہ واقعی ایک سافٹ ویئر انجینئر ہی لگتا تھا۔ اس کی شخصیت میں مزے کی چیز اس کے منہ کی گولائی تھی جس پر دو گول گول آنکھیں، نظر کے چشمے کے پیچھے اس کو بہت ہی سہل پسند آدمی ظاہر کرتی تھیں۔ اس کی باتیں بھی اسی کی طرح سافٹ تھیں۔

''یہ حداد بن طلال کچھ زیادہ ہی بھاری نام نہیں ہے۔'' مشعل کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''میرے دوست مجھے طلال کہتے ہیں، تم بھی کہہ سکتی ہو۔'' وہ اس کی گہری آنکھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''واؤ...... یہ آفر صرف مشعل کے لیے ہے یا ہم بھی کہہ سکتے ہیں؟'' علینہ چیونگم چباتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے ہم کافی بہتر ساتھی بن چکے ہیں۔'' اس کی اس بات پر سب ہنس دیے۔ دوسرے ہی لمحے وہ لابی میں ہونے والے بے تحاشا شور سے چونک اٹھے۔

یہ کچھ جوان لڑکے اور لڑکیوں کا گروپ تھا۔ وہ بھی ٹورسٹ تھے۔ ایسے ٹورسٹ جو زندگی کے ہر لمحے کو انجوائے کرنا چاہتے ہوں۔ وہ سب کے سب زور زور سے بولتے ہوئے ہپ ہوپ کرتے ناشتے سے سجی ٹیبلو کی طرف بڑھنے لگے۔ ان میں کچھ لڑکے لڑکیاں بڑی بے باکی سے انہیں بھی دیکھتے ہوئے آنکھ مارتے ہوئے گزرنے لگے۔

''مجھے زندگی کو ایسے ہی انجوائے کرنا پسند ہے۔'' ایک بلیک مین بڑی بے باکی سے اسے چھیڑتا ہوا گزرا تو علینہ جواباً برا مانے بغیر ہنسنے لگی۔

''ڈیوڈ کا بڑا دل ہے جو تمہارا منگیتر ہے، میں تو زندہ نہ چھوڑوں ایسی بے ہودگی پر۔'' مشعل قدرے نفرت سے بولی۔ اس کے چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے جیسے وہ خود کو بمشکل روک کے بیٹھی ہو۔ ڈیوڈ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے جیسے اس کے غصے کو کنٹرول کرنا چاہا جبکہ طلال کا خیال تھا کہ وہ زیادہ ہی ری ایکٹ کر رہی ہے۔

وہ لڑکے لڑکیاں تعداد میں سات تھے جن میں ایک لڑکی اور لڑکا سیاہ فام تھے باقی تین لڑکیاں اور دو لڑکے گورے تھے۔ ان کے لباس بھی انہی کی طرح فحش تھے۔ لڑکیوں نے تو صرف نیکر اور بلاؤز پر گزارا کیا تھا جبکہ لڑکوں نے پوری شرٹس پہن رکھی تھیں، ساتھ میں شارٹ اور لانگ نیکرز تھے۔ ان کے بیگز ان کے شانوں پر ابھی بھی لٹکے ہوئے تھے۔ وہ یہاں کافی لیٹ پہنچے تھے اور اب جلدی سے اپنا ناشتا ختم کر لینا چاہتے تھے۔ اسی دوران ان کی ٹور ازم کمپنی کے افسران آ گئے۔

☆☆☆

یہ ایک مرد اور عورت تھی۔ مرد لمبے قد اور بھاری جسامت کا ایک آسٹریلوی باشندہ تھا جبکہ عورت کے بارے میں فی الوقت کچھ کہنا مشکل تھا۔ وہ بھی دراز قد، قدرے کٹیلے نقوش کی مالک تھی۔ رنگ بہت گورا نہیں تھا۔ مگر حد سے زیادہ پُرکشش تھی۔ اس کی جسامت ایک دم فٹ تھی جیسے اسے کسی ماہر معمار نے تراشا ہو اس پر چست بلیک یونیفارم میں اس کا سراپا غضب ڈھا رہا تھا۔ اس کی کالی آنکھیں اور بال ظاہر کر رہے تھے کہ وہ دو مختلف نسلوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے مگر بہت شاندار۔

''ہم ایف جے ٹورز کی جانب سے آئے ہیں۔ آپ سب کو اس نئے پُرعزم دن کی شروعات پر مبارک باد دیتے ہیں۔ آپ سب نے ہمارے اسپیشل تھری ڈیز ٹو نائٹس ٹور کو جوائن کیا ہے۔ یہ ٹور ہم پورے سال میں بس دو دفعہ آفر کرتے ہیں۔ آپ کی پہلی رات مع رہائش کے بلوماؤنٹینز پر گزرنے والی ہے۔ ہمارے شاندار لگژری رائل پیلس میں جہاں کی صبح ہونے پر آپ سیر کریں گے۔ بلوماؤنٹینز کی اگلی صبح آٹھ بجے آپ پیلس چھوڑ دیں گے اور روانہ ہوں گے 'ہنٹر ویلی وائن کنٹری' کی جانب۔'' آفیسر نے شاندار طریقے سے اپنی تقریر کا آغاز کیا اور انہیں تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔

''مارننگ کافی بریک ہوگا ہاکس بری دریا پر۔'' اس نے ایک نظر ہال پر ڈال کر دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''لنچ آپ واپس ہنٹر ویلی آ کے کریں گے جہاں آپ کو آپ کی مرضی کا لنچ ملے گا۔ اس کے ساتھ ہی آپ ہماری ہنٹر وائن کو انجوائے کریں گے اور چار بجے کے قریب ہم ہنٹر ویلی کو چھوڑ دیں گے اپنی اگلی رہائش گاہ پورٹ اسٹیفن جانے کے لیے۔'' وہ

ایک مرتبہ پھر رکا۔

"تیسرے دن آپ لوگ مزے لیں گے بیچ پر سوئمنگ اور واک کے جہاں ہماری اسپیشل کروز یاٹ اسٹیفن پورٹ پر تیار کھڑی ہوگی۔ آپ کو وائلڈ ڈولفنز کا نظارہ دکھانے کے لیے ٹی اور کافی آپ کو یاٹ پر ہی پیش کی جائے گی۔ واپسی پر لنچ کے ساتھ ساتھ ہم سیر کروائیں گے، آسٹریلین اپنی ٹائل پارک کی جہاں آپ بہت ہی قریب سے دیکھیں گے اپنے فیورٹ وائلڈ اینی ملز کو اور شام چھ بجے ہم سڈنی واپس چل پڑیں گے۔" اس کی بات کے اختتام پر پورٹ ہال سے پُرجوش آوازیں آنے لگیں ہر کوئی بے چین تھا اس تھرلنگ اور ایڈونچرز ٹور پر جلد از جلد روانہ ہونے کے لیے۔

"یہ ہیں مس ایشل فاسٹر ہماری بیسٹ گائڈ آفیسر۔ یہ اس ٹور میں آپ کو نہایت عمدگی سے گائڈ کرتی رہیں گی، وش یو بیسٹ آف لک فار دس جرنی۔" وہ پُرجوش انداز میں مسکراتے ہوئے بولا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

"گڈ مارننگ۔" میل آفیسر کے جاتے ہی وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولی۔ اس کی آواز بھی اسی کی طرح بہترین تھی۔ علینہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ خوب صورت لوگ ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہے تھے۔

"میں بس آپ کو کچھ ٹریول انسٹرکشنز دوں گی۔ تو پہلے یہ کہ ہماری ائرلائن صرف بیگز کیری کرتی ہے۔ عام پہننے کا لباس، ٹھیک۔" وہ سب کی جانب ایک تفصیلی نگاہ ڈال کر بولی۔ "ایک جیکٹ لے لیجیے، سن ہیٹ، سن اسکرین اور سوئمنگ کاسٹیوم اور ساتھ لے جانے کے لیے اپنا چھوٹے سے چھوٹا بیگ لیجیے گا۔ بڑے سوٹ کیس کو آپ اپنے اس ہوٹل میں چھوڑ دیجیے۔ آپ کے سامان کی حفاظت ہوٹل کے ذمے ہے۔" وہ بات پوری کرتے ہوئے بولی۔

"میرا خیال ہے آپ کو ریڈی ہونے میں صرف دس منٹس لگیں گے۔ میں آپ کو باہر ملوں گی اپنی بس سروس کے ساتھ۔" وہ تیزی سے بولتے ہوئے گھڑی دیکھتی باہر کی جانب چل دی جبکہ باقی سب اپنی فائنل تیاریوں میں لگ گئے۔

☆☆☆

شٹل بس سروس نے انہیں ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ائرپورٹ پر پہنچا دیا جہاں ایک چھوٹا ٹورسٹ طیارہ ان کے لیے تیار کھڑا تھا۔ طیارے کا اوپری حصہ سفید تھا جبکہ نچلا حصہ اسکائی بلو تھا۔ وہ سب تیزی سے طیارے میں سوار ہوئے اور جاری کردہ سیٹ نمبرز کے حساب سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے لگے۔ وہ سب ہی پُرجوش تھے۔ یہ ان لوگوں کا یقیناً پہلا تفریحی سفر نہیں تھا مگر ہر تھرلنگ سفر سے پہلے شاید سب ہی ایکسائٹڈ ہوتے ہیں۔ ڈیوڈ اور علینہ کی سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں جبکہ مشعل اور طلال کے درمیان ایک نیگرو نژاد تھا جو اس کی درخواست پر بھی سیٹ بدلنے پر آمادہ نہ ہوا بلکہ تیز تیز لہجے میں اپنا تعارف کروانے لگا۔

"اب بند کرو اپنی یہ بکواس۔" اس کے مسلسل بولنے پر وہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔ وجہ شاید نسلی تضاد تھا یا پھر طلال کے ساتھ نہ بیٹھنے کا غصہ کیونکہ وہ اسے پسند کرنے لگی تھی۔

طلال اس لڑکی کے بار بار چڑنے پر دلچسپ نظروں سے اسے دیکھنے لگا جبکہ وہ خود بھی کسی کی نظروں کے حصار میں تھا۔

"آج کل میری ضروری اپائنٹ منٹس چل رہی تھیں۔ میں اس ٹور پر آنا ہی نہیں چاہتی تھی، علینہ نے زبردستی کی۔ دو بہت ضروری آپریشنز کی ڈیٹس بڑھوا کے آئی ہوں یعنی دو زندگیوں کو خطرے کی سولی پر لٹکا کے آئی ہوں، اس لیے بس کچھ زیادہ ہی ری ایکٹ کر رہی ہوں۔" طلال کے پوچھنے پر وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔ پانچ منٹس پہلے ہی طیارے نے انہیں بلو ماؤنٹینز پر رائل پیلس چھوڑا تھا۔ اس پیلس کے قریب ہی رن وے تھا اس لیے وہ پیدل ہی پیلس کی جانب چل رہے تھے۔

"ہوا بہت مسحور کن چل رہی ہے اور شاید تم دونوں کی دوستی بھی۔" علینہ ان کو جوائن کرتے ہوئے بولی۔ اس کا لہجہ کافی شرارتی تھا۔ ڈیوڈ اس کے ساتھ ہی تھا جو اپنے لیپ ٹاپ پر کچھ سرچ کرتا جا رہا تھا۔ وہ کافی لیے دیے رہنے والا لڑکا تھا علینہ کے برعکس۔ علینہ کی بات پر دونوں ہنس دیے۔

"مشعل ہے ہی پیاری جو دیکھتا ہے بس اسی کا ہو جاتا ہے۔" علینہ پیار سے مشعل کو دیکھ کر بولی۔

"مجھے سب لڑکیاں اچھی لگتی ہیں، چاہے وہ خوب صورت ہوں یا نہ ہوں۔" طلال معنی خیز انداز میں بولا۔

"بڑے فراخ دل ہو۔" وہ اُسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے بولی۔

"لیکن میں اتنی فراخ دل ہرگز نہیں ہوں، تم میرے ساتھ ہو تو صرف اس لیے کہ تم گڈ لکنگ ہو ورنہ مجھے بدصورتی سے نفرت ہے۔" مشعل آنکھیں سکیڑتے ہوئے سرد لہجے میں بولی۔

طلال نے چونک کر اُسے دیکھا۔

"یہ کافی سڑی ہوئی ہے اس کی باتوں پر نہ جاؤ۔ دل

کی بہت اچھی ہے۔ یہاں کی فضا میں کچھ دیر اور رہی تو خود ہی نارمل ہو جائے گی۔'' علینہ مسکرا کے طلال کے دیکھنے پر بولی۔

ان کے ساتھ موجود سات لڑکے لڑکیوں کا گروپ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے اونچی آواز میں نعرے لگاتا جارہا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں سیر کا لطف لے رہے تھے اور ساتھ ساتھ بڑی بے تکلفی سے ایک دوسرے کے بوسے بھی لے رہے تھے۔ ان کی طرف دیکھ کر علینہ بھی ڈیوڈ سے چپک گئی جس کو ناچار لیپ ٹاپ بند کرنا پڑا۔ ان کی گائیڈ آفیسر ایشل کچھ فاصلے پر تیزی سے قدم اٹھاتی چل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ سب رائل پیلس میں تھے۔ یہ پیلس بہت ہی بڑا تھا اور یہاں آسٹریلوی رائل فیملیز کی بڑی نادر تصویریں دیواروں پر آویزاں تھیں۔

''آپ سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر فریش ہو جائیں۔ آپ کا لنچ تیار ہے جو ڈائننگ ہال میں صرف گیارہ منٹس کے بعد لگا دیا جائے گا۔'' گائیڈ آفیسر آفیشل انداز میں کہتے ہوئے ہال سے نکل گئی۔ سب کے سب تیزی سے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

اپنے لیے مخصوص کمرے میں آ کر ایشل نے خود کو بیڈ پر اچھال دیا۔ آرام دہ تکیے پر سر رکھ کر وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ اس کے پاس آدھا گھنٹا تھا پھر اسے ٹورسٹ ٹیم کو لے کر کچھ قریبی جگہوں کی سیر کروانی تھی۔ وہ سال میں ایک دفعہ یہاں آتی تھی اور جب بھی آتی عجیب سی بے چینی کا شکار ہو جاتی۔ اس کے خون کا بہاؤ خود بخود تیز ہونے لگتا تھا۔ دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگتے اور یادوں کی بوچھاڑ پڑنے لگتی۔ زندگی کی ڈگر بھی عجیب ہوتی ہے۔ اچھی یادیں دھندلی ہو جاتی ہیں اور برا وقت کسی آسیب کی طرح چمٹ جاتا ہے۔ دماغ پر ہر وقت دستک دیتا رہتا ہے۔ دروازہ کھلے نہ کھلے اسے تو آنا ہی ہے۔ ایسا ان چاہا مہمان زندگی کو بیمار کر دیتا ہے۔ اگر وقت میزبان بن جائے تو ناسور کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اندر ہی اندر کسی لاوے کی طرح پکتا ہے، رنگ بدلتا ہے اور پھر راستہ ملتے ہی پھٹ پڑتا ہے۔

ہلکی سے دستک کر کے ویٹر اس کے کہنے پر لنچ کمرے میں سینٹرل ٹیبل پر رکھ گیا تھا۔ اس نے زور سے اپنی آنکھیں میچیں، تیزی سے اٹھ کر لنچ ختم کرنے لگی۔ ان کے آرام کا وقت بس ختم ہونے والا تھا۔

☆☆☆

انگلش گانا دھیمی آواز میں سُر بکھیر رہا تھا۔ مشعل خاص طور پر طلال کو متاثر کرنے کے ارادے سے تیار ہو کر آئی تھی جبکہ وہ ایک سرخ بالوں والی لڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا ساتھ ہی دوسرے گروپ کے لڑکے بھی تھے۔ وہ سب شاید کوئی دلچسپ قصہ چھیڑے بیٹھے تھے جبکہ سرخ بالوں والی طلال سے چپک کے بیٹھی ہوئی تھی۔ مشعل بے نیازی سے گزر کر اپنی ٹیبل پر چلی گئی جہاں علینہ اور ڈیوڈ ایک دوسرے میں گم بیٹھے تھے۔

''تم پیاری لگ رہی ہو اگر اپنی شکل کے زاویے کچھ بہتر کر لو تو مزید اچھی لگو گی۔'' علینہ اس کی افسردگی دیکھ کر ڈیوڈ سے الگ ہوتے ہوئے بولی لیکن مشعل اس کی بات پر کوئی بھی ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے اپنا کھانا ختم کرنے لگی۔

کچھ قریبی مقامات کی سیر و تفریح کے بعد واپس آ کر بھی طلال انہی لڑکے لڑکیوں کے ساتھ رات گئے تک تاش کھیلتا رہا۔ 'کم' نامی جوان تاش کھیلنے میں ماہر تھا اور سب کو ہرا رہا تھا۔ سب آہستہ آہستہ کر کے ہاتھ کھینچ کر اٹھ گئے لیکن طلال کے پاس چونکہ پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے وہ اس وقت تک ہارتا رہا جب تک کہ وہ جیت نہ سکے اور ایسا رات دو بجے تک نہ ہو سکا۔

''تم خوش قسمت ہو کم جو تمہیں میرے جیسا مقابل ملا۔'' طلال اس کی مسلسل فتح پر ہنستے ہوئے بولا۔ ایسا وہ دل سے کہہ رہا تھا کیونکہ اسے ہارنے کا کوئی غم نہیں تھا۔

''کم کی قسمت میرے آنے سے بہت کھل گئی ہے۔ یہ مجھے اپنا لکی اسٹار کہتا ہے۔'' سرخ بالوں والی لڑکی کم کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ وہ کم کی گرل فرینڈ تھی اور وہ لوگ شادی کے بغیر ہی ہنی مون منانے نکلے تھے۔

''کم کو لڑکیوں کی قدر ہے بالکل میری طرح۔'' طلال سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولا۔

''اسے صرف میں اچھی لگتی ہوں...... ہے نا۔'' وہ اب کم پر گرنے لگی تھی اس لیے اس نے مزید کھیلنے کا ارادہ ترک کر کے اس کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

''او کے چلتا ہوں، کافی وقت ہو گیا ہے۔'' طلال ایک دم سے اٹھتے ہوئے بولا۔ کم اور سرخ بالوں والی لڑکی کو ایک دوسرے میں گم دیکھتے ہی اس نے اٹھنے کا ارادہ باندھا، وہ ایک مسکراہٹ بھری نظر ان پر ڈال کر کمرے سے نکل آیا۔

باہر کافی سناٹا تھا۔ راہداری جیسے چپ کی لوری دے رہی تھی۔ سب لوگ صبح کی تفریح کو صحیح طور پر انجوائے کرنے کے لیے سو چکے تھے۔ وہ دھیرے سے ایک عربی گانا گنگناتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھا جو راہداری کے بالکل اختتام

پر تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ جیسے ٹھٹک گیا۔ وہ پورے ہوش و حواس میں تھا۔ گہری خاموشی میں جیسے کہیں ہلچل سی ہو رہی تھی۔ بہت ہلکی بہت ہی دھیمی سی...... پھر جیسے ساتھ والی راہداری میں کوئی دروازہ کھلا تھا، اس کے بعد نپے تلے قدموں کی آہٹ نے اسے چونکایا۔ وہ تیزی سے ایک قریبی اوٹ میں ہو گیا۔ قدموں کی آواز اب تھم گئی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی دم سادھے کھڑا رہا پھر ایک پھریری سی لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے میں آ کر وہ بے اختیار ہنس دیا۔ وہ ان لوگوں کے درمیان تھا جو بنا شادی ہنی مون منانے آئے ہوئے تھے۔ لڑکیوں سے وہ بھی دور رہنے والوں میں سے نہیں تھا لیکن وہ بہرحال ایک آزاد قسم کی، بغیر کسی بندش کی زندگی گزارنے کو پسند کرتا تھا۔ اسے پتا تھا اس جیسے بندے کو ہر جگہ لڑکی مل سکتی ہے اس لیے اس نے کسی دُم چھلے کو ساتھ لانے کی غلطی نہیں کی تھی۔

سادہ لباس پہن کر وہ آرام دہ بستر پر لیٹ گیا، کچھ ہی دیر میں وہ نیند کی وادی میں تھا مگر نیند زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی جب کمرا ہلکی آہٹ سے کھلا اور کوئی دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ طلال بنا حرکت کیے لیٹا ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد ایک گداز جسم اس کے بستر میں آ گھسا جسے اس نے نرمی سے اپنی باہوں میں لے لیا۔

"میں جانتی تھی تمہارا دروازہ کھلا ہوگا اور مجھے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔" ایک سُریلی آواز اس کے کانوں میں رس گھولنے لگی اور وہ ہنس دیا۔ دروازہ کھلا رکھنا اس کی عادت نہیں، ادا تھی جسے لڑکیاں سمجھ لیتی تھیں۔

☆☆☆

تین عدد طاقتور انجن والی جیپوں نے انہیں بلو ماؤنٹینز پر لا اتارا۔ آسمان کی بلندیوں سے باتیں کرتے یہ اونچے پہاڑ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ علینہ بلیک مین سے جڑی ہوئی باتوں میں مگن تھی جبکہ ڈیوڈ حسبِ معمول لیپ ٹاپ لیے ایک اونچی پتھریلی جگہ پر بیٹھا تھا۔ گائڈ آفیسر اینشل چیئر لیفٹ کے بکنگ کاؤنٹر پر کاؤنٹر مین سے باتوں میں مصروف تھی۔ یہاں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر چیئر لفٹس اور شیشے کی کیبل کاروں کے ذریعے جانا پڑتا تھا۔ چیئر لفٹس ابھی دستیاب نہیں تھیں کیونکہ لوگوں کا رش بہت زیادہ تھا۔ سیر و تفریح کے لیے یہ موسم بہت مناسب تھا۔ نہ زیادہ ٹھنڈ تھی نہ گرمی۔ دھوپ نکلی ہوئی اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا سب کو محظوظ کر رہی تھی۔ سال کے ان دنوں اس علاقے میں بہت رش ہوتا تھا اس لیے انہیں کچھ دیر مزید انتظار کرنا تھا۔ طلال کچھ دیر تو اردگرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر ڈیوڈ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"لگتا ہے کچھ ایجاد کرنے جا رہے ہو؟" وہ ایک طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ ایجاد ہی ہوگی سافٹ ویئر کی دنیا کی نئی ایجاد۔" ڈیوڈ برا مانے بغیر اسی طرح لیپ ٹاپ میں ڈوبے ہوئے بولا۔ اس کا مصروف انداز دیکھ کر طلال بیزاری سے آنکھیں جھپک کر رہ گیا۔

"تم نے پاور پوائنٹ اور ایپل جیسے پروگرامز کا نام سنا ہی ہے بلکہ یقیناً تم نے انہیں استعمال بھی کیا ہے لیکن یہ اس سے زیادہ ہے کچھ بہت انوکھا...... تم شاید اسے مذاق سمجھو۔" وہ بولتے بولتے ہنس دیا۔ "لیکن یہ مذاق نہیں ہے۔" وہ مسلسل اپنے کام میں مگن تھا۔

اوریکل۔" طلال اب بور ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں گائڈ آفیسر کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

"چلو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میں کچھ ایسا بنانے جا رہا ہوں جس سے ہمارے ہاتھوں اور دماغ کو زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔ ایک ایسا سافٹ ویئر جو ہمارے دماغ کو ریڈ کرے گا اور اسے رائٹنگ کی شکل میں ڈھیلے کرے گا یا پھر ہماری سوچ کو Visual Affects دے گا۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر دوبارہ بولا۔ "یہ سافٹ ویئر ایک چپ کے ساتھ کام کرے گا۔ جسے ہم اپنی دونوں کنپٹیوں پر لگائیں گے اور ہمارے دماغ میں چلنے والی سوچ کو یہ ایک تصویر کی مدد سے اسکرین پر شو کرے گا جیسے میں اگر کسی لڑکے کے بارے میں سوچوں تو وہ مجھے اسی حلیے میں اسکرین پر دکھائی دینے لگے گا جیسا میں اسے سوچ رہا ہوں گا اور یہ کام میرا اپنا پروگرام کرے گا۔" طلال کے اینشل کو دیکھنے پر وہ قدرے مسکرا کر بولا۔

"او...... تم جینئس ہو ڈیوڈ...... اس خدمت کے بدلے تمہیں یقیناً نوبل پرائز ملے گا۔ اس وقت مجھے ضرور بلوانا میں تمہارے ساتھ ایک تصویر بنواؤں گا اور اسے اپنی ہونے والی وائف کو تحفے میں دوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا اور اٹھ گیا۔ "میں گائیڈ آفیسر سے تھوڑی انفارمیشن لے آؤں اگر وہ اسی طرح کاؤنٹر مین سے گپیں لڑاتی رہی تو ہم شام کو ہی یہاں سے کہیں اور پہنچیں گے۔" وہ ٹہلتے ہوئے آگے بڑھ گیا تو ڈیوڈ نے ایک خاموش نظر اس پر ڈالی اور پھر سے سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اب وہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔

اسے شاید طلال پر غصہ آرہا تھا جس نے اس کی ساری محنت کو ایک مذاق کی طرح لیا تھا حالانکہ اس نے کبھی کسی سے مذاق نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

تیزی سے نزدیک آتی چیئر لفٹ میں بیٹھنے کے لیے وہ تیار کھڑے تھے اور پھر جیسے ہی چیئر نزدیک آئی ایک ہلکے سے جھٹکے سے وہ اس میں بیٹھ گئے اور مضبوطی سے اس کی آئرن راڈ کو پکڑ لیا۔ طلال اور گائیڈ آفیسر چونکہ سب کی چیئر پر بیٹھنے میں مدد کرتے رہے اس لیے اب آخر میں دونوں اکٹھے بیٹھ گئے۔

''ایشل تمہارے ساتھ بیٹھنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی پری کے ساتھ اُڑ رہے ہوں۔'' طلال موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خوشگوار انداز میں بولا۔

''سب مجھے فاسٹر کہہ کر پکارتے ہیں۔'' اس کی بات کے جواب میں وہ قدرے ریزرو لہجے میں بولی۔

''ایشل کیوں نہیں جبکہ یہ تمہارے جیسی خوب صورت لڑکی پر بہت جچتا ہے۔''

''تم مسلم ہونا۔'' وہ جواباً بولی تو وہ چونک اٹھا۔

''ظاہر ہے میں مسلمان ہی ہوں لیکن خود کو تمہاری طرح کرسچن کہلوانا پسند نہیں کرتا۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔

''وہ اس لیے کہ تم اپنے ملک میں رہتے ہو۔'' وہ اس کی معلومات پر حیران ہوئے بغیر بولی۔ ''جبکہ ہم وہ مسلمان ہیں جو نائن الیون کے بعد اپنے ہی ملک میں پرائے ہو چکے ہیں، اپنی سیکیورٹی کے لیے ہی ہمیں اپنی شخصیت کو دوسرے نام سے متعاف کروانا پڑتا ہے۔''

''حالانکہ تم لوگ تعداد میں کم نہیں ہو، مل کر اپنے حقوق منوانا چاہو تو عدم تحفظ کو محسوس نہیں کرو گے اور ویسے......''

''یہ بوگس لیکچر بند کرو پلیز...... میرا باپ ایک عیسائی تھا اور میری ماں ایک انڈین مسلم تھی۔ میں ان دونوں میں سے کوئی بھی مذہب اختیار کر سکتی ہوں اور مجھے فاسٹر کہلوانا اچھا لگتا ہے۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

''لیکن ابھی تو تم نے کہا کہ تم ان مسلمانوں میں سے ہو......''

''اُف...... تم ایسٹرن لوگ کتنی بحث کرتے ہو، میرا مذہب میری مرضی سے بدلتا رہتا ہے مجھے۔''

''واؤ......'' وہ آنکھیں پھیلا کر کافی خوش دلی سے بولا۔ ''یعنی کچھ دنوں میں تم یہودی بننے والی ہو؟''

''نہیں، یہودی مجھے کچھ خاص پسند نہیں ہیں۔'' وہ ہونٹوں کو پھیلا کر بولی۔ ''کیوں نا میں تمہیں ان پہاڑوں کے بارے میں بتاؤں جو سالوں سے یہاں اپنی خوفنا کیوں سمیت کھڑے ہیں کسی بھی بدلاؤ کے بغیر......''

''ہاں ضرور، مجھے ویسے بھی پل پل بدلنے والی چیزیں عام لگتی ہیں۔'' وہ بولا تو وہ زور سے ہنس دی۔

''تم کافی دلچسپ ہو۔''

''نہیں میرے خیال میں تم زیادہ دلچسپ ہو۔'' وہ بولا تو جواباً وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔ بلیک پینٹ اور سفید شارٹ شرٹ کے اوپر بلیک ہی رنگ کی لیدر جیکٹ میں بالوں کو کھلا چھوڑے وہ نہایت دلکش لگ رہی تھی۔ اس کے جسمانی خطوط لاجواب تھے۔

''تم نہایت دلکش ہو اور بہت زیادہ پُرکشش ہو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھ کر بولا۔

''ہاں۔'' وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے بولی۔

☆☆☆

''مشعل دنیا کتنی حسین ہے نا۔'' علینہ چاروں طرف گھوم کر دیکھتی ہوئی حیرت و مسرت سے بولی۔ ''شکریہ ادا کرو میرا جو تمہیں گھسیٹ لائی ورنہ وہیں کسی سڑے ہوئے کمرے میں بیٹھی آپریشنز کی ڈیٹس دیکھتی رہتیں۔''

''ہوں...... واقعی یہاں نہ آنا بے وقوفی ہوتی، مجھے اب مزہ آنے لگا ہے۔'' وہ دور کم کے ساتھ کھڑے طلال پر ایک نظر ڈال کر بولی۔ علینہ اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

''لگتا ہے محترمہ کا بھی کسی پر دل آگیا ہے؟''

''کچھ ایسا ویسا......'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

کچھ دیر پہلے ہی وہ لوگ چیئر لفٹس سے اترے تھے اور اب پہاڑ کی چوٹی سے اردگرد بکھرے خوب صورت نظاروں کو دیکھ رہے تھے۔ علینہ مووی کیمرے سے مووی بنا رہی تھی۔ ڈیوڈ بھی اپنا لیپ ٹاپ اپنے شولڈر بیگ میں منتقل کرتا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک تھی جس کے تینوں نے باری باری سپ لے رہے تھے۔ سپ لیتی مشعل کی نظر سامنے سے آتے بھورے بالوں والے آدمی پر پڑی تو اسے جیسے اُچھو لگ گیا۔ بری طرح کھانستے ہوئے اس کا سانس جیسے سینے میں اٹک گیا۔ آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ اسی اثنا میں وہ آدمی بھی اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس کے ساتھ ایک مرد اور عورت بھی تھے۔

''ہائے مس...... کیسی ہیں آپ، کافی عجیب اتفاق ہے

''آپ کو یہاں دیکھنا، اتنی دور ان بلو ماؤنٹینز پر۔'' بھورے بالوں والا تیزی سے اس کے پاس آکر خوشگوار لہجے میں بولا۔

یہ وہی آدمی تھا جو اسے کچھ دن پہلے ہی ہاسٹل کی پارکنگ میں لفٹ کی آفر کرتا ہوا ملا تھا۔ اسے وہ پہلی نظر میں ہی اچھا نہیں لگا تھا۔

''ہاں واقعی بہت عجیب ہے۔'' وہ اس سے جان چھڑاتی آگے بڑھنے لگی تو اس نے تیزی سے اس کا بازو تھام لیا۔

''اتنی جلدی کیا ہے؟'' وہ بے باکی سے اس کے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''میں اجنبیوں سے زیادہ فرینک نہیں ہوتی۔'' وہ اپنا ہاتھ جھٹکے سے کھینچ کر بولی تو وہ ہنس دیا۔ اس کے ساتھی مرد عورت بھی شکل سے ہی جرائم پیشہ لگتے تھے۔

''چلو علینہ۔'' قدرے خوف سے لرزتے لہجے پر بمشکل قابو پاتی علینہ سے بولی۔

''دیکھیے مس علینہ۔'' وہ جلدی سے علینہ کو روکتا ہوا بولا۔ ''میں تو بس دوستی کرنا چاہتا ہوں وہ بھی ہر حال میں۔'' وہ ہٹیلے لہجے میں گویا ہوا۔

''کس ہوٹل میں رکے ہیں آپ لوگ؟''

''بلوربن ہوٹل میں۔'' وہ بولا۔ ''یہ ہوٹل رائل پیلس کے مخالف سمت تھا۔

''تو پھر وہیں ملیں گے شام میں۔'' علینہ قدرے مسکرا کر حوصلہ افزا انداز میں بولی تو وہ سر ہلاتا آگے بڑھ گیا۔

''کیا ضرورت تھی اس سے یہ کہنے کی؟''

''کہنے میں کیا حرج ہے، جان تو چھوٹ گئی ہے۔''

''کافی خطرناک لوگ لگتے ہیں یہ علینہ ہر کسی کو منہ مت لگا لیا کرو۔'' وہ بیزاری سے کہتی آگے بڑھ گئی جبکہ ڈیوڈ اس سب سے بے نیاز ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مشعل کو اس پر بھی غصہ آرہا تھا۔ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ نجانے علینہ نے اس بے وقوف انجینئر میں کیا دیکھ لیا تھا لیکن علینہ کا بھی قصور نہیں تھا وہ ہر کسی پر اعتماد کر لینے والوں میں سے تھی۔

پہاڑ پر اگنے والے گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ درختوں کے درمیان ہی ایک خستہ حال سا کاٹیج نظر آرہا تھا۔ سامنے سے آتی تین چار لڑکیوں کی باتوں نے انہیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کسی قتل کا ذکر کر رہی تھیں وہ بھی ہوٹل رائل پیلس میں ہونے والے۔

''سنیے......'' مشعل نے بے اختیار اس لڑکی کو مخاطب کیا جو کافی اونچا بول رہی تھی اور شکل سے کافی ہراساں بھی لگ رہی تھی۔

''آپ لوگ کس قتل کی بات کر رہی ہیں؟''

''تم لوگ نہیں جانتے ہو حالانکہ اسی سائڈ سے آئے ہوئے لگتے ہو۔'' سرخ شرٹ میں ملبوس وہ لڑکی حیرانی سے بولی۔

''تم رائل پیلس کا ذکر کر رہی تھیں۔'' وہ اس کی بات کے جواب میں دوبارہ الجھے انداز میں بولی۔

''بالکل...... کیونکہ قتل وہیں ہوا ہے۔ میرا بوائے فرینڈ آج ہمارے ساتھ نہیں آیا اسی نے فون کر کے بتایا ہے، ہم وہیں واپس جا رہے ہیں۔''

''لیکن قتل کس کا ہوا ہے؟'' ڈیوڈ بولا۔

''قتل ایک آدمی کا ہوا ہے جو کہ سیاح ہی تھا لیکن قاتل نے بڑی بے رحمی سے مارا ہے۔'' وہ لڑکی جھرجھری لے کر بولی۔

''مگر قاتل کون ہے اور کیا وہ پکڑا گیا؟'' علینہ قدرے خوف زدہ لہجے میں بولی۔

''قاتل کا کچھ پتا نہیں، یہ اب وہاں پہنچیں گی تو کچھ پتا چلے گا۔''

''جانتی ہو مشعل قتل وہیں ہوا ہے جہاں ہم رات کو رکے تھے اور اب ہمیں واپس بھی وہیں جانا ہے۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' علینہ ان لڑکیوں کے آگے بڑھتے ہی مشعل سے بولی۔

''ہمیں گائیڈ آفیسر سے بات کرنی چاہیے، وہ یقیناً جانتی ہو گی۔'' ڈیوڈ تیز قدم اٹھاتا آگے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ایشل ان سے اگلے گروپ کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ جیسے ہی اس کے قریب پہنچے، علینہ نے جلدی سے انہیں روک کر ساری بات بتائی۔

''ہاں کچھ دیر پہلے ہی مجھے بھی فون پر بتایا گیا ہے مگر گھبرانے کی بات نہیں، قاتل جلد ہی پکڑ لیا جائے گا۔'' وہ ان کی بات پر قدرے تحمل سے بولی۔

''اگر تمہیں پتا چل چکا تھا تو تمہیں ہمیں بتانا چاہیے تھا۔'' مشعل قدرے تلخی سے بولی۔

''میں آپ کا ٹور ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی ویسے بھی واپسی پر سب کو پتا چل ہی جانا تھا۔'' ایشل ٹھہرے ہوئے لہجے میں سب پر ایک نظر ڈال کر بولی۔ ان کے ٹور کے سب لوگ تقریباً اکٹھے ہو چکے تھے اور ایک بے چینی اور خوف کی لہر ان میں دوڑ گئی۔

''لیکن اب آگے بڑھنے کو کس کا دل چاہے گا۔ تم

شاید بھول رہی ہو قتل اس ہوٹل میں ہوا ہے جہاں رات کو ہم سب ٹھہرے ہوئے تھے۔" کم منہ بنا کر بولا۔

"اس کا مطلب ہے ہم نے غلط ٹور کمپنی پر بھروسا کیا۔" بلیک مین قدرے غصے سے بولا۔

"اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم واپسی پر اس ہوٹل میں نہیں ٹھہریں گے۔" مشعل دوٹوک لہجے میں بولی تو سب نے اس کی تائید کی۔ مس فاسٹر نے ایک تفصیلی نظر سب پر ڈالی اور پھر گہری سانس لے کر بولی۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی، لیکن ایک بات مجھے کہنے دیجیے، اس ہوٹل میں صرف ہماری کمپنی کے ٹورسٹ نہیں ٹھہرے بلکہ اور بھی ٹور کمپنیز نے ٹھہراؤ کیا ہے اور اس ہوٹل کی انتظامیہ پر شک کیا ہی نہیں جا سکتا ہم کئی برسوں سے وہاں رکتے رہے ہیں لیکن ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا......"

"لیکن اب یہ ہو چکا ہے اور اس کا مطلب ہے کہ سیکیورٹی کی واقعی کمی تھی۔" ڈیوڈ اس کی بات کاٹ کر قدرے خوف زدہ لہجے میں بولا۔ واپس اس ہوٹل میں جانے کے خیال سے ہی اس کا دل لرزنے لگا تھا اور وہ علینہ سے چپک کر کھڑا ہوا جیسے اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے یہاں آنا پلان کیا۔

"اوکے...... میں اپنی کمپنی افسران سے بات کرتی ہوں، وہ شام تک ہمارے لیے کسی اور مناسب ہوٹل میں ٹھہرنے کا بندوبست کر دیں گے۔ تب تک آپ لوگ انجوائے کیجیے۔" وہ سر ہلاتی اپنے سیل میں موجود کمپنی کے نمبرز پر رابطہ کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے انہیں ہوٹل چینج ہو جانے کی نوید دی تو سب کے افسردہ چہرے کھل اٹھے۔ جیسے کسی انجان قاتل سے جان بچ گئی ہو۔

☆☆☆

رائل پیلس میں ہونے والی قتل کی واردات نے سب کو ہی سہما دیا تھا۔ قاتل نے سیاح کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا تھا۔ اس کے جسم پر تشدد کے بے پناہ نشانات ملے اور اس کے نازک ترین عضو کو کاٹ ڈالا گیا تھا۔ اس کی موت کی وجہ بھی بے پناہ خون کا بہہ جانا تھا۔ یقیناً کسی ذاتی دشمنی کی واردات تھی جس نے سب کو خوف زدہ کر دیا تھا۔

کمپنی نے ان کے نائٹ اسٹے کا انتظام بلور بن ہوٹل میں کر دیا تھا۔ جہاں مشعل کی ملاقات بھورے بالوں والے کولن ٹیڈ اور اس کے ساتھی مرد عورت سے بھی ہوئی۔ یہ ایک مختصر ملاقات تھی جو تلخ کلامی پر مبنی تھی۔

☆☆☆

"مشعل کو اب آپ اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ آدمی مجھے شکل سے ہی کرمنل لگتا ہے۔ مزید کوئی لڑائی یا بدمزگی یقیناً اچھا رزلٹ نہیں دے گی۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ......" وہ ان دونوں کو مخاطب کرتا ہوا بولا تو ڈیوڈ مارے اضطراب کے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا جبکہ علینہ نے آہستگی سے اس کی بات پر سر ہلا دیا۔ طلال مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ ویسے بھی دوسروں کے معاملات میں زیادہ دخل دینے کا قائل نہیں تھا۔ لیکن رات والے واقعے نے اسے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اگر رات کو وہ تھوڑی سی کوشش کرتا تو شاید ایک انسان قتل ہونے سے بچ سکتا تھا۔ اسے کسی انہونی کا گمان ہوا تھا لیکن اس نے اپنا وہم سمجھ کر درگزر کر دیا مگر اب وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ جب اسے کسی کے چلنے کی آواز آئی تھی تو ایک دفعہ تو دیکھنا چاہیے تھا کہ کون ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اور اپنے خیالات میں مگن اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا جب نیچے سے اوپر آتی آخری سیڑھی پر کھڑی ایشل اسے دیکھ کر وہیں رک گئی۔ وہ بھی اسے دیکھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

"میں مشعل کو دیکھنے آئی تھی نیچے ہونے والی گڑبڑ کا مجھے پتا چلا تو میں نے سوچا مل لوں آخر بات کیا تھی؟"

"ایک عام سا جھگڑا تھا۔ وہ کرمنل اسے پسند کرتا ہے جبکہ مشعل انٹرسٹڈ نہیں ہے بس اسی بات پر تکرار ہوئی تھی مگر اب اس سے ملنا ممکن نہیں، وہ سو چکی ہے۔" وہ اس کے حسن ہوشربا پر بھرپور نظر ڈال کر اطمینان سے بولا۔ نائٹ سوٹ میں وہ کافی دلکش لگ رہی تھی مگر ساتھ میں قدرے افسردہ بھی۔

"یہ پہلی مرتبہ ہے کہ اوپر تلے ناخوشگوار واقعات ہو رہے ہیں۔ میں بہت وہمی ہوں، پتا نہیں کیوں اس سفر کی شروعات اچھی نہیں رہی تو اختتام کا سوچ کر ہی میں پریشان ہو جاتی ہوں۔" وہ کافی الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔ طلال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"ہمیشہ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم واقعات سے اخذ کر لیتے ہیں، آپ تو کافی مضبوط اعصاب کی لگتی ہیں بی بریو۔" وہ اب اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بولا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے پیچھے نہ ہٹا سکی۔ اس وقت اسے جذباتی تسلی کی ضرورت تھی۔ اس کے ذہن میں عجیب خیالات آ رہے تھے۔ کچھ پرانے اور نئے واقعات آپس میں جیسے گڈمڈ ہونے لگے۔ اسے بہت کچھ ایسا ہی یاد آنے لگا جو ہو چکا تھا مگر اس

کے اثرات ابھی تک نکل نہیں رہے تھے۔ اور اب جو ہونے لگا تھا وہ اسے کیسے روک سکتی تھی۔ اپنے ذہن میں آتی بے شمار سوچوں کو اس نے ایک جھٹکے سے پیچھے دھکیلا اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

باہر کھڑے طلال پر تشکر بھری نظر ڈال کر وہ دروازہ بند کر چکی تھی۔ بہت ساری سوچیں اس کے دماغ میں چکرا رہی تھیں اور وہ انہیں بھگا رہی تھی۔ اپنے بیگ سے ایک سلیپنگ پلز نکال کر اسے پانی سے نگل کر وہ خود کو بیڈ کے حوالے کر چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں نیند آجاتی اور پھر ساری سوچیں ختم ہو جاتیں۔

طلال اپنے کمرے میں آکر ہمیشہ کی طرح دروازہ کھلا چھوڑ کر شاور لینے باتھ روم جا چکا تھا۔ اچھی اور پُرسکون نیند کے لیے یہ ضروری تھا۔ شاور لے کر جہاں اس کے اعصاب کو سکون ملا وہاں اس کی بدمزگی بھی کافی ٹھیک ہوگئی تھی۔ ایشل فاسٹر نے اسے نولفٹ کرائی تھی اور یہ اسے کافی توہین آمیز لگا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اسے ایشل فاسٹر کے ساتھ اچھا ٹائم گزارنے کا موقع مل جائے گا مگر ایسا نہ ہوسکا جس پر قدرے بدمزہ ہو کر وہ واپس کمرے میں آیا تھا۔ مگر اب کافی حد تک خود پر قابو پا چکا تھا۔

مس ایشل سے اس توہین کا بدلہ لینے کے لیے ابھی کافی وقت پڑا تھا اور وہ کھانا ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی تھا۔ اب ... ایشل فاسٹر کو خود چل کے اس کے پاس آنا تھا اور اتنا انتظار وہ بہرحال کر ہی سکتا تھا۔

☆☆☆

صبح آٹھ بجے سب کو ہنٹر ویلی وائن کنٹری کے لیے نکلنا تھا۔ سات بجے تقریباً سبھی اپنے کمروں کو چھوڑ کر ہوٹل پارکنگ میں بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ بس جیسے ہی اپنے مسافروں کو لے کر نکلی ہوٹل میں ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک خاکروب نے ٹوائلٹس کی صفائی کرتے ہوئے جب ایک ٹوائلٹ کا دروازہ کھولا، ایک کٹا ہوا سر کموڈ میں گھومتے ہوئے پانی میں غوطے کھا رہا تھا۔ کسی نے کموڈ ٹنکی کو کھلا چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے مسلسل پانی کا اخراج ہو رہا تھا چونکہ کٹے ہوئے سر کا سائز اخراج والے راستے سے بڑا تھا۔ اس لیے پانی کے پریشر سے غوطے کھا رہا تھا۔ یہ بڑا خوفناک منظر تھا۔ خاکروب کی چیخیں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

مزید چیکنگ سے یہ پتا چلا کہ اسی طرح کا کٹا ہوا ایک اور سر بھی دوسری جانب کے ٹوائلٹس میں ملا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ کسی عورت کا سر تھا۔ قاتل نے بڑی بے رحمی سے دونوں قتل کیے تھے۔ ہوٹل انتظامیہ سے لے کر اس علاقے کے منتظمین اعلیٰ تک سب شدید حیرانگی کا شکار تھے۔

گزشتہ دو راتوں میں تین قتل ہو چکے تھے اور قاتل کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ مرنے والے تینوں افراد کا تعلق مختلف ملکوں سے تھا۔ آنے والے سیاحوں کی اس طرح بے رحمانہ اموات نے انتظامیہ کو پریشان کر دیا تھا۔

مرنے والوں میں سے ایک عورت اور مرد برٹش تھے جبکہ تیسرے کا تعلق جرمنی سے تھا۔ یوں یہ قتل جلد ہی ملکی سطح پر منظرِ عام پر آنے والا تھا۔ علاقائی انتظامیہ نے پولیس کے دو افسران کو گزشتہ رات ہونے والے قتل کیس کی انویسٹی گیشن پر لگا دیا تھا۔ ان کے ساتھ اب ایک اور لیڈی آفیسر بھی شامل کر دی گئی تھی تاکہ قاتل کا جلد از جلد سراغ لگایا جاسکے۔

انویسٹی گیشن آفیسر کیون قتل ہونے والے مرد اور عورت کے ساتھی سے سوالات کر رہا تھا۔ لیکن اسے اپنے سوالات کے مناسب جواب نہیں مل رہے تھے۔ کیونکہ مرنے والوں کا ساتھی نشے میں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ رات کو اس کا کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔ اور اسی غصے میں وہ ساری رات پیتا رہا، صبح کے قریب اس کی آنکھ لگی تھی اور وہ ابھی تک خمار کے زیر اثر تھا۔ آفیسر کیون اب تک اس پر دو بالٹی پانی پھنکوا چکا تھا اور نتیجتاً وہ کچھ مناسب جواب دینے لگا تھا۔ لیکن اپنی ایسی بے عزتی پر وہ قدرے غصہ بھی دکھا رہا تھا۔

”ہاں تو کس بات پر جھگڑا ہوا تھا اور کیا جھگڑے کے وقت تمہاری ساتھی عورت اور مرد بھی ساتھ تھے؟“

”ہاں شاید وہ میرے ساتھ ہی تھے۔“ وہ اپنی سرخ آنکھوں کو جھپکتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

”مسٹر ٹیڈ سیدھا اور دوٹوک جواب......“

”ٹیڈ نہیں کولن ٹیڈ مجھے پورے نام سے مخاطب کرو آفیسر۔“ کولن نے آفیسر کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو جھنجلائے ہوئے کیون نے زور کا ایک طمانچہ اس کے مضبوط جبڑے پر رسید کر دیا اور پھر ایک طرف ہٹ گیا۔

”یہ مجھے پاگل کر دے گا۔“ کیون شدید جھنجلایا ہوا تھا۔ اس کی جگہ اب اس کا ساتھی آفیسر کولن سے بات کرنے آیا۔

”تم اگر اسی طرح کرتے رہے تو ہوسکتا ہے قاتل کو فرار ہونے کا موقع مل جائے اور وہ مزید قتل کر دے۔ کولن ٹیڈ ہمیں ضرورت ہے تمہارے تعاون کی۔“ دوسرا آفیسر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا تو کولن ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔

"جب تک یہ سوری نہیں کہے گا میں کچھ نہیں بتانے والا۔" کولن، کیون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اسے اپنی بے عزتی پر شدید غصہ آرہا تھا۔ ساتھ ہی اسے شدت سے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ اس کے دو قریبی ساتھی قتل ہو چکے ہیں اور اب وہ اپنے ملک سے اتنی دور بے یارومددگار کھڑا تھا۔ وہ اپنے علاقے کا غنڈا تھا۔ لیکن اپنے ملک سے باہر اتنی دور کسی اور غنڈے نے اس کو اکیلا کر دیا تھا۔ کیون کے سوری کہنے پر وہ ساری رُوداد سنانے لگا۔ کہیں کہیں وہ بری طرح رونے بھی لگتا تھا۔ مرنے والا اس کا بچپن کا ساتھی اور وہ عورت ان دونوں کی مشترکہ گرل فرینڈ تھی۔ جیسے جیسے وہ اپنے حواس میں آرہا تھا اسے اپنے ساتھیوں کی موت کا احساس زیادہ ہونے لگا۔

انویسٹی گیشن افسر کیون اور اس کے ساتھی جونیئر آفیسرز نے کولن ٹیڈ سے ممکنہ سوالات کر لیے تھے۔ جائے وقوعہ سے فنگر پرنٹس اٹھانے اور دوسری معلومات اکٹھی کرنے کے بعد انہوں نے ہوٹل کو سیل کر دیا تھا۔ ہوٹل کے عملے اور وہاں ٹھہرنے والے کچھ سیاحوں کو ہوٹل سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی کیون نے رات سے اب تک جتنے سیاحوں کے گروپس یہاں سے قریبی جگہوں کی سیر کے لیے جا چکے تھے، ان کو واپس بلوانے کے آرڈرز جاری کر دیے تھے کیونکہ جب تک قاتل پکڑا نہیں جاتا، سب لوگ دائرۂ تفتیش میں تھے۔

☆☆☆

ہاکس بری ریور پر کمپنی کی طرف سے دیے گئے ہلکے پھلکے ناشتے سے فارغ ہو کر فاسٹ میوزک پر تقریباً سبھی لڑکے لڑکیاں اچھلنے کودنے لگے۔ طلال کی درخواست پر ایشل فاسٹر بھی ان کے ساتھ آملی تھی۔ لیکن پھر جلد ہی اس سے معذرت کرتی اپنے اسسٹنٹ کے اشارے پر اٹھ کر چلی گئی۔

"کیا بات ہے؟" اس کے چہرے اور آواز میں تشویش تھی جس پر اس کے اسسٹنٹ نے اسے ہوٹل بلور بن میں ہونے والے سیاحوں کے قتل کے بارے میں بتایا ساتھ ہی سیاحوں کی واپسی کے آرڈرز کا بھی بتایا۔

"کیا ہوا، تم پریشان لگ رہی ہو؟" اسے پریشان دیکھ کر طلال بھی اس کے قریب آگیا۔

"رات کو مشعل کا جس سے جھگڑا ہوا، اس آدمی کے ساتھی مرد عورت کو کسی نے قتل کر دیا ہے، پولیس نے بس واپسی کے آرڈرز جاری کیے ہیں۔" ایشل نے حواس باختہ لہجے میں کہا۔

"او نو...... یہ سب کیا سلسلہ چل پڑا ہے؟" وہ بھی پُرتفکر لہجے میں بولا۔ "اب کیا سب کو بتانا پڑے گا؟"

"بتانا ہی ہے۔ اب آگے تو موو کر ہی نہیں سکتے ویسے بھی پولیس مشعل وغیرہ سے تفتیش کرے گی۔ ان کا جائے وقوعہ پر پہنچنا ضروری ہے۔" وہ بولی پھر سب کو اکٹھا کر کے اس نے تمام واقعہ ان کے گوش گزار کیا جسے سن کر جہاں کچھ لوگ پریشان ہو گئے وہیں زیادہ تر بدمزہ بھی ہو گئے۔ تفریح کے لیے آنے والے سیاحوں کے پاس چونکہ وقت کی زیادہ فراوانی نہیں ہوتی اس لیے سفر کی رکاوٹیں ان کی پریشانی کا باعث بن جاتی ہیں۔

"پولیس کو بیان لینا ہے تو انہیں چاہیے کہ وہ اِدھر آجائیں ہم میں سے کوئی اب واپس نہیں جائے گا۔" بلیک مین بلند آواز میں بولا تو اس کے ساتھیوں نے اس کی تائید کی۔

"ہمارے پاس صرف دو دن ہیں ہمیں واپس بھی جانا ہے۔ پولیس ہمارے ساتھ رہ کر بھی تفتیش کر سکتی ہے۔ سرخ بالوں والی اپنے بوائے فرینڈ کم کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔

"بٹ ایم ریڈی ٹو گو بیک۔" مشعل بولی۔ "مجھے پتا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس واقعے میں ملوث نہیں ہے مگر ہم سب کو قانون کا احترام کرنا چاہیے۔" وہ ایشل کے پاس آگئی۔

"میں رات نشے میں تھی اور پتا نہیں کیا کیا بول گئی مگر یہ لڑائی ایسی نہیں تھی کہ کسی کو قتل ہی کر دیا جائے ویسے بھی میں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں لوگوں کی زندگیاں بچاتی ہوں ان کو مارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" وہ روانی سے بول رہی تھی۔ علینہ نے بھی اس کی تائید کی۔

"ہم قانون کا احترام کریں گے اور واپس جانے کے لیے تیار ہیں۔"

"میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمیں اس ٹور کو ختم کر دینا چاہیے اور واپس اپنے اپنے ملکوں میں چلے جانا چاہیے۔ پتا نہیں اِدھر کون خوفناک قاتل گھس آیا ہے۔" ڈیوڈ کا تو جیسے سارا وجود ہی لرز رہا تھا۔

ابھی ان میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں۔ جب ہوٹل انتظامیہ نے انہیں وہیں رکنے کو کہا کیونکہ پولیس آفیسران کے بیانات لینے وہیں آرہے تھے۔ آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد جیسے ہی پولیس آفیسران کے پاس آئے، ایک مرتبہ پھر تفتیش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ایک گھنٹے کی تفتیش کے بعد کیون نے انہیں آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ اور ساتھ ہی اپنا ایک آفیسر اور دو سپاہی ان کی سیکیورٹی کے پیش نظر روانہ کردیے۔

''آپ کا قیمتی وقت ضائع ہوا اس کے لیے معذرت خواہ ہوں، امید ہے آپ لوگوں کی واپسی تک ہم اس سرپھرے قاتل کو ڈھونڈ نکالیں گے۔'' کیون بولا تو سب نے اس کی تائید کی۔ کچھ ہی دیر میں ان کی ٹور بس ہنٹر ویلی کی جانب محوسفر تھی۔ ہنٹر ویلی پہنچنے تک سب اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ اگر کچھ لوگ واپسی کا ارادہ کیے ہوئے بھی تھے تو ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی اب ترک کر چکے تھے۔ اس علاقے میں اس قدر خوب صورتی تھی کہ واپس جانے کو اب کسی کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا ویسے بھی قتل والی جگہ پیچھے رہ گئی تھی، قاتل کا خوف بھی مٹنے لگا۔ ہنٹر ویلی پہنچ کر مزے دار لنچ سے تواضع کی گئی۔

مشعل نے بڑا خوب صورت پھولدار اسکرٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ سب لوگ ایک اوپن ریسٹورنٹ میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ طلال، مشعل وغیرہ کے ساتھ ہی ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا۔

مس ایشل آج اپنا یونیفارم پہنے ہوئے تھی اور کچھ ڈسکس کرنے کے ساتھ ساتھ ایک قریبی نیوز پیپر کی ورق گردانی بھی کر رہی تھی۔ لیکن ان سب سے ہٹ کر وہ وقتاً فوقتاً ایک نظر سب لڑکے لڑکیوں پر بھی ڈال لیتی تھی۔ گزشتہ دو راتوں میں ہونے والے قتل کے واقعات نے اسے کافی الرٹ کر دیا تھا۔ سیاحوں کو امن وامان سے واپس لے کر جانا اس کی ذمے داری میں شامل تھا۔ اسی لیے وہ متفکر بھی تھی۔

طلال اور مشعل رات والے واقعے پر بات چیت کر رہے تھے۔

''طلال مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے رات والی لڑائی پر ساتھ میں خوف بھی آ رہا ہے۔''

''خوف کس بات کا؟'' وہ دریا کے کنارے فشنگ کرتے کم اور سرخ بالوں والی کو دیکھتے ہوئے انہیں ہاتھ ہلاتا دیکھ کر جواباً ہاتھ ہلا کر بولا۔ وہ اسے بھی بلا رہے تھے لیکن اس نے اشارے سے انکار کر دیا۔

''بات ہی خوفناک ہے، پرسوں رات اور گزشتہ رات قاتل ہمارے کتنے قریب رہا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کا اگلا شکار ہم میں سے ہی کوئی ہو۔'' بات کرتے ہوئے وہ ایک پھریری سی لیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو یہ سوچ کر ہی ہول اٹھنے لگتا ہے لیکن دیکھا ہے سب کو کیسے بھول بھی چکے ہیں۔''

''بھولے نہیں ہیں مائی ڈیئر بھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اتنے بڑے واقعات ہو جائیں تو کون بھولتا ہے۔ یہ انجوائے منٹ اس افسردہ کیفیت سے باہر نکلنے کی ہی تو کوشش ہے۔ اس کی نظریں کم پر تھیں جس نے شاید کوئی مچھلی پکڑی تھی اور جوش میں اسے دم سے پکڑ کر سب کو دکھا رہا تھا۔ مچھلی اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ چھوٹے سائز کی ٹراؤٹ تھی جو ٹھنڈے پانی کی مچھلی ہے۔ کھانے میں لذیذ بھی ہوتی ہے اور جسم کو گرم بھی رکھتی ہے۔

''فشنگ کا موڈ ہے تو چلو میرے ساتھ۔'' اب طلال سے رہا نہ گیا تو اس سے بولا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چل دی۔

☆☆☆

فشنگ سب کے لیے ایک دلچسپ مشغلہ ثابت ہوا۔ اُن کی دیکھا دیکھی تقریباً بھی دریا میں کانٹا ڈالے بیٹھے تھے لیکن ٹراؤٹ جیسی پھرتیلی مچھلی دوبارہ ہاتھ نہیں لگی تھی۔

''میں اسے بوسہ دوں گی جو ایک مچھلی بھی پکڑ کے دکھائے گا۔'' سرخ بالوں والی فخر سے کم کو دیکھ کر اٹھلاتے ہوئے بولی۔

''اور میرے علاوہ ایسا خوش قسمت کون ہوسکتا ہے۔'' کم اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے بولا تو سب جوش سے ہلا گلا کرنے لگے۔

مس ایشل فاسٹر اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ ریسٹورنٹ کی پچھلی جانب قدرتی اُگے ہوئے جنگل کی جانب چل دی۔ یہ جنگل کافی گھنا تھا اور کچھ سومیٹر کی دوری کے بعد تو اس جنگل میں راستہ بنانا بھی مشکل تھا۔ جنگل چونکہ عام گزرگاہ نہیں تھی۔ اس لیے یہاں لوگوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بڑے بڑے دیوہیکل سرسبز درخت بڑا ہیبت ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ ایشل نے اپنے کندھے سے ٹریولنگ بیگ اتارا اور اوپری پاکٹ سے ایک جدید ڈیجیٹل کیمرا نکالا۔

''چار بجے ہمیں پورٹ اسٹیفنز کے لیے نکلنا ہے سب کو ریڈی کرو، میں آ رہی ہوں۔'' وہ کیمرا ہاتھ میں لے کر بیگ اپنے قدموں کے پاس نیچے سوکھے پتوں پر رکھتے ہوئے بولی۔

''لیکن تم یہاں اکیلی......''

''جو کہا ہے، وہ کرو۔'' وہ دوٹوک لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی تو وہ سر ہلا کر عجیب سے انداز میں اسے دیکھ کر مڑ گیا۔ کچھ دور جا کر تجسس سے مجبور ہو کر اس نے دیکھا تو وہ درختوں کی تصویریں لے رہی تھی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا

آگے بڑھ گیا۔ اس خوفناک جنگل میں مرد ہو کر اس کا رکنے کو دل نہیں مان رہا تھا اور وہ عورت ہو کر آرام سے کھڑی فوٹوگرافی کر رہی تھی۔

کچھ دیر تصویریں اتارنے کے بعد ایک قدرے بڑے درخت کی کھوہ میں اس نے کچھ جنگلی پھول توڑ کر رکھ دیے۔ ہاتھ اٹھا کر کچھ پڑھا اور پھر اپنی آنکھوں میں آنے والی نمی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کر کے وہ پلٹ گئی۔ سفری بیگ میں کیمرا ڈالا اور اسے کندھے پر ڈال کر ایک الوداعی نظر جنگل پر ڈال کر وہ ریسٹورنٹ کی جانب چل دی۔ اس نے اپنے اسسٹنٹ کا انتظار نہیں کیا تھا۔ اسے معلوم تھا اب وہ واپس نہیں آئے گا۔

☆☆☆

پورٹ اسٹیفنز میں ان کی رہائش کا بندوبست ایک گیسٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ یہ گھنے جنگل کا اختتامی علاقہ تھا۔ جہاں قطار در قطار گیسٹ ہاؤسز بنے ہوئے تھے۔ شام کے سائے بڑھنے لگے تھے۔ سیاحوں کا رش بھی یہاں معمول سے زیادہ تھا۔ اپنا اپنا سامان گیسٹ ہاؤسز میں رکھ کر بھی آرام کرنے کے بجائے ساحل کی سیر کرنے لگے۔ جہاں اتنی رونق اور روشنیاں تھیں کہ دن کا گمان ہو رہا تھا۔

مہذب دنیا کے یہ باشندے غیر مہذب بن کر زندگی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ وقت کی قلت نے ان کے جوش کو بڑھا دیا تھا۔ ان کے ساتھ آئے ہوئے سیکیورٹی گارڈز بھی وقتی طور پر اپنی ڈیوٹی بھلا کر ہلے گلے کا حصہ بن گئے تھے۔ یہ جشن آدھی رات سے زیادہ دیر تک جاری رہا۔ مشعل اور طلال بھی رات گئے تک اکٹھے بیٹھے اپنی اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات ایک دوسرے کے گوش گزار کرتے رہے۔ طلال جہاندیدہ تھا، سمجھ رہا تھا کہ مشعل اس میں ضرورت سے زیادہ ہی دلچسپی لے رہی ہے۔ اسے بھی وہ اچھی لگ رہی تھی اس لیے اس کے ساتھ گزرنے والا وقت بھلا لگ رہا تھا۔ کم اور اس کی گرل فرینڈ کچھ دیر پہلے ہی نشے میں دھت ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے گیسٹ ہاؤس کی جانب جاتے دکھائی دیے۔ باقی لڑکے لڑکیاں بھی من پسند ساتھیوں کو لیے بقیہ رات گزارنے جہاں جگہ مل رہی تھی، جا رہے تھے۔

دونوں سیکیورٹی گارڈز کو بھی اپنی من پسند ساتھی مل گئی تھی۔

سیکیورٹی گارڈ کی ساتھی لڑکی کالی ضرور تھی لیکن جوانی کا جوش اور حسن ان کی آنکھوں کو چکاچوند کر رہا تھا۔ حسن ہو، جوانی ہو، رات ہو اور چاند کی چاندنی بھی مل جائے تو نشہ دوآتشہ ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں بھی اسے لیے ایک پرانی طرز کے گیسٹ روم کی پچھلی جانب چلے گئے۔ یہاں ایک کمرا تھا جو اسٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ پرانا فرنیچر اور کچھ ٹوٹی ہوئی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ خربوزہ چھری پر گرے یا چھری خربوزے پر بات ایک تھی۔ دونوں میں یہ دم خم نجانے کب تک رہتا جب ایک دم ہی ایک خربوزے کا نرخرہ کٹ گیا۔

چھری بھی اصلی تھی اور کٹنے والا گلا بھی اصلی تھا۔ خون کا ایک تیز فوارہ سا نکلا تھا جب ایک سیکیورٹی گارڈ تیورا کے نیچے گر پڑا، خون کے چھینٹوں نے دوسرے سیکیورٹی گارڈ اور لڑکی کو چونکنے پر مجبور کر دیا لیکن جب تک وہ صورتِ حال کو سمجھتے، کمرے میں کھڑے تاریک سایوں نے ان کو کچھ سمجھنے کے قابل نہ چھوڑا۔ ان کے ہاتھوں میں اتنے تیز دھار آلے تھے کہ لمحوں میں ان کی روح ان کے جسموں کا ساتھ چھوڑ گئی۔ تاریک سایوں نے آرام سے آگے بڑھ کر ان کی کٹی ہوئی گردنوں کو تن سے جدا کر دیا۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ انہیں اس کام کی جلدی نہیں تھی بلکہ اس کام میں ان کو مزہ آ رہا تھا۔ بڑی نفاست اور مہارت سے گلے کاٹ کر انہوں نے اپنے ساتھ لائے گئے تھیلوں میں ڈال لیے۔ باہر آ کر وہ جیسے کچھ تلاش کرنے لگے پھر ایک جانب پڑی گلا کٹی لاش ان کی نظروں میں آ گئی۔ پہلے کی طرح یہاں بھی انہوں نے بڑے آرام سے سر کو تن سے جدا کیا۔ سر جدا کر کے انہوں نے اسے بھی تھیلے میں ڈال لیا تھا۔ اٹھنے سے پہلے ایک سائے نے چہرے سے تھوڑا سا ماسک اتار کر کٹے ہوئے جسم کے اوپری حصے سے جہاں سے خون اب بھی نکل رہا تھا۔ اپنی انگلی خون میں بھگو کر منہ میں ڈال کر ایسے نکالی جیسے لالی پوپ نکالتے ہیں۔

”یہ لاجواب ہے۔“ خون چکھنے والا سایہ اپنے ساتھی سے بولا تو وہ اسے ہاتھ سے اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ساتھی کے آگے بڑھنے پر دوسرا سایہ بھی آگے بڑھ گیا۔ لیکن اس کا انداز قدرے جھنجلاہٹ آمیز تھا۔ جیسے کسی بچے سے اس کا پسندیدہ کھلونا چھین لیا جائے تو وہ غصہ کرتا ہے لیکن کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ کٹے ہوئے چاروں سر انہوں نے ایک ہی درخت کی مختلف شاخوں سے ٹانگ دیے تھے۔ اس کے بعد وہ اندھیرے میں گم ہو گئے تھے۔ ویسے بھی جشن ختم ہو چکا تھا۔ ساحل پر تاریکی ہو گئی تھی۔ سب لوگ سونے جا چکے تھے۔ وہ بھی چلے گئے۔

☆☆☆

صبح خیزی کے عادی سیاح اٹھ کر ساحل پر سورج نکلنے سے پہلے غوطہ خوری کا مزہ لے رہے تھے، کچھ ننگے پاؤں چہل قدمی کر رہے تھے۔ طلال نے بھی ایک طویل انگڑائی لی اور لحاف بدن سے ہٹاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ آنکھیں ملتا وہ کھڑکی کا پردہ ہٹانے کی نیت سے آگے بڑھا تو لڑکھڑا گیا۔ وہ گرتا گرتا بمشکل بچا تھا پاؤں اٹکنے کی وجہ مشعل تھی جو ٹیڑھے میڑھے اسٹائل میں بے سدھ لیٹی سو رہی تھی۔ وہ کافی گہری نیند میں تھی اور جیکٹ سمیت سو گئی تھی۔ طلال چونکا پھر مسکراتا ہوا اٹیچڈ باتھ روم کی جانب بڑھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تیراکی کا لباس پہنے ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ مشعل کو بھی ساتھ لے لے لیکن وہ گہری نیند میں تھی۔ اس نے اسے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

بیچ پر دیکھتے ہی دیکھتے کافی گہما گہمی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ سورج کی ابتدائی کرنیں پھوٹ پڑی تھیں۔ کچھ لوگ رنگ برنگی چھتریوں تلے سوئمنگ کے بعد جسموں کو سینک رہے تھے۔ طرح طرح کے جوسز ہاتھوں میں پکڑے مقامی لوگ سیاحوں کو پیش کر رہے تھے۔ ان دنوں ان کی آمدنی بڑھ جاتی تھی۔ ایک چھتری تلے بیٹھی مس ایشل فاسٹر نے بھی ایک جوس خریدا اور آہستہ آہستہ اس کے سپ لینے لگی۔ اس کے ایک ہاتھ میں دوربین بھی تھی جسے وہ وقتاً فوقتاً آنکھوں سے لگا کر ساحل کا نظارہ لے لیتی تھی۔ کچھ دیر غوطہ خوری کا مزہ لے کر وہ بھی سیدھا وہیں آ گیا۔ ایک جوس والا بھاگتا ہوا آیا اور اسے جوس آفر کرنے لگا۔ جوس لے کر وہ ایشل کے پاس ہی بیٹھ گیا اور پھر اس کے آفر کرنے پر دوربین سے اردگرد کے نظارے دیکھنے لگا۔

''ویژن بہت اچھا ہے اس کا۔'' وہ تعریفی انداز میں دوربین آنکھوں سے لگائے بولا۔ پھر دفعتاً وہ ٹھٹک گیا۔ ایشل بھی چونکہ اسی کو دیکھ رہی تھی اس لیے اس کے چہرے کے بدلے تاثرات اس سے مخفی نہ رہ سکے۔ یہ زوم لینس دوربین تھی۔ اس لیے اس نے جلدی سے اسے ایڈجسٹ کیا اور پھر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''کیا ہوا؟'' اس کے چہرے کی بدلتی رنگت نے بالآخر ایشل کو بولنے پر مجبور کیا۔ طلال نے بولنے کے بجائے دوربین اس کو دے دی۔ مس فاسٹر اسی سمت دیکھنے لگی تھوڑی سی جدوجہد نے اسے بھی وہ منظر دکھا دیا جو انتہائی روح فرسا تھا۔

''یہ یہ...... تو سیکیورٹی......'' وہ انتہائی بے یقینی کی بدولت ہکلانے لگی۔

''بالکل...... آپ نے صحیح اندازہ لگایا، یہ تینوں سیکیورٹی گارڈز کے کٹے ہوئے سر ہیں اور چوتھا غالباً ایک لڑکی کا سر ہے۔'' وہ متفکر لہجے میں بولا۔

''او نو اس کا مطلب ہے وہ قاتل ہمارے پیچھے پیچھے اِدھر بھی آ چکا ہے۔'' ایشل کا چہرہ مارے دہشت کے فق ہو رہا تھا۔

''اور وہ بہت چالاک بھی ہے اس نے سیکیورٹی گارڈز کو ہی مار دیا ہے۔''

اسی اثنا میں ایشل خود پر کافی کنٹرول پا چکی تھی۔ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو دیکھتے ہیں چل کر۔'' وہ بیگ کندھے سے لٹکا کر بولی۔ طلال بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ درخت کے پاس پہنچ کر ایشل نے اپنا کیمرا بیگ سے نکالا اور چاروں سروں کی کلوز تصویریں بنانے لگی جبکہ طلال چاروں طرف گھوم پھر کر ان سروں کے دھڑ ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد دو مختلف جگہوں سے اسے دھڑ بھی مل گئے۔ صبح کا اجالا کافی پھیل چکا تھا۔ کافی سے زیادہ سیاح ساحل پر نکل آئے تھے لوگ اِدھر اُدھر گھومتے گھماتے ان کے پاس بھی آ نکلے تھے اور لاشیں اور کٹے ہوئے سر دیکھ کر چیخنے چلّانے لگے تھے۔ درخت کی پھیلی ہوئی شاخوں پر لٹکے چاروں سر اتنا دہشت ناک نظارہ پیش کر رہے تھے کہ اچھے اچھوں کے حواس خطا ہو رہے تھے۔ ایک سیاح لڑکی نے تو قے بھی کر دی تھی جسے دیکھ کر باقیوں کی انتڑیاں بھی اچھل کود کرنے لگی تھیں لیکن معدے رات بھر خالی رہنے کی وجہ سے کچھ بھی اگلنے سے قاصر تھے۔

''میرا خیال ہے ہمیں یہ سر اتار لینے چاہئیں اگر یہ اسی طرح لٹکتے رہے تو باقی سب لوگ خوف و ہراس کا شکار ہو جائیں گے۔'' ایک ادھیڑ عمر بلیک مین سیاح طلال اور ایشل کی طرف دیکھ کر بولا۔ وہ ان دونوں کو کھڑا دیکھ کر آیا تھا اور اس کے پوچھنے پر ان دونوں نے اسے بتایا تھا کہ یہ ان کے ساتھ آئے سیکیورٹی گارڈز تھے۔

''بالکل آپ صحیح کہہ رہے ہیں ہمیں ایسا ہی کرنا ہوگا اس سے پہلے کہ باقی لوگ بھی یہاں آ کر ایسا کریہہ منظر دیکھیں۔'' طلال ادھیڑ عمر سے متفق ہوتا ہوا بولا پھر مس فاسٹر کی رضامندی پوچھے بغیر ہی وہ سر اتارنے لگا۔ یہ کام کافی دل گردے کا تھا۔ لیکن وہ کافی مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اسے اکیلا دیکھ کر ادھیڑ عمر سیاح بھی اس کے ساتھ آملا البتہ

باقی سیاح وہیں کھڑے پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ ہولناک منظر دیکھ رہے تھے۔ کچھ تو الٹے پیروں بھاگ گئے تھے جن میں ہمت تھی وہ وہیں رکے ہوئے تھے۔ کٹے سروں کو لٹکتی ہوئی بیل نما شاخوں سے جدا کر کے انہوں نے وہیں نیچے سوکھی گھاس پر رکھ دیے تھے۔ مس ایشل کا اسسٹنٹ بھی کچھ دیر میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ پھر اس نے اپنی لیڈر کے کہنے پر پہلے اپنی کمپنی اونر سے بات کی پھر بلوربن ایریا کی پولیس کو بھی مطلع کر دیا۔ ان لوگوں نے انہیں وہیں رکنے کو کہا تھا اور ان کو یقین دہانی کرائی تھی کہ اگلے چند گھنٹوں میں پولیس کی مدد ان تک پہنچ جائے گی۔ لاشوں کو قریبی گیسٹ رومز کی انتظامیہ کے حوالے کر کے ایک مرتبہ پھر سب لوگ واپس اپنے اپنے گیسٹ رومز میں پہنچ چکے تھے۔ مس ایشل کے اسسٹنٹ نے سب کو اپنے گیسٹ روم میں پیغام بھیج کر بلوا لیا تھا۔ سب کے سب ہی اب کٹے ہوئے سروں والا واقعہ جان چکے تھے۔ اس لیے بیشتر لوگ سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ سب سے بری حالت ڈیوڈ کی تھی۔ وہ کبھی اپنی گول عینک ناک سے نیچے کرتا کبھی اوپر کرتا۔ اس کی صحت کے لحاظ سے یہ خبر واقعی بڑی تھی اور وہ مسلسل بڑبڑا کر مشعل اور علینہ کو یہاں سے واپس جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ان دونوں کی اپنی حالت خستہ تھی۔ قاتل ان لوگوں کا پیچھا کرتا ہوا ان کے اتنے قریب آ چکا تھا کہ ان کے سیکیوٹی گارڈز کو فارغ کر دیا تھا۔ سب ہی اس وقت کو کوس رہے تھے جب وہ اس سیاحتی سفر پر نکلے۔

موت کی سمت متعین نہیں ہوتی، وہ کبھی بھی کہیں بھی رخ کر لیتی ہے لیکن موت اگر ساتھ ساتھ سفر کرنے لگے تو پریشان کر دیتی ہے۔ وہ سب بھی پریشان تھے۔ اڑ کر یہاں سے واپس اپنے اپنے ملکوں اور شہروں میں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ ایک خوفناک موت اُن کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی تھی، وہ ابھی تک ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ فی الوقت وہ سب ہی محفوظ تھے لیکن دماغ کا کہنا تھا کہ یہ سکون عارضی ہے موت شاید انہی کے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی۔ علینہ تو اونچی آواز میں مذہبی عبادت کرنے لگی۔ اس کی دیکھا دیکھی سب ہی دعا مانگنے لگے۔

ایشل ان سب کو اب تک کے واقعات اور اپنی کی جانے والی کارروائی سے آگاہ کرنے لگی۔

”بلوربن پولیس جلد از جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ جیسے ہی آئے گی یہاں پہ کچھ ضروری کارروائی کر کے آپ سب کو اپنی سیکیورٹی میں واپس لے جائے گی۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ لوگوں کا یہ تفریحی

اخبار ہی پڑھتے رہو گے... چلو! جلدی سے برتن دھولو!

دورہ ادھورا رہا لیکن یہ آپ کی زندگیوں سے زیادہ ضروری نہیں، ہمارے لیے یہ اہم ہے کہ آپ سب لوگ بحفاظت اپنے اپنے ملک پہنچ جائیں۔“ وہ سب پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر قدرے رنجیدگی مگر مضبوط لہجے میں بولی۔

”پولیس پتا نہیں کب آئے تب تک وہ انجانا قاتل مزید قتل بھی کر سکتا ہے یہاں مزید رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“ بلیک مین بولا تو سب ہی اس کی تائید کرنے لگے۔

”میں خود یہاں مزید ایک گھنٹا بھی رکنے کے حق میں نہیں ہوں، ہو سکتا ہے قاتل کا اگلا شکار ہم میں سے ہی کوئی ہو۔“ ڈیوڈ قدرے ہمت کر کے بولا۔

”بالکل یہاں رکنا خود ہی موت کو دعوت دینا ہے ہمیں جلد از جلد نکلنا چاہیے۔ پولیس کے آتے آتے شام ہو جائے گی اور رات میں یہاں سے نکلنا ویسے بھی خطرناک ہو گا۔ کل تک رکنا پڑے گا اور رکنے کا مطلب ہے مزید قتل۔“ کم بھی سنجیدگی سے بولا، اس کی بات میں وزن تھا۔ سب ہی سر ہلانے لگے۔

”ویسے بھی ابھی تک قاتل نے رات کے اندھیرے میں ہی قتل کیے ہیں ہمیں اندھیرے سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ مشعل بے تابی سے بولی۔

”مائی گاڈ! قاتل اب تک سات لوگوں کو مار چکا ہے وہ بھی انتہائی بے دردی کے ساتھ۔ مجھے تو یہاں بالکل بھی نہیں رکنا۔“ سرخ بالوں والی دہشت زدہ لہجے میں بولی تو جیسے سب کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ وہ سب یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہ رہے تھے۔ ایشل قدرے بے بسی سے اپنے اسسٹنٹ کو دیکھنے لگی۔

”دیکھیے جو کچھ آپ سب کہہ رہے ہیں، میں اس سے متفق ہوں مگر واپس بغیر سیکیورٹی کے جانا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔کم ازکم میں ایسا رسک لینے کی حماقت نہیں کرسکتی۔“ ایشل ٹھوس لہجے میں بولی۔

”تو آپ کیا چاہتی ہیں کہ ہم قاتل کا اگلا شکار بن جائیں۔“ ڈیوڈ قدرے غصے سے ہکلاتا ہوا بولا۔ ”قاتل ہمارے کہیں پاس ہی ہے اور اس کا اگلا شکار لازما ہم میں سے کوئی ایک ہوگا اور یہ ضروری نہیں کہ وہ صرف ایک قتل کرے، وہ ہم سب کو اکٹھا بھی مار سکتا ہے‘ جب وہ تین سیکیورٹی گارڈز کو تنہا مار سکتا ہے تو ہم کیا چیز ہیں اس کے آگے۔“

”میرا خیال ہے ایشل ہمیں واپس چل پڑنا چاہیے، پولیس کے انتظار میں شام تک دہشت سے ویسے ہی آدھے لوگ مر جائیں گے۔“ طلال کافی دیر سب کو سننے کے بعد نتیجے پر پہنچتا ہوا بولا۔

”مجھے پولیس کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا اور ایسا میں نہیں کرسکتی۔کسی کو جانا ہے تو وہ اپنی ذمے داری پر جا سکتا ہے مگر ہماری بس اب سیکیورٹی کے بغیر نہیں چلے گی۔“ مس ایشل دوٹوک لہجے میں بولتی اندر چلی گئی۔

”یو نان سینس، ہم تمہارے بغیر بھی جا سکتے ہیں۔تم سڑو یہاں اور یقینا قاتل کے لیے اچھا شکار بن سکتی ہو، ہم مزید ایک گھنٹا بھی نہیں رک سکتے۔“ مشعل قدرے غصے سے بولی تو کمرے کا دروازہ بند کرتی ایشل نے قدرے سخت نظروں سے اسے دیکھا۔

”تمہیں اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے۔“ اسسٹنٹ مشعل کو گھور کر بولا۔

”یو شٹ اپ۔ہم تم دونوں کی مرضی کے غلام نہیں ہیں۔تم لوگ ہمیں لیڈ کرنے آئے ہو اپنی اوقات میں رہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ مشعل اس سے بھی اونچے لہجے میں بولی تھی۔باقی بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔مزید آدھے گھنٹے کی بحث اور تکرار کے بعد طلال اور اسسٹنٹ مس ایشل کو ساتھ چلنے پر رضامند کر چکے تھے۔سب اتنا اصرار کر رہے تھے کہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔رات ہونے سے پہلے اگر وہ لوگ واپس پہنچ جاتے تو کم ازکم بلوربن پولیس کی سیکیورٹی مل جاتی اور وہ قاتل کی دسترس سے محفوظ ہو جاتے۔

☆☆☆

واپسی کا سفر شروع ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے سب ہی اپنی اپنی جگہ سہمے بیٹھے تھے۔حالات بتا رہے تھے کہ یہ سہماپن اب جلد ٹھیک ہونے والا نہیں تھا مگر قدرے سکون میں تھے کہ قاتل کی دسترس سے دور جا رہے تھے۔سب جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، مطمئن ہوتے جا رہے تھے۔ہلکی پھلکی گپ شپ شروع ہو چکی تھی۔سرخ بالوں والی بم کی آغوش میں گھسی بیٹھی تھی۔باقیوں کا بھی یہی حال تھا۔میٹھی میٹھی سرگوشیاں شروع ہو چکی تھیں۔مس ایشل سب سے الگ تھلگ اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ بیٹھی تھی۔وہ سپاٹ چہرہ لیے تھی۔اس کے چہرے سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔طلال، مشعل وغیرہ کے ساتھ بیٹھا حالات پر تبصرہ کر رہا تھا جبکہ ان کے ساتھ ہی بیٹھا ڈیوڈ بظاہر شریک محفل تھا مگر گفتگو سے پرہیز کر رہا تھا۔خوف اس کی آنکھوں پر لگے گول شیشے کے فریموں سے بھی جھلک رہا تھا۔خلاف معمول اس کا لیپ ٹاپ بند تھا جسے وہ ہر وقت کھولے رکھتا تھا۔مشعل وقتاً فوقتاً اس پر قہر آلود نظر ڈال لیتی تھی۔اسے یا تو ڈیوڈ کے سہمے اور بزدل پن سے چڑ تھی یا پھر ایک مرد کی احمقانہ حرکتوں پر غصہ آتا تھا، وہ ایک مرد ہوتے ہوئے بھی ان کی حفاظت کرنے سے قاصر تھا یہی وجہ تھی کہ مشعل اسے ہر پریشانی میں غصے سے دیکھنے لگتی۔غصہ اسے علینہ کی بری چوائس پر بھی آتا تھا مگر اس سب سے ہٹ کر وہ اسے بہت عزیز بھی تھی۔اس لیے مشعل، ڈیوڈ پر کسی تبصرے سے پرہیز کرتی تھی۔

”مس ایشل ہمارے پاس اپنی حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار نہیں ہے۔کیا آپ کے پاس کچھ ایسا ہے جسے بطور حفاظت استعمال کیا جا سکے؟“ اچانک ہی سرگوشی زدہ ماحول میں طلال کی آواز نے جہاں ایشل فاشر کو متوجہ کیا وہیں سب اسے دیکھنے لگے۔

”جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لیے دو عدد شاٹ گنز ہیں جن کی ضرورت آج سے پہلے کبھی نہیں پڑی مگر ہوسکتا ہے کام آجائیں۔“

”تو پھر برائے مہربانی انہیں جہاں کہیں سنبھال کر رکھا ہوا ہے، نکال لیجیے تاکہ بوقتِ ضرورت استعمال کیا جا سکے۔“ طلال قدرے تیکھے لہجے میں بولا تھا جسے مس ایشل نے نظر انداز کر دیا اور بس کے عملے میں سے ایک لڑکے کو گنز لانے کو کہا۔تھوڑی ہی دیر میں وہ گنز اٹھائے چلا آیا۔طلال نے اس سے ایک گن لے لی جبکہ ایک گن مس ایشل کے اسسٹنٹ نے پکڑ لی۔بس میں ایک مرتبہ پھر سرگوشیاں پھیلنے لگی تھیں۔کچھ ہی دیر بعد سرخ بالوں والی کے یاد دلانے پر

سب کو لنچ کی فکر لاحق ہوگئی۔ کیونکہ جس افراتفری کے عالم میں وہ لوگ نکلے تھے، کچھ کھانے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ اب ناشتے کو چھوڑ کر لنچ کا اہتمام ہونے لگا۔ سورج بھرپور آب و تاب سے ان کے سروں پر چمک رہا تھا۔ بس کو ایک پرانی طرز کے بنے اوپن ریسٹورنٹ کے پاس روک دیا گیا۔ یہ ریسٹورنٹ شاید قابلِ استعمال نہیں رہا تھا۔ اس لیے فی الوقت خالی تھا۔ ریسٹورنٹ کے اندر سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے سب اپنے بیٹھنے کے لیے کرسیاں کھینچ لائے تھے۔ کُک کھانا تیار کرنے لگا تھا۔ کھانے کی تیاری میں کچھ وقت تھا۔ مشعل اور علینہ کُک کی مدد کر رہی تھیں تاکہ کھانا جلد تیار ہو اور وقت ضائع ہونے سے بچ جائے جبکہ طلال اور رکم ریسٹورنٹ کے اندر گھوم پھر کر ہتھیار نما کوئی چیز ڈھونڈ رہے تھے۔ اپنی حفاظت کے لیے ان کے پاس صرف دو عدد شاٹ گنز تھیں جو ناکافی ہو سکتی تھیں۔ طلال بظاہر مطمئن تھا مگر اس کی چھٹی حس بار بار خطرے کا الارم بجانے لگتی تھی۔ اسی لیے وہ زیادہ مسلح رہنا چاہتا تھا۔ کچھ جدوجہد کے بعد انہیں کچن میں سے پرانی زنگ آلود سبزی وغیرہ کاٹنے کی دو چھریاں مل گئیں۔ ایک چھری اس نے رکم کو دے دی جبکہ دوسری بلیک مین کو دے دی۔ چھریاں قدرے زنگ آلود تھیں مگر کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے کہ پیشِ نظر اب ان کے پاس چار حفاظتی ہتھیار آچکے تھے۔ وہ پہلے سے مطمئن نظر آرہے تھے۔ ساتھ ہی طلال کو ایک پستول بھی مل گیا تھا۔ مشعل اور دوسری لڑکیوں نے اپنی اپنی حفاظت کے لیے لکڑی کے موٹے اور ٹوٹے ہوئے قدرے ڈنڈا نما ٹکڑے پکڑ لیے تھے۔ یہ طلال کے کہنے پر ہی انہوں نے اپنے لیے ڈھونڈے تھے کیونکہ سفر میں قاتل سے ہٹ کر انہیں جنگلی درندوں اور خطرناک جانوروں سے بھی واسطہ پڑ سکتا تھا۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ مسلح افراد کی موجودگی حوصلہ افزا بات ہوتی۔

کھانے کی تیاری سے لے کر کھانے تک انہیں ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا تھا۔ آج وقت کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ وہ سب صبح سے بھوکے نہ ہوتے تو شاید لنچ کا تکلف بھی نہ کرتے سیدھے بغیر رکے واپس پہنچتے لیکن پیٹ کا درد سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ پیٹ میں پڑا کھانا حوصلہ بڑھا دیتا ہے جبکہ بھوکا پیٹ حوصلے کو گھٹاتا رہتا ہے۔ پیٹ بھر چکے تھے، حوصلے بھی بڑھ چکے تھے۔ جسم میں کچھ طاقت آئی تو قاتل کا خوف بھی کم پڑ گیا۔ کھانے کے بعد تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد ان کا آگے بڑھنے کا ارادہ تھا جب ایک اور سیاحوں سے بھری بس ان کے قریب سے گزر گئی۔ بس میں بیٹھے ادھیڑ عمر بلیک مین نے طلال کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ یہ وہی تھا جس نے صبح انہیں شاخوں سے کٹے ہوئے سر اتارنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ لوگ بھی قاتل کی دہشت کی بدولت شاید واپس جا رہے تھے۔ طلال نے ادھیڑ عمر کو مسکرا کر دیکھا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔

”میرا خیال ہے ہمیں بھی چلنا چاہیے ان لوگوں کے ساتھ رہیں گے تو سیکیورٹی ملے گی۔“ طلال نے چہل قدمی کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پُرسوچ انداز میں کہا تو ایشل نے رضامندی ظاہر کی۔ صبح والی بحث کے بعد اب وہ ہر بات خاموشی سے مان رہی تھی۔ شاید اس کے اپنے اندر کہیں قاتل کا خوف بسا ہوا تھا اور اب وہ خود یہاں سے جلد از جلد نکلنا چاہتی تھی۔ سب بس میں سوار ہو چکے تھے لیکن جلد ہی انہیں بس کے ساتھ ہونے والی گڑبڑ کا احساس ہو چکا تھا۔ ایک شدید خوف کی لہر اُن کے جسموں میں سرایت کرنے لگی۔ بس کے ٹائر سے ہوا یا تو کسی نے نکال دی تھی یا وہ پنکچر ہو گیا تھا لیکن ان کے لیے اتنی سی بات بھی باعثِ خوف بن چکی تھی۔ شاید انجانا قاتل ان تک پہنچ چکا تھا یا ان کی بدقسمتی نے ان کے پاؤں باندھ دیے تھے۔ وہ بڑی بے دلی سے دوبارہ بس سے اترنے لگے۔ بس میں ایک اضافی ٹائر پڑا ہوا تھا۔ ڈرائیور اور اس کے ساتھی نے جلدی سے ٹائر نکالا اور جیک لگانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ پنکچر ٹائر کو اتار لیا گیا تھا اور اب صحیح ٹائر کو لگایا جا رہا تھا۔ گزرنے والا ایک ایک لمحہ آزمائش بن گیا۔ اب تو ان کے خوف کا یہ عالم تھا کہ پتے بھی ہلتے تو ان کے دل دہل جاتے۔

”میں اس منحوس تفریحی دورے پر آنا ہی نہیں چاہتی تھی، علینہ کی بچی نے میرے ساتھ زبردستی کی۔“ مشعل بلند آواز میں بڑبڑائی تھی۔ علینہ نے ایک سنجیدہ نظر اس پر ڈالی اور خاموش رہی۔ خوف سے اس کی اپنی حالت پتلی ہو رہی تھی اور وہ سر گھما گھما کر ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اچھا لگنے والا ریسٹورنٹ بھی اب خوفناک اور ڈراؤنا لگ رہا تھا۔

بالآخر ٹائر بدل دیا گیا تھا۔ ڈرائیور ٹائر بدلنے کے بعد بھی مطمئن نہیں لگ رہا تھا۔ ایشل کے استفسار پر اس نے بتایا کہ دو عدد اور ٹائروں میں بھی ہوا کم ہو رہی ہے اور اگر ہوا اسی طرح کم ہوتی رہی تو وہ بمشکل آدھے گھنٹے کا سفر کر سکیں گے۔ یہ حالت تشویش ناک تھی۔ وہ سب لوگ بری طرح پھنسنے والے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ ان کی بدقسمتی نے اُن کے لیے ایک چوہے دان تیار کر دیا تھا اور وہ اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود بھی اس چوہے دان میں پھنستے چلے جا رہے تھے۔

ان میں سے بیشتر اس وقت کو کوس رہے تھے جب تھوڑی دیر پہلے ہی سیاحوں کی ایک بس ان کے قریب سے گزری تھی، وہ اس میں بھی سوار ہو سکتے تھے لیکن تب انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ہونے کیا والا ہے۔ بس کے ٹائروں سے لحہ بہ لحہ نکلنے والی ہوا نے ان کے حواس جیسے معطل کر دیے تھے۔ ایشل نے سوالیہ نظروں سے طلال کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ مجھ میں تو فیصلہ کرنے کی طاقت نہیں رہی، اب بتاؤ کیا کہتے ہو۔

''میرا خیال ہے ہمیں آگے نہیں بڑھنا چاہیے، یہیں رہ کر مدد کا انتظار کرنا چاہیے۔ بس واپسی کا یہی روٹ ہے عنقریب ہو سکتا ہے کوئی اور بس بھی واپسی کے لیے نکل پڑی ہو۔ ایسا ہو جائے تو ہم کم از کم خواتین کو تو بھجوا ہی سکتے ہیں۔'' طلال نے سمجھداری سے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ مشعل اور علینہ وغیرہ کی متغیر ہوتی حالتیں اس کے سامنے تھیں، وہ سمجھ سکتا تھا کہ اگر انہیں انتظار کرتے ہوئے یہیں رات پڑ گئی تو بیشتر خواتین خوف سے ہی مر جائیں گی۔

''ہمیں فون کرنا چاہیے۔ انتظامیہ کو بتاتے ہیں کہ ہمارے لیے کسی تیز رفتار امداد کا بندوبست کیا جائے، میں نے بلوربن میں ہیلی پیڈ دیکھا ہے وہ لوگ ہمیں بذریعہ ہیلی کاپٹر بھی تو لے جا سکتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اپنی کانپتی آواز پر بمشکل کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

''موبائل سگنلز اس علاقے میں نہیں آتے ہم کسی کو فون نہیں کر سکتے۔'' ایشل کے اسسٹنٹ نے قدرے بے بسی سے بتایا تو جیسے کسی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ سب ہی اپنے اپنے موبائل نکال کر چیک کرنے لگے لیکن انہیں کوئی سگنل نہیں ملا۔ سب کے منہ لٹک چکے تھے۔ یہ بے بسی کی جیسے انتہا تھی۔ وہ سب اسی عالم میں کھڑے تھے جب انہیں بلیک مین کی چیخ سنائی دی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی سگنلز ڈھونڈنے کے چکر میں کچھ دور واقع ٹیلے پر چڑھا تھا لیکن اب الٹے پاؤں چیختا ہوا واپس آ رہا تھا۔ طلال اور اسسٹنٹ بوائے نے جلدی سے اپنی شاٹ گنز اس مقام کی طرف تان لیں جہاں کسی گڑبڑ کے امکانات متوقع تھے۔

''وہ......وہ......اس نے اسے مار دیا ہے۔'' وہ ہکلاتا ہوا ان کے پاس پہنچ کر بولا۔ طلال اور بکم وغیرہ تیزی سے بھاگتے ہوئے اس ٹیلے کی طرف گئے تھے جہاں قاتل اور مقتول کا پایا جانا متوقع تھا۔ ٹیلے پر پہنچ کے جو منظر ان کی آنکھوں نے دیکھا کافی بھیانک تھا۔ یہ ان کا ساتھی گورے رنگ کا سیاح تھا۔ جو قاتل کی درندگی کا شکار ہو چکا تھا۔ طلال نے دور سے ہی اس میں زندگی کی چمک ختم ہوئی دیکھ لی تھی۔ قاتل نے یہاں بھی گردن پر ایک ہی بھرپور وار سے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اس کو چیخنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔

''وہ مر چکا ہے۔'' بکم کے بڑھتے قدموں کو طلال کی آواز نے وہیں منجمد کر دیا۔ مرنے والے کے اردگرد پھیلا خون بھی جم چکا تھا۔ اسے مرے ہوئے لگ بھگ گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی کا دھیان اس کی گمشدگی کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ مرنے والے کی کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں تھی۔ ورنہ اب تک اس کا لاپتا ہونا سامنے آ جاتا۔ طلال کو جہاں تک یاد پڑتا تھا۔ وہ کھانے سے پہلے ہی غائب ہو چکا تھا۔ اس کی پڑی ہوئی لاش سے کچھ دور ہی پڑا ہوا کیمرا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ یہاں تصویر بنانے آیا تھا لیکن قاتل کے خونی پنجوں کا شکار ہو گیا تھا۔ بکم نے آگے بڑھ کر مرنے والے کی پھیلی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔ کچھ ہی دیر میں سب ان کے پاس جمع ہو چکے تھے۔ مرنے والے کی لاش کو اٹھا کر بس کے اوپر لادو دیا تھا تا کہ جب وہ لوگ واپس پہنچیں تو لاش ورثا کو پہنچائی جا سکے۔

''مجھے نہیں لگتا ہم میں سے اب کوئی زندہ سلامت واپس پہنچ سکے گا۔'' سرخ بالوں والی کی حالت غیر تھی اور وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

''ہمیں ہر وقت پُرامید رہنا چاہیے، مایوسی گناہ ہے۔'' مس ایشل نے قدرے سنجیدگی سے کہا تو طلال نے چونک کر اسے دیکھا۔ بالآخر مشکل میں مس ایشل کو بھی اللہ یاد آ گیا تھا۔ وہ زیرلب کچھ دعائیں پڑھ رہی تھی جسے دیکھ کر طلال کے ہونٹ ان حالات میں بھی پھیل گئے جنہیں اس نے جلدی سے سکیڑ لیا۔ فی الوقت وہ سب کا لیڈر بن چکا تھا۔ اب سب مس ایشل کے بجائے اس کا منہ دیکھ رہے تھے۔

''ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہیے۔ قاتل بالآخر ہم تک پہنچ چکا ہے۔ اب ہمیں اس خوش فہمی سے نکل آنا چاہیے کہ وہ ہمیں چھوڑ دے گا۔ وہ ہمارا ایک ساتھی مار چکا ہے۔'' مشعل بولی۔

''نہیں، آگے بڑھنا سراسر بے وقوفی ہے۔ ہماری بس کے ٹائروں میں سے ہوا نکل رہی ہے۔ پتا نہیں آگے ہم کس جگہ پھنس جائیں۔ یہاں کم از کم رات سونے کے لیے ریسٹورنٹ ہے آگے نہ جانے کیا حالات ہوں۔ میرے خیال میں ہمیں یہیں رہ کر مدد کا انتظار کرنا ہوگا۔'' طلال گہری سنجیدگی سے بولا۔

''تم شاید بھول رہے ہو کہ قاتل ہم تک پہنچ چکا ہے اور ہمیں مارنے کے لیے وہ رات کا انتظار بھی نہیں کرنے والا۔'' علینہ بولی۔

''ہمارے بالکل قریب ہمارا ایک ساتھی قتل ہو گیا اور ہمیں پتا بھی نہیں چل سکا۔ اس سے اندازہ کرو کہ قاتل کتنا چالاک ہے وہ یہی تو چاہتا ہے کہ ہم بوکھلاہٹ میں یہاں سے نکلیں اور آگے بچھائے ہوئے اس کے مرضی کے جال میں پھنس جائیں' اب تو میرا یقین پختہ ہو گیا ہے کہ قاتل نے ہی ٹائروں کو پنکچر کیا ہے۔'' طلال بولا۔

''یہ ٹھیک کہتا ہے آگے بڑھنا بے وقوفی ہی ہے ہمیں مناسب مدد آنے تک یہیں رکنا چاہیے۔'' کم، طلال کی بات سے متفق ہوتا بولا تو باقیوں نے بھی نہ چاہتے ہوئے ان کی بات مان لی۔

''میری طبیعت خراب ہو رہی ہے میں استھمیٹک ہوں اور میرا اِن ہیلر نہیں مل رہا ہے۔'' ان کی ساتھی ایک کالے رنگ کی لڑکی نے اچانک انکشاف کیا تو سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا اکھڑتا سانس اور زرد پڑتی رنگت بتا رہی تھی کہ اسے جلد طبی امداد نہ ملی تو......

علینہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر خود اس کا اِن ہیلر ڈھونڈنا شروع کیا۔ اس کے ہینڈ بیگ میں واقعی وہ نہیں تھا۔ ہینڈ بیگ کے بعد اس کا سفری بیگ بھی چیک کیا گیا لیکن اِن ہیلر نہیں ملنا تھا نہ ہی ملا۔ اب سب کو لڑکی کی غیر ہوتی حالت نے پریشانی میں ڈال دیا تھا۔

''مشعل پلیز کچھ کرو تم تو ڈاکٹر ہو۔'' ڈیوڈ، گم صم کھڑی مشعل سے بولا۔

''میرے پاس فرسٹ ایڈ کا ہلکا پھلکا سامان ہے لیکن اِن ہیلر نہیں ہے، میں اس دمے کی مریضہ کے لیے بس اتنا ہی کر سکتی ہوں کہ اس کو اپنی سانسیں دے کر کچھ دیر کے لیے اس کی طبیعت ٹھیک کر دوں لیکن یہ کوئی مستقل علاج نہیں ہے۔ یہ علاقہ پولن زدہ ہے اور دمے کے مریضوں کے لیے خطرناک ہے۔'' وہ قدرے سپاٹ لہجے میں بولی اور ہچکچاتی ہوئی اس لڑکی کی طرف بڑھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے یہ کام کرنا پڑ رہا تھا۔ طلال سمجھ رہا تھا کہ اس لڑکی کی بدصورتی کی بدولت مشعل اس سے احتراز کر رہی تھی۔

کچھ دیر کی کوششوں کے بعد وہ اس لڑکی کی سانس بحال کرنے میں کامیاب ہو گئی اور اپنا اس کا یہ حال ہو رہا تھا کہ ابھی قے کر دے گی۔ بس کچھ لوگ ہوتے ہیں جو ہر چیز میں حسن دیکھنے کے لیے اتنے کریزی ہوتے ہیں کہ بدصورتی ان کی برداشت سے باہر ہوتی ہے۔ کم کے کہنے پر لڑکی کو ریسٹورنٹ کے اندر بھیج دیا گیا تاکہ وہاں ریسٹ کر سکے۔ ویسے بھی وہ ان کے پاس کھڑی رہتی تو اس کی حالت پھر سے خراب ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

سورج ڈھلنا شروع ہو گیا تھا لیکن نہ کوئی بس گزری نہ ہی کسی قریبی جگہ پر کوئی آبادی ہی ملی۔ دور دور تک بس جنگل ہی جنگل تھا اور جنگل کے بیچ ان کی واحد جائے پناہ وہ کاٹیج تھا جس کی خستہ حالی اسے مزید ہولناک تاثر دے رہی تھی۔ دمے کی مریضہ کو ایک ٹوٹے ہوئے بیڈ پر لٹا دیا گیا تھا۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ طلال نے مشعل اور علینہ کو اس کے پاس رہنے کو کہا۔ وہ بغیر کسی اعتراض کے چل پڑی تھیں۔ لیکن دس منٹ بعد ہی بے تحاشا چیخوں کی آواز نے انہیں اندر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اندر کے منظر نے ان کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے تھے۔ کالی لڑکی کے سینے میں کسی نے اندر تک خنجر گھونپ دیا تھا وہ اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی جبکہ علینہ قریب ہی اوندھے منہ گری ہوئی تھی اور مشعل بغیر رکے چیخے جا رہی تھی۔ طلال نے آگے بڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا اسسٹنٹ بوائے نے تیزی سے علینہ کو سیدھا کیا۔ وہ زندہ تھی لیکن بے ہوش تھی۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد علینہ کو ہوش آ گیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ رونے لگی تھی۔

''وہ ہم سب کو مار دے گا۔'' وہ بری طرح روتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔ طلال نے سکتے کی کیفیت میں بیٹھی مشعل سے پوچھا تو وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی کہ وہ واش روم سے باہر آئی تو علینہ بے ہوش تھی اور کسی نے مرنے والی کے سینے میں خنجر گھونپ دیا تھا لیکن قاتل کا دور دور تک کوئی سراغ نہیں تھا۔ کم، طلال، اسسٹنٹ بوائے اور بلیک مین قاتل کی تلاش میں کافی دیر اِدھر اُدھر بھٹک کر واپس آ چکے تھے لیکن وہ قاتل کم چھلاوا زیادہ تھا۔ انہیں کہیں ایک سراغ تک نہیں ملا تھا جبکہ علینہ کے بقول اس نے قاتل کو دیکھا تھا وہ کالے لباس میں تھا اور بڑی تیزی سے کالی لڑکی کے پاس گیا اور بغیر رکے خنجر گھونپ کر غائب ہو گیا۔ طلال کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ مشعل واش روم گئی تو لڑکی نے اس سے پانی مانگا وہ پانی لینے کچن میں گئی لیکن واپس آئی تو قاتل اپنا وار کر چکا تھا پھر اسے دیکھ کر اچانک ہی نہ جانے کس سمت بھاگا اسے کچھ یاد نہ رہا، وہ لڑکی کے سینے سے ابلتے خون کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہو

گئی تھی۔

مس ایشل ان کے قریب ہی ایک شکستہ سے صوفے پر اپنا سر پکڑ کر بیٹھی تھی۔ لڑکی ختم ہو چکی تھی۔

''سب اندر آجائیں اس چار دیواری کے اندر۔ میں دیکھتا ہوں اب اس قاتل کے بچے کو وہ ہمیں تنہا کر کے مار رہا ہے۔'' طلال نے غصے میں بہ آواز بلند کہا..... ''ہمت ہے تو سامنے آؤ بزدل چوروں کی طرح چھپ کر وار کر رہے ہو۔'' وہ کمرے کی خستہ دیواروں پر نظریں جمائے ہوئے تھا جیسے نامعلوم قاتل کو آنکھوں ہی آنکھوں میں مار ڈالے گا۔

سبھی اکٹھے ہو چکے تھے اور ہلکے سے کھٹکے پر بھی چونک اٹھتے۔ انہیں اس طرح بیٹھے ہوئے مزید دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ لاش کو کپڑے میں لپیٹ کر بس کے اوپری حصے میں دوسری لاش کے ساتھ ڈال دیا گیا تھا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ ہمارا اب بس ایک ہی کام رہ گیا ہے۔ لاشیں اکٹھی کرتے رہنا اور ایک دوسرے کو مرتے دیکھنا۔'' علینہ بھیگی پلکیں اٹھائے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر بولی۔

''تم ہو نا لیڈر اس ٹرپ کی تو بتاؤ اب کیا کرنا ہے کوئی حل تو ہونا چاہیے نا تمہارے پاس۔'' بلیک مین خاموش بیٹھی مس ایشل سے بولا۔

''مائنڈ یو میں اب لیڈر نہیں ہوں' میری لیڈر شپ اسی وقت ختم ہو گئی تھی جب آپ سب نے ہنٹر ویلی میں میری بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔'' وہ دوٹوک بولی تو بلیک مین تو جیسے بھتے سے اکھڑ گیا۔

''تمہارا مطلب ہے ہم اسی طرح مرتے رہیں، تمہارے پاس ایسی صورتِ حال کا کوئی علاج نہیں تو پھر تمہیں لیڈر کس نے بنا دیا؟''

''علاج تھا اور میں نے بتا بھی دیا تھا' اب تم لوگ لاعلاج ہو چکے ہو۔'' وہ بھی اسی ٹون میں بولی تو بلیک مین غصے سے اس کی طرف لپکا جسے بمشکل کم اور اسسٹنٹ نے روکا۔

''اسے کہو دفع ہو جائے یہاں سے ہم لاعلاج ہو چکے ہیں تو یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟'' وہ خود کو چھڑانے کی کوشش میں دہاڑتے ہوئے بولا لیکن مس ایشل اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلی بلکہ وہ بڑے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھی تھی۔

''ہمارے پاس اتنا راشن نہیں ہے کہ ہم زیادہ دیر اس جگہ بغیر کسی مدد کے رہ سکیں اور نہ ہی ہم اس جگہ سے آگے یا پیچھے جاسکتے ہیں۔ پیدل سفر کی صورت میں ہم بھٹک سکتے ہیں تو پلیز سب لوگ سوچیں کوئی بہتر حل ڈھونڈنے کی کوشش کریں ایسی سچویشن میں۔'' مشعل بولی۔

''یہاں مرنے سے بہتر ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے گروپس کی صورت مختلف سمتوں میں نکل پڑتے ہیں۔ قاتل زیادہ سے زیادہ کتنے لوگوں کو مار سکے گا اور......''

''اور یہ انتہائی بے ہودہ خیال ہے تمہاری شکل کے جیسا۔'' ڈیوڈ بولا۔ تو اس کی بات کو کاٹا بلیک مین بولا۔

''مختلف سمتوں میں کیوں جبکہ ہمارے پاس یہ روڈ ہے اور یہ سیدھی بلوربن جاتی ہے ہم بالکل درمیان میں ہیں آگے بڑھنا چاہیں یا واپس ہنٹر ویلی اتنا ہی وقت لگے گا۔ اب آپ لوگ سوچ لیں آگے جانا ہے یا پیچھے۔''

''میرا خیال ہے پیچھے کا سفر اب کوئی نہیں کرنا چاہے گا مدد چونکہ بلوربن سے ہی مل سکتی ہے تو پھر وہیں جانے کا پروگرام بننا چاہیے۔'' ایک گورے سیاح نے مداخلت کی تو سب نے اس سے اتفاق کیا۔ کچھ دیر کی مزید بحث کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ وہ رات یہیں گزاریں گے اور صبح دن کی روشنی میں گروپس کی شکل میں سفر کریں گے۔ لڑکیاں کمرے میں ٹھہر گئیں جبکہ لڑکوں .... چھوٹے گروپس کی صورت میں ریسٹورنٹ کے اردگرد پہرا دینے کے لیے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

یہ ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا جس کے صرف دو ہی کمرے ایک کچن اور ایک ڈائننگ ہال تھا۔ پورے کاٹیج کو اندر سے اچھی طرح چیک کر کے وہ لوگ باہر پہرا دے رہے تھے۔ یہ رات جیسے تیسے گزارنی تھی۔ کم، طلال اور بلیک مین کاٹیج کے سامنے جبکہ اسسٹنٹ بوائے اور دونوں انگریز سیاح پچھلی سائڈ کو کور کیے ہوئے تھے جبکہ ڈرائیور اور اس کے عملے کے دو لڑکے اور کک کاٹیج کے اطراف کو گھیرے ہوئے تھے۔

رات کا ابتدائی پہر آرام سے گزر گیا تھا۔ رات کے کھانے کو خود ہی بچا لیا گیا تھا تاکہ دن کی روشنی میں ناشتے کے علاوہ تھوڑا تھوڑا بچا ہوا راشن سب گروپس میں تقسیم کیا جاسکے اور دورانِ سفر کام آئے۔ ویسے بھی وہ جس صورتِ حال میں تھے کھانے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ ڈیوڈ کی پتلی حالت کی بدولت اسے اندر لڑکیوں کے ساتھ رہنے دیا گیا۔

ایشل فاسٹر بیٹھنے کے بجائے پورے ریسٹورنٹ میں چل پھر رہی تھی۔ وہ بیٹھنے والوں سے تھی بھی نہیں نہ ہی وہ بزدل تھی لیکن اس سفر نے اسے شروع سے ہی جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ ٹہلتی ہوئی کچن میں آگئی تھی۔ دفعتاً اس کی نظر ٹوٹے ہوئے سنک کے کنارے رینگتے ہوئے سیاہ بچھو پر پڑی۔ وہ

آہستگی سے آگے بڑھی، اپنے بیگ سے ایک چھوٹا شیشے کا جار نکالا اور بچھو کے اوپر ڈھکن کھول کر رکھ دیا۔ بچھو بوکھلا کر تھوڑا اوپر ہوا تو اس نے ڈھکن بند کر دیا۔ بچھو اب اس جار میں بے قراری سے اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ یہ آسٹریلین نر فنل ویب بچھو تھا۔ (Male Funnel web) یہ انتہائی زہریلا ہوتا ہے اور کاٹنے پر مہلک بھی ثابت ہوتا ہے۔ کچھ دیر اسے اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس نے اسے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ اسی وقت علینہ اندر آگئی۔ وہ ایک خاموش نظر اس پر ڈال کر کولر سے پانی نکالنے لگی۔ راشن اور پانی چونکہ کچن میں لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ اس لیے بوقتِ ضرورت وہ لوگ پانی وہیں سے لے رہے تھے۔ علینہ کے پاس چھوٹی پانی کی بوتل تھی جسے اس نے پانی سے بھر لیا تو اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گئی۔ بلیک مین اور ایشل کے درمیان ہونے والی جھڑپ کے بعد سب لوگ اسے نظرانداز کر رہے تھے۔ علینہ کے جانے کے بعد ایشل کچن کا نئے سرے سے تفصیلی جائزہ لینے لگی۔ وہ اس علاقے کے بچھوؤں کے بارے میں بہت معلومات رکھتی تھی جس نسل کے بچھو کو اس نے پکڑا تھا، یہ بچھو گروہ کی صورت میں اِدھر اُدھر نقل و حرکت کرتے ہیں۔ یہ گروہ پندرہ سے بیس یا اس سے بھی زیادہ بچھوؤں کی تعداد پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن اسے ابھی ایک ہی بچھو ملا تھا۔ اس کا مطلب تھا یا تو وہ اپنے گروہ سے بچھڑ گیا تھا یا پھر اس کا گروہ یہیں کہیں تھا اور یہ بات خطرناک تھی۔ یہ بچھو تعداد میں اتنے تھے کہ انہیں نقصان پہنچا سکتے تھے۔ ان کا جلد از جلد مل جانا اور پکڑا جانا ضروری تھا۔ وہ ایک خاص سمت متعین کر کے باقی بچھوؤں کی ٹوہ لینے میں مصروف ہوگئی۔ اسی دوران پچھلی جانب پہرا دیتے اسسٹنٹ بوائے اور دونوں انگریز مسلسل کھڑے کھڑے تھک گئے تو ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ لیکن انجانے قاتل کی دہشت ان پر پوری طرح سوار تھی۔ وہ سو نہیں سکتے تھے مگر اپنی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ دفعتاً انہیں کچھ دور روشنی سی دکھائی دی۔ یہ روشنی کوئی دو تین فرلانگ کے فاصلے پر جھاڑیوں کے پیچھے دکھائی دے رہی تھی۔ ان تینوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"میں طلال وغیرہ کو بتا کے آتا ہوں۔" اسسٹنٹ بوائے ایک دم سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ ہے کیا ورنہ شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔" ایک انگریز سیاح بولا اور ساتھ ہی اپنے ساتھی کو لیے اٹھ کھڑا ہوا تو اسسٹنٹ بھی خاموش ہوگیا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ جھاڑیوں کے پاس پہنچے تو انہیں وہاں ایک فلیش لائٹ پڑی ملی۔ لائٹ آن تھی اور اسی کی روشنی نے انہیں متوجہ کیا تھا۔ اسسٹنٹ نے لائٹ اٹھالی لیکن سوال بڑا واضح تھا کہ یہ لائٹ یہاں آئی کیسے اور پھر آن کس نے کی۔

"یار واپس چلتے ہیں، مجھے تو خطرے کی بُو آرہی ہے۔" ایک سیاح بولا۔

"ضروری نہیں کہ خطرہ ہی ہو، ہوسکتا ہے کسی کو ہماری مدد کی ضرورت ہو آؤ دیکھتے ہیں۔" اسسٹنٹ نے لائٹ کو خالی جھاڑیوں پر دوبارہ مارتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی ٹریپ بھی ہوسکتا ہے، میں تو نہیں جارہا۔" پہلے والا بولا اور ساتھ ہی واپسی کے لیے چل پڑا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ تیورا کر گر پڑا۔ اسسٹنٹ نے تیزی سے فلیش لائٹ کا رخ اس کی طرف کیا تو ایک خنجر گرنے والے کی گردن کے آر پار نظر آیا وہ بے چارہ تڑپ بھی نہیں سکا تھا۔ ان دونوں نے سہم کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اسسٹنٹ بوائے نے لائٹ چاروں طرف گھمانی شروع کر دی۔ اس کے منہ سے دہشت کی بدولت کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ یہی حالت دوسرے کی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی کمر سے کمر لگائے آہستہ آہستہ گھومتے ہوئے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ موت کا تنگ ہوتا دائرہ انہیں اپنے چاروں طرف محسوس ہو رہا تھا۔ ان کے حواس جیسے ساتھ چھوڑنے لگے۔

"ک...... کون ہو تم...... بس ...... سامنے آؤ۔" اسسٹنٹ ہکلاتے ہوئے بولا لیکن جواب میں ایک سنسناتی ہوئی گولی اس کی پیشانی کے عین درمیان آ گھسی۔ گرتے ہوئے اسے بس ایک پستول والا ہاتھ نظر آیا۔ اس کے بعد کا ہر منظر دھندلا گیا تھا۔ سیاح انگریز نے بھی پستول دیکھ لیا تھا۔ پستول کا رخ اوپر کی جانب تھا لیکن اسے پتا تھا کہ وہ اس پستول کا اگلا شکار ہے الٹے قدموں پیچھے کو بھاگا لیکن پستول والے ہاتھ نے اسے زیادہ دور نہ جانے دیا تھا۔ ٹھاہ کی دوسری آواز نے جہاں اسے گرا دیا وہیں گولیوں کی آواز پر بھاگتے قدموں کی آواز اور لڑکیوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ خون کا ایک فوارہ سا اس کے سینے سے پھوٹ پڑا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ خون کے پریشر کو روکنے کے لیے سینے پر رکھا۔ پستول والا ہاتھ اپنے وجود سمیت اس کے عین سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنی بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھول کر آنے والے کو دیکھا۔ قاتل نے ایک اور فائر کیا اور غائب ہوگیا۔ بالآخر وہ قاتل کو پہچان چکا تھا۔ بغیر کسی ماسک کے وہ

چہرہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا مگر اس کے پاس وقت ختم ہو گیا تھا۔ طلال پوری رفتار سے دوڑتا ہوا اس تک پہنچا تھا۔ اس نے ایک ڈوبتی نظر اس پر ڈالی اور اشارے سے اسے کچھ بتانے کی کوشش کی مگر موت نے اسے مزید مہلت نہ دی اور اس کا اٹھا ہوا سر ایک سائڈ کو ڈھلک گیا۔

☆☆☆

ایک مرتبہ پھر سب کمرے میں اکٹھے ہو چکے تھے لیکن ڈرائیور اور اس کے ساتھی لاپتا تھے۔ قریبی کسی جگہ پر بھی ان کے آثار نہ ملے تو یہی فرض کر لیا گیا کہ یا تو وہ قاتل کے ہاتھ لگ گئے تھے یا پھر قاتل کے خوف سے فرار ہو گئے تھے۔ دوسرا خیال دل کو زیادہ لگتا تھا۔ یہ علاقہ ان لوگوں کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ یقیناً اپنے تحفظ کی خاطر بھاگ گئے تھے۔ حالات لحہ بہ لحہ قاتل کے حق میں ہو رہے تھے۔ جب سے طلال اندر آیا تھا، مسلسل کسی سوچ میں گم تھا۔ مرنے والا اسے اشارے سے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شاید قاتل کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا، وہ قاتل کو جانتا تھا اور اسے بھی بتانے کی کوشش کر رہا تھا اور اگر وہ قاتل کو جان چکا تھا تو اس کا مطلب تھا قاتل ان کے بیچ ہی ہے ورنہ وہ اسے بتانے کی کوشش نہ کرتا۔ قاتل ان کے درمیان ہی تھا تو وہ کون ہو سکتا ہے؟ مرنے والے نے اپنی انگلیاں اوپر نیچے کیں اور پھر انہیں گھما کر اسے کچھ بتانے کی کوشش کی تھی۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا لیکن اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اور بچ جاتا تو انہیں پتا چل جاتا کہ قاتل کون ہے۔ طلال نے سب کے چہروں پر ایک تفصیلی نظر ڈالی لیکن ؛ سے کم از کم ان میں سے کوئی قاتل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سب کے سب نہایت سہمے اور ڈرے ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں سے قتل کی توقع کیسے کی جاسکتی تھی۔

وہ انہی خیالوں میں ڈوبا تھا جب سرخ بالوں والی اچانک اپنی جگہ سے اچھلی۔ وہ بری طرح اپنے لباس کو جھاڑ رہی تھی۔ جیسے اس پر کوئی خطرناک چیز چڑھ گئی ہو اور وہ اسے جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے۔ وہ اپنی شرٹ سے چپکی چیز کو ہاتھ سے جھٹک رہی تھی مگر پھر ایک ''سی'' کی تیز آواز اس کے منہ سے نکلی۔ بڑی تکلیف میں اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا جھٹکنے والا ہاتھ تھاما۔ ایشل تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور اس کے ہاتھ کو پکڑ کر دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ کی پشت پر ایک چھوٹا سا سرخ دھبا دیکھا تو جلدی سے اپنا بیگ اتار کر اس میں سے اپنا ایک اسکارف نکالا۔ اسکارف کو اس کی کلائی پر اچھی طرح باندھ کر وہ پیچھے ہٹی تو مشعل اور طلال بھی اس کے پاس آ گئے۔

''کیا ہوا ہے اس کو؟''

''ایک زہریلے بچھو نے کاٹ لیا ہے۔ میں نے کلائی زور سے باندھ دی ہے فی الوقت زہر یہیں رکا رہے گا لیکن اگر زہر نکالا نہ گیا تو کچھ گھنٹوں میں اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔'' وہ قدرے فکر سے بولی اور ساتھ ہی کمرے کے فرش پر گرے بچھو کو ڈھونڈنے لگی۔ ''یہ اس علاقے کا سب سے خطرناک بچھو ہے۔'' اس کی نظریں تیزی سے بچھو کو ڈھونڈ رہی تھیں جبکہ علینہ سخت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

مشعل نے بڑے غور سے لڑکی کے ہاتھ کا جائزہ لیا۔ سرخ بالوں والی بے پناہ تکلیف کے باعث رو رہی تھی۔ اوپر سے ایشل فاسٹر نے جو امکانات بغیر کسی لحاظ سے بتائے تھے اسے فکر میں ڈالے ہوئے تھے۔

''پلیز کچھ کرو......'' وہ مشعل سے التجا کرتے ہوئے بولی۔ ''تم تو ڈاکٹر ہو نا مجھے بچالو پلیز۔''

''یہ بچھو یہاں کہاں سے آگیا۔'' کم پریشان لہجے میں اپنی گرل فرینڈ کے پاس کھڑا تھا۔

''میں نے بتایا نا یہ اس علاقے کا خطرناک بچھو ہے، تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک بچھو کچن میں بھی دیکھا تھا۔''

''جسے تم نے خاموشی سے پکڑ لیا اور اب چھوڑ دیا تاکہ وہ مر جائے۔'' علینہ ایک دم سے مس ایشل کی بات کاٹ کر بولی تو سب حیران نظروں سے ان دونوں کو دیکھنے لگے۔

''میں تمہارا کھیل سمجھ چکی ہوں، دمے کی مریضہ کا اِن ہیلر غائب ہو جانا، ٹائروں کی ہوا کا نکل جانا اور اب یہ بچھو یہ سب کیا ہے کچن میں جب یہ بچھو پکڑ رہی میں نے اسے دیکھ لیا تھا اس نے بچھو اپنے بیگ میں بند کر کے ڈال لیا تھا۔ اس کے بیگ کی تلاشی لے لو مجھے سو فیصد یقین ہے یہ وہی بچھو ہے۔''

علینہ کے انکشاف پر بلیک مین نے تیزی سے بڑھ کر مس ایشل فاسٹر کا بیگ جبراً اس کے کندھے سے اتارا۔ اس کے بیگ سے واقعی کوئی بچھو برآمد نہیں ہوا تو علینہ معنی خیز انداز میں ہنستی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔

''تو تم ہو وہ قاتل ...... یا پھر قاتل کی ساتھی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استہزائیہ انداز میں بولی تو مس ایشل فاسٹر جیسے بھڑک اٹھی۔

''اپنی بکواس بند کرو، ہم پہلے ہی قاتل کی وجہ سے پریشان ہیں اور تم ایک نئی کہانی سنانے لگی ہو۔''

''یہ کہانی نہیں ہے ڈارلنگ حقیقت ہے۔ ایک تلخ سچ، ٹائروں کی ہوا کسی جن کی کارستانی نہیں ہے نہ ہی کسی انجانے

قاتل کو یہ علم تھا کہ ہمارے بیچ کوئی دمے کی مریضہ ہے۔ یہ صرف تمہیں پتا تھا کیونکہ ہمارا ریکارڈ تمہارے پاس تھا، تم نے بڑے ٹائم پر سچویشن سے فائدہ اٹھایا اور وہ بے چاری اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی، اس کا ساتھی باہر قتل کر رہا ہے اور یہ اندر بیٹھی آرام سے مار رہی ہے اور ایک ہم بے وقوف ہیں ہمارے درمیان قاتل ہے اور ہم اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔'' علینہ خاموش ہوئی تو بلیک مین نے ایک زور کا تھپڑ مس ایشل کے گال پر رسید کیا اور اس کے بازوؤں کو پیچھے کی طرف سے جکڑ لیا۔ باقی سب منہ اٹھائے انہیں دیکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ سرخ بالوں والی بھی اپنی تکلیف وقتی طور پر بھلائے مس ایشل کو حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی جبکہ مس ایشل کا منہ ایک تو تھپڑ سے دوسرا توہین کے باعث سرخ ہو رہا تھا۔

''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میرا کسی معاملے سے کوئی تعلق نہیں، میں ایسی کسی گھٹیا حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''مس ایشل فاسٹر کچن سے بچھو آپ نے پکڑا تھا؟'' طلال دوٹوک لہجے میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''ہاں، میں نے پکڑا تھا مگر......''

''پکڑا تھا تو اس کے بارے میں بتایا کیوں نہیں؟'' وہ مسلسل اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''سب پہلے ہی پریشان تھے اس لیے میں نے نہیں بتایا اور خود ہی بچھو کے باقی ماندہ ساتھیوں کو ڈھونڈنے لگی کیونکہ یہ گروہ کی صورت میں سفر کرتے ہیں، میں ڈھونڈ ہی رہی تھی......''

''جب باہر تمہارے ساتھی نے ان تینوں کو مار دیا۔'' علینہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''تم اپنی زبان بند کرو تو بہتر ہوگا۔''

''چلو تم اپنی زبان کھول دو اور بتاؤ تمہارے بقیہ ساتھی کہاں ہیں بلکہ میرا خیال ہے ڈرائیور اور باقی لوگ ہی تمہارے معاون ہوں گے اسی لیے فی الوقت غائب ہو گئے ہیں۔'' کم اس کے بالوں کو جکڑ کر غصے سے بولا تو تکلیف کی شدت سے وہ بلبلانے لگی۔ حالات ہی کچھ ایسا رخ اختیار کیے ہوئے تھے کہ قاتل کے ہاتھ لگتے ہی وہ اس کی لمحوں میں تکا بوٹی کر دیتے، ایسے میں مس ایشل فاسٹر کا مشکوک ہونا انہیں بھڑکا رہا تھا۔

''میں بتا رہی ہوں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، عملے کے لوگ مر چکے ہیں یا بھاگ گئے ہیں، میں یہ بھی نہیں جانتی۔ میرا یقین کرو میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں پچھلے سات سالوں سے میں اپنے ساتھ سیاحوں کو لاتی لے جاتی رہی ہوں، میرا ریکارڈ چیک کر لو بے داغ ہے۔''

''نہیں مس ایشل فاسٹر تمہارا ریکارڈ بے داغ نہیں ہے۔ پانچ سال سے پہلے تک تم ہو سکتا ہے ٹھیک رہی ہو لیکن پچھلے پانچ سالوں میں تم بہت بدل چکی ہو۔'' علینہ مسلسل انکشافات کر رہی تھی۔ بولتے ہوئے وہ اس کے بیگ کی طرف بڑھی۔ بیگ کے ایک بظاہر نظر نہ آنے والے حصے کو اس نے کھولا اور اس میں سے چند تصویریں نکال کر اس نے طلال کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔ تصویریں دیکھ کر طلال کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کم نے اس سے ... کر تصویریں دیکھیں اور پھر باری باری سب ہی نے تصویریں دیکھیں تو نفرت سے مس ایشل کو دیکھنے لگے۔ یہ چند لاشوں کی تصویریں تھیں۔

''جیسا آپ لوگ سمجھ رہے ہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔'' وہ سب کے تاثرات کو دیکھ کر بے اختیار چلائی تھی۔

''اسے باندھ دو تاکہ یہ مزید کوئی حرکت نہ کر سکے۔'' مشعل نے بلیک مین کو کہا تو تھوڑی سی جدوجہد سے مس ایشل کو ایک کرسی سے باندھ دیا گیا۔

''میرا دل چاہ رہا ہے تمہاری گردن بھی بالکل اسی طرح کاٹوں جیسی تم نے باقی بے گناہ لوگوں کی کاٹی تھی۔'' کم نے غصے سے ہاتھ میں پکڑے زنگ آلود چاقو کا رخ اس کی گردن کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''پلیز، میری بات سن لو، تم لوگ غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو، یہ قتل میں نے نہیں کیے ہیں۔'' مس ایشل حالات کو اپنے گردتنگ دیکھ کر بے اختیار چلانے لگی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے کی اس کی اکڑ ایک دم سے غائب ہو گئی تھی۔

''پلیز طلال تم تو میرا یقین کرو۔'' وہ بلکتی ہوئی طلال کو دیکھ کر پُرامید نظروں سے بولی۔

''طلال کو مزید رجھانا بھول جاؤ تم اب۔'' مشعل اونچی آواز میں بولی۔

''ہمیں اسے سن لینا چاہیے، وہ بندھ چکی ہے اب کیا کر سکتی ہے۔'' طلال بولا تو وہ تشکر سے اسے دیکھنے لگی۔

''پانچ سال پہلے میری شادی ہوئی تھی ولیم سے۔'' وہ اپنی کہانی شروع کرتے ہوئے بولی۔ ''ہم دونوں خوش تھے۔ میں لوگوں کو اس علاقے میں تفریح کے لیے لاتی تھی۔ شادی کے بعد ولیم کو بھی راضی کیا کہ ہنی مون یہیں منائیں گے مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ ہماری بدقسمتی ہمیں یہاں لا رہی ہے، یہاں کچھ غنڈے ٹائپ لوگ ہمارے پیچھے لگ گئے۔ میں نیم

لیڈر تھی لیکن وہ مجھے حاصل کرنا چاہتے تھے جب میں نے ان کو لفٹ نہ کرائی تو انہوں نے اسی طرح ایک تفریحی دن میں ہمیں اکیلے میں گھیر لیا۔ میرے شوہر کے سامنے ہی وہ میرا ریپ کرنے لگے تو غصے سے بھڑک کر اس نے ان چاروں بدمعاشوں پر فائر کھول دیا۔ ان میں سے ایک بدمعاش نے مرتے مرتے میرے شوہر کو گولی ماردی۔'' وہ بات کرتے ہوئے بے اختیار رودی۔

''مجھے بچاتے ہوئے وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، مجھے تبھی مرجانا چاہیے تھا لیکن شاید آج کی ذلت دیکھنے کے لیے میں زندہ رہی۔'' وہ سسک رہی تھی۔ ''یہ تصویریں میں نے ہی اتاری تھیں اپنے شوہر کی آخری یادگار کے طور پر اور انہیں میں ہمیشہ ساتھ ہی رکھتی ہوں۔ جب اس علاقے میں آتی ہوں اس جگہ پھول رکھتی ہوں جہاں ولیم نے مجھے بچاتے ہوئے اپنی جان نچھاور کردی۔''

''اپنی جھوٹی کہانی سے تم کم از کم ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔'' علینہ سپاٹ لہجے میں بولی تو سب الجھ سے گئے۔ اس کی کہانی سچی لگ رہی تھی لیکن حالات اس کے حق میں ہموار نہیں ہو رہے تھے۔

''اب قاتل ہاتھ آگئی ہے تو پلیز میرے ہاتھ کا کچھ کرو، یہ تکلیف اب میری برداشت سے باہر ہے۔'' سرخ بالوں والی بے چارگی سے بولی تو مشعل نے اٹھ کر پھر اس کے ہاتھ کا جائزہ لیا۔

''ہاتھ کو کاٹنا پڑے گا۔'' وہ تفصیلاً جائزہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے بولی تو سرخ بالوں والی خوف سے سر کو نفی میں ہلانے لگی۔

''کچھ دیر تک ہاتھ کو نہ کاٹا تو زہر اس کی جان لے لے گا۔'' مشعل کا لہجہ سرد تھا۔

''نہیں، پلیز تم کچھ سوچو میں...... میں اپنا ہاتھ نہیں کٹواؤں گی۔'' وہ بم کو دیکھ کر روتے ہوئے بولی۔ بم خود اس سچویشن پر پریشان تھا۔

''کوئی اور حل تو ہوگا۔'' بم امید سے مشعل کو دیکھ کر بولا۔

''جب وہ کہہ چکی ہے کہ ہاتھ کٹے گا تو ہاتھ ہی کٹے گا نا تمہیں سمجھ نہیں آرہا؟'' ڈیوڈ قدرے جھنجلاتا ہوا بولا تو طلال نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اپنا لیپ ٹاپ اچھی طرح بند کر کے بیگ میں ٹھونس رہا تھا۔ ایک دم ہی طلال کے ذہن میں جیسے بجلی سی کوندی۔ اسے جیسے کچھ یاد آنے لگا۔ مرنے والا اسے انگلیوں کے اشارے سے یقیناً لیپ ٹاپ کے بارے میں ہی بتا رہا تھا پھر اس کا اپنی انگلی کو گول گھما کر دکھانا بھی اسے سمجھ میں آگیا۔ طلال نے غور سے ڈیوڈ کے چہرے کا جائزہ لیا تو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا اور اس کی آنکھوں پر لگی گول فریم والی عینک اتار لی۔ مرنے والا اسے یہی سمجھا رہا تھا۔ ڈیوڈ ہی وہ قاتل تھا جس کی انگلیاں ہر وقت اوپر نیچے ہوتیں۔ لیپ ٹاپ پر چلتی رہتی تھیں اور صرف اس کی آنکھوں پر گول فریم والی مضحکہ خیز عینک تھی۔

☆☆☆

''یہ کیا حرکت ہے؟'' ڈیوڈ غصے سے بولا تو طلال نے اسے زور کا ایک تھپڑ دے مارا اور اسے کالر سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

''یہی ہے وہ سور کا بچہ جس نے مارا ہے سب کو۔'' وہ نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھتا اور رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔

''م...... میں...... میں کیوں ماروں گا، جھ...... جھوٹ بول رہے ہو تم۔'' ڈیوڈ ہکلاتے ہوئے بولا تو طلال نے زور سے اس کا سر دیوار سے دے مارا۔

''یہی ہے وہ قاتل...... میرا دل چاہ رہا ہے تمہیں ایک گڑھے میں گردن تک دفن کروں اور تمہارا سر مار مار کر کچل دوں۔''

''تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟'' مشعل بولی۔

''مرنے والا وہ سیاح مجھے اس کے بارے میں بتا رہا تھا تب مجھے سمجھ نہیں آئی لیکن اب سمجھ گیا ہوں، تم دونوں لڑکیاں اپنے ساتھ آستین کے سانپ کو لیے پھر رہی ہو۔'' وہ بات کرتے کرتے مشعل کی طرف متوجہ ہوا تو جیسے بوکھلا گیا۔ مشعل اور علینہ دونوں کے ہاتھ میں تیز دھاردار خنجر تھے۔ مشعل سرخ بالوں والی کو اور علینہ ایک اور انگریز لڑکی کو پکڑے کھڑی تھی۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''بڑے ٹائم سے سمجھ میں آئی ہے بات تم کو پچو بوائے۔'' مشعل خنجر لڑکی کی گردن سے لگائے آرام سے بولی۔ ''لیکن تھوڑا لیٹ ہو گئے، یہ آستین کا سانپ ہمارا پالا ہوا ہے، اسے چھوڑ دو۔'' وہ ڈیوڈ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ مس ایشل فاسٹر کو قاتل سمجھ کے باندھ کر اپنی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے لیکن ان کے درمیان تین تین قاتل کھڑے تھے جن کو قاتل ماننے کو اب بھی عقل تیار نہ تھی۔ ڈیوڈ کو جیسے ہی طلال نے چھوڑا اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا پستول نکال کر اب وہ اسی

پرتانے کھڑا تھا۔ طلال کے ہاتھ سے اپنی گول فریم والی عینک لے کر وہ اسے دور پھینک چکا تھا اور باقیوں کو بتا چکا تھا کہ عینک اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بس اس بھیس کا ایک حصہ تھا جو اُن تینوں نے بدلا ہوا تھا مگر اب اپنی اصلی شکلوں کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔ علینہ کے قہقہے تو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''بہت مزہ آرہا ہے مشعل۔'' وہ ہنسی کو بمشکل کنٹرول کرتے ہوئے مشعل سے بولی۔

''ہاں واقعی اس ٹرپ میں زیادہ مزہ آیا۔ پچھلے سال فرانس والے ٹرپ میں تو آدھے لوگ بچ گئے تھے لیکن یہ پہلی مرتبہ ہے کہ ہم ہاتھ لگے سب لوگوں کو آرام سے مار سکیں گے۔'' مشعل اپنی زبان ہونٹوں پر پھیر کر شیطانی قہقہہ لگاتے ہوئے طلال کو آنکھ مار کر بولی تو طلال نے غصے سے اپنی ٹانگ قریب کھڑے ڈیوڈ کے پستول والے ہاتھ پر ماری تو پستول لہراتا ہوا دور جا گرا جہاں پستول گرا وہاں مس ایشل فاسٹر بندھی بیٹھی تھی۔

''اسٹاپ دس مسٹر طلال! اب مزید کوئی حرکت کی تو اس لڑکی کو چھوڑوں گی نہیں۔'' علینہ دھمکاتے ہوئے بولی تو طلال ایک نفرت بھری نظر اس پر ڈال کر رہ گیا۔

''سب سے پہلے ڈیوڈ اسے باندھو پھر باقیوں کو باندھیں گے۔ اس کا خون کچھ زیادہ ہی گرم ہے۔'' وہ بولی تو ڈیوڈ نے آگے بڑھ کر اسے مضبوطی سے ایک کرسی سے باندھ دیا۔ مزید آدھے گھنٹے تک وہ سب کو باندھ کر فارغ ہو چکے تھے۔ ایک انگریز لڑکی نے تھوڑی مزاحمت دکھائی تو علینہ نے سفاکی سے اس کی شہ رگ پر خنجر پھیر دیا اور ایک جھٹکے سے اسے دور پھینک دیا۔

''یہ خوب صورت نظارہ تم سب کے لیے۔'' تڑپتی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے علینہ قدرے مسکراتے ہوئے بولی تو سب نے منہ پھیر لیے۔ وہ لڑکی ان کی نظروں کے سامنے پھڑک پھڑک کے دم توڑ گئی لیکن وہ بے بسی سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

''تم لوگ جانور ہو انسان نہیں۔'' بلیک مین غصے سے دہاڑا۔

''او...... کالے کو جوش آرہا ہے۔'' ڈیوڈ اپنا پستول اس کے ماتھے پر لگا کر بولا۔

طلال نے غصے سے نتھنے پھلا کر ڈیوڈ کو دیکھا۔ یہ کچھ دیر پہلے والے ڈرے سہمے ڈیوڈ کی شکل لگ ہی نہیں رہی تھی۔ گول فریم والے عدسوں نے اس کی آنکھوں کی سفاکیت کو ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ اب سافٹ ویئر انجینئر لگ ہی نہیں رہا تھا۔ پتا چل رہا تھا کہ وہ کئی قتل کر چکا ہے اور سافٹ نیس اسے چھو کر بھی نہیں گزری۔

''اگر تم نے اِسے مارا تو میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔'' طلال غصے سے بولا۔

''چھوڑو گے تب نا جب پکڑو گے اور یہ حسرت اپنے دل میں لیے تم اوپر پہنچو گے۔''

''تم لوگ واقعی انسان کہلوانے کے حق دار نہیں ہو۔'' بکم نفرت سے بولا۔

''نہ...... نہ ایسے مت کہو ہم معاشرے کے بڑے معزز انسان ہیں، مشعل ڈاکٹر ہے سیریس مریضوں کا آپریشن کرتی ہے، علینہ فیشن ڈیزائنر ہے اور اس کے ڈیزائن کردہ ڈریسز کی تعریف ملکہ برطانیہ نے بھی کی ہے رہی میری بات تو عنقریب میں سافٹ ویئر کی دنیا میں ایک نیا دھماکا کرنے والا ہوں، مجھے ضرور نوبل پرائز دیا جائے گا اور میں اس دنیا کا مشہور انسان بن جاؤں گا۔''

''گھن آتی ہے تمہارے جیسے بھیڑیے نما انسانوں سے، کون کہتا ہے تم لوگ ڈاکٹر اور انجینئر ہو، تم لوگوں کو تو سولی پر چڑھا دینا چاہیے۔'' مس ایشل بولی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کے بیگ سے بچھو علینہ نے ہی نکالا تھا اور تصویریں دیکھ کر کہانی بھی گھڑ لی تھی۔

''اپنی تقریر بند کرو، تمہاری زبان پر تالا میں لگاؤں گی لیکن ابھی نہیں پہلے تمہارے اس محبوب کو ماروں گی۔ بڑی میٹھی نظروں سے دیکھتا تھا تمہیں۔'' مشعل، طلال کی طرف اشارہ کر کے بولی پھر ہنس دی۔ ''تم کیا سمجھتے ہو مجھے تمہاری خبر نہیں ہے، میں چاہتی تو تمہیں بہت پہلے اسی دن مار دیتی جب میں پہلی رات تمہارے کمرے میں آئی تھی۔ اس رات ہم نے پہلا قتل کیا تھا، نہیں، نہیں زندگی کا پہلا قتل نہیں۔ اس تفریحی دورے کا پہلا قتل۔'' وہ بولی تو طلال کو اپنی کم عقلی پر غصہ آنے لگا۔ اس رات وہ ٹھٹکا تھا لیکن کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''تم صحیح سوچ رہے ہو۔ اُس رات میں تمہیں دیکھ چکی تھی اسی لیے تمہارے کمرے میں آئی، میں تمہیں مارنے آئی تھی لیکن تمہارا جوش تمہارا پیار مجھے اچھا لگا، میں نے سوچا تمہیں آخر میں ماروں گی تب تک تمہاری کمپنی انجوائے کروں گی لیکن میرے ساتھ تو تم ٹائم پاس کرتے رہے ہو تمہارے دل کو تو یہ کمینی بھا گئی تھی۔'' وہ نفرت سے ایشل کو دیکھ کر بولی۔ ایشل کے ہاتھ میں شیشے کا ایک ٹکڑا آ گیا تھا۔ جسے وہ کمالِ

ہم دونوں کیوں لڑیں... غلطی کا فیصلہ اب ہماری بیویاں ہی کریں گی... مزہ آئے گا۔

ہوشیاری سے دبا کر اپنے بندھے ہوئے بازوؤں کی بندشیں کاٹنے میں مصروف تھی لیکن ساتھ ہی وہ کوشش کر رہی تھی کہ ان تینوں کو اس بات کا علم نہ ہو ورنہ وہ سب سے پہلے اسے ہی مارتے۔ ان لوگوں کے پاس جتنے ہتھیار تھے لے لیے گئے تھے اس لیے وہ بے بسی کی تصویر بنے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اب تو سرخ بالوں والی بھی اپنی تکلیف دبائے چپ بیٹھی تھی۔ جانتی تھی بولی تو موت سے پہلے موت آجائے گی۔

☆☆☆

"اب یہ پوچھنا تو حماقت ہے کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو، یقیناً ہمیں مار کر مزے لینا چاہو گے لیکن مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کیوں کرتے ہو ایسا، معاشرے کے اتنے معزز فرد ہو کر ایسی گھناؤنی حرکتیں کیوں؟" طلال افسوس سے بولا۔

"سوال بھی کر رہے ہو جواب بھی جانتے ہو، جب پتا ہے کہ مزہ لیں گے تو کتنا بیکار سوال کر رہے ہو۔" مشعل مرنے والی لڑکی کے کٹے گلے سے رستے خون میں اپنی انگلی ڈبو کر اسے چکھتے ہوئے بولی۔

"ہونہہ...... یہ کسی اچھی نسل کی نہیں ہے۔" وہ علینہ کو دیکھ کر تجزیہ کرتے ہوئے بولی۔ سرخ بالوں والی نے بمشکل اپنی قے روکی تھی۔

"او، تو تمہیں گھن آرہی ہے؟" مشعل اس کے سرخ بالوں کو پکڑ کر زور سے ایک جھٹکا دے کر بولی تو وہ تکلیف سے سسکنے لگی۔

"دل تو چاہ رہا ہے تم لوگوں کو تکلیف دے دے کر مارا جائے مگر ایسا ہے کہ ہمیں اپنے طے شدہ شیڈول کے مطابق واپس جانا ہے، مجھے کچھ ضروری آپریشنز کرنے ہیں۔ میں کام کے وقت انتہائی ذمے دار ڈاکٹر ہوں۔ یہ قتل وغیرہ میں صرف اپنے تفریحی دوروں میں کرتی ہوں۔ جب لوگ اپنے گھروں سے بہت دور ہوتے ہیں اور ہمارے جال میں پھنس کر رو رو کر اپنی زندگی کی بھیک مانگتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں تو اس کا مزہ

ہی بڑھ جاتا ہے، آپریشن تھیٹر میں پہلے سے مرے ہوئے کو کیا مارنا۔'' مشعل اپنی آنکھوں کو سکیڑ کر سرخ بالوں والی پر نظر جما کر آرام سے بولی۔

''تو کام شروع کیا جائے۔'' علینہ نے اجازت طلب نظروں سے اُسے دیکھا۔ بلیک مین کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگی تھیں کیونکہ علینہ اسے بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔

''طلال کو میں ماروں گا، اسٹوپڈ میری ایجاد کا مذاق اُڑاتا رہا ہے حالانکہ میں مذاق بالکل برداشت نہیں کرتا۔'' ڈیوڈ، طلال کے منہ پر ایک زور کا گھونسا مار کر بولا۔

''تم بیمار لوگ ہو، ذہنی بیمار، دماغی مریض ہو، تم لوگوں کو علاج کی ضرورت ہے۔'' بم خوف سے کانپتا ہوا بولا۔

''اچھا تو ہمارا علاج کون کرے گا۔ کسی ڈاکٹر کا نام بتا دو پلیز ورنہ میں مزید بیمار ہو جاؤں گی۔'' مشعل بم کے بازو میں خنجر گھسیڑ کر ہنستے ہوئے بولی تو وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ خون تیزی سے اس کے بازو پر پھیلنے لگا تھا، وہ سب دہشت سے کانپنے لگے۔

''ہمارے جیسے لوگوں کو جینئس کہا جاتا ہے، ہم ہر کام پرفیکٹ کرتے ہیں، چاہے معاملہ آپریشن تھیٹر میں پڑے مریض کا ہو یا کسی کا گلا کاٹنے کا ہو، ہر چیز صفائی سے کرتے ہیں حتیٰ کہ ہماری ایکٹنگ بھی لاجواب ہوتی ہے، کیا تم میں سے کسی کو ذرا سا بھی شک گزرا ہم پر؟'' وہ خنجر سب کی آنکھوں کے سامنے سے گزارتے ہوئے فخریہ بولی۔ ''وہ مرنے والا اشارہ نہ کرتا تو طلال کی اگلی دس نسلوں کو بھی ہم پر شک نہیں ہونا تھا، تم لوگوں کو تو داد دینی چاہیے ہماری لاجواب ذہانت کی۔''

''یہ جو تمہاری آنکھوں میں خوف چھایا ہوا ہے نا آئی لائک دیٹ'' وہ خنجر کی نوک بلیک مین کی دونوں آنکھوں کے درمیانی حصے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''او نو، زیادہ مت ڈرو میں تمہیں ماروں گی نہیں، مجھے بدصورت لوگوں سے نفرت ہے۔ تمہیں علینہ مارے گی اسے سب پسند ہیں بس شرط یہ ہے وہ مرد ہوں۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے علینہ کو آنکھ مار کر بولی۔ جواباً وہ بھی مسکرا دی۔ طلال غصے سے انہیں دیکھنے لگا۔

''اتنا غصہ ٹھیک نہیں بڈی، میں برداشت نہیں کرتی۔ وہ کمینہ کولن ٹیڈ یاد ہے، اس کی قسمت اچھی تھی جو بچ گیا، مارنے تو میں اسی کو نکلی تھی مگر شراب پی کے نجانے کہاں گھس گیا۔ غصے میں اس کے دوستوں کو مار آئی۔ مگر چھوڑوں گی نہیں اس کو میرے ہی شہر کا ہے جا کے اس سے بھی حساب برابر کروں گی۔'' وہ طلال کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولی تو سب کو ایک بار پھر جھرجھری سی آگئی۔

''اب تک کتنوں کو مار چکے ہو تم لوگ؟'' ایشل انہیں باتوں میں الجھانے کی غرض سے بولی۔

''فہرست لمبی ہے۔'' وہ میکانکی انداز میں بولی۔ ''ان میں کئی لوگوں کا قتل تو میں نے اکیلی نے کیا ہے۔ باقی علینہ کا شکار ہوئے بس آخری تین لوگوں کو ڈیوڈ نے مارا ہے تھوڑا نیا ہے کام ابھی زیادہ صفائی سے نہیں کرتا اسی لیے طلال کو شک ہو گیا۔ یہ ابھی صرف پستول چلانا جانتا ہے آج ہم اسے گردن کاٹنا بھی سکھائیں گے۔''

''پہلے ہم نے سوچا تھا تمہیں بھی اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں لیکن تم ہمارے ٹائپ نہیں ہو، تمہیں صرف لڑکیوں کو رجھانا اور ان کے ساتھ سونا آتا ہے۔'' وہ طلال کے سینے پر ایک نپا تلا پنچ مار کر بولی تو تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''آج تو جناب لیڈر بنا ہوا تھا لوگوں کا۔'' علینہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔

''تو تمہیں اس کی نارمل ذہنی حالت پر اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے۔'' ایشل فاسٹر بولی تو اس نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر دے مارا۔ مس ایشل کا ہونٹ پھٹ گیا اور اس سے خون نکلنے لگا۔

''تو تم سمجھتے ہو خود کو اعلیٰ...... مطلب نارمل، ہونہہ۔'' اس کا انداز سنکیوں جیسا لگ رہا تھا۔ ''میں ان نارمل لوگوں کے دماغ کا بھرتا بناؤں گی اور اس بھرتے کو تین دن ناشتے میں لوں گی، سنا علینہ تم نے۔'' وہ سفاکی سے بولی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے مس ایشل کی بات پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ وہ یقیناً ردعمل میں کچھ کرنے کا ہی سوچ رہی تھی۔

''صبح اٹھنا، ناشتا کرنا، آفس جانا، وہاں سے آنا، پھر کھانا کھانا، شام کو کسی حسینہ کو بانہوں کے حصار میں کسی ریسٹورنٹ یا کلب میں لے جا کر آدھی رات تک تفریح کرنا اور بس، تم لوگ واقعی بہت نارمل ہو۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

اسے دیکھ کر انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ عنقریب بھیانک موت کا شکار ہونے والے ہیں۔ قاتل سامنے کھڑے تھے ایسے قاتل جو جان لینے کا کسی تھرل کی طرح مزہ لیتے تھے۔ وہ قتل اپنی ذہنی تفریح کے لیے کرتے تھے۔ ان سے آسان موت کی توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ مشعل آہستگی سے چلتی ہوئی طلال کے پاس آئی۔ اس کی گردن پر

خنجر کی نوک رکھی اور ایک ہلکی سی خون کی لکیر کھینچتی چلی گئی۔ تکلیف سے طلال کے جبڑے بھینچ گئے۔

''تمہیں ماروں گی نہیں صرف چکھوں گی۔'' وہ اس کا خون چکھتے ہوئے آرام سے بولی۔ ''مارے گا تمہیں ڈیوڈ، واؤ یہ مزے کا ہے۔'' وہ ایک مرتبہ پھر اپنی انگلی اس کی گردن سے رستے خون میں ڈبو کر بولی۔ طلال نے اس کے منہ پر غصے سے تھوک دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ غصے سے کوئی کارروائی کرتی، باہر سے دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ سب کے چہرے غیبی مدد سے کھل اٹھے۔ آنے والی پولیس تھی جن کے ساتھ غائب ہونے والا ڈرائیور اور اس کا عملہ تھا۔

☆☆☆

''جہاں ہو وہیں رک جاؤ، ورنہ میں گولی چلانے سے دریغ نہیں کروں گا۔'' ڈیوڈ پستول طلال کے ماتھے سے لگا کر بولا۔ یہ پولیس کے سات آٹھ سپاہی تھے جو اپنی اپنی جگہوں پر رک گئے۔

''ہونہہ...... تو غدارو...... تم لوگ اسی لیے فرار ہوئے تھے۔'' مشعل غصے سے ڈرائیور کو دیکھ کر بولی جبکہ وہ لوگ ابھی تک حیرانی کی زد میں تھے۔ یہاں سے وہ لوگ فرار ہی ہوئے تھے لیکن پھر راستے میں پولیس کی مدد مل گئی تو ناچار ان کو پولیس کے ساتھ یہاں واپس آنا پڑا۔ مگر کاٹیج کے اندرونی حالات کی انہیں خبر نہیں تھی۔ قطعاً توقع نہیں کر رہے تھے کہ قاتل ان کے اپنے ہی ساتھی ہیں۔

مس ایشل نے پاس کھڑی مشعل کو زور کی لات ماری۔ اپنے بازوؤں کو وہ آزاد کروا چکی تھی۔ تیزی سے اپنی رسیاں کھول کر اٹھتے ہی اس نے سنبھلنے سے پہلے دوسری لات ڈیوڈ کے پستول والے ہاتھ پر ماری۔ پولیس کے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی، وہ تیزی سے حرکت میں آئے اور تینوں کو اپنی حراست میں لے لیا۔ ڈرائیور اور اس کا عملہ جلدی سے سب کو بندشوں سے آزاد کرنے لگا۔ آزاد ہوتے ہی طلال نے اتنے زور کا تھپڑ مشعل کے منہ پر مارا کہ اس کی انگلیوں کے نشان چہرے پر ثبت ہو گئے۔

''یہ اُس سفاک لڑکی کے منہ پر مارا ہے جس کے ساتھ میں نے ٹائم گزارا اور اس کی درندگی کو جان نہ پایا۔'' وہ بے پناہ نفرت سے بولا تھا۔

پولیس کے ہاتھ لگتے ہی وہ تینوں بھیگی بلی بن چکے تھے۔

اگلے چند گھنٹوں بعد وہ سب لوگ بلور بن پہنچ چکے تھے۔ سرخ بالوں والی کم کی محبوبہ کو ڈاکٹروں نے بڑی مشکل سے بچایا تھا۔ باقی زخمیوں کو بھی طبی امداد مل گئی۔

یہ اگلے دن کا منظر تھا جب باقی ماندہ سیاح واپسی کے لیے ائرپورٹ پر کھڑے تھے۔ مس ایشل فاسٹر انہیں الوداع کہنے آئی تھی۔ آسمانی رنگ کے سوٹ میں اپنے کھلے بالوں کو ہلکا سا باندھے وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے موتیوں جیسے دانت سرخ لپ اسٹک لگے ہونٹوں کی قید میں چمک رہے تھے۔ بلاشبہ وہ چاہے جانے کے قابل تھی۔

''تو کیا میں تمہارا انتظار کروں اگلے ہفتے اپنی شادی پر جو دلہن کے بغیر یقیناً نہیں ہو سکتی۔'' وہ معنی خیز نظروں سے اس کے دلکش سراپا کو دیکھ کر بولا تو وہ مسکرا اٹھی۔

''دلہن ضرور آئے گی۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر یقین سے بولی۔

''تھینک یو سوچ فاسٹر۔''

''فاسٹر نہیں ایشل...... جسٹ ایشل۔'' وہ مسکراتے ہوئے پُریقین لہجے میں بولی۔ طلال نے اُسے خود سے لپٹا لیا۔ کم وغیرہ تالیاں بجانے لگے۔ اپنی مرضی سے مذہب بدلنے والی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے اصل کو پہچان چکی ہے اب بار بار مذہب اور نام نہیں بدلے گی۔

جہاز نے جیسے ہی پرواز شروع کی سرخ بالوں والی نے ایک طویل سانس اپنے لبوں سے خارج کی۔

''کم مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ اتنے معزز پیشوں سے وابستہ لوگ بھی قاتل ہو سکتے ہیں، وہ بھی اتنے سفاک۔'' وہ ایک جھرجھری سی لے کر بولی۔ قاتلوں کی دہشت ابھی تک اس کے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔

''بات ذہنی اعتدال کی ہے۔ ذہنی توازن جب تک صحیح رہے سب نظام ٹھیک چلتا ہے جہاں پر بگڑ جائے تو سب ایب نارمل ہو جاتا ہے اور ایب نارمل لوگوں سے کچھ بھی توقع کی جا سکتی ہے چاہے وہ بہت ہی کم عقل ہوں یا پھر حد سے زیادہ عقل مند۔ ہمارے اردگرد ایسے بے شمار لوگ ہوتے ہیں جو بظاہر بڑی نارمل زندگی گزارتے نظر آرہے ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ کتنے ایب نارمل ہوتے ہیں یہ وہی بتا سکتا ہے جو اُن کا شکار ہوتا ہے۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''اور ہر شکار ہماری طرح خوش قسمت نہیں ہوتا کہ بچ جائے۔'' وہ اس کے کندھے پر سر ٹکا کر بولی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

قزاق اجل

سلیم فاروقی

خودغرضی سے جو بھی داؤ کھیلا جائے، وہ الٹا ہی پڑتا ہے... یک ایسی ہی تکون جس کے تینوں زاویے خودغرضی... بے حسی اور بے وفائی کی بنیاد پر کھڑے تھے... ان تینوں پر عجیب کیفیت طاری تھی... جذبات و بے حسی کے طوفانوں نے اندر باہر کھلبلی مچا دی تھی... یاد تھا تو صرف اپنا مفاد... اپنی خواہشات کا بے ہنگم ریلا... سُرور اور بدمستی نے ہر رشتے اور ناتے کو جھنجوڑ کر تار تار کر دیا تھا... اجل کی تکون تھی... جو صرف جان لینے کے درپے تھی...

میڈیا کی دنیا سے تعلق رکھنے والے گروہ کی رنگ باز

حیلہ سازیاں...... سرورق کی تیزرفتار کہانی

''دیکھو کھانا وقت پر کھانا اور رات کو دیر تک جاگنا مت۔'' شمسہ نے کئی دفعہ کی دی ہوئی ہدایات ایک مرتبہ پھر دہرائیں۔

''ہوم ورک وقت پر کرنا، رات کو سونے سے پہلے دانتوں میں برش ضرور کرنا اور باہر نکلتے وقت گرم کپڑے پہننا مت بھولنا۔'' فرحان نے ہنس کر اُس کے جملے میں اضافہ کیا۔

شمسہ منہ بنا کر بولی۔ ''ایک تو تم ہر بات مذاق میں ٹال دیتے ہو۔''

''میں مذاق بالکل نہیں کر رہا ہوں۔'' فرحان مسکرایا۔ ''میں نے تمہاری یہ ہدایات گزشتہ تین چار دن میں اتنی دفعہ سنی ہیں کہ مجھے ازبر ہو گئی ہیں۔''

''بھابی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' جاوید نے کہا۔ پھر وہ شمسہ سے مخاطب ہوا۔ ''بھابی، سب سے اہم بات تو آپ اِسے بتانا ہی بھول گئیں کہ سگریٹ کم پینا اور وہاں کسی بار کے

نزدیک سے بھی مت گزرنا۔"

فرحان نے گھور کر جاوید کو دیکھا، پھر بولا۔ "تم لوگ شمسہ کو سمجھانے کے بجائے اسے میرے خلاف بھڑکا رہے ہو؟"

"ہرگز نہیں۔" شیراز نے کہا۔ "ہم تو بھابی کو وہ نکات یاد دلا رہے ہیں جو وہ بھولی ہوئی ہیں۔"

"ایسا نہ ہو کہ میں بھی تمہیں کچھ پرانی باتیں یاد دلاؤں اور تمہاری بولتی بند ہو جائے۔" پھر وہ اپنے دوستوں کی طرف مڑ کر بولا۔ "سنو، تم لوگوں نے مس ٹینا کا نام تو سنا ہوگا، وہ......"

"فرحان!" شیراز جلدی سے بولا۔ "تم تو مذاق کی بات میں سنجیدہ ہو گئے۔ سوری یار، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔" اس کے سہمے ہوئے انداز پر سب زوردار قہقہہ مار کے ہنسے۔

"نہیں۔" شمسہ نے کہا۔ "بتاؤ نا فرحان! ٹینا کا کیا چکر ہے؟"

"ارے یار! اگر میں ٹینا کی تفصیل بتانے بیٹھ گیا تو میری فلائٹ مس ہو جائے گی۔"

"کومل! تم......"

"ٹینشن مت لیں بھابی۔" کومل نے کہا۔ "میں فرحان سر کا خیال رکھوں گی۔"

☆☆☆

فرحان پاکستان کے ایک بہت بڑے نجی چینل میں اسکرپٹ ایڈیٹر تھا۔ وہ اس سے قبل مختلف اخبارات میں سیاسی آرٹیکل لکھتا تھا اور ہر سیاست دان پر کھل کر تنقید کرتا تھا۔ اب چینل ہی کی طرف سے وہ ایک سیمینار میں امریکا جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ اسے سلامتی کونسل کے اجلاس کی کوریج بھی کرنا تھی۔ نیویارک میں چینل کے بیورو چیف سلطان غوری نے سلامتی کونسل کی کارروائی کی کوریج کے تمام انتظامات کیے تھے۔

شمسہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ خاص طور پر آئی ٹی کے شعبے میں اسے مہارت حاصل تھی۔ وہ کراچی کے ایک بہت بڑے پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی تھی۔

فرحان اور شمسہ کسی زمانے میں پڑوسی تھے۔ وہیں ان کی محبت پروان چڑھی تھی اور پھر ان کی شادی ہو گئی تھی۔ فرحان، شمسہ کو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ شادی کے دو سال بعد بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے لیکن ایک دوسرے کی قربت میں انہیں اس محرومی کا احساس نہیں تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ ان دونوں ہی کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا۔ فرحان کی پرورش اس کے چچا نے کی تھی۔ اس کے والدین کا انتقال برسوں پہلے ہو گیا تھا۔ فرحان یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا تو اس کے چچا کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔

شمسہ کے صرف والد حیات تھے لیکن شمسہ کی شادی کے دو مہینے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"سر! اب کام ختم ہو گیا ہے۔" کومل نے کہا۔ "کچھ گھومیں پھریں، انجوائے کریں۔ آپ تو ہر وقت ہوٹل کے کمرے میں بند رہتے ہیں۔"

"میں یہاں سیر سپاٹے کے لیے نہیں آیا تھا۔" فرحان نے کہا۔ "میں تو آج صبح ہی واپس چلا جاتا لیکن مجبوری یہ ہے کہ فلائٹ میں سیٹ ہی نہیں ہے۔"

"اچھا ہے نا سر۔" کومل ہنس کر بولی۔ "اس بہانے ہمیں کچھ دن سکون کے گزارنے کا موقع مل جائے گا۔"

"اگر شمسہ ساتھ ہوتی تو میں واقعی انجوائے کرتا۔" فرحان مسکرایا۔

"اپنے اردگرد دیکھیں سر۔" کومل ہنس کر بولی۔ "شمسہ سے کہیں زیادہ حسین اور پرکشش لڑکیاں موجود ہیں۔"

"لیکن شمسہ کوئی نہیں ہے۔" فرحان نے کہا۔

"او کے سر، پھر میں جاؤں؟"

"ہاں، ہاں تم جاؤ، گھومو پھرو، انجوائے کرو۔"

دوسرے دن رات کو بارہ بجے ان کی فلائٹ تھی۔

فرحان نے شمسہ کے لیے دو بہترین شولڈر بیگ اور ہینڈی کیم خریدا تھا۔ شمسہ کو فوٹو گرافی اور ویڈیو بنانے کا شوق بلکہ جنون تھا۔ فوٹو گرافی کا شوق فرحان کو بھی تھا لیکن اتنا نہیں تھا کہ وہ ہر اچھے منظر کی تصویریں لیتا پھرتا۔

کومل نے نہ جانے کیا کچھ خرید لیا تھا۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ کچھ بھی خرید سکتی تھی۔ بس فرحان کی محبت نہیں خرید سکی تھی۔ وہ اسے نہ جانے کب سے چاہتی تھی۔ جب فرحان نے شمسہ سے شادی کر لی تو وہ خاصی مایوس ہوئی تھی۔

رات کو دو بجے کے قریب فرحان کو شمسہ کی کال موصول ہوئی۔

"ہائے ڈارلنگ! کیسی ہو؟" فرحان نے پوچھا۔

"فائن۔" شمسہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم کب آ رہے ہو؟"

"کل رات کو میری فلائٹ ہے۔"

"ایک بات بتاؤ۔" شمسہ نے کہا۔ "یہ کومل کا وہاں کیا کام ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" فرحان ہنس کر بولا۔ "اس کے باپ کا چینل ہے، وہ جسے چاہے بھیجے۔" پھر وہ موضوع بدل کر بولا۔ "تم بتاؤ، تمہارے لیے کیا لاؤں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" شمسہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "کوئی فضول خرچی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

☆☆☆

فلائٹ روانہ ہوئی تو فرحان نے سکون کا سانس لیا اور سیل فون جیب سے نکال لیا۔

اسی وقت طرح دار سی ایک فضائی میزبان اس کے پاس آئی اور بولی۔ "سر! پلیز اپنا سیل فون سوئچ آف کر دیں۔"

"اوہ...... سوری۔" فرحان نے جلدی سے اپنا موبائل آف کر دیا۔

کومل اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ فرحان نے سیٹ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کومل سے کہا۔ "بیس گھنٹے کا یہ طویل سفر کیسے گزرے گا؟"

"میں ہوں نا۔" کومل نے ہنس کر کہا۔ "لوگ تو میری قربت کی تمنا کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے۔" فرحان نے منہ بنا کر کہا۔

☆☆☆

وہ لوگ کراچی ائرپورٹ پر اترے تو صبح کے سات بج رہے تھے۔

وہ کومل کے ساتھ ائرپورٹ سے باہر نکلا تو اس کے چینل کے دوست استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان میں جاوید اور شیراز بھی موجود تھے۔

فرحان نے مسکرا کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ پھر شیراز سے بولا۔ "یہ شمسہ کہاں رہ گئی؟ اسے میں نے بتایا بھی تھا کہ کس فلائٹ سے یہاں پہنچ رہا ہوں۔"

سب لوگ خاموشی سے اُسے دیکھتے رہے۔

"تم لوگ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" کومل نے پوچھا۔ "سب ٹھیک تو ہے نا؟"

"جی میڈم...... وہ......"

"کیا بات ہے شیراز؟" فرحان نے گھبرا کر پوچھا۔ "تم بولتے کیوں نہیں کہ شمسہ کہاں ہے؟"

جاوید اچانک آگے بڑھ کے فرحان کے گلے لگ گیا۔

"ارے ارے۔" فرحان بوکھلا کر بولا۔ "میں کوئی برسوں بعد نہیں لوٹا ہوں۔"

جاوید اچانک بلک بلک کر رونے لگا۔

"آخر بات کیا ہے جاوید؟" فرحان نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"فرحان...... وہ بھابی......"

"کیا ہوا شمسہ کو؟" فرحان وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

"فرحان...... شمسہ بھابی اب اِس...... دنیا میں نہیں رہیں۔" جاوید نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"کیا بکتے ہو؟" فرحان نے جنونی انداز میں جاوید کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ "شمسہ نہیں مر سکتی......"

اچانک اسے زور کا چکر آیا اور وہ فرش پر گرنے لگا۔ شیراز نے آگے بڑھ کر اسے گرنے سے روکا۔

"کومل چیخی۔ "یہ کیسے ہو گیا؟" وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

"خود کو سنبھالیں میڈم۔" شیراز نے کہا۔ "اور فرحان کا خیال کریں۔ اسے اس وقت ہماری ہمدردیوں کی ضرورت ہے۔"

"چلیں سر، گھر چلیں۔" کومل نے بھرائی ہوئی آواز

میں کہا۔

''گھر؟'' فرحان نے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا۔''ہاں گھر تو جانا ہوگا۔''

''آجاؤ، میری گاڑی میں آجاؤ۔'' جاوید نے کہا۔

''تمہاری گاڑی تو......''

''سر! آپ میرے ساتھ چلیں۔'' کومل نے کہا۔

☆☆☆

''مجھے بتاؤ جاوید۔'' فرحان نے کہا۔''یہ سب کیسے ہوا؟'' شمسہ کی تدفین کے بعد فرحان اب کافی حد تک نارمل ہوگیا تھا۔ وہ اس وقت اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ آفس کے دوسرے لوگ تو واپس چلے گئے تھے۔ صرف جاوید، شیراز اور کومل ہی وہاں رہ گئے تھے۔ کومل ہی نے سب کے لیے کافی بنائی تھی۔

''بھابی کی گاڑی ایک ٹرک سے ٹکرا کر بری طرح تباہ ہوگئی تھی۔ ان کے ساتھ اسکول کا ایک ٹیچر حامد بھی تھا۔''

''حامد؟'' فرحان چونک کر بولا۔''گاڑی کون ڈرائیو کررہا تھا؟''

''یہ معلوم نہیں ہوسکا۔'' جاوید نے کہا۔''ویسے پوسٹ مارٹم رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ حامد نے اس وقت شراب پی رکھی تھی۔''

''حامد نے شراب پی رکھی تھی؟'' فرحان نے حیرت سے کہا۔''میں حامد کو اچھی طرح جانتا ہوں، بہت سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ شراب تو دور کی بات ہے، میں نے تو اسے کبھی سگریٹ پیتے نہیں دیکھا۔''

''پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ڈرائیونگ اس وقت حامد کررہا تھا۔ نشے کی حالت میں گاڑی اس کے قابو سے باہر ہوگئی اور سامنے سے آنے والے ٹرک سے ٹکرا گئی۔''

''پولیس کے پاس جائے حادثہ کی تصویریں بھی ہوں گی؟'' فرحان نے پوچھا۔''میں ناصر سے کہتا ہوں کہ کسی طرح پولیس سے وہ تصویریں حاصل کرے۔'' اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ڈائل کر کے بولا۔''ناصر! فرحان بول رہا ہوں۔''

''فرحان...... شمسہ بھابی کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔ میں اس وقت اسلام آباد میں تھا۔ میں ابھی تمہاری طرف آرہا ہوں۔''

''یار، ایک کام کرتے آؤ۔'' فرحان نے کہا۔''تم پولیس اسٹیشن سے جائے حادثہ کی تصویریں لیتے آؤ۔ تم کرائم رپورٹر ہو، تمہارے لیے یہ کام مشکل نہیں ہوگا۔''

''میں تصویریں لے کر پہنچتا ہوں۔'' ناصر نے کہا۔

فرحان نے سلسلہ منقطع کردیا۔

تھوڑی دیر بعد ناصر آگیا۔ وہ آتے ہی فرحان سے لپٹ گیا اور بولا۔''یار! اسلام آباد جانے سے پہلے میں شمسہ بھابی سے ملا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ میری آخری ملاقات ہے۔''

''حادثے سے...... چند گھنٹے پہلے شمسہ سے میری بات ہوئی تھی۔'' فرحان نے افسردگی سے کہا۔''اس وقت میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں شمسہ کی کھنکتی ہوئی ہنسی آخری مرتبہ سن رہا ہوں۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔

''تم جائے حادثہ کے فوٹوگراف لے آئے؟''

''ہاں، لے آیا۔'' ناصر نے کہا اور اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈال کر خاکی رنگ کا ایک لفافہ نکال لیا۔

''فرحان نے فوٹوگراف لفافے سے نکال کر سینٹر ٹیبل پر پھیلا لیے۔ اس میں تباہ شدہ گاڑی کے فوٹوگراف تھے۔ مختلف زاویوں سے جائے حادثہ کی تصویریں تھیں۔ گاڑی ٹرک سے ٹکرانے کے بعد جس الیکٹرک پول سے ٹکرائی تھی اس کی بھی تصویر تھی۔

اچانک فرحان کھڑا ہوگیا۔''میں ذرا جائے حادثہ کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''

''فرحان!'' ناصر نے کہا۔''مجھے فوری طور پر ایک میٹنگ میں جانا ہے، کل ملاقات رہے گی۔''

''شیور۔'' فرحان نے کہا اور ناصر کو دروازے تک رخصت کرکے آیا۔

''کومل!'' فرحان نے کہا۔''تم بھی گھر جا کر آرام کرو۔ تم نے بھی طویل سفر کیا ہے۔''

کومل گھر جانے پر راضی نہیں تھی، بہت اصرار کے بعد وہ جانے پر راضی ہوگئی۔

شیراز بھی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔''یار! وہ سلمٰی کی طبیعت خراب ہے، اسے ذرا ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔''

''تم فوراً گھر جاؤ اور مجھے سلمٰی بھابی کی خیریت سے مطلع کرنا۔''

''اب تم بھی سوجاؤ فرحان۔'' جاوید نے کہا۔

''یار! میں پہلے جائے حادثہ کا معائنہ کروں گا۔'' فرحان نے کہا۔''چلو اٹھو۔''

☆☆☆

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شمسہ گھر سے اتنی دور اس علاقے میں کیوں آئی؟'' فرحان نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس طرف تو ہمارا کوئی جاننے والا بھی نہیں رہتا ہے۔ نہ شمسہ کی کوئی فرینڈ یا کولیگ یہاں رہتی ہے۔'' وہ لوگ اس وقت صفورا گوٹھ سے آگے اس سڑک پر کھڑے تھے جو کچھ فاصلے پر جا کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ وہاں ٹریفک برائے نام تھا۔

فرحان نے تصویریں نکال کر اس جگہ کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ''تصویروں کے مطابق شمسہ کی گاڑی صفورا گوٹھ سے ملیر کینٹ والی روڈ کی طرف جا رہی تھی۔ ٹرک سے تصادم کے بعد گاڑی الٹ گئی۔ الٹنے سے پہلے گاڑی نے کم سے کم دو قلابازیاں کھائی ہوں گی۔''

''ہم صرف اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔'' جاوید نے کہا۔

''یہ دیکھو۔'' اس نے ایک تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ٹرک سے ٹکرانے کے بعد گاڑی کا اگلا حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ گاڑی کا اسٹیئرنگ بالکل ڈرائیونگ سیٹ میں گھس گیا ہے۔ ڈرائیور کو بھی اسٹیئرنگ اور سیٹ کے درمیان پھنسنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ نہ شمسہ اسٹیئرنگ میں پھنسی اور نہ حامد؟'' فرحان نے بہت غور سے سڑک کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''گاڑی اس مقام پر ٹرک سے ٹکرائی ہے۔ ٹرک کو دیکھ کر شمسہ نے یا حامد نے بریک لگانے کی کوشش تو کی ہو گی؟ ڈرائیونگ کرنے والا نشے میں ہو تب بھی غیر شعوری طور پر وہ بریک لگانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہاں روڈ پر کسی اسکریچ کا نشان نہیں ہے۔ نہ ٹرک ڈرائیور نے بریک لگائے، نہ شمسہ نے۔''

''یار! حادثے کو کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔'' جاوید نے کہا۔ ''اس دوران میں تو سڑک سے تمام نشانات مٹ گئے ہوں گے۔''

گاڑی بریک لگنے کے بعد کچھ دور تک گھسٹتی ہے۔ اسکریچ کا نشان دو تین دن تک تو سڑک پر رہتا ہی ہے، پھر یہ اتنی مصروف سڑک بھی نہیں ہے۔'' فرحان نے غور سے سڑک کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''یہ دیکھو، یہ خون کے دھبے ابھی تک یہاں موجود ہیں۔'' پھر اس کی نظر سڑک کے کنارے پڑے ہوئے بلاک پر پڑی۔ وہ تعمیر میں استعمال ہونے والا ادھورا بلاک تھا۔ فرحان نے جھک کر بلاک اٹھا لیا اور غور سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

''یہ کیا ہے؟'' جاوید نے پوچھا۔

''یہ بلاک کا ٹکڑا ہے۔'' فرحان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس پر خون کے دھبے ہیں، ادھر گاڑی کے ونڈ اسکرین کے ریزے بھی بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ادھورا بلاک گاڑی کے اندر موجود تھا۔''

''اندر موجود تھا؟'' جاوید نے کہا۔

''ہاں۔'' فرحان نے کہا۔ ''لگتا تو ایسا ہی ہے۔ دیکھو، اس بلاک پر خون کے اچھے خاصے دھبے ہیں۔ اس پر خون جم گیا ہے۔ میں نے یہ بلاک جہاں سے اٹھایا ہے وہاں خون کا کوئی دھبا نہیں ہے پھر سڑک پر اس ادھورے بلاک کا کیا کام؟ اگر ہوتا بھی تو گاڑیوں کے نیچے دب کر چورا ہو جاتا۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' جاوید نے پوچھا۔

''مجھے شبہ ہے کہ شمسہ اور حامد کو قتل کیا گیا ہے، پھر اسے حادثے کا رنگ دے دیا گیا۔''

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔'' جاوید نے الجھ کر کہا۔

''دیکھو، اس بلاک کو گاڑی کے ایکسیلیٹر پر باندھا گیا ہو گا تاکہ ایکسیلیٹر وزن سے دبا رہے۔ پھر قاتلوں نے کسی ٹرک کی آمد کا انتظار کیا ہو گا اور ٹرک دیکھ کر انہوں نے گاڑی کا کلچ چھوڑ دیا ہو گا۔ اب مجھے اپنی گاڑی دیکھنا ہے اگر اس کے ایکسیلیٹر یا گاڑی کے اندر کہیں کوئی رسی یا ایسی چیز ملی جس سے بلاک کو باندھا گیا تھا تو پھر میرا شبہ مزید پختہ ہو جائے گا۔ میری گاڑی کہاں ہے؟''

''اسے پولیس اٹھا کر لے گئی تھی۔ وہ یہاں کے متعلقہ تھانے میں ہو گی یا ممکن ہے تھانے کے باہر کہیں پڑی ہو۔'' جاوید نے کہا۔

''چلو، پہلے گاڑی کا جائزہ لے لیں۔''

وہ لوگ وہاں سے متعلقہ تھانے پہنچے تو تھانے کے عقبی حصے میں بہت سی موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔ دو تین گاڑیاں بھی تھیں۔ سب کچھ گرد میں اٹا ہوا تھا۔ وہیں کچھ فاصلے پر فرحان کی گاڑی کا ڈھانچا بھی موجود تھا۔

وہ گاڑی کی طرف بڑھے تو مریل سا ایک سپاہی آگے بڑھا اور بولا۔ ''کیا بات ہے؟''

''یہ میری گاڑی ہے۔'' فرحان نے کہا۔

''یہ آپ ابھی نہیں لے جا سکتے۔'' سپاہی نے اپنی آواز میں دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ''یہ گاڑی آپ کو کورٹ سے ملے گی۔''

''ہم اسے کہیں نہیں لے جا رہے۔'' جاوید نے کہا۔ ''یہ کہیں جانے کے قابل ہے بھی نہیں۔ ہمیں صرف اس کا انجن اور چیسز نمبر دیکھنا ہے تاکہ ہم انشورنس کمپنی کو کلیم کر سکیں۔''

''آرڈر نہیں ہے۔'' سپاہی نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

''انچارج صاحب سے بات کرو۔'' فرحان نے ناگواری سے کہا۔ ''بلکہ اسے یہیں بلالاؤ۔''

''سر! انچارج صاحب یہاں آئے تو اس بے چارے کی شامت آجائے گی۔'' جاوید نے کہا۔ پھر سپاہی سے بولا۔ ''یہ میڈیا کے آدمی ہیں۔''

سپاہی لاکھ اَن پڑھ سہی لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ میڈیا والوں سے نہیں الجھنا چاہیے۔ وہ پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔ ''صاحب! آپ لوگ پہلے بتاتے کہ......''

''کوئی بات نہیں۔'' فرحان آگے بڑھا اور دروازے سے اندر جھانکا۔ اس کی توقع کے مطابق ایکسلیریٹر سے باریک سی ایک ڈوری بندھی تھی۔ اس پر بھی خون کے دھبے تھے۔ فرحان نے اپنا سیل فون نکالا اور گاڑی کے اندرونی حصے کی کئی تصویریں لے لیں۔

وہ دونوں وہاں سے لوٹ آئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے فرحان نے کہا۔ ''اب تو صاف ظاہر ہے کہ شمسہ اور حامد کو قتل کیا گیا ہے۔''

''چلو، اس کیس کے متعلقہ افسر سے بات کرتے ہیں۔'' جاوید نے کہا۔

''پہلے میں ان تصویروں کے پرنٹ آؤٹ بنوالوں جو میں نے ابھی لی ہیں۔ صفورا گوٹھ کے آس پاس کمپیوٹر کی کوئی دکان ضرور ہوگی۔''

انہوں نے ایک جگہ پرنٹ بننے کو دیے۔ دکان دار نے کہا کہ آپ کو کم سے کم آدھا گھنٹا انتظار کرنا ہوگا۔

وہ لوگ آدھے گھنٹے بعد آنے کا کہہ کر ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔ وہ سڑک کے کنارے بنا ہوا چھوٹا سا ایک ہوٹل تھا۔ وہ ہوٹل تو دراصل ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ اس کے آگے خاصی بڑی جگہ پر ہوٹل والے نے میزیں اور کرسیاں رکھ کر قبضہ کرلیا تھا۔ وہیں دو تین تخت بھی پڑے تھے۔ ان پر قالینوں کے ٹکڑے ڈال کر گاؤ تکیے رکھ دیے گئے تھے۔ یعنی گاہکوں کے آرام کا بھی بندوبست تھا۔ ان کے پیچھے اسی قسم کا ایک تخت تھا جس پر تین آدمی آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور چائے پی رہے تھے۔

ایک آدمی ہنس کر بولا۔ ''گل خان! پولیس نے تمہیں تو نہیں پکڑا؟''

''ہم لوگ کو کیوں پکڑے گا؟'' گل خان نے کہا۔ ''قصور ہمارا نہیں تھا، قصور اُس گاڑی والے کا تھا، خانہ خراب سائڈ سے نکل کر ایک دم ہمارے سامنے آگیا۔ ڈرائیور یا تو نشے میں تھا یا پھر اندھا تھا۔ ٹرک دیکھ کر بھی اس نے اسپیڈ کم نہیں کیا اور ایک دم ہم سے ٹکرا گیا۔''

''پھر بھی تم ہوشیار رہو، پولیس کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔''

''خانہ خراب، یہ بات تم کو معلوم ہے یا ہمارے اس کلینڈر (Cleaner) کو۔ تم پولیس کو بتائے گا یا پھر ہم بتائے گا۔ ہم نے تو وہ اسکریچ بھی صحیح کروالیا ہے جو گاڑی کے ٹکرانے سے پڑا تھا۔''

جاوید اچانک اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور جارحانہ انداز میں ان کی طرف بڑھا اور ڈپٹ کر بولا۔ ''تم میں سے گل خان کون ہے؟''

گل خان نے چونک کر دیکھا اور بولا۔ ''کیا بات ہے صاحب؟''

''تم ذرا میرے ساتھ تھانے چلو۔''

''تھانے؟'' گل خان تھوک نگل کر بولا۔ ''کیوں صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ کیوں اور کیسے تھانے جا کر کرنا، جلدی کرو، میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔''

گل خان تخت سے نیچے اترا، پشاوری چپل پہنی اور جاوید سے بولا۔ 'صاحب! آپ ہم کو تھانے کیوں لے جاتا ہے؟''

''پھر وہی کیوں؟'' جاوید نے جھنجلا کر کہا۔

گل خان، جاوید کو ایک طرف لے گیا اور بولا۔ ''صاحب! ابھی بات کرو، ہم تو مزدور لوگ ہے، آپ......''

''جس گاڑی سے تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ کس طرف سے آرہی تھی؟''

''وہ گاڑی تو صفورا کی طرف سے آرہا تھا۔'' گل خان نے جواب دیا۔

''گاڑی میں کتنے آدمی تھے؟''

''یہ تو معلوم نہیں صاحب۔'' گل خان نے کہا۔ ''اس وقت روڈ پر اندھیرا تھا۔ بس وہ گاڑی ایک دم سائڈ سے نکل کر بہت تیزی سے سامنے آگیا۔ ہم بھی بہت اسپیڈ میں تھا۔ ہم کو بریک لگانے کا بھی موقع نہیں ملا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' جاوید نے پوچھا۔
''وہ گاڑی ٹرک سے ٹکرا کر اوپر اچھلا پھر روڈ پر گر کر دو دفعہ کلٹی ہوا اور الٹ کر رک گیا۔''
''اور تم وہاں سے بھاگ گئے؟''
''ہم بہت ڈر گیا تھا صاحب۔'' گل خان نے کہا۔
''پولیس یہ بات کبھی نہیں مانتا کہ قصور گاڑی والے کا تھا۔''
''تمہارے ٹرک کا نمبر تو میں نے لے لیا ہے۔ اب ذرا اپنا نام اور پتا لکھواؤ۔''
''صاحب ابھی جانے دیو...... ہم......''
''دیکھو گل خان!'' جاوید نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ رعایت ہی کر رہا ہوں ورنہ یہ باتیں تھانے لے جا کر بھی پوچھ سکتا تھا۔ اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھاؤ۔''
''لائسنس......؟'' گل خان نے مردہ لہجے میں کہا پھر اس نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذات نکالے جو ایک شاپر میں لپٹے ہوئے تھے۔
جاوید نے اس کا نام اور پتا نوٹ کرنے کے بعد کہا۔ ''گل خان! میں تمہیں جانے دے رہا ہوں لیکن یاد رکھنا، اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو پولیس تمہیں زمین کی تہ سے بھی نکال لے گی۔ اب جاؤ۔''
گل خان بوجھل قدموں سے اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا۔
جاوید نے کاؤنٹر پر جا کر بل دیا اور وہ دونوں سیل فون کی تصویروں کا پرنٹ لینے روانہ ہو گئے۔
وہ لوگ دوبارہ تھانے پہنچے تو عقبی حصے میں جانے کے بجائے اس کمرے کی طرف بڑھے جس پر ایس ایچ او کی تختی لگی تھی۔ دروازے پر ایک ڈھیلا ڈھالا پولیس والا کھڑا تھا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر ایکٹو نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔
''انچارج صاحب بیٹھے ہیں؟'' فرحان نے کہا۔
''جی ہاں بیٹھے ہیں، آپ کون؟''
پولیس والے کی بات کا جواب دیے بغیر فرحان اور جاوید اندر داخل ہو گئے۔
ایس ایچ او نے بہت خندہ پیشانی سے کہا۔ ''جی فرمایئے؟''
''مجھے ایک ایکسیڈنٹ کے سلسلے میں بات کرنا ہے۔'' فرحان نے کہا۔
انچارج نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر نرم لہجے میں بولا۔ ''تشریف رکھیے۔''

فرحان اور جاوید اس کے مقابل کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انچارج کی جیب پر اس کے نام کی پٹی لگی ہوئی تھی۔ اس پر انگریزی میں ماجد لکھا ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''جی، اب فرمایئے، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''
''کل صفورا گوٹھ سے کچھ آگے ایک گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔''
''اچھا، آپ اس ٹویوٹا کرولا کی بات کر رہے ہیں جو تیز رفتاری کی وجہ سے کسی گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔''
''جی ہاں، میں اسی حادثے کی بات کر رہا ہوں۔ حادثے میں مرنے والی میری بیوی اور اس کے اسکول کا ایک ٹیچر تھا۔''
''اچھا اچھا، آپ ہیں فرحان صاحب۔''
''جی ہاں، میں ہی فرحان ہوں۔''
اسی وقت دروازہ کھلا اور ایک سب انسپکٹر اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ فائلیں تھیں۔ اس نے انچارج سے کچھ کہنا چاہا لیکن انچارج نے اشارے سے اسے روک دیا اور فرحان سے بولا۔ ''جی فرحان صاحب!''
''میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ حادثہ نہیں تھا بلکہ قتل تھا۔''
''قتل تھا؟'' سب انسپکٹر نے ناگواری سے کہا۔ ''اسے بھلا کون قتل کرے گا؟ ہاں، دو مہینے پہلے اس نے دس لاکھ روپے کی انشورنس کرائی تھی۔ انشورنس کی رقم اس کے شوہر کو ملے گی۔ اگر یہ قتل تھا فرحان صاحب تو سب سے پہلے تو آپ ہی پر شبہ کیا جائے گا۔''
''آپ کا مطلب ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے؟'' فرحان نے ناگواری سے کہا۔
''آہستہ بولیں فرحان صاحب!'' سب انسپکٹر نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ ''یہ آپ کا گھر نہیں ہے، پولیس اسٹیشن ہے۔''
''آپ بھی اسے پولیس اسٹیشن ہی سمجھیں۔'' دروازے کے پاس سے ناصر کی آواز آئی۔ ''آپ بات کس لہجے میں کر رہے ہیں؟''
''ناصر صاحب!'' انچارج جلدی سے بولا۔ ''آپ تشریف رکھیں۔ پھر وہ سب انسپکٹر سے بولا۔ ''تم باہر جاؤ احمد خان۔''
''میرے پاس شواہد ہیں کہ میں اسے قتل ثابت کر سکتا ہوں۔''
''جی فرمایئے، میں سن رہا ہوں۔'' ماجد نے بہت

انکساری سے کہا۔
فرحان نے اسے ادھورے بلاک کے بارے میں بتایا، پھر ایکسیلریٹر سے بندھی ہوئی خون آلود ڈوری کے بارے میں بتایا اور تصویروں کے پرنٹ آؤٹ اس کے سامنے رکھ دیے۔
''جائے حادثہ پر وہ ادھورا بلاک اب بھی پڑا ہوا ہے۔'' فرحان نے کہا۔
''آیئے، ذرا گاڑی کا جائزہ لے لیں۔'' انچارج نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔
فرحان، جاوید اور ناصر اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ انچارج نے جھک کر گاڑی کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ''آپ کی بات درست ہے۔ ایکسیلریٹر میں ایک ڈوری پھنسی ہوئی ہے۔''
''ایک بات اور۔'' فرحان نے کہا۔ ''ڈرائیونگ سیٹ کی پشت پر اور نیچے کی طرف خون کے بڑے دھبے ہیں۔ خون بہہ کر گاڑی کے فرش پر بھی گرا ہے اور جم گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے میری بیوی کو قتل کرنے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچایا اور قتل کو حادثے کا رنگ دینے کے لیے گاڑی کو ٹرک سے ٹکرا دیا۔''
''ہماری رپورٹ تو یہ کہتی ہے کہ گاڑی وہ شخص حامد چلا رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق وہ شراب کے نشے میں تھا۔''
''چلیے، حامد ہی سہی۔'' فرحان نے کہا۔ ''لیکن اُسے پہلے قتل کر کے اس کی لاش کو گاڑی میں رکھا گیا تھا۔ ایکسیڈنٹ کے بعد تو ان کے جسم اچھل کر گاڑی سے باہر جا گرے تھے۔ گاڑی میں اگر خون گرا بھی ہوتا تو بہت تھوڑا ہوتا۔''
''ہاں، آپ کا پوائنٹ ویلڈ ہے۔'' انچارج نے کہا۔ ''آیئے میں آپ کا اسٹیٹ منٹ لے لوں۔''
وہ پھر انچارج کے دفتر کی طرف چل دیے۔ چلتے چلتے فرحان نے ناصر سے پوچھا۔ ''تم یہاں کیسے آ گئے؟''
''مجھے جاوید نے فون کر کے بتایا تھا کہ ہم لوگ پولیس اسٹیشن جا رہے ہیں اور بھابی کا انتقال ایکسیڈنٹ میں نہیں ہوا بلکہ ایسا ظاہر کیا گیا ہے۔''
انچارج کے آفس میں بیٹھ کر فرحان نے ایک مفصل رپورٹ لکھ کر انچارج کی طرف بڑھا دی۔
اسی وقت شیراز بھی وہاں پہنچ گیا۔
انچارج نے پُرخیال انداز میں فرحان سے پوچھا۔
''یہ بتایئے، آپ کی بیگم کی کسی سے دشمنی تھی، ابھی حال ہی میں کسی سے جھگڑا ہوا تھا؟''
''جھگڑا؟'' فرحان نے تاسف سے کہا۔ ''اس کا تو روز جھگڑا ہوتا تھا، کبھی سبزی والے سے، کبھی دودھ والے سے، کبھی رکشا والے سے، وہ بے ایمانی اور بددیانتی برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی لیکن یہ جھگڑے ایسے نہیں تھے جن کی بنا پر اسے قتل کر دیا جائے۔''
''فرحان صاحب!'' انچارج نے کہا۔ ''آپ مجرموں کی نفسیات سے واقف نہیں ہیں، بعض اوقات لوگ بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ ویسے ذرا سوچ کر بتایئے آپ کی بیگم کا کسی سے ایسا جھگڑا ہوا کہ......''
''جی ہاں ہوا تھا۔'' فرحان کے بجائے شیراز نے کہا۔ ''وہ سی ڈی شاپ والے سے۔''
''سی ڈی شاپ والے سے؟'' انچارج نے الجھ کر پوچھا۔ ''یہ سی ڈی شاپ کا کیا چکر ہے فرحان صاحب؟''
''ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک مارکیٹ ہے۔ وہاں ایک سی ڈی شاپ ہے۔ شمسہ وہاں ایک سی ڈی لینے گئی تھی۔ وہاں دس بارہ سال کا ایک بچہ بھی موجود تھا۔ سی ڈی شاپ کا مالک نذیر اس بچے سے کہہ رہا تھا کہ پہلے جو سی ڈی لے گیا تھا وہ لے کر آ، پھر نئی سی ڈی دوں گا۔''
''دے دو، میں وہ سی ڈی ابھی لے آؤں گا۔''
''چل نکل یہاں سے۔'' نذیر نے لڑکے کو دھکا دیا۔
''ارے، دھکے کیوں دے رہے ہو؟'' شمسہ نے کہا۔ ''سی ڈی ہی تو ہے، لے آئے گا۔''
''میڈم! آپ کو پتا نہیں، وہ سی ڈی بہت مہنگی ہے۔ یہ سالا اپنے باپ کے نام سے لے جاتا ہے، ہمیں کیا معلوم، یہ خود دیکھتا ہوگا۔''
''کیسی سی ڈی ہے وہ؟'' شمسہ نے چونک کر پوچھا۔
''ارے میڈم! آپ کو تو کچھ معلوم نہیں ہے۔'' نذیر مکاری سے ہنسا۔ ''وہ ٹرپل ایکس کی سی ڈی ہے اور......''
''وھاٹ؟'' شمسہ چیخ کر بولی۔ ''تم ایسی سی ڈیز رکھتے ہو اور بچوں کو بھی دیتے ہو؟''
''بچہ!'' نذیر طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''یہ بچہ نہیں ہے میڈم، آپ سے زیادہ سیانا ہے۔''
''تمہیں ایسی سی ڈیز کا کاروبار کرتے شرم نہیں آتی، پھینکو ساری سی ڈیز۔'' شمسہ نے بھنّا کر کہا۔
''او میڈم۔'' نذیر نے بہت حقارت سے کہا۔ ''اپنا

لیکچر بند کرو۔ یہ ہمارا کاروبار ہے۔"

"میں یہ کاروبار بند کرادوں گی۔"

اسی وقت دکان کا دوسرا پارٹنر بلال آگیا۔ اس نے شمسہ کی بات سن لی تھی۔ وہ بھی بدتمیزی سے بولا۔ "او میڈم! اتنا دم ہے تو جاؤ بند کرادو۔ یہ کبیر شاہ کی دکان ہے۔ نام سنا ہے کبھی کبیر شاہ کا؟" پھر وہ لڑکے سے بولا۔ "چل نکل باہر۔"

شمسہ پلٹ کر جانے لگی تو نذیر بولا۔ "او میڈم! شاہ جی کا نام سن کر سارا جوش ختم ہوگیا؟"

شمسہ وہاں سے سیدھی اپنی دوست فرزانہ کے پاس پہنچی۔ وہ ان دنوں علاقے کی ایس ڈی ایم تھی۔ شام تک شمسہ نے دکان کی تمام قابلِ اعتراض سی ڈیز کو تلف کرادیا اور دکان سیل کرادی۔

پولیس نے نذیر اور بلال کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔ اچانک وہاں کبیر شاہ آگیا۔ کبیر شاہ کو تو آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ وہ اپنے حلیے اور چہرے سے انتہائی شریف اور مہذب نظر آتا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر نذیر کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا اور بولا۔ "میں نے تم لوگوں کو دکان اس لیے کھول کردی تھی کہ تم یہاں یہ غیر قانونی کام کرو؟" پھر وہ فرزانہ سے مخاطب ہوا۔ "میڈم! ان لوگوں کو جیل بھجوادیں تاکہ آئندہ یہ کبھی ایسی حرکت نہ کریں۔" پھر وہ سرگوشی میں بلال سے بولا۔ "آدھے گھنٹے بعد تم لوگ باہر ہوگے۔"

شمسہ نے اس کی بات سن لی تھی لیکن فرزانہ اس وقت تک جا چکی تھی۔

"ہاں، نذیر اور بلال کا نام تو میں نے بھی سنا ہے۔" انچارج نے کہا۔ "آپ نے رپورٹ درج کرادی ہے۔ اب اس کیس کو نئے سرے سے دیکھنا پڑے گا۔"

"تھینک یو۔" فرحان نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھ سے رابطے میں رہیے گا فرحان صاحب۔" انچارج نے کہا اور انہیں رخصت کرنے برآمدے تک آیا۔

فرحان وہاں سے رخصت ہو کر گھر آگیا۔ نیویارک سے کراچی تک کا طویل سفر، پھر کراچی پہنچتے ہی پے در پے واقعات نے اسے ذہنی اور جسمانی طور پر نڈھال کر دیا تھا۔ اب وہ صرف اور صرف کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے کپڑے بدلے۔ کمرے میں اندھیرا کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے باہر کوئی چل پھر رہا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بلند آواز میں بولا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں ڈیئر۔" شمسہ کی آواز آئی تو وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا اور تیزی سے لاؤنج میں آگیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ لاؤنج میں سامنے ہی شمسہ کی تصویر مسکرا رہی تھی۔

وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگالی۔

پھر اسے ایسا لگا جیسے شمسہ اچانک کچن میں گئی ہو۔ اس نے چونک کر کچن کی طرف دیکھا۔ وہاں واقعی شمسہ موجود تھی۔ وہی پنک ٹراؤزر اور ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ پہنے ہوئے جو وہ اکثر پہنتی تھی۔

فرحان کھڑا ہوا تو شمسہ اچانک غائب ہوگئی۔ فرحان کو اپنی ذہنی حالت پر ہنسی آگئی۔ شمسہ مر چکی تھی لیکن اس کے خیالوں میں، اس کے تصور میں زندہ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا شمسہ کی تصویر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسے تصویر کی مسکراہٹ گہری ہوگئی ہو۔

"میں تمہارے قاتلوں کو قانون کے حوالے کرکے رہوں گا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" شمسہ نے کہا۔ "تم مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہو۔"

"پھر تم مجھے چھوڑ کر چلی کیوں گئیں شمسہ؟" فرحان نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

اچانک اس کے شانے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ فرحان بری طرح اچھل پڑا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ اس کی پشت پر کومل کھڑی تھی۔

"سر! آپ نے ابھی تک آرام نہیں کیا؟"

"میں سونے لیٹا تھا کومل لیکن شمسہ کی یادوں نے مجھے سونے ہی نہیں دیا۔"

"کوشش کریں سر!" کومل نے کہا۔ "نیند آجائے گی۔"

"تم نے آرام نہیں کیا، تم بھی تو تھکی ہوئی ہو؟"

"میں دو گھنٹے تک سوتی رہی ہوں۔ اب میں بالکل فریش ہوں۔"

فرحان نے زینکس کی دو ٹیبلیٹ پانی سے نگلیں اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ پھر نہ جانے کب اسے نیند آگئی۔ وہ نیند بھی پُرسکون نہیں تھی۔ نیند میں بھی اسے شمسہ، تباہ شدہ گاڑی نظر آتی رہی۔

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ دیوار گیر گھڑی اس وقت پانچ بجا رہی تھی۔ گویا وہ صرف دو گھنٹے سویا تھا۔ وہ شاور لے کر باتھ روم سے نکلا اور لاؤنج میں آیا تو کومل کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی لیکن فرحان کے

آرام کے خیال سے اس نے ٹی وی کی آواز میوٹ کر رکھی تھی۔ اس نے آہٹ سن کر سر گھمایا اور فرحان کو دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ''او، لکنگ فریش۔ آپ بیٹھیں سر، میں کافی لے کر آتی ہوں۔'' کومل نے کہا۔

''وہ کام والی بھی آج نہیں آئی۔'' فرحان نے پوچھا۔

''نہیں سر، میرے سامنے تو نہیں آئی۔''

''بے چاری ڈر گئی ہوگی۔'' فرحان نے کہا۔ ''گھر کی مالکن ایک حادثے میں ہلاک ہوگئی تو وہ کیوں آئے گی۔''

کومل کافی بنا لائی۔ فرحان نے کافی کا مگ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہو اور یہاں یہ چھوٹے چھوٹے کام کر رہی ہو۔''

''بڑے باپ کی بیٹیوں کے لیے کام کرنے پر کوئی پابندی تو نہیں ہے۔'' کومل مسکرائی۔ ''پھر آپ کا کام کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔''

''ان چکروں میں مجھے حامد کے گھر والوں کا خیال نہیں آیا۔'' فرحان نے کہا۔ ''مجھے ان کے پاس بھی جانا چاہیے تھا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میرے خیال میں مجھے وہاں چکر لگا ہی لینا چاہیے۔'' پھر وہ جاتے جاتے رک گیا۔ ''لیکن......میری گاڑی......''

''گاڑی میرے پاس ہے نا سر۔'' کومل جلدی سے بولی۔ ''میں چینل سے آپ کو دوسری گاڑی ایشو کرا دوں گی۔''

فرحان ایک دفعہ شمسہ کے ساتھ حامد کے گھر آیا تھا۔ حامد منظور کالونی کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ گلی اتنی تنگ تھی کہ اس میں گاڑی جا ہی نہیں سکتی تھی۔ فرحان نے گاڑی گلی کے باہر ہی چھوڑی اور حامد کے گھر پیدل ہی روانہ ہوگیا۔ کومل اس کے ساتھ تھی۔ راستہ ناہموار تھا، کومل ہائی ہیل کی وجہ سے بہت مشکل سے چل رہی تھی۔

حامد کی بیوی نے اندر سے جھانکا، پھر فرحان کو پہچان کر دروازہ کھول دیا اور بولی۔ ''آیئے، اندر آجایئے۔''

وہ انہیں ایک کمرے میں لے گئی۔ وہ کمرا ایک وقت بیڈروم، ڈرائنگ روم اور سٹنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کمرے میں سستا سا فرنیچر تھا۔

''مسز حامد!'' فرحان نے کہا۔ ''سوری، میں آپ کے پاس تاخیر سے آیا ہوں۔ دراصل آتے ہی......''

''کوئی بات نہیں فرحان صاحب۔'' حامد کی بیوی نے کہا۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ ''اب حامد ہی نہیں رہے تو میرے لیے تو دنیا اندھیر ہوگئی۔ آپ کی بہت مہربانی کہ آپ میرا حال احوال پوچھنے چلے آئے۔'' پھر وہ کومل کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''میں انہیں نہیں پہچانی؟''

''یہ کومل ہیں۔ میرے ساتھ چینل کے اسکرپٹ سیکشن میں کام کرتی ہیں۔'' فرحان نے کومل کا تعارف کرایا۔ وہ عورت اب بھی کومل کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''مسز حامد!'' فرحان نے کہا۔ ''آپ کو شاید معلوم نہیں کہ یہ حادثہ نہیں تھا بلکہ کسی نے قتل کو حادثے کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔''

''جی؟'' حامد کی بیوی حیرت سے بولی۔ ''قتل؟ حامد کو کون قتل کرے گا اور شمسہ بی بی کا تو کوئی دشمن ہو ہی نہیں سکتا۔''

''لیکن ایسا ہوا ہے۔'' فرحان نے کہا۔ ''آپ یہ بتایئے، حامد صاحب کب سے شراب کے عادی تھے؟''

''حامد اور شراب؟'' حامد کی بیوی کے انداز میں ناگواری تھی۔ ''ہمارے تو روزمرہ کے اخراجات ہی بہت کھینچ تان کر پورے ہوتے تھے۔ ایسے میں حامد شراب کی عیاشی کیسے کر سکتے تھے؟''

''لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ہے کہ حامد نے شراب پی رکھی تھی۔ اسی شراب کے نشے میں انہوں نے گاڑی ٹرک سے ٹکرا دی۔''

''فرحان صاحب! پولیس کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ حامد تو سگریٹ سے بھی نفرت کرتے تھے۔ پھر وہ ڈرائیونگ کیسے کر سکتے تھے۔ انہیں تو ڈرائیونگ سرے سے آتی ہی نہیں تھی۔''

''جی۔'' کومل نے حیرت سے کہا۔ ''انہیں ڈرائیونگ نہیں آتی تھی؟''

''آپ اتنی حیران کیوں ہیں؟'' حامد کی بیوی بولی۔ ''حامد کو تو موٹر سائیکل چلانا بھی نہیں آتی تھی۔''

''اچھا۔'' فرحان پُرخیال انداز میں بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ حادثے کے وقت اسٹیئرنگ پر شمسہ تھی۔''

''سوری، میں نے آپ سے چائے کو بھی نہیں پوچھا۔ آپ بیٹھیں، میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔'' حامد کی بیوی نے کہا۔

''چائے کا تکلف مت کریں۔'' فرحان نے کہا۔ ہم ابھی گھر سے چائے پی کر ہی نکلے تھے۔''

''آپ کے کتنے بچے ہیں؟'' کومل نے پوچھا۔

''میرا صرف ایک بیٹا ہے جو اسی اسکول میں پڑھتا ہے جہاں حامد پڑھاتے تھے۔ مجھے ایک فکر یہ بھی ہے کہ حامد کی وجہ سے اسکول والے ہم سے رعایتی فیس لیا کرتے تھے۔ اب وہ شاید رعایت بھی نہ کریں۔ میں اتنی فیس کیسے دے سکتی ہوں۔''

''آپ کی کوالیفکیشن کیا ہے مسز حامد؟'' کومل نے پوچھا۔

''میری کیا کوالیفکیشن۔'' حامد کی بیوی نے کہا۔ ''میں بی اے کا امتحان دے رہی تھی کہ میری شادی ہوگئی۔''

''نو پرابلم۔'' کومل نے کہا اور پرس سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اُسے دیا۔ ''اس کارڈ پر چینل کا فون نمبر اور ایڈریس بھی ہے اور میرا سیل نمبر بھی ہے۔ آپ کل کسی وقت مجھ سے مل لیں۔ آپ کی جاب کا بندوبست ہوجائے گا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ کومل صاحبہ۔'' حامد کی بیوی ممنونیت سے بولی۔

''آپ نے اب تک اپنا نام نہیں بتایا۔'' کومل نے کہا۔

''آپ نے پوچھا ہی نہیں۔ میرا نام شاہینہ ہے۔''

''او کے شاہینہ۔'' فرحان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''حامد اور شمسہ کے حوالے سے آپ کو کوئی بات یاد آئے تو مجھے ضرور بتایئے گا۔'' اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر شاہینہ کو دیا۔ ''اس کارڈ پر میرا سیل نمبر اور ایڈریس بھی موجود ہے۔''

وہ گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ اسے سیل فون پر شیراز کی کال موصول ہوئی۔ ''تم کہاں ہو فرحان؟'' شیراز نے پوچھا۔

''میں اب گھر کی طرف جارہا ہوں۔'' فرحان نے کہا۔

''او کے، تم گھر چلو، میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔''

فرحان نے سلسلہ منقطع کر کے کومل کی طرف دیکھا جو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''کہاں غائب ہو کومل۔'' فرحان نے کہا۔ ''تم ایسا کرو، مجھے گھر ڈراپ کرنے کے بعد تم چلی جانا۔ میں کل تک اپنے لیے گاڑی کا بندوبست کرلوں گا۔''

''آپ مجھ سے اتنا ہی اکتا گئے ہیں سر؟' کومل نے شاکی لہجے میں کہا۔

''میں تو تمہارے آرام کے خیال سے کہہ رہا تھا۔ ویسے بھی چینل کی تمام ذمے داریاں تم پر ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آغا صاحب تو اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔''

''یہ شوق بھی تو میرا ہی تھا۔'' کومل نے ہنس کر کہا۔ ''ڈیڈی نے تو پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ چینل کی تمام ذمے داریاں تمہیں اٹھانا ہوں گی۔ میں صرف نام کی حد تک سی ای او ہوں، وہ بھی اس لیے کہ مارکیٹ میں کچھ لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' فرحان نے کہا۔

''سر! آپ جانتے ہیں تو ذمے داریوں کو بانٹنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔''

''اپنی سی تو میں پوری کوشش کرتا ہوں۔'' فرحان نے کہا۔

''سر! میں چاہتی ہوں کہ ڈیڈی کے بجائے آپ چینل کے سی ای او ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' فرحان چونک کر بولا۔

''سر، اب آپ کو مطلب بھی سمجھانا پڑے گا؟'' کومل منہ بنا کر بولی۔

''فضول باتیں مت کرو کومل۔'' فرحان سنجیدگی سے بولا۔

''ٹھیک ہے سر، میں جارہی ہوں۔'' کومل نے کہا۔ ''اپنا خیال رکھیے گا۔ اب صبح آپ سے ملاقات ہوگی۔ ہاں، میں گاڑی بھجوادوں گی آپ کے لیے۔''

''گاڑی کی ضرورت تو مجھے اس وقت بھی ہے۔'' فرحان نے کہا۔ کوئی بات نہیں، میں ٹیکسی استعمال کرلوں گا یا پھر جاوید یا شیراز کسی کو بلالوں گا۔''

''سر! ایسا کریں۔'' کومل نے کہا۔ ''آپ مجھے گھر ڈراپ کردیں اور میری گاڑی لے جائیں۔ میں اپنے لیے دوسری گاڑی کا بندوبست کرلوں گی۔''

فرحان، کومل کو ڈراپ کرنے اس کے بنگلے پر پہنچا تو کومل نے کہا۔ ''آئیں سر، ایک کپ کافی ہی پی لیں۔ میرا کچھ وقت مزید خوش گوار گزر جائے گا۔''

''ابھی تو مجھے ایک جگہ جانا ہے۔'' فرحان نے کہا۔ ''کافی پھر کبھی سہی۔''

''اینی ٹائم سر۔'' کومل ہنس کر بولی۔ ''میرے گھر کے دروازے تو ہمیشہ آپ کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔''

فرحان کومل کو ڈراپ کر کے جاوید کا نمبر ملا رہا تھا کہ اسے خیال آیا کہ شیراز نے گھر آنے کو کہا تھا۔

اسی وقت اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف

جاوید تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”فرحان تم کہاں ہو؟“
”میں بس گھر پہنچنے ہی والا ہوں۔“ فرحان نے کہا۔
”تم نے آدھا گھنٹا پہلے شیراز سے بھی یہی کہا تھا۔“ جاوید نے کہا۔ ”وہ بھی میرے ساتھ ہی ہے۔ ہم لوگ تمہارے گھر پر بیٹھے ہیں۔“
فرحان گھر پہنچا تو شیراز اور جاوید دونوں اس کے انتظار میں بیٹھے تھے اور کافی پی رہے تھے۔
”واہ بھئی۔“ فرحان نے ہنس کر کہا۔ ”تم لوگ اکیلے ہی اکیلے کافی پی رہے ہو۔“
”تمہارے لیے بھی بن جائے گی۔“ شیراز نے ہنس کر کہا۔ ”تمہارے انتظار سے اکتا کر میں نے کافی بنائی تھی کہ جاوید بھی آ گیا۔“
اچانک شیراز کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون اٹھایا اور ان لوگوں سے کچھ دور چلا گیا۔ اس نے کسی سے مختصر سی بات کی، پھر واپس آ کر فرحان سے بولا۔
”سوری یار، امی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔“
”آنٹی کی کیا طبیعت خراب ہے شیراز؟“ فرحان نے پوچھا۔ ”ہم لوگ بھی چلیں؟“
”نہیں یار۔“ شیراز نے کہا۔ ”امی کو نہ جانے کیوں آج کل ڈپریشن کے دورے پڑ رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ دورے کی حالت میں بھی مجھے بلاتی ہیں۔“
”تم گھر جا کر آنٹی کی طبیعت کے بارے میں اطلاع ضرور دینا۔“ فرحان نے کہا۔
اس کے جانے کے بعد جاوید نے کہا۔ ”یار! بھابی کے اسکول کی ایک اور ٹیچر کے بارے میں معلوم ہوا ہے، اس کے پاس کچھ اہم اطلاعات ہیں لیکن وہ صرف تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“
”مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے تو میں کرلوں گا۔“ فرحان نے کہا۔ ”چلو اُس سے بھی مل لیں۔“

☆☆☆

نادیہ بہت ذہین اور پُرکشش لڑکی تھی۔ شاید وہ فرحان کو پہلے دیکھ چکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ مسکرا کر بولی۔
”مسٹر فرحان! میں نادیہ ہوں۔“ شمسہ کی بیسٹ فرینڈ۔“ پھر وہ چونک کر بولی۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ شمسہ کو قتل کیا گیا ہے۔ شمسہ کو بھی اور مسٹر حامد کو بھی۔“
”آپ کو کس سے معلوم ہوا؟“
”مجھے مسز حامد نے بتایا ہے۔ میں آج اُن کے گھر گئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے فرحان صاحب بھی آئے تھے۔“
”میں نے سنا ہے کہ تمہارے پاس کچھ اہم معلومات ہیں؟“
”ہاں، میں نے ایک ویڈیو بنائی تھی۔ شمسہ کی طرح مجھے بھی ہر ہر لمحے کی ویڈیو بنانے کا شوق ہے۔ شاید اس میں کوئی کام کی بات ہو۔“
”یہ تو ویڈیو دیکھ کر ہی معلوم ہوگا۔“ فرحان نے کہا۔
”میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ وہ تیزی سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ تھوڑی دیر بعد آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک یو ایس بی تھی۔
”میں نے اپنے کمپیوٹر سے وہ ویڈیو اس یو ایس بی پر شفٹ کر دی ہے۔ یہ اصل میں تین مختلف دنوں کی ویڈیوز ہیں۔ شاید آپ کے کسی کام آ جائیں۔“
”تھینک یو نادیہ۔“ فرحان نے کہا۔ ”میں اب چلوں گا۔“
وہ لوگ نادیہ کے گھر سے باہر نکلے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ نادیہ ڈیفنس کے فیز سیون میں رہتی تھی۔ وہ سڑک اس وقت بالکل سنسان تھی۔ مین روڈ کے ساتھ کمرشل ایریا تھا۔ لیکن وہاں بھی سناٹا تھا۔ وہ لوگ کمرشل ایریا سے آگے بڑھے تو سڑک دور دور تک سنسان تھی۔ اچانک سروس روڈ سے ایک بائیک سڑک پر آئی۔ اس پر دو افراد سوار تھے۔ دونوں کے سر پر ہیلمٹ تھے۔ ان کی جینز اور جوگرز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نوجوان ہیں۔ بائیک ایک دم گاڑی کے برابر آ گئی اور عقب میں بیٹھے ہوئے شخص نے اچانک گن نکال کر فرحان کو دکھائی اور اسے رکنے کا اشارہ کیا۔
”شٹ!“ فرحان نے جھنجلا کر کہا اور گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھا دی۔
بائیک کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔
”گاڑی روک دو فرحان۔“ جاوید نے گھبرا کر کہا۔ ”یہ لوگ فائر بھی کر دیتے ہیں۔“
”تمہارے پاس گن ہے؟“ فرحان نے پوچھا۔
”میرے پاس کوئی گن نہیں ہے۔“ جاوید نے کہا۔
بائیک ایک مرتبہ پھر اُن کے نزدیک آ گئی اور عقبی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے انہیں پھر رکنے کا اشارہ کیا اور انہیں مزید خوفزدہ کرنے کے لیے اپنی گن لوڈ کی۔

''گاڑی روک دو فرحان۔'' جاوید پھر چیخا۔ ''یہ لوگ صرف اچکّے ہیں۔ یہ موبائل فون اور ہمارے پرس لے کر چلے جائیں......'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ فرحان نے گاڑی کا اسٹیئرنگ تھوڑا سا گھما کر بائیک کو ٹکر ماری تھی۔ تیز رفتاری سے چلتی ہوئی بائیک کا توازن بگاڑنے کے لیے ہلکا سا ایک دھکا ہی کافی ہوتا ہے۔ کہاں لینڈ کروزر جیسی بھاری گاڑی کی ٹکر۔ بائیک، گاڑی کی ٹکر سے ساٹھ کے زاویے میں سڑک پر دائیں طرف گئی، پھر سڑک کے درمیان آئی لینڈ سے بری طرح ٹکرائی اور اس کے دونوں سوار گویا ہوا میں اُڑتے ہوئے سڑک کی دوسری جانب گرے اور گھسٹتے ہوئے دور تک چلے گئے۔ یہ بھی ان لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ مخالف سمت سے کوئی گاڑی نہیں آرہی تھی ورنہ ان دونوں اچکّوں کو روندتی ہوئی گزر جاتی۔

فرحان نے برا سا منہ بنایا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پھر جاوید سے بولا۔ ''یار، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم پسٹل دیکھ کر اتنے خوف زدہ ہو جاتے ہو؟''

''تم شاید اخبارات نہیں پڑھتے یا پھر ٹی وی پر نیوز بلیٹن نہیں دیکھتے۔'' جاوید منہ بنا کر بولا۔ ''یہ اچکّے محض دو ہزار کے سیل فون کی خاطر بھی لوگوں کو مار دیتے ہیں۔ یہ بزدلی نہیں بلکہ احتیاط پسندی ہے۔''

''یہ کون لوگ ہو سکتے تھے؟'' فرحان پُرخیال انداز میں بولا۔ ''اب مجھے یاد آرہا ہے کہ جب ہم نادیہ کے گھر سے نکل کر مین روڈ پر آئے تو ایک بائیک سروس روڈ پر ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس بائیک کے ہیڈ لیمپس آف تھے۔''

''وہ لوگ ابھی وہیں پڑے ہوں گے۔'' جاوید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''واپس جا کر اُن ہی سے پوچھ لیں کہ بھیا کون ہو اور بغیر تعارف کے ہماری جان کے لاگو کیوں ہو رہے تھے؟''

فرحان نے ایک دم بریک لگا دیے۔ ''ہاں یار، ہم اُن سے بھی تو معلوم کر سکتے تھے۔''

اس نے گاڑی کو یوٹرن دینے کی کوشش کی تو جاوید جلدی سے بولا۔ ''یار! تم مجھے یہیں اتار دو، پھر اُن سے پوچھ گچھ کرتے رہنا۔''

''اترو۔'' فرحان نے سنجیدگی سے کہا اور گاڑی کے دروازے کا لاک کھول دیا۔

جاوید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یار! پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' جاوید نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم کیا خود کو بہت بڑے طرم خان سمجھتے ہو؟''

فرحان بے ساختہ ہنسنے لگا۔ ''یار! تم تو واقعی سنجیدہ ہو گئے۔ میں ان سے پوچھ گچھ نہیں کرنا چاہتا، بس یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون تھے۔ ظاہر ہے گرنے کے بعد ان کے ہیلمٹ تو سر پر نہیں ہوں گے۔ وہ ٹھیک ٹھاک زخمی ہوئے ہوں گے، کیونکہ سڑک پر دور تک منہ کے بل اسکیٹنگ کرتے ہوئے گئے تھے۔''

وہ جگہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ مشکل سے پانچ منٹ میں فرحان دوبارہ وہاں پہنچ گیا لیکن وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ بائیک تھی، نہ اس کے دونوں سوار۔ بائیک جس ٹریفک آئی لینڈ سے ٹکرائی تھی اس کے نزدیک البتہ کچھ شیشے بکھرے ہوئے تھے۔ وہیں تیل کا ایک دھبا بھی تھا جو یقیناً بائیک کا آئل گرنے سے روڈ پر بن گیا تھا۔ پھر فرحان نے اس جگہ کا جائزہ لیا جہاں دونوں اچکّے گرے تھے۔ کچھ فاصلے پر فرحان کو کوئی چمک دار چیز نظر آئی۔ اس نے جھک کر دیکھا، وہ ایک لائٹر تھا۔ فرحان نے اسے آن کیا تو اس میں سے شعلہ لپکا اور ساتھ ہی موسیقی سنائی دی۔ اس نے الٹ پلٹ کر لائٹر کا جائزہ لیا، پھر اسے جیب میں رکھ لیا۔ اب اسے اس گن کی تلاش تھی جو اس اچکّے کے ہاتھ سے گری تھی۔ فرحان کے اندازے کے مطابق گن اسی وقت گری ہو گی جب فرحان نے بائیک کو ٹکر ماری تھی۔ بہت تلاش کرنے کے بعد بھی انہیں وہ گن نہ مل سکی۔

''وہ گن یا تو اچھل کر کہیں دور جا گری ہے یا پھر اچکّے اسے اٹھا کر لے گئے۔'' جاوید نے کہا۔

فرحان نے گاڑی میں بیٹھ کر ایک مرتبہ پھر یوٹرن دیا اور تیز رفتاری سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر فرحان نے جاوید سے کہا۔ ''میرا خیال ہے اس بھاگ دوڑ میں تم بھی تھک گئے ہو گے اس لیے میں تم سے بیٹھنے کو نہیں کہوں گا۔''

''تم شاید بھول گئے کہ تم نادیہ سے ایک ویڈیو فلم لے کر آئے ہو۔'' جاوید نے کہا۔ ''میں وہ فلم دیکھے بغیر نہیں جاؤں گا۔''

فرحان نے طویل سانس لیا اور بولا۔ ''آجاؤ۔''

''یار! تم نے دن بھر کچھ کھایا بھی ہے؟'' جاوید نے لاؤنج میں پہنچ کر پوچھا۔

''میں نے کچھ نہیں کھایا ہے اور کچھ کھانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا ہے۔''

"میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ میں نے تو شام کو چائے کے ساتھ بہت کچھ کھا لیا تھا۔"

"کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فریج میں انڈے، مکھن اور ڈبل روٹی موجود ہے۔ میں سینڈوچز بنالوں گا۔"

"تم فریش ہو جاؤ۔" جاوید نے کہا۔ "سینڈوچز اور کافی میں بنالیتا ہوں۔"

وہ نہا دھو کر تازہ دم ہو کے کمرے سے باہر نکلا تو جاوید سینڈوچز اور کافی لیے اس کا منتظر تھا۔

کھانے کے دوران میں فرحان نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور نادیہ سے لی ہوئی یو ایس بی اس میں لگا دی۔

اچانک مووی چلنا شروع ہو گئی۔ اس میں شمسہ کچھ ساتھی ٹیچرز کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔

"اسے ذرا زوم کرو۔" فرحان نے کہا اور کافی کا گھونٹ لیا۔

جاوید نے اسے زوم کر دیا۔ وہ بھی اسکول کی کوئی تقریب تھی۔ اسکول کے بچے اور بچیاں صاف ستھری چمکتی ہوئی یونیفارم میں گھوم رہے تھے۔

کیمرا گھوم کر اسٹیج کی طرف گیا۔ وہاں کسی فارماسوٹیکل کمپنی کے بینر لگے تھے اور کمپنی کی چند پروڈکٹ کے پوسٹرز بھی اسٹیج پر لگے تھے۔

"یہ کون سی کمپنی ہے؟" فرحان نے کہا۔ "آرائن فارما؟"

"یہ چھوٹی سی ایک لوکل کمپنی ہے۔" جاوید نے کہا۔ "ان کی پروڈکٹس بھی کوئی ایسی خاص نہیں ہیں۔"

پھر اسٹیج پر خوش لباس اور خوش وضع شخص نظر آیا اور غائب ہو گیا۔

"اس شخص کو جانتے ہو؟" فرحان نے پوچھا۔ "تم نے بھی تو کئی برسوں تک ایک فارماسوٹیکل کمپنی میں جاب کی ہے۔"

"ہاں، شاید میں اسے جانتا ہوں۔" جاوید نے کہا۔ "یہ یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔"

پھر تقریب کا آغاز ہو گیا اور ایک بچہ تلاوت قرآن پاک کرنے لگا۔ ہال میں موجود خواتین اور لڑکیوں کے سروں پر دوپٹے تک گئے۔ بہت سی خواتین نے سر پر ساڑی اور دوپٹوں کے برائے نام پلو لے کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ پھر خوب صورت سی ایک لڑکی اسٹیج پر آئی اور خصوصی مہمان کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔

مہمانِ خصوصی کو دیکھ کر فرحان بری طرح چونکا۔ وہ شہر کا ایک بدنام گینگسٹر تھا۔ اب دو سال سے بدمعاشی چھوڑ کر سیاست دان بن گیا تھا۔ وہ سفاری سوٹ میں ملبوس تھا اور اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے مہمانوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اسی وقت کیمرے نے شمسہ کو کور کیا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ وہ نفرت بھرے انداز میں دلاور خان کو دیکھ رہی تھی۔ فرحان جانتا تھا کہ وہ زیرِ زمین دنیا میں ڈی کے (DK) کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے رابطے اب بھی انڈر ورلڈ سے تھے لیکن چہرے پر سیاست کا نقاب ڈال کر خود کو معزز سمجھ رہا تھا۔

اسے ڈائس پر آنے کی دعوت دی گئی۔ بچوں نے اس کے استقبال پر زوردار تالیاں بجائیں۔

دلاور نے اردگرد کا جائزہ لیا، پھر ڈائس تک پہنچا اور بولا۔ "سب کو میری طرف سے السلام علیکم۔ میں اسکول انتظامیہ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اتنی عزت دی۔ میں ڈاکٹر شکور الٰہی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جو نہ صرف کم قیمت اور معیاری دوائیں بنا رہے ہیں بلکہ ہر چھ مہینے بعد کراچی کے اسکولوں میں مفت ادویات بانٹتے ہیں۔ آج بھی ڈاکٹر صاحب کمپنی کے تیار کردہ آئی ڈراپس یہاں لائے ہیں۔"

فلم کا منظر اچانک بدل گیا۔ اسٹیج پر دو بچیاں نظر آ رہی تھیں۔ دلاور نے آئی ڈراپ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور کیمرے کی طرف دیکھ رہا تھا گویا تصویر بنوا رہا ہو۔ پھر ایک بچی کو اپنے نزدیک بلایا اور جھک کر اس کی آنکھوں میں ڈراپ ڈالنے کی کوشش کی۔

اسی وقت شمسہ بھاگ کر اسٹیج پر پہنچی اور چیخ کر بولی۔ "ٹھہر جائیں، یہ آئی ڈراپس نہیں ہیں بلکہ پولیو کے قطرے ہیں۔"

ڈاکٹر نے چونک کر شمسہ کو دیکھا۔ دلاور کے چہرے پر بھی ناگواری تھی۔ پھر اس نے خود پر قابو پالیا اور بولا۔ "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میڈم، یہ آئی ڈراپس ہی ہیں۔" وہ ڈاکٹر کی طرف مڑا۔ "ڈاکٹر صاحب! ذرا چیک کر کے بتائیں، یہ کون سے ڈراپس ہیں۔"

"یہ آئی ڈراپس ہی ہیں سر۔" ڈاکٹر نے کہا۔

دلاور نے ڈراپس کی وائل اس کے ہاتھ سے لی اور بچی کی آنکھوں میں ڈراپس ڈال دیے۔ اس نے باری باری تین بچوں کی آنکھوں میں ڈراپس ڈالے اور مسکراتا ہوا اسٹیج سے اتر گیا۔

فرحان نے الجھ کر پوچھا۔ ”اس کا مقصد کیا تھا؟“

”میں اس بارے میں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ آرائین فارما نے چھ مہینے پہلے یہ آئی ڈراپس امپورٹ کیے تھے لیکن ان میں خامی تھی۔ ان ڈراپس کے اثر سے آنکھوں کی تکلیف وقتی طور پر تو ختم ہو جاتی تھی لیکن اس کے اثرات دو گھنٹے بعد شروع ہوتے تھے۔ آنکھوں میں سوزش ہو جاتی تھی۔ بینائی پر اثر پڑتا تھا بلکہ دوا کے ٹیسٹ کے دوران میں کچھ لوگوں کی بینائی بھی جاتی رہی۔ وہ غریب لوگ تھے۔ کمپنی نے پیسے دے کر ان کا منہ بند کر دیا۔ کمپنی کا کروڑوں روپیہ ان ڈراپس کی امپورٹ میں پھنسا ہوا تھا۔ اب انہوں نے دلاور کو ساتھ ملایا ہوگا اور ممکن ہے اس میں ہیلتھ منسٹری کے کچھ لوگ بھی شریک ہوں۔ اسکول کے بچوں پر تجربہ کرنے کا مقصد صرف یہ رہا ہوگا کہ لوگوں کو یہ باور کرایا جا سکے کہ یہ ڈراپس بے ضرر ہیں۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”تم نے مووی روک کیوں دی۔ آگے بھی تو دیکھو۔“

فرحان نے دوبارہ پلے کا بٹن دبا دیا۔ اب اسکرین پر اسکول کی پرنسپل نظر آ رہی تھی۔ اس کے سامنے شمسہ اور جابر بیٹھے تھے۔ شمسہ نے اس سے کہا۔ ”میڈم! جن بچوں کی آنکھوں میں ڈراپس ڈالے گئے تھے، ان تینوں کی بینائی ختم ہو گئی ہے اور ان کی آنکھوں میں بھی شدید تکلیف ہے۔“

”ہاں، مجھے بھی اطلاع ملی ہے اور میں نے ڈاکٹر شکور کو بلایا ہے۔“ اسی وقت ڈاکٹر شکور کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دلاور اور اس کے دو چمچے بھی تھے۔

پرنسپل نے ناگواری سے انہیں دیکھا اور بولی۔ ”میں نے صرف ڈاکٹر شکور کو بلایا تھا۔ آپ نے کیوں زحمت کی دلاور صاحب؟“

”میڈم!“ دلاور نے چبا چبا کر کہا۔ ”اب ہماری شکل اتنی بری تو نہیں ہے کہ لوگ ہمیں برداشت نہ کریں۔“ پھر اس کی نظر شمسہ پر پڑی اور وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”اوہو، یہاں تو بڑے بڑے لوگ موجود ہیں۔“

”میں آپ سے بعد میں بات کروں گی میڈم۔“ شمسہ نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈاکٹر شکور اور دلاور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پرنسپل نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! اس دوا کے استعمال سے بچوں کی بینائی چلی گئی ہے۔“

”مجھے بہت افسوس ہوا میڈم۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”لیکن بچے اس دوا سے اندھے نہیں ہوئے۔“

”چھوڑیں میڈم، کس بحث میں پڑ گئیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”میں نے آپ کے بنگلے پر گفٹ بھجوا دیا ہے۔ بس سب بھول جائیں۔“ پھر وہ لہجہ بدل کر بولا۔ ”اور سنیں، پولیس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ بچوں کے والدین اس بات سے انکار کر دیں گے کہ ان کے بچے کو کوئی نقصان پہنچا ہے۔“ دلاور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اور ہاں۔“ وہ جاتے جاتے بولا۔ ”اگر آپ سیدھی طرح سے نہ مانیں تو ہمیں دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔“

”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟“ پرنسپل نے ناگواری سے کہا۔

”میں تو آپ کے بھلے کی بات کر رہا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکل گیا۔

اس کے ساتھ ہی نادیہ کی بنائی ہوئی مووی بھی ختم ہو گئی۔

جاوید نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ”یار بہت دیر ہو گئی۔ اب میں چلتا ہوں۔“

”دیر سویر سے تجھے کیا لینا؟“ فرحان نے کہا۔ ”تیرے کون سے بچے رو رہے ہوں گے۔ اب یہیں سو جا۔ میں تجھے اپنا سلیپنگ سوٹ دے دیتا ہوں۔“

دوسری صبح فرحان کی آنکھ جاوید کے جھنجوڑنے سے کھلی۔ اس نے درشت لہجے میں جاوید سے پوچھا۔ ”کیا زلزلہ آ گیا ہے یا تمہیں قیامت کے آنے کی اطلاع ملی ہے؟“

”زلزلہ ہی سمجھ لو۔“ جاوید نے کہا۔ ”کسی نے کل رات کومل کو اغوا کر لیا ہے۔“

فرحان اچھل پڑا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے جاوید سے پوچھا۔

”ٹی وی کھلا ہوا ہے۔“ جاوید نے کہا اور ہر نیوز چینل سے یہی بریکنگ نیوز چل رہی ہے۔“

فرحان کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ وہ لاؤنج میں جا کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔ ہر چینل یہی خبر دے رہا تھا کہ چینل K-24 کے سی ای او آغا افتخار کی بیٹی اور K-24 کی ڈائریکٹر کومل آغا کو رات کو ان کے گھر سے اغوا کر لیا گیا۔ اغوا کرنے والے دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے۔ ان کے دونوں گارڈز کو بے بس کیا اور انہیں بہت آسانی سے اغوا کر کے لے گئے۔

فرحان نے بہت عجلت میں کپڑے بدلے اور آفس کی طرف بھاگا۔ پورے آفس میں افراتفری کا عالم تھا۔ چینل بار بار کومل کے اغوا کی خبر نشر کر رہا تھا۔

نیوز ہیڈ سرور بھی بہت مصروف تھا۔ وہ ہیڈ فون کانوں پر چڑھائے بیٹھا تھا۔ فرحان کو معلوم ہوا کہ آغا صاحب لندن میں ہیں اور شام کو چارٹرڈ طیارے کے ذریعے پاکستان پہنچ رہے ہیں۔

چینل کا ڈائریکٹر مارکیٹنگ احسان بھی پریشان نظر آرہا تھا۔ وہ سینئرز ڈائریکٹر میں سے ایک تھا اور بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ آغا صاحب یہ صدمہ برداشت نہیں کرسکیں گے۔ وہ بیٹی کو اپنی جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔ وہ تو جیتے جی مرجائیں گے۔''

''اغوا کرنے والوں کی طرف سے کوئی مطالبہ سامنے آیا؟'' فرحان نے پوچھا۔

''انہوں نے تو اب تک رابطہ ہی نہیں کیا ہے۔ یہ بھی پولیس کا مفروضہ ہے کہ کومل کو اغوا کیا گیا ہے کیونکہ بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔'' پھر وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''کومل سے ملنے والے آخری شخص آپ ہیں مسٹر فرحان! آپ ہی کچھ بتا سکتے ہیں۔''

''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں نے آٹھ بجے کے قریب کومل کو گھر ڈراپ کردیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ میں کیسے جان سکتا ہوں؟''

تھوڑی دیر بعد پولیس کا ایک ایس پی اور دو سب انسپکٹرز آفس میں داخل ہوئے۔

''آیئے ایس پی صاحب۔'' احسان نے کہا۔ ''میں آپ ہی کا انتظار کررہا تھا۔''

ایس پی نے کمرے کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ''یہ فرحان کون ہے؟''

''میں ہوں فرحان۔'' فرحان نے کہا۔

''مجھے آپ کا اسٹیٹ منٹ لینا ہے۔ کومل کو آخری دفعہ آپ نے دیکھا ہے۔''

''کومل کو آخری دفعہ میں نے نہیں، اس کے گارڈز نے اور گھریلو ملازمین نے دیکھا ہے آفیسر۔'' فرحان نے کہا۔ ''آپ پوچھیں، مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''آپ نے کومل کو کس وقت گھر ڈراپ کیا تھا؟''

''تقریباً آٹھ بجے کے قریب۔'' فرحان نے کہا۔ ''میں نے اس وقت گھڑی نہیں دیکھی تھی لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس وقت یہی ٹائم ہوا تھا۔''

''آپ کے پاس گاڑی کون سی ہے؟'' ایس پی نے اچانک پوچھا۔

''میری گاڑی ایک حادثے میں تباہ ہوگئی ہے اس لیے میں کومل کی گاڑی استعمال کررہا ہوں۔'' فرحان نے جواب دیا۔

''کب سے استعمال کررہے ہیں؟'' ایس پی نے پوچھا۔

''کل جب کومل میرے پاس آئی تھی تو اس نے اپنی گاڑی مجھے دے دی تھی۔ میں اسی لیے اسے ڈراپ کرنے گیا تھا۔''

''آپ کل آٹھ اور دس بجے کے درمیان کہاں تھے؟'' ایس پی نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''میں اپنے ایک دوست جاوید کے ساتھ تھا۔ ہم دونوں شمسہ کی ایک کولیگ نادیہ کے گھر گئے تھے۔''

''کیوں؟'' ایس پی نے یوں پوچھا جیسے نادیہ کے گھر جانا بھی جرم ہو۔

''میرا کچھ ذاتی کام تھا۔'' فرحان نے جواب دیا۔ ''وہاں سے واپسی پر بھی جاوید میرے ساتھ تھا۔ صبح جاوید ہی نے مجھے نیند سے جگا کر بتایا تھا کہ مس کومل کو اغوا کرلیا گیا ہے۔''

''اوکے مسٹر فرحان۔'' ایس پی نے کہا۔ ''لیکن آپ شہر چھوڑ کر مت جایئے گا۔ اگر جانا ضروری ہو تو مجھے انفارم کرکے جایئے گا۔''

''کیا آپ مجھ پر کسی قسم کا شبہ کررہے ہیں؟'' فرحان نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ہماری تفتیش شبے ہی کے ذریعے آگے بڑھتی ہے مسٹر فرحان۔'' ایس پی سرد لہجے میں بولا۔ ''میں کسی پر بھی شبہ کرسکتا ہوں۔ وہ احسان صاحب ہوں یا آغا صاحب۔'' وہ احسان سے مل کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر فرحان! ہمیں کسی بھی وقت آپ کی دوبارہ ضرورت پڑسکتی ہے۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے دونوں سب انسپکٹر روبوٹس کی طرح اس کے پیچھے لپکے۔

ان کے جانے کے بعد فرحان نے احسان سے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے احسان صاحب؟''

''یہ پولیس کی تفتیش کا انداز ہے۔'' احسان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

فرحان وہاں سے اٹھ کر اپنے روم میں پہنچا تو اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس کی الماری اور درازوں کی تلاشی لی گئی تھی۔ اس کا لیپ ٹاپ بھی غائب تھا۔ فرحان نے اپنی پی اے کو آواز دی۔ ''نورین!''

نورین سہمی ہوئی سی کمرے میں داخل ہوئی، وہ معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔ ''لیں سر۔''

''میرے کمرے کی تلاشی کس نے لی ہے؟'' فرحان بپھر کر بولا۔

''سر! آپ کے آنے سے پہلے یہاں پولیس آئی تھی۔ جس وقت آپ احسان صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ دو پولیس والے آپ کے کمرے کی تلاشی لے رہے تھے۔''

''میرا لیپ ٹاپ کہاں ہے؟'' فرحان نے پوچھا۔

''وہ...... تو...... پولیس والے لے گئے۔'' نورین نے جواب دیا۔

''کس کی اجازت سے؟'' فرحان کا پارا چڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''یہ تو آپ کو احسان صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔'' نورین نے کہا۔

وہ غصے میں بھرا ہوا احسان کے کمرے میں پہنچا۔ وہ اس وقت کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

فرحان کو دیکھتے ہی بولا۔ ''جی فرحان صاحب۔''

''میرے کمرے کی تلاشی کس نے لی ہے؟'' فرحان نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''یہ پولیس کا کام ہے، میں تو آپ کے کمرے کی تلاشی لینے سے رہا۔ پولیس آپ پر میڈم کے اغوا کا شبہ کر رہی ہے۔''

''پولیس کے پاس تلاشی کا وارنٹ تو ہوگا نہیں۔'' فرحان چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''انہیں آپ ہی نے تلاشی کی اجازت دی ہوگی۔''

''میں اگر اجازت نہ دیتا تو وہ سرچ وارنٹ لے آتے۔'' احسان نے سرد لہجے میں کہا۔

فرحان غصے میں وہاں سے نکلا اور اپنے آفس میں بیٹھنے کے بجائے باہر نکل گیا۔

شام تک اغوا کرنے والوں نے کسی سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ رات کو دس بجے تک آغا صاحب پاکستان پہنچ گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے فرحان کو گھر بلوا لیا۔

آغا صاحب نے بھی فرحان سے وہی کچھ پوچھا جو پولیس پوچھ چکی تھی لیکن ان کا انداز مختلف تھا۔

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔ ''میں نے اس لڑکی سے کتنا کہا کہ اس بنگلے میں تنہا نہ رہے لیکن وہ تو کوئی بات سنتی ہی نہیں تھی۔''

دو سال پہلے کومل نے ضد کر کے وہ بنگلا لیا تھا اور اس میں شفٹ ہوگئی تھی۔ وہ فرحان سے کہتی تھی کہ میں گھر میں اکثر دوستوں کی پارٹیز کرتی رہتی ہوں، ہلا گلا ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے ڈیڈی ڈسٹرب ہوں۔ وہ پہلے ہی شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔

آغا صاحب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ان کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے اسکرین پر نظر ڈالی پھر خود کلامی کے انداز میں بولے۔ ''یہ کون ہے؟'' انہوں نے بٹن دبا کر کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو...... جی ہاں بول رہا ہوں۔ ہیلو...... تم کومل کے بارے میں کیا جانتے ہو......؟ نہیں ایسا کچھ نہیں ہوگا...... ہیلو......'' انہوں نے سیل فون کو دیکھا۔ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

''کون تھا؟'' فرحان نے بے تابی سے پوچھا۔

''کومل کو اغوا کرنے والے کی کال تھی۔ اس نے کہا ہے کہ کومل ہمارے قبضے میں ہے، میں دس منٹ بعد پھر کال کروں گا۔ پولیس کو انفارم مت کرنا ورنہ تمہاری بیٹی کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''مجھے ذرا وہ نمبر بتائیں جس سے کال آئی تھی۔'' فرحان نے کہا۔ ''میں ابھی معلوم کر لیتا ہوں کہ یہ کال کہاں سے کی گئی تھی۔''

آغا صاحب نے اپنے سیل فون سے وہ نمبر نکالا اور فرحان کو نوٹ کرا دیا، پھر بولے۔ ''فرحان! کوئی ایسی بات مت کرنا جس سے کومل کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔''

''میں سمجھتا ہوں آغا صاحب۔''

اسی وقت احسان، نیوز ڈائریکٹر سرور اور پولیس کا ایس پی وہاں پہنچ گئے۔

''آغا صاحب!'' ایس پی نے کہا۔ ''کیا اغوا کرنے والوں نے آپ سے رابطہ کیا؟''

''نہیں۔'' آغا صاحب نے جواب دیا۔

اسی وقت پھر ان کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ آغا صاحب معذرت کر کے وہاں سے اٹھ گئے۔ وہ برآمدے میں جا کر سیل فون پر بات کرتے رہے، پھر بوجھل قدموں سے واپس ڈرائنگ روم میں آگئے۔

فرحان نے بہت غور سے ان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ کچھ مضطرب نظر آ رہے تھے۔

ایس پی تھوڑی دیر بعد اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''آغا صاحب! اغوا کرنے والے آپ سے رابطہ کریں تو آپ پہلی فرصت میں ہمیں انفارم کیجیے گا۔'' وہ فرحان کو گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔

آغا صاحب خاموشی سے خلا میں تکتے رہے۔
''فرحان!'' انہوں نے فرحان کو مخاطب کیا۔ ''ملازم سے کہو، ان لوگوں کے لیے کافی بنا دے، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔''
''اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے آغا صاحب۔'' احسان نے جلدی سے کہا۔ ''ہم لوگ بھی اب چلیں گے۔'' احسان اور سرور اٹھ کھڑے ہوئے۔
سرور نے پوچھا۔ ''فرحان صاحب! آپ نہیں چل رہے؟''
''مجھے آغا صاحب سے ایک ضروری کام ہے۔''
وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد آغا صاحب نے فرحان سے کہا۔ ''اغوا کرنے والوں کا فون آیا تھا۔ انہوں نے پانچ کروڑ کی ڈیمانڈ کی ہے۔ وہ کچھ دیر بعد پھر کال کریں گے۔''
اچانک آغا صاحب کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔
''یہ اغوا کرنے والوں کی کال ہوگی۔'' فرحان نے کہا۔ ''آپ اسپیکر آن کر دیجیے گا۔''
''آغا صاحب نے کال ریسیو کی اور سیل فون کا اسپیکر آن کر دیا۔
''ہیلو۔'' دوسری طرف سے کرخت آواز سنائی دی۔ صاف لگ رہا تھا کہ بولنے والا آواز بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ''آپ نے کیا فیصلہ کیا آغا صاحب؟''
''اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنے میں کچھ تو وقت لگے گا۔'' آغا صاحب نے کہا۔
''ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک دن کی مہلت دیتا ہوں۔ کل شام تک کیش کا بندوبست کر لو۔ میں بعد میں کال کر کے بتا دوں گا کہ رقم کب اور کہاں پہنچانا ہے۔''
اچانک فرحان نے کہا۔ ''آواز بدلنے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔''
''بکواس مت کرو۔'' اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔
''ہیلو...... ہیلو......'' آغا صاحب مضطرب ہو کر بولے۔ ''اس نے لائن کیوں کاٹ دی، کیا تم اُسے پہچان گئے ہو؟''
''نہیں سر، میں اس سے بلف کر رہا تھا۔ اس بلف سے وہ ایک دم گھبرا گیا۔''
آغا صاحب کمرے میں ٹہلتے رہے اور سگار پیتے رہے۔
''آپ بیٹھ جائیں سر! تھک گئے ہوں گے۔''
''تمہیں یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ تم اُسے پہچان گئے ہو؟'' آغا صاحب جھنجلا کر بولے۔ ''اس نے آدھے گھنٹے بعد کال کرنے کو کہا تھا۔ اب تو ڈھائی گھنٹا ہو چکا ہے۔''
اسی وقت ایک گارڈ بھاگتا ہوا آیا اور ہیجانی انداز میں بولا۔ ''صاحب دروازے پر ایک لاش پڑی ہے۔ کسی گاڑی میں سے اسے ابھی پھینکا گیا ہے۔''
آغا صاحب چیخ کر بولے۔ ''مردود، یہ تو دیکھ لیتا کہ کس کی لاش ہے اور اس کا ہم سے کیا تعلق ہے جو اسے ہمارے گیٹ پر پھینکا گیا ہے۔'' آغا صاحب باہر نکلے تو دوسرا گارڈ سامنے سے آیا اور بولا۔
''آغا صاحب! مجھے تو لگ رہا ہے کہ وہ کومل بی بی ہیں۔''
''کیا بک رہے ہو؟'' آغا صاحب نے چیخ کر کہا اور باہر کی طرف لپکے۔ فرحان بھی ان کے ساتھ تھا۔
مین گیٹ کے پاس ایک لاش پڑی تھی۔ فرحان نے اس کے بال دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ کومل ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کومل کا جائزہ لینے لگا۔
کومل کے پپوٹوں میں خفیف سی حرکت ہوئی تو فرحان چیخ کر بولا۔ ''آغا صاحب! یہ ابھی زندہ ہے۔'' اس نے ایک گارڈ سے کہا۔ ''تم فوراً ایمبولینس کو فون کرو۔'' پھر اس نے جھک کر کومل کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا اور تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔
''ایمبولینس نہ جانے آنے میں کتنی دیر لگائے گی۔'' آغا صاحب نے کہا۔ ''اسے میری گاڑی میں لے چلو۔'' وہ چیخ کر بولے۔ ''ڈرائیور گاڑی نکالو۔''

☆☆☆

کومل کے جسم پر زیادہ گہرے زخم نہیں تھے۔ بس ہاتھوں اور پیروں پر خراشیں تھیں۔ وہ ہوش میں تو تھی لیکن خوف زدہ تھی۔ آغا صاحب نے اس سے پوچھا۔ ''بیٹا! تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''
''ڈیڈی!'' کومل نے آہستہ سے کہا۔ ''میں سونے کے لیے لیٹی تھی کہ اچانک مجھے باہر سے ہلکے سے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ ایسا لگا جیسے کوئی دھم سے کودا ہو۔ پھر اچانک دو آدمی میرے کمرے میں گھس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں اور چہروں پر نقاب تھے۔
میں نے چیخنے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک نے

میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ''چیخنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ تمہارے دونوں گارڈ بے ہوش پڑے ہیں اور تمہارے ملازم ایک کمرے میں بند ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے ایک رومال نکال کر میرے منہ اور ناک پر رکھ دیا پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔''

''تم وہ جگہ پہچان سکتی ہو جہاں انہوں نے تمہیں رکھا تھا؟'' فرحان نے کہا۔

''وہ عجیب سا کمرا تھا۔ اس کی دیواروں اور چھت پر پلاستر نہیں تھا، فرش بھی جگہ جگہ سے اُدھڑا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی فرنیچر بھی نہیں تھا۔ وہاں صرف پرانی سی ایک دری بچھی ہوئی تھی۔''

''آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ جگہ کہاں ہو سکتی ہے؟''

''یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں۔'' کومل نے کہا۔

''پھر انہوں نے آپ کو چھوڑا کیسے؟''

''ان میں سے ایک نے ڈیڈی سے سیل فون پر بات کی تھی اور ان سے پانچ کروڑ کی ڈیمانڈ کی تھی۔''

''میں نے وہ سیل نمبر معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ نمبر کس کے نام پر ہے۔'' فرحان نے کہا۔

''پھر آغا صاحب نے ان کی بات کا کیا جواب دیا؟'' ایس پی نے پوچھا۔

''ڈیڈی نے شاید سیل فون کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ جس وقت وہ آدمی ڈیڈی سے پیسوں کی بات کر رہا تھا، اچانک نہ جانے اُسے کیا ہوا کہ اس نے سیل فون آف کر دیا۔''

ایس پی نے آغا صاحب کی طرف دیکھا۔ آغا صاحب نے کہا۔ ''اسی وقت اچانک فرحان نے اس سے کہا تھا کہ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ وہ بولتے بولتے ایک دم خاموش ہو گیا اور اس نے لائن کاٹ دی۔''

''شاید وہ اسی بات سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے دوبارہ مجھے بے ہوش کر دیا۔ پھر مجھے ہوش آیا تو میں یہاں تھی۔'' کومل نے کہا۔

''آپ اس شخص کو پہچان گئے تھے؟'' ایس پی نے فرحان سے پوچھا۔

''میں نے تو بلف کیا تھا۔'' فرحان نے کہا۔ ''اس کی اس حرکت سے اب مجھے لگ رہا ہے کہ میں شاید اُسے جانتا ہوں اور وہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ ورنہ یوں خوف زدہ نہ ہوتا۔''

پھر ایس پی کومل سے گھما پھرا کر مختلف سوالات کرتا رہا لیکن اس نے مزید کچھ نہیں بتایا۔

ایس پی کے حلق سے کومل کی یہ کہانی ہضم نہیں ہوئی تھی۔ فرحان کو بھی اس کہانی میں جھول نظر آ رہا تھا لیکن کومل بہ ضد تھی کہ اس کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ وہ ایسی کوئی خاص زخمی بھی نہیں تھی۔ اسپتال میں چوبیس گھنٹے رہنے کے بعد وہ گھر آ گئی۔ آغا صاحب نے اس دفعہ اسے اپنے ہی ساتھ رکھا تھا۔

فرحان کے ہاتھ بھی کوئی سرا نہیں آ رہا تھا جس کے ذریعے وہ شمسہ کے قاتلوں کو پکڑتا۔ اس نے بھی عہد کر لیا تھا کہ جب تک شمسہ کے قاتلوں کو پکڑ نہیں لوں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔

اس دن وہ آفس سے لوٹا ہی تھا کہ کومل آ گئی اور بولی۔ ''سر! آپ تو آج کل پتا نہیں کہاں بزی ہیں۔ آپ کے پاس میرے لیے ٹائم نہیں ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے کومل۔'' فرحان نے کہا۔ ''وہ دراصل آج کل آفس میں......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی بج اٹھی تھی۔

فرحان نے ریسیور اٹھایا اور بولا۔ ''ہیلو۔''

''فرحان صاحب!'' دوسری طرف سے کسی مرد کی آواز آئی۔

''جی ہاں، بول رہا ہوں۔'' فرحان نے کہا۔ ''آپ کون؟''

''اس بات کو چھوڑیں کہ میں کون ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کی وائف کے قاتلوں کا کوئی سراغ ملا؟''

''ابھی تک تو نہیں ملا ہے لیکن جلد ہی مل جائے گا۔''

''میرے پاس کچھ اہم معلومات ہیں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''آپ اپنی وائف کے قاتلوں تک پہنچ جائیں گے۔''

''ہاں تو بتائیں کون ہے شمسہ کا قاتل؟''

''ایسے نہیں فرحان صاحب!'' دوسری طرف سے بولنے والا شاید ہنسا بھی تھا۔ ''آپ کو ان معلومات کے لیے پیسے خرچ کرنا پڑیں گے۔''

''ہاں، بولیں، کتنے پیسے چاہئیں آپ کو؟''

''ایک لاکھ روپے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''ایک لاکھ؟'' فرحان نے دہرایا۔ ''رقم تو بہت زیادہ ہے۔''

”تو پھر آپ سے ڈیل نہیں ہوسکتی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک لاکھ تو کیا پانچ لاکھ بھی آسانی سے دے سکتے ہیں لیکن میں نے آپ کی مجبوری کا فائدہ نہیں اٹھایا۔“

”او کے۔“ فرحان نے کہا۔ ”چلیں ایک لاکھ ہی سہی۔ آپ مجھے کہاں ملیں گے؟“

”آپ پیسے لے کر کلفٹن تین تلوار پر آجائیں۔ میں آپ کو تین تلوار کے سامنے والے اسنیک بار میں ملوں گا۔“

”لیکن میں آپ کو پہچانوں گا کیسے؟“

”اس کی فکر مت کریں۔ میں آپ کو پہچانتا ہوں، کل ٹھیک ساڑھے سات بجے میں وہاں آپ کا انتظار کروں گا۔“

”او کے، میں پہنچ جاؤں گا۔“ فرحان نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

”کس کا فون تھا؟“ کومل نے پوچھا۔

فرحان نے اسے تفصیل سے بتا دیا۔

”سر! مجھے تو یہ کوئی فراڈ لگ رہا ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ آپ شمسہ کے قاتل کی تلاش میں ہیں، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ آپ اس کے لیے بڑی سے بڑی رقم بھی خرچ کر سکتے ہیں۔ بس اس نے آپ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا ہے۔“

”لیکن اُسے کیا فائدہ ہوگا؟“ فرحان نے کہا۔ ”وہ جب تک مجھے کچھ بتائے گا نہیں، میں اسے رقم نہیں دوں گا۔“

”سر! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کو بہانے سے بلا رہا ہو۔ وہاں وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہوگا اور آپ سے ایک لاکھ روپے چھین لے گا۔“

”نہیں کومل۔“ فرحان نے کہا۔ ”مجھے اس کے لہجے میں سچائی کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ فراڈ ہے تو بھی کوئی بات نہیں۔ میرے دل میں یہ خلش تو نہیں رہے گی کہ مجھے شمسہ کے قاتل کو ڈھونڈنے کا ایک موقع ملا لیکن میں نے محض ایک لاکھ روپے کی وجہ سے اسے ضائع کر دیا۔“

”سر! آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو آپ کو کون روک سکتا ہے۔“ پھر وہ مسکرا کر بولی۔ ”سر! آج ڈنر کہیں باہر کریں؟“

”نہیں کومل، میرا موڈ نہیں ہے۔“

”موڈ تو خود بہ خود بن جائے گا سر۔“ کومل نے کہا۔ ”آپ چلیں تو۔“

کومل کے اصرار پر فرحان اس کے ساتھ ڈنر پر چلا گیا۔

دوسرے دن کومل کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ اسے خاصا تیز بخار تھا۔ وہ چار بجے ہی گھر چلی گئی تھی۔ وہ ضد کر کے ایک مرتبہ پھر اپنے علیحدہ گھر میں آگئی تھی۔

فرحان بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ وہ یہاں سے سیدھا تین تلوار جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

فرحان ٹھیک سات بجے آفس سے نکلا۔ فرحان کا گھر بھی تین تلوار کے علاقے میں تھا۔ بلکہ ریسٹورنٹ کے پیچھے ہی اس کا بنگلا تھا۔

فرحان ٹھیک ساڑھے سات بجے اس اسنیک بار میں پہنچ گیا جہاں اسے بلایا گیا تھا۔ وہاں اس وقت دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ فرحان نے اسنیک بار کے ہال پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ شخص ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ وہ یہ سوچ کر اسنیک بار سے باہر آگیا کہ دس منٹ بعد پھر چکر لگاؤں گا۔

وہ اسنیک بار سے نکل کر سگریٹ کے کیبن تک گیا۔ اسی وقت جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس اسمارٹ سا ایک نوجوان اس کے نزدیک آگیا اور بولا۔ ”فرحان صاحب!“

فرحان نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اپنے حلیے اور چہرے سے کرمنل نہیں لگ رہا تھا۔

فرحان نے اثبات میں سر ہلایا۔

”پیسے لائے ہیں؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”یار، پیسے بھی لایا ہوں۔“ فرحان نے کہا۔

”آیئے میرے ساتھ۔“ اس نے کہا اور اسنیک بار کی طرف قدم بڑھائے۔

اچانک وہ کراہ کر گر گیا۔ فرحان نے جھک کر اُسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ کسی نے اس پر بے آواز فائر کیا تھا۔

لمحوں میں وہاں مجمع اکٹھا ہو گیا۔ فرحان کا خیال تھا کہ اس پر کسی چلتی ہوئی گاڑی سے فائر کیا گیا تھا یا پھر فائر کرنے کے بعد گاڑی فوراً ہی روانہ ہو گئی تھی۔ بہرحال فرحان پھر اندھیرے میں تھا۔

مجمع میں سے ایک لڑکی آگے بڑھی اور اس نوجوان کی لاش دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

فرحان نے اس لڑکی کو غور سے دیکھا تو چونک اٹھا۔ وہ زینت تھی۔ ان کے گھر میں صبح سے شام تک کام کیا کرتی تھی۔ شمسہ خاص طور پر زینت پر بہت مہربان تھی۔ زینت بھی بہت صفائی سے کام کیا کرتی تھی۔

فرحان نے اچانک اسے پکارا۔ ”زینت! تم اسے جانتی ہو؟“

زینت نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے جانے لگی۔

”زینت! میری بات سنو۔“ فرحان اس کے پیچھے لپکا۔

زینت وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ فرحان کو اس کے پیچھے بھاگنا اچھا نہیں لگا۔ فضول میں اس کا تماشا بن جاتا۔ نوجوان کو ایمبولینس لے جا چکی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی گاڑی میں بیٹھا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ زینت منظور کالونی کے علاقے میں رہتی ہے۔ وہ ایک مرتبہ عید کے موقع پر شمسہ کے ساتھ اس کے گھر جا چکا تھا۔

وہ گھر پہنچا تو شیراز پہلے سے وہاں موجود تھا۔

”تم کب آئے؟“ فرحان نے ہنس کر پوچھا۔

”بس ابھی دس منٹ پہلے ہی آیا ہوں۔“ شیراز نے جواب دیا۔

”چلو، ذرا میرے ساتھ منظور کالونی تک چلو۔“ فرحان نے کہا۔

”منظور کالونی؟“ شیراز نے حیرت سے کہا۔ ”وہاں کیا ہے؟“

”وہاں مجھے ایک ضروری کام ہے۔“ فرحان نے جواب دیا۔

”چلو یار! شیراز نے کہا۔

وہ لوگ زینت کے گھر پہنچے تو اس کا نشئی باپ ایک کمرے میں پڑا تھا۔ اس نے آہٹ سن کر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں پوچھا۔ ”کون...... ہے بھائی؟“

”زینت کہاں ہے؟“ فرحان نے پوچھا۔

”زینت!“ بڈھے نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ ”کون زینت...... اچھا زینت......!“

”وہ اس وقت کہاں ہوگی؟“ شیراز نے کہا اور جیب سے سو سو روپے کے کئی نوٹ نکال لیے۔

بڈھے نے للچائی ہوئی نظروں سے نوٹوں کو دیکھا، پھر بولا۔ ”وہ اُدھر ٹی وی والے صاحب کے گھر ہوگی۔“ اس نے کہا۔

”وہ وہاں نہیں ہے۔“ فرحان نے کہا۔ ٹی وی والا صاحب زینت اسی کو کہتی تھی۔

”بتاؤ، وہ کہاں جا سکتی ہے؟“ فرحان نے پوچھا اور کچھ نوٹ مزید جیب سے نکالے۔ ”وہ تم سے ناراض ہو کر کہاں جاتی ہے؟“

”وہ ناراض ہو کر سیدھی حیدرآباد جاتی ہے، اپنی خالہ کے گھر۔“ بڈھے نے کہا۔

”اس کی خالہ حیدرآباد میں کہاں رہتی ہے؟“ فرحان نے نوٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔

”بڈھے کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ وہ لطیف آباد، گیارہ نمبر میں رہتی ہے۔ گیارہ نمبر میں گرلز اسکول کے سامنے چائے کا ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے، وہ اس کے خالو کا ہے۔“

”مکان نمبر کیا ہے؟“ شیراز نے پوچھا۔

”مکان نمبر مجھے معلوم نہیں۔“ بڈھے نے کہا۔

”اب مجھے حیدرآباد جانا پڑے گا۔“ فرحان نے کہا۔

”وھاٹ ڈو یو مین فرحان؟“ شیراز نے کہا۔ ”تم ایک ملازمہ کے لیے حیدرآباد جاؤ گے؟“

”ہاں، جانا ضروری ہے۔“ فرحان نے کہا۔

فرحان وہاں سے گھر پہنچا اور اپنا سوٹ اتار کے جینز اور ٹی شرٹ پہن لی۔ وہ جانے ہی والا تھا کہ کومل اور جاوید ایک ساتھ وہاں پہنچ گئے۔

ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی شیراز نے انہیں بتا دیا کہ فرحان حیدرآباد جا رہا ہے۔

”کیوں؟“ کومل نے حیرت سے پوچھا۔ ”حیدرآباد میں کیا ہے؟“

”حیدرآباد میں ان کی ملازمہ ہے جو کئی دن سے کام پر نہیں آرہی ہے۔ موصوف اس کی خیریت معلوم کرنے جا رہے ہیں۔“ شیراز کے لہجے میں طنز تھا۔

فرحان کا موڈ دیکھ کر کومل نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ فرحان سے بولی۔ ”چلو، میں بھی حیدرآباد چل رہی ہوں۔ میں بھی بہت دن سے لانگ ڈرائیو پر نہیں گئی ہوں۔“

”پھر میں بھی چلوں گا۔“ جاوید نے کہا۔

”یار! میں کسی تقریب میں وہاں نہیں جا رہا ہوں۔“ فرحان نے سرد لہجے میں کہا۔ ”بور ہونا چاہتے ہو تو چلو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

ان سب کے پاس گاڑیاں تھیں لیکن فرحان کی لینڈ کروزر سب سے بہترین تھی۔ ان لوگوں نے اسی میں جانے کا فیصلہ کیا۔ روانگی سے پہلے فرحان نے بغلی ہولسٹر لگائے اور ان میں ایک ایک ماؤزر رکھ لیا اور اوپر سے جیکٹ پہن

لی پھر اس نے ایک بریف کیس بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
وہ روانہ ہونے لگے تو شیراز بھی ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ فرحان نے چونک کر اسے دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔
''تم ڈرائیونگ مت کرو۔'' جاوید نے کہا۔ ''ورنہ ہم لوگوں کا بلڈ پریشر شوٹ اپ کر جائے گا۔ تم گاڑی کو جیٹ فائٹر سمجھ کر چلاتے ہو بلکہ اڑاتے ہو۔''
''تمہیں اتنا شوق ہے تو تم ڈرائیو کرلو۔'' فرحان نے پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
کومل اور شیراز عقبی سیٹ پر تھے۔ وہ کراچی سے نکلے تو شام کے سات بج رہے تھے۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ وہ لوگ بغیر رکے رات کے دس بجے حیدر آباد پہنچ گئے۔ زینت کے خالو کا چائے خانہ ڈھونڈنے میں انہیں دشواری نہیں ہوئی۔
ادھیڑ عمر کا ایک آدمی چائے بھی بنا رہا تھا اور لوگوں سے پیسے بھی وصول کر رہا تھا۔ پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا میزوں پر چائے پہنچا رہا تھا۔
ان کی لینڈ کروزر دیکھ کر پہلے ہی وہاں کے لوگ چونک اٹھے تھے پھر اس میں سے فرحان اتر کر ادھیڑ عمر آدمی کی طرف بڑھا تو وہ گھبرا گیا۔
''کچھ چائے وغیرہ ملے گی چاچا۔'' فرحان نے ہنس کر کہا تاکہ ماحول کا تناؤ کچھ کم ہو سکے۔
''بالکل ملے گی صاحب۔'' ہوٹل والا جلدی سے بولا۔
''ہمیں چار کپ چائے گاڑی میں پہنچا دو۔'' فرحان نے کہا۔
''آپ چلیں، میں بھجوا رہا ہوں۔''
''کیا رہا؟'' جاوید نے پوچھا۔
''میں نے چائے کے لیے کہہ دیا ہے۔'' فرحان نے جواب دیا۔
''کیا؟'' کومل چونک کر بولی۔ ''ہم یہاں چائے پئیں گے؟''
''چائے تو پینا ہی پڑے گی۔'' فرحان نے کہا۔
چائے والے نے بہت پھرتی دکھائی۔ وہ فوراً چار کپ ٹرے میں رکھ کر لے آیا۔ کپ بھی صاف ستھرے تھے اور چائے کی رنگت بھی بہت اچھی تھی۔
فرحان نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور مسکرا کر بولا۔ ''واہ، مزہ آگیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ یہاں اتنی اچھی چائے ملے گی۔''
پھر ان سب نے کپ اٹھا لیے۔ چائے واقعی اچھی تھی۔
تھوڑی دیر بعد اس نے اشارے سے ہوٹل والے کو بلایا اور بولا۔ ''بھائی! آپ کی چائے تو بہت اچھی لگی۔'' اس نے جیب سے سو سو روپے کے تین نوٹ نکالے اور چائے والے کی طرف بڑھا دیے۔
''یہ تو بہت زیادہ ہیں صاحب۔'' چائے والے نے حیرت سے کہا۔
''مجھے تم سے ایک کام اور بھی ہے۔'' فرحان ہنس کر بولا۔ ''تمہاری بیوی کی بھانجی زینت کراچی سے یہاں آئی ہے نا؟''
''زینت...... جی سرکار...... وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی پہنچی ہے۔''
''بس ذرا اسے بلا لاؤ۔''
''زینت کو یہاں بلا لاؤں؟'' چائے والے نے حیرت سے پوچھا۔
''یا ایسا کرتے ہیں ہم تمہارے گھر جا کر اس سے مل لیں گے۔ مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے۔ اصل میں وہ میرے گھر میں کام کرتی ہے۔ میں نے......''
''آپ ٹی وی والے صاحب ہو؟'' ہوٹل والے نے اس کی بات کاٹ دی۔
''ہاں میں ٹی وی والا ہوں۔'' فرحان نے کہا۔ ''لیکن تم اسے ابھی میرے بارے میں بتانا مت، وہ اصل میں مجھ سے ناراض ہو کر آئی ہے۔''
''وہ تو شروع سے نخرے والی ہے صاحب۔'' ہوٹل والے نے کہا اور بولا۔ ''آپ میرے ساتھ چلیں۔''
ہوٹل والے نے انہیں گھر کے باہر رکنے کو کہا اور بولا۔ ''میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔''
اس نے ایک کے بجائے پانچ منٹ لگا دیے۔ اس کی بیوی شاید سو چکی تھی۔ پانچ منٹ بعد اس نے فرحان اور دوسرے لوگوں کو اندر بلا لیا۔ اس نے بہت عجلت میں بستر کی چادر بدلی تھی اور کمرے میں بکھری ہوئی چیزیں حتی الامکان سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ کمرے میں اس چارپائی کے علاوہ اس نے دو مونڈھے بھی رکھ دیے تھے۔ انہیں بٹھا کر وہ دوسرے کمرے میں گیا اور زینت کو بلا لایا۔ زینت اسے دیکھ کر ایک دم خوف زدہ ہوگئی اور بولی۔ ''صاحب، میں نے کچھ نہیں کیا، وہ عابد......

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''ڈرومت زینت۔'' فرحان نے نرم لہجے میں کہا۔
''مجھے سچ سچ بتا دو کہ تم مجھے وہاں سے دیکھ کر بھاگی کیوں تھیں اور وہ مرنے والا کون تھا؟''
''صاحب...... آپ مجھے پولیس کے حوالے تو نہیں کرو گے؟''
''اگر تم سچ بولیں تو میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ اب بتاؤ، وہ کون تھا؟''
''وہ عابد تھا صاحب۔'' زینت کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔''اس نے وعدہ کیا تھا کہ... مجھ سے شادی کر لے گا۔ آپ نے سچ بولنے کو کہا ہے صاحب تو میں سچ بولوں گی۔ آپ اور بیگم صاحبہ تو آفس چلے جاتے تھے۔ میں عابد کو گھر میں بلا لیتی تھی۔'' پھر وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔
''صاحب! اس آدمی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر تو نے زبان کھولی تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا، وہ...... وہ مجھے مار دے گا صاحب۔''
''کوئی تمہیں نہیں مارے گا۔'' فرحان نے کہا۔''پھر تم عابد سے میرے گھر میں ملاقات کرتی تھیں؟''
''یہ آئیڈیا بھی عابد ہی کا تھا صاحب۔'' زینت نے کہا۔''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیرے صاحب اور بیگم صاحبہ تو سارا دن گھر پر نہیں ہوتے ہیں، ہمیں کہیں اور ملنے کی کیا ضرورت ہے؟'' پھر وہ خلا میں تکتے ہوئے بولی۔
''صاحب اس دن بھی میں عابد کے ساتھ تھی۔ آپ تو پاکستان میں تھے ہی نہیں۔ بیگم صاحبہ بھی دیر سے آتی تھیں۔ میں نے عابد کو ٹیلی فون کر دیا۔ وہ تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت چار بجے تھے صاحب۔ بیگم صاحبہ چھ بجے سے پہلے نہیں آتی تھیں اس لیے پہلے ہم دونوں نے کافی اور سینڈوچز بنا کر کھائے۔ پھر ہم پیار محبت کی باتیں کرنے لگے۔ ہمیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ گھڑی نے سات بجائے تو میں چونک اٹھی اور عابد سے بولی۔''اب تم جاؤ، بیگم صاحبہ آنے والی ہیں۔''
اسی وقت مجھے گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ بیگم صاحبہ ہی تھیں۔ میں ایک دم گھبرا گئی اور عابد سے بولی۔ اب جلدی سے کہیں چھپ جا، باہر بھاگنے کا وقت نہیں تھا اور راستہ بھی ایک ہی تھا۔
بیگم صاحبہ بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھیں۔ ان کے ساتھ اسکول کے ایک ٹیچر بھی تھے۔ وہ بھی اکثر گھر آتے رہتے تھے..... ان کا نام حامد تھا۔

پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک دوسری گاڑی وہاں آ کر رکی۔ اس میں سے دو آدمی اترے۔ دونوں لمبے تڑنگے اور صحت مند تھے۔ ان کے منہ پر نقاب چڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے شکل نہیں پہچانی جا رہی تھی۔ بیگم صاحبہ نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں دھکا دے کر اندر گھس گئے۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ لاؤنج اور کچن تو میری کھڑکی کے بالکل سامنے تھا۔
حامد صاحب نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن ان میں سے ایک نے حامد صاحب کو پکڑ لیا۔ دوسرا بیگم صاحب کے پیچھے بھاگا اور ان سے کچھ کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے کیا کہا تھا۔ بیگم صاحبہ نے انکار کر دیا۔ حامد صاحب خود کو چھڑا کر پھر بیگم صاحبہ کو بچانے کے لیے آگے بڑھے۔ دوسرے آدمی نے طیش میں آ کر کچن میں رکھا ہوا سبزی کاٹنے کا چاقو اٹھایا اور حامد صاحب کے پیٹ میں مار دیا۔ اس نے حامد صاحب کو دو دفعہ چاقو مارا اور انہیں لات مار کے دور پھینک دیا پھر اس نے بیگم صاحبہ کے بال پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور بولا۔''دیتی ہے کہ نہیں؟''
بیگم صاحبہ بری طرح چیخیں پھر نڈھال ہو کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ آدمی پھر ان کی طرف بڑھا۔ بیگم صاحبہ اچانک وہاں سے نکل کر لاؤنج کی طرف بھاگیں۔ دوسرے آدمی نے انہیں زوردار دھکا دیا۔ پہلے آدمی نے برف توڑنے والا سُوا اٹھا لیا تھا اور اس کا رخ بیگم صاحبہ کی طرف تھا۔ دھکے سے وہ دوسرے آدمی سے ٹکرائیں اور...... اور...... برف توڑنے والا سُوا...... ان کے پیٹ میں گھس کر پیچھے سے باہر نکل آیا۔ وہ بری طرح تڑپیں پھر...... انہوں نے دم توڑ دیا۔ صاحب...... وہ لوگ پورے گھر کی تلاشی لینے لگے۔ میں نے عابد کو باتھ روم میں چھپا دیا۔ وہ بھی بہت ڈر گیا تھا صاحب۔
وہ لوگ پورے گھر کی تلاشی لیتے پھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک میرے کمرے میں آیا تو مجھے دیکھ کر چونک گیا اور بولا۔''تم کون ہو؟''
''میں ملازمہ ہوں صاحب۔'' میں نے کہا۔''کیا بیگم صاحبہ آ گئیں؟''
''تم کہاں تھیں؟'' اس نے پوچھا۔
''میری تو طبیعت ٹھیک نہیں ہے صاحب، میں اندر والے کمرے میں سو رہی تھی۔''
''چھوڑ یار، اس نے کچھ نہیں دیکھا ہے اور دیکھا بھی

ہوگا تو ہمارا کیا بگاڑ لے گی؟''

''اگر تو نے زبان کھولی تو یاد رکھنا تیرے ٹکڑے کر دیں گے۔'' ان میں سے ایک نے مجھے بیڈ سے باندھ دیا۔

''تم ان دونوں میں سے کسی کو پہچانتی تھیں؟'' فرحان نے پوچھا۔ شمسہ کی ایسی اذیت ناک موت پر اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

''ان میں سے ایک لمبے قد کا تھا اور اس کی شرٹ پر پیچھے نیویارک لکھا ہوا تھا۔''

''اور کوئی نشانی......اور کوئی شناخت......؟''

''اور مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے صاحب۔'' وہ ذہن پر زور دینے لگی۔

''جھوٹ بولتی ہے تو؟'' شیراز چیخ کر بولا۔ وہ لوگ اتنی دیر تک تیری آنکھوں کے سامنے رہے اور تو انہیں شناخت نہیں کر سکی۔''

زینت نے خوف زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''سچ سچ بتا ورنہ میں تجھے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

زینت مزید خوف زدہ ہو گئی اور اچانک کمرے سے نکل کر بھاگی۔ شیراز اُس کے پیچھے دوڑا۔ پھر وہ سبھی دوڑ پڑے۔

زینت دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔ جیسے موت اس کے تعاقب میں ہو۔ وہ بھاگتی بھاگتی ایک موڑ پر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شیراز اس کے پیچھے تھا۔ وہ بھی زینت کی طرح کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک کسی گاڑی کے بریک چرچرائے اور سناٹا چھا گیا۔ اندھیرے میں یوں بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اچانک انہیں دور سے ایک ہیولا نظر آیا۔ فرحان نے اس کی چال سے پہچان لیا۔ وہ شیراز تھا۔ وہ لوگ تیزی سے اس کے نزدیک پہنچ گئے۔

فرحان نے اس سے پوچھا۔ ''زینت کہاں ہے؟''

اس نے افسردگی سے سر ہلایا اور ایک طرف اشارہ کر دیا۔ سڑک کے بیچ میں زینت کی لاش پڑی تھی۔

''میں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رکی نہیں اور دائیں طرف سے آنے والے ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا گئی۔ ٹرک والا بھی موقع سے فرار ہو گیا۔''

''تمہیں آخر اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت تھی؟'' فرحان نے پوچھا۔

''یار! اس نے بھابی کی موت کا جو منظر کھینچا تھا، وہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔'' شیراز نے کہا۔

''اب علاقے کے تھانے میں فون کرو اور یہاں سے نکلو۔'' جاوید نے کہا۔

واپسی کے سفر میں وہ سب خاموش تھے اور اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ اس خاموشی کو کومل نے توڑا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ آدمی واقعی وہاں آیا تھا؟''

''کون آدمی؟'' فرحان نے چونک کر پوچھا۔

''جس نے آپ سے ایک لاکھ روپے مانگے تھے۔'' کومل نے کہا۔

''ہاں، وہ وہاں آیا تھا لیکن مجھے کچھ بتانے سے پہلے ہی کسی اندھی گولی کا شکار ہو گیا۔'' فرحان نے کہا۔

''زینت بے چاری فضول میں ماری گئی۔'' جاوید نے کہا۔

وہ لوگ واپس کراچی پہنچے تو صبح کے دو بج رہے تھے۔ سبھی بری طرح تھک گئے تھے۔ فرحان کے گھر پہنچ کر وہ سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

دوسری صبح فرحان کی آنکھ دیر سے کھلی۔ اُس نے اپنے لیے ناشتا بنایا اور ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر کوئی خاص پروگرام نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ٹی وی آف کیا اور اخبار اٹھانے کے لیے باہر لان میں آیا۔ اخبار اٹھاتے ہوئے اس کی نظر ایک بند لفافے پر پڑی۔ اس نے وہ لفافہ اٹھا لیا۔ لفافے پر فرحان کا نام نمایاں طور پر پیسٹ کیا گیا تھا۔ پیسٹ ان معنوں میں کہ کسی اخبار یا رسالے سے حروف کاٹ کر فرحان کا نام پیسٹ کیا گیا تھا۔ اسے حیرت بھی ہوئی کہ آئی ٹی کے اس تیز رفتار دور میں کس نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے۔

اس نے اخبار اٹھایا اور لاؤنج میں آ گیا۔ اخبار ایک طرف رکھ کر اس نے لفافہ کھول لیا۔ لفافے میں سے ایک پرچہ نکلا۔ اس پر بھی اسی طرح اخبار یا کسی میگزین سے حروف کاٹ کر عبارت بنائی گئی تھی۔ شمسہ کا قاتل کبھی تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ اگر اب بھی تم نے یہ سراغ رسانی ختم نہیں کی تو عابد اور زینت کے بعد اگلا نمبر تمہارا ہو گا۔ ایک بات اور، جاوید کی طرف سے ہوشیار رہو۔''

فرحان نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ عام سا لفافہ تھا۔ اس نے خط دوبارہ لفافے میں ڈالا اور اسے اپنی الماری کی دراز میں رکھ دیا۔ اب سے بیس پچیس برس پہلے لوگ اس طرح دھمکی آمیز خطوط بھیجا کرتے تھے۔ اس وقت انہیں خوف ہوتا تھا کہ ان کی رائٹنگ پہچان لی جائے گی۔

بہت سے ذہین افراد ٹائپ رائٹر کے حروف سے بھی پہچان لیا کرتے تھے کہ خط کس ٹائپ رائٹر سے ٹائپ کیا گیا ہے۔ اب تو لوگ کمپیوٹر پر ٹائپ کر کے اس کا پرنٹ آؤٹ نکالتے ہیں اور بلاجھجک بھیج دیتے ہیں۔

وہ دیر تک بیٹھا ہوا اس خط کے بارے میں سوچتا رہا کہ یہ واقعی کسی نے بھیجا ہے یا اس کے کسی دوست نے مذاق کیا ہے؟

پھر اس کا ذہن شمسہ کی طرف چلا گیا۔ شمسہ کی آخری کال فرحان کو ساڑھے پانچ بجے موصول ہوئی تھی۔ زینت نے بتایا ہے کہ شمسہ سات بجے گھر آئی تھی۔ شمسہ نے فرحان کو بتایا تھا کہ میں ایک اہم مشن پر جارہی ہوں، پاکستان آؤ گے تو تفصیل سے بتاؤں گی۔ ساڑھے پانچ بجے سے سات بجے تک وہ کہاں رہی؟ اس نے سر جھٹکا اور بڑبڑایا۔ ''یہ بھی معلوم ہو ہی جائے گا۔''

سب کچھ ذہن سے جھٹک کر وہ اخبار پڑھنے لگا۔ اخبار میں بھی ایسی کوئی خاص خبر نہیں تھی۔ اخبارات میں کافی عرصے سے ایک ہی طرح کی خبریں چھپ رہی تھیں۔ وہی اغوا، ڈکیتی، ٹارگٹ کلنگ اور پولیس مقابلے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اخبارات کی صرف تاریخ بدل گئی ہے، بقیہ اخبار پرانا ہے۔

ڈوربیل بجی تو اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ اس نے باہر جا کر گیٹ کھولا تو کومل اپنی گاڑی لے کر اندر آ گئی۔ اس نے پورچ میں گاڑی روکی اور اترتے ہوئے فرحان سے بولی۔ ''سر! آج آپ آفس نہیں آئے؟''

''تم مجھ سے جواب طلب کر رہی ہو؟''

''فار گاڈ سیک سر۔'' کومل نے کہا۔ ''میں آپ سے جواب طلب کروں گی؟ میں تو صرف یہ پوچھ رہی تھی کہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں، طبیعت بالکل فٹ ہے۔ اصل میں رات کو بہت دیر سے نیند آئی اس لیے صبح آنکھ نہیں کھل سکی اور تم آفس کیوں نہیں گئیں؟''

''میں تو آفس ہی سے آ رہی ہوں سر، آپ کے بغیر آفس میں دل ہی نہیں لگتا۔'' کومل نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''یہ تو اچھی علامت نہیں ہے۔'' فرحان مسکرا کر بولا۔ ''کل کلاں کو تم پرائے گھر کی ہو جاؤ گی تو یہ عادت تمہیں بہت تکلیف دے گی۔''

کومل جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فرحان ریسیور اٹھا کر بولا۔ ''ہیلو۔''

''فرحان صاحب؟'' دوسری طرف سے غیر مہذب سی ایک آواز سنائی دی۔

''جی بول رہا ہوں۔'' فرحان نے کہا۔ ''لیکن میں آپ کو پہچانا نہیں؟''

''آپ میری آواز پہچان بھی نہیں سکتے۔ میں بلال بول رہا ہوں۔''

''بلال؟'' فرحان نے ذہن پر زور دیا۔ ''کون

بلال؟''

''بلال سی ڈی والا۔'' بولنے والا شاید ہنسا بھی تھا۔

''اچھا بلال!'' فرحان نے کہا۔ ''کہو، تم نے کیسے زحمت کی؟''

''فرحان صاحب! آپ کی مسز نے تو ہماری شاپ پر پولیس کا ریڈ کرایا تھا اور پولیس نے اب مجھے ہی میڈم کے کیس میں انوالو کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے میڈم کے قاتلوں کے خلاف کچھ ثبوت ملے ہیں۔ میں نے سوچا، وہ آپ کے حوالے کردوں۔''

''کتنے پیسے چاہئیں؟'' فرحان نے کہا۔

''پیسوں کی بات مت کیجیے گا۔'' بلال نے کہا۔ ''میں برا آدمی ہوں لیکن اتنا برا نہیں ہوں کہ کسی کمزور عورت کو قتل کردوں۔''

''کہاں ملوگے؟'' فرحان نے پوچھا۔

''آپ میری شاپ پر آجائیں۔'' بلال نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

''اب کس کا فون تھا سر؟'' کومل نے پوچھا۔

''سی ڈی شاپ والے بلال کو شمسہ کے قاتلوں کا کوئی سراغ ملا ہے۔ وہ مجھے اپنی شاپ پر بلا رہا ہے۔''

اچانک کومل کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فرحان سے کہا۔ ''ایکسکیوزمی سر!'' وہ سیل فون لے کر باہر برآمدے کی طرف چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو فرحان نے کہا۔ ''میں ذرا سی ڈی شاپ تک جارہا ہوں۔''

''میں آپ کو اکیلا وہاں نہیں جانے دوں گی۔'' کومل نے کہا۔ ''میں نے جاوید بھائی کو بلایا ہے۔''

''تیرہ منٹ کے اندر اندر جاوید، فرحان کے گھر پہنچ گیا اور بولا۔ ''تم لوگوں نے خود تو ورکنگ ڈے کو سنڈے میں تبدیل کیا، اب چاہتے ہو کہ دوسرے بھی کام چھوڑ کر تمہارے ساتھ چھٹی منائیں؟''

کومل نے ٹی وی کھول دیا تھا اور اس پر نیوز بلیٹن چل رہا تھا۔ ایک خبر سن کر فرحان سناٹے میں رہ گیا۔ ''ڈیفنس سی ڈی اور ویڈیو شاپ کے پارٹنر بلال احمد کو کچھ نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے ہلاک کردیا۔ بلال احمد اپنی شاپ پر بیٹھے تھے کہ موٹر سائیکل پر سوار دو افراد وہاں پہنچے، ان دونوں نے ہیلمٹ پہن رکھے تھے۔ وہ دکان میں داخل ہوئے اور بلال احمد پر گولیاں برسا دیں۔''

فرحان دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

کومل بھی گھبرا کر لاؤنج سے باہر نکل آئی۔ فرحان نے سوچا، جو شخص میری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے، مارا جاتا ہے۔ آخر شمسہ کو کن لوگوں نے قتل کیا ہے۔ کتنے لمبے ہاتھ ہیں ان کے اور انہیں معلوم کیسے ہوجاتا ہے کہ کوئی میری مدد کرنے والا ہے؟

اچانک اس کے ذہن میں بدگمانی نے سر ابھارا۔ کہیں واقعی اس خط کی یہ بات درست تو نہیں کہ جاوید ہی یہ سب کرا رہا ہے۔ اسے خیال آیا کہ کومل نے جاوید کو بلایا تھا۔ جاوید برق رفتاری سے وہاں پہنچ گیا لیکن اس کے بعد کیا ہوا۔ بلال کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔

ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے فرحان گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا تھا۔ رہ رہ کے اسے جاوید کا خیال آرہا تھا۔ بدگمانی کا سانپ جب ذہن میں کنڈلی مار کے بیٹھ جائے تو انسان کو اپنے سائے پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔

ساحلِ سمندر اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ گاڑی سیدھی وہیں لے گیا۔ ابھی اسے ساحل پر کھڑے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اچانک کئی گاڑیوں نے اسے گھیر لیا۔ ان گاڑیوں میں مسلح افراد سوار تھے اور ان کی گنز کا رخ فرحان کی طرف تھا۔ فرحان اس وقت اپنی گاڑی سے اتر کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھا اور خود سے بولا۔ ''شاید اب میرا وقت بھی آگیا ہے۔ ممکن ہے یہی لوگ شمسہ کے قاتل ہوں اور اب مجھے بھی ٹھکانے لگانا چاہتے ہوں۔''

ایک گاڑی میں سے شاہ جی باہر نکلا۔ وہی سی ڈی شاپ کا مالک۔ اس کے چہرے پر برہمی کے تاثرات تھے۔ وہ نپے تلے قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھا اور فرحان سے بولا۔ ''تمہارے کیس کا بہانہ بنا کر پولیس نے میرے ایک لڑکے بلال کا اِن کاؤنٹر کردیا۔''

''پولیس نے اِن کاؤنٹر کردیا؟'' فرحان نے حیرت سے دہرایا۔ ''اسے تو نامعلوم افراد نے گولیاں ماری ہیں۔ میں نے ابھی ٹی وی پر نیوز دیکھی ہے۔''

''میں جانتا ہوں کہ یہ 'نامعلوم افراد' پولیس ہی کے آدمی تھے۔ انہوں نے کئی دن پہلے بلال کو دھمکی دی تھی کہ وہ اپنا کاروبار وہاں سے سمیٹ لے۔''

''اگر ایسا ہے بھی تو یہ پولیس اور بلال کا معاملہ ہے۔ تم مجھے اس میں کیوں ملوث کرنے کی کوشش کررہے ہو؟''

فرحان نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اس نے آخری کال تمہیں کی تھی۔'' شاہ جی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس نے تمہیں کال کیوں کی تھی؟''

''وہ مجھے کچھ انفارمیشن دینا چاہتا تھا۔'' فرحان نے کہا۔ ''لیکن میرے پہنچنے سے پہلے ہی......''

''یہ تو میں معلوم کرلوں گا کہ وہ نامعلوم افراد کون تھے۔ شاہ جی کے آدمی کو مارنا آسان نہیں ہے۔ اگر اس معاملے میں تم بھی کہیں ملوث ہوئے تو میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے معاملات سے دور رہو۔ اب میں تمہیں لاسٹ وارننگ دے رہا ہوں۔ شاہ جی لاسٹ وارننگ دینے کے بعد پھر اسے چھوڑتا نہیں ہے۔'' پھر اس نے اپنے لوگوں کو واپسی کا اشارہ کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

فرحان پھر ساحل پر آگیا۔ وہ کافی دیر تک ساحل کے کنارے بیٹھا رہا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہوگیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس کے لیے یہ بھی سوالیہ نشانہ تھا کہ شمسہ نے مرنے سے پہلے وہ ڈیڑھ گھنٹا کہاں گزارا؟

وہ گھر پہنچا تو سب لوگ جاچکے تھے۔ فرحان نہادھو کر تازہ دم ہو کر لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا۔ اس نے فریج سے انڈے اور ڈبل روٹی نکالی اور سینڈوچ بنانے لگا۔ دوبارہ اس نے کیچ اپ کے لیے فریج کھولا تو اس کا بلب نہیں جلا۔ فرحان نے دو تین مرتبہ دروازے کو کھولا، بند کیا۔ فریج کے اندر بٹن کو ہلا کر دیکھا لیکن روشنی نہ ہوئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے دوبارہ فریج کھولا اور اس کا اندرونی بلب نکالنے کے لیے اس کے سامنے رکھی ہوئی چیزیں ہٹائیں لیکن بلب ایسے زاویے سے لگا تھا کہ فرحان کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ اس نے ٹارچ سے اندر روشنی ڈالی اور بلب کو دیکھنے کی کوشش کی۔

اچانک اس کی نظر کسی سرخ چیز پر پڑی۔ وہ فریج کی اندرونی چھت کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ فرحان نے حیران ہو کر ٹارچ کی روشنی اس چیز پر ڈالی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا چیز ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے نکالنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اسے ٹیپ کی مدد سے چپکایا گیا ہے۔

فرحان نے تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ چیز وہاں سے نکال لی۔ وہ ایک یو ایس بی تھی۔

فرحان نے چونک کر اس یو ایس بی کو دیکھا۔ اسے ضرور وہاں شمسہ نے چپکایا ہوگا۔ اس نے یو ایس بی کے گرد لپٹا ہوا ٹیپ ہٹایا اور غور سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ 16gb کی یو ایس بی تھی۔ فرحان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا، شمسہ نے یہ یو ایس بی یہاں چھپائی ہے تو ضرور اس میں کوئی خاص بات ہوگی۔ وہ دبے دبے جوش کے ساتھ اٹھا اور اپنا کمپیوٹر آن کر دیا۔ پھر کانپتے ہاتھوں سے اس نے یو ایس بی کمپیوٹر میں لگائی۔ اس میں شمسہ کے کئی چھوٹے چھوٹے مووی کلپ تھے۔ وہ فوٹوگرافی کی جنونی تھی۔ دو تین مووی میں اس نے مختلف مناظر فلمارکھے تھے۔ شمسہ اور اس کی کولیگز کی بے شمار تصویریں تھیں۔

فرحان صبروتحمل سے وہ تمام فضول چیزیں دیکھتا رہا۔

پھر اچانک اسکرین پر اسکول کی پرنسپل نمودار ہوئی۔ وہ اسکول کے لان میں کھڑی تھی۔ اس کے سامنے دلاور کھڑا تھا۔ مووی کی آواز بہت کم تھی لیکن فرحان نے والیوم فل کر کے آواز سننے کی کوشش کی تھی۔ اسے بہت ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دلاور، پرنسپل سے کہہ رہا تھا۔ ''میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا میڈم کہ ان چکروں میں مت پڑیں۔ جب بچوں کے والدین کو اعتراض نہیں ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟''

''اسکول کے بچے میری ذمے داری بھی ہیں۔'' پرنسپل نے کہا۔ ''ان کے ساتھ اسکول ٹائم کے بعد کچھ ہوا ہوتا تو میں معاملہ ان کے والدین پر چھوڑ دیتی لیکن ان بچوں کی بینائی اسکول ٹائمنگ میں گئی ہے۔ مجھے اس کی رپورٹ کرنا ہوگی۔''

''آپ بھی کن چکروں میں پڑگئیں میڈم۔'' دلاور نے کہا۔ ''یہ رکھ لیں۔ اس نے خاکی کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز میڈم کی طرف بڑھادی۔ ''اس میں پورے پچیس لاکھ روپے ہیں۔ اتنی رقم میں تو لوگ اپنے باپ کا خون کر دیتے ہیں۔ اپنے نزدیکی رشتوں کو بھول جاتے ہیں۔ رکھ لیں یہ

رنگِ ظرافت

ٹکٹ چیکر مسافر سے۔ ''تم ٹکٹ لیے بغیر گاڑی میں کیوں بیٹھے ہو؟''

مسافر۔ ''جناب غلطی ہوگئی پیچھے میں کھڑا ہوجاتا ہوں۔''

پیسے، آپ کے کام آئیں گے۔"

پرنسپل نے وہ بنڈل دلاور کے منہ پر اچھال دیا اور آگے بڑھ گئی۔

"پکڑو، اِس کو۔" دلاور چیخ کر بولا۔ "اور کاٹ ڈالو سالی کو۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔" دلاور کے دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر پرنسپل کا راستہ روک لیا۔

"راستہ چھوڑو میرا۔" پرنسپل چیخ کر بولی۔ اس کے سامنے کھڑا ہوا بدمعاش ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ پرنسپل نے اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

اس شخص نے بھنا کر پرنسپل کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر کیا اور بولا۔ "حرام زادی، عزت تجھے راس نہیں آتی؟"

پرنسپل تھپڑ کی ضرب سے بری طرح لڑکھڑا گئی۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا تھا۔

"ختم کر دو اِسے۔" دلاور چیخ کر بولا۔

"دو آدمیوں نے پرنسپل کے ہاتھ دونوں طرف سے پکڑے اور تیسرے آدمی نے لمبے پھل والا چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ پرنسپل کے منہ سے اذیت ناک چیخ نکلی اور وہ بری طرح تڑپنے لگی۔ چاقو والے نے اس پر مزید تین بھرپور وار کیے۔

فرحان کو چاقو والے کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی پشت کیمرے کی جانب تھی۔ فرحان نے موی کو وہاں اسٹل کر دیا۔ وہ اچانک چونک اٹھا۔ چاقو والے کی ٹی شرٹ کی پشت پر جلی حروف میں نیویارک لکھا ہوا تھا۔

اچانک ایک آدمی چیخا۔ "اس لڑکی کو پکڑو۔ وہ نہ جانے کب سے فلم بنا رہی ہے۔"

پھر منظر تیزی سے تبدیل ہوا اور ایسا لگا جیسے کیمرا بہت تیز حرکت کر رہا ہو۔ یقیناً شمسہ کیمرا لے کر بھاگ رہی ہوگی۔

پھر فرحان کو اسکرین پر اپنی کار نظر آئی اور موی ختم ہوگئی۔

غصے اور صدمے سے فرحان کی حالت غیر تھی۔ اس کا پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا، دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور اس کی مٹھیاں غصے میں بھینچی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور دوسرا گلاس اپنے سر پر الٹ لیا تو اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔

"یہ بات کھل گئی تھی کہ شمسہ کا قاتل دلاور تھا۔ اسی کے کہنے پر شمسہ کو ہلاک کیا گیا تھا۔ دلاور کے آدمیوں نے شمسہ سے موی کی ڈی وی ڈی لینے کی کوشش کی ہوگی۔ اس پر ان لوگوں نے تشدد بھی کیا تھا۔ یہ بات زینت بتا چکی تھی۔

فرحان تھوڑی دیر بیٹھا سوچتا رہا، پھر ایک عزم سے اٹھا۔ اس نے یو ایس بی کا تمام ڈیٹا ایک دوسری یو ایس بی میں ٹرانسفر کیا اور اسے دوبارہ فریج میں وہیں چپکا دیا جہاں سے نکالا تھا۔

اس سے فارغ ہونے کے بعد فرحان نے لباس تبدیل کیا۔ دونوں ماؤزر بغلی ہولسٹرز میں لگائے پھر ایک بریف کیس اٹھایا۔ فرحان نے کھول کر اس کا جائزہ لیا۔ اس میں SIG کی دور مار فولڈنگ رائفل، ٹیلی اسکوپ اور سائیلنسر تھا۔ رائفل کے بہت سے فاضل راؤنڈ بھی تھے۔

اس نے بریف کیس دوبارہ بند کیا اور ہذیانی انداز میں بولا۔ "دلاور، میں تیری موت بن کر آرہا ہوں۔ تو تو صرف قزاق ہے، لٹیرا ہے، بدمعاش ہے لیکن میں قزاقِ اجل ہوں۔" اس نے بریف کیس اٹھایا، یو ایس بی وہ پہلے ہی پینٹ کی واچ پاکٹ میں رکھ چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا تنقیدی جائزہ لیا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

اس کا رخ دلاور کے بنگلے کی طرف تھا۔ وہ انتہائی خوف ناک انداز میں ڈرائیونگ کرتا ہوا دلاور کے گھر پہنچ گیا۔

دلاور کے مین گیٹ پر دو مسلح آدمی کھڑے تھے۔ ان کے حلیے کراہت آمیز تھے اور چہروں پر مکاری کی چھاپ تھی۔ فرحان نے ایک ایک لات میں دونوں کو ناک آؤٹ کر دیا اور غضب ناک انداز میں اندر کی طرف بڑھا۔

برآمدے میں چار آدمی بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے تھے۔ وہ چاروں فرحان کو دیکھ کر چونکے اور اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھ گنز تک جاتے، فرحان نے ماؤزر نکال لیا اور بولا۔ "میری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے اس لیے خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھے رہو۔"

ان میں سے ایک نے غیر محسوس طریقے پر اپنے سامنے رکھی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فوراً ہی فرحان کے ماؤزر نے شعلہ اگلا۔ فائر کا دھماکا ہوا، اس کے ساتھ ہی اس شخص کی اذیت ناک چیخ بلند ہوئی۔ فرحان نے آگے بڑھ کر تیزی سے ان لوگوں کی گنز اٹھالیں اور ان کے میگزین خالی کر کے انہیں لان میں اچھال دیا۔

اندر سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ فرحان دونوں ماؤزر ہاتھوں میں لے کر ایک ستون کی آڑ میں چھپ گیا۔

سامنے والے دروازے سے اچانک دلاور باہر آگیا۔ فرحان نے ڈپٹ کر کہا۔ "اپنی جگہ سے حرکت مت

کرنا ورنہ میں فائر کردوں گا۔“
”ارے یار! تو کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے؟“ دلاور نے منہ بنا کر کہا۔
”اس لیے کہ تو میری بیوی کا قاتل ہے۔ تو نے اسکول کی پرنسپل کو قتل کیا تھا۔ شمسہ نے اس کے قتل کی ویڈیو بنالی تھی۔ میرے پاس تیرے قتل کا ثبوت یو ایس بی میں موجود ہے۔ میں تجھے نہ بھی ماروں تو عدالت تجھے پھانسی پر لٹکا دے گی۔“
”میری بات سنو فرحان۔“ دلاور نے کہا۔ ”اب تمہاری بیوی تو واپس آنے سے رہی، نہ وہ اسکول کی میڈم واپس آسکتی ہے۔ تم مجھ سے ایک ڈیل کرلو۔“
”میں یہاں ڈیل کرنے نہیں، تجھے جہنم رسید کرنے آیا ہوں۔“
اچانک فرحان کو اپنی گردن پر کسی ٹھوس چیز کا احساس ہوا۔ پھر کوئی غرا کر بولا۔ ”خاموشی سے اپنے ماؤزر پھینک دو اور اندر چلو ورنہ گولی گردن سے نکلے گی اور حلق کے پار ہو جائے گی۔“
”اب ڈیل کا ٹائم ختم ہوگیا۔“ دلاور نے کہا۔ ”اس کی تلاشی لو اور وہ یو ایس بی نکال لو جس کے بل بوتے پر یہ اتنا اچھل رہا ہے۔“
بہ یک وقت فرحان پر کئی آدمی ٹوٹ پڑے اور لاتوں اور گھونسوں سے اسے بے رحمی سے مارنے لگے۔ فرحان کے کپڑے پھٹ گئے۔ چہرہ زخمی ہوگیا۔ آنکھ کا نچلا حصہ پھٹ گیا جس سے اس کا خون چہرے سے ہوتا ہوا ٹھوڑی تک بہنے لگا۔
پھر دلاور نے اس کی اچھی طرح تلاشی لی اور بالآخر اس کی پینٹ کی واچ پاکٹ سے یو ایس بی نکال لی۔ پھر وہ فاتحانہ انداز میں بولا۔ ”اگر مجھ سے ڈیل کرلیتا تو زندہ رہ کر انجوائے کرتا۔ اب گولی کھا کے سوجا۔“ اس نے اپنا ریوالور نکال کے اس پر تانا اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔
وہ فائر کرنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی چیخا۔ ”ایک منٹ! اس کے پاس اس یو ایس بی کی کاپی بھی ہوگی۔“
”کاپی نہیں بلکہ ماسٹر پرنٹ۔“ فرحان نے ہنس کر کہا۔ اس کی ہنسی بھی اس وقت بہت بھیانک لگ رہی تھی۔
”ماسٹر پرنٹ۔“ دلاور نے کہا۔ ”ماسٹر پرنٹ کہاں ہے؟“
”ماسٹر پرنٹ ایسی جگہ ہے کہ تمہارے فرشتے بھی وہاں نہیں پہنچ سکتے۔“
”اس کی زبان کھلواؤ۔“ دلاور نے ایک آدمی سے کہا۔
وہ شخص جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔
فرحان کچھ سوچ کر مسکرایا اور بولا۔ ”رک جاؤ۔“
وہ فرحان کے نزدیک آکر رک گیا۔
”میں تمہیں اس ماسٹر پرنٹ کا پتا بتا دیتا ہوں۔ اسے تم اگر حاصل کرسکتے ہو تو کرلو۔“
”ہمیں پتے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔“ دلاور نے کہا۔
”ٹھیک ہے، میں چلنے کو تیار ہوں۔“ فرحان نے کہا۔

☆☆☆

وہ لوگ تین گاڑیوں میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ فرحان زخمی ہونے کے بعد دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ وہ دلاور کو شاہ جی کے ٹھکانے پر لے جارہا تھا۔ شاہ جی کے ٹھکانے کے بارے میں بہت پہلے اسے کرائم رپورٹر ناصر نے بتایا تھا۔ فرحان شہر کے مختلف چھوٹے بڑے گینگز پر ایک پروگرام بھی کرنے والا تھا لیکن وہ پروگرام کسی نہ کسی وجہ سے ٹلتا رہا تھا۔
تقریباً ایک گھنٹا چلنے کے بعد وہ ملیر کے ایک فارم ہاؤس کے سامنے کھڑے تھے۔
”یار! تو اس ویرانے میں ماسٹر پرنٹ لینے آیا ہے یا پکنک منانے؟“ دلاور نے جھنجلا کر کہا۔ ”یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں، بالکل سناٹا ہے۔“
”یہاں کے لوگ باہر والوں کو نظر نہیں آتے۔ میں نے تمہیں ماسٹر پرنٹ کا پتا بتا دیا ہے، اب اسے وصول کرنا تمہارا کام ہے۔“
”ابے تو کیا اِن درختوں یا پودوں سے وصول کروں؟“ دلاور بپھر کر بولا۔
”کون ہو تم لوگ؟“ اندر سے ایک گونج دار آواز آئی لیکن بولنے والا ان کے سامنے نہیں آیا۔
”میں کون ہوں؟“ دلاور نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ”میں وہ ہوں جس سے مخالف ہوا بھی کترا کر گزرتی ہے۔ سامنے آکر مردوں کی طرح بات کر۔ اندر سے کیا عورتوں کی طرح میں میں کررہا ہے۔“
اسی وقت اندر سے شاہ جی اور اس کے کچھ آدمی نمودار ہوئے۔
”کون ہے بے تو؟“ شاہ جی نے پوچھا۔ ”اور یہاں کیوں مرنے آگیا ہے؟“

''تو.....تو مجھے نہیں جانتا؟'' دلاور نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''وہ ماسٹر پرنٹ مجھے دے دے۔''

''کون سا ماسٹر پرنٹ؟ دفع ہو جا یہاں سے۔'' شاہ جی چیخ کر بولا۔

دلاور نے اچانک پسٹل نکال کر شاہ جی کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ ''ماسٹر پرنٹ دے گا یا میں گولی تیرے بھیجے میں اتار دوں؟'' دلاور نے کہا۔

''تو.....تو مجھ سے ماسٹر پرنٹ لے گا، تو؟''

''یار جھگڑا کیوں کرتے ہو، ماسٹر پرنٹ دلاور کے حوالے کردو اور جھگڑا ختم کرو، سمپل۔'' فرحان نے کہا۔

''ابے کون سا ماسٹر پرنٹ اور تو پھر میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے آ گیا۔ میں نے تجھے وارننگ دی تھی نا، اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔''

''ابے، لڑکے کو ہاتھ مت لگانا۔''

''دیکھا دلاور بھائی۔'' فرحان نے کہا۔ ''کیسی اس کی نیت خراب ہوئی۔ یہ تو سرے سے ماسٹر پرنٹ کے وجود سے ہی مکر گیا۔''

''ابے کون سا ماسٹر پرنٹ؟'' شاہ جی نے کہا۔ ''پہلے میں تجھے خاموش کردوں، پھر ان لوگوں سے نمٹوں گا۔'' اس نے اپنی گن سیدھی کر کے فرحان کا نشانہ لیا۔ فائر کا دھماکا ہوا لیکن فرحان کو کچھ نہیں ہوا۔ گولی شاہ جی کے ایک آدمی کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔

فرحان جانتا تھا کہ اب یہاں بہت خوفناک فائرنگ ہوگی۔ فرحان بہت پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ اسی لمحے وہاں فائرنگ شروع ہو گئی۔ دونوں گینگ اپنے اسلحے اور قوت کا بھرپور استعمال کر رہے تھے۔

اچانک ایک گولی شاہ جی کی کھوپڑی میں پیوست ہو گئی۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح آگے پیچھے ڈولا، پھر اس نے گردن ڈال دی۔ اس کے بعد دونوں گینگز میں دھواں دھار فائرنگ شروع ہو گئی۔

چند منٹ بعد وہاں کراہتے ہوئے زخمیوں اور لاشوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

فرحان نے دلاور کو تلاش کیا تو اس کی لاش چند قدم کے فاصلے پر پڑی تھی۔ فرحان نے اس کی جیب سے وہ یو ایس بی نکال لی جس کے فرضی ماسٹر پرنٹ کی خاطر نہ صرف اس کی بلکہ بہت سے لوگوں کی جان گئی تھی۔ فرحان کو بھی ... اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال اچانک اتنی سنگین ہو جائے گی۔

وہ بوجھل قدموں سے باہر کی طرف لپکا۔ آبادی وہاں سے بہت دور تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہاں تک فائرنگ کی آواز سن نہ گئی ہو۔ وہ اب جلد از جلد وہاں سے نکلنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت محتاط تھا۔ باہر جو دلاور کی گاڑیاں تھیں۔ ان میں دلاور کا کوئی آدمی ہو سکتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر موقع ملا تو دلاور کی کوئی گاڑی لے کر وہاں سے نکل جائے گا۔ اس کی اپنی گاڑی تو وہاں تھی نہیں۔

اچانک سیل فون کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ چونک اٹھا۔ گھنٹی کی رِنگ ٹیون بالکل فرحان کے سیل فون کی طرح تھی۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنی جیب پر ہاتھ مارا لیکن اس کا سیل فون موجود نہیں تھا۔ گھنٹی کی آواز وہاں پڑے ہوئے ایک زخمی کے سیل فون کی تھی۔ شاید وہ بے ہوش تھا یا مر چکا تھا۔ سیل فون اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ فرحان نے سیل فون اٹھا کر اس کا بٹن دبایا اور کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف والا شاید بہت عجلت میں تھا۔ اس نے جو کچھ کہا اسے سن کر فرحان صدمے سے گنگ ہو کر رہ گیا۔ وہ بولنے والے کی آواز پہچان گیا تھا۔

اس نے سیل فون وہیں پھینکا اور دیوانہ وار وہاں سے باہر نکلا۔ وہاں دلاور کی گاڑیاں موجود تھیں لیکن ان میں کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ فرحان نے محتاط انداز میں ایک گاڑی کے اندر جھانکا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ فرحان نے دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا پھر اس نے بہت تیزی سے گاڑی کا اگنیشن ڈائریکٹ کیا اور گاڑی لے کر وہاں سے نکل گیا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا نزدیکی دوست بھی ایسا کر سکتا تھا۔

اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ دو دفعہ وہ سامنے سے آتے ہوئے ایک ٹرالر اور ٹرک سے ٹکراتے بچا۔ اس کے ذہن میں سیل فون پر سنائی دینے والا جملہ گونج رہا تھا۔ ''فرحان کو زندہ مت چھوڑنا، کسی بھی قیمت پر نہیں۔''

اس نے گاڑی اسٹار گیٹ کے پاس چھوڑ دی اور وہاں سے ٹیکسی کے ذریعے اپنے مطلوبہ بنگلے تک پہنچا، گھر میں کوئی نہیں تھا۔ فرحان عقبی دیوار کودا اور ایک کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ سیدھا اس شخص کے بیڈروم میں پہنچا اور اس کی ٹیبل کی تلاشی لی۔ دراز کے سب سے نچلے خانے میں اسے دو تین اخبارات اور میگزین ملے جن سے الفاظ کاٹے گئے تھے۔ فرحان کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو گیا۔ اس کا شبہ یقین میں بدل گیا تھا۔ اس نے کپڑوں کی الماری کھولی تو وہ ایک ٹی شرٹ دیکھ کر پھر چونکا۔ اس کی پشت پر جلی حروف سے نیویارک لکھا ہوا تھا۔

الماری کی اندرونی دراز سے چند فوٹوگراف اور ایک ڈائری اس کے ہاتھ لگی۔ فوٹوگراف میں کومل اور شیراز مسکرا رہے تھے۔ اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ وہ شیراز ہی تھا جو اسے سیل فون پر قتل کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ فرحان نے اس کی آواز پہچان لی تھی لیکن اس کا ذہن کسی بھی طرح سے یہ تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ شیراز اس کا دشمن ہو سکتا ہے۔ میگزین اور اخبارات کے کٹے ہوئے حروف اور اس سے بڑھ کر نیویارک والی مخصوص شرٹ دیکھ کر اسے یقین آ گیا تھا کہ شیراز نہ صرف اس کی جان کا دشمن تھا بلکہ اس نے شمسہ کی جان بھی لی تھی۔

ایک تصویر صرف کومل کی تھی۔ اس کے پیچھے شیراز نے لکھا تھا۔ ”جان سے زیادہ پیاری کومل جسے میں ایک دن اپنا بناؤں گا۔“

فرحان نے اس کی ڈائری کھولی اور وہ تاریخ نکالی جس دن شمسہ قتل ہوئی تھی۔ شیراز نے لکھا تھا۔ ”میری جان کومل نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس کے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی اس کے راستے کی دیوار گرا دوں۔ میں بھی اب انتظار سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں اس کا راستہ صاف کروں گا، پھر اسی طرح اپنا راستہ بھی صاف کرلوں گا اور کومل میری ہوگی۔ اس کی ساری دولت میری ہوگی۔

فرحان کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ شیراز نے دوست بن کر اس کی شمسہ کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ حیرت تو اسے کومل پر تھی۔ وہ تو فرحان کی محبت کا دم بھرتی تھی۔ وہ بھی اتنی سفاک ہو سکتی تھی کہ کسی کی جان لے سکے اور اس دلاور اور آرائین فارما سے کومل اور شیراز کا کیا تعلق تھا؟

اچانک باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی تو فرحان چونک گیا۔ اس نے تمام تصویریں اور ڈائری دوبارہ الماری میں رکھیں اور لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔

شیراز نے دروازہ کھولا اور گنگناتا ہوا آگے بڑھا۔ اچانک اس کی نظر فرحان پر پڑی تو وہ اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا۔ یہ کیفیت چند لمحے رہی پھر فوراً ہی وہ سنبھل گیا اور زبردستی مسکرا کر بولا۔ ”فرحان! تم کب آئے؟“

فرحان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس اُسے گھورتا رہا۔

”کیا بات ہے فرحان؟“ شیراز نے پوچھا پھر چونک کر بولا۔ ”تم گھر پر بھی نہیں تھے، آفس میں بھی نہیں تھے پھر......“

”اداکاری مت کرو شیراز۔“ فرحان نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں کہاں تھا؟“

”ارے یار، میں واقعی نہیں جانتا کہ تم کہاں تھے۔“ شیراز نے کہا۔

”بکواس مت کرو، تم اچھی طرح جانتے تھے کہ میں کہاں ہوں۔“ فرحان چیخ کر بولا۔

”ہیلو۔“ شیراز نے کہا۔ ”مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرو۔ دوستی میں بے تکلفی کی بھی ایک حد ہی اچھی لگتی ہے۔“

”دوستی۔“ فرحان چیخ کر بولا۔ ”تو دوستی کی بات کر رہا ہے حرام زادے، آستین کے سانپ۔“ فرحان نے آگے بڑھ کر شیراز کی گردن دبوچ لی۔

”میری گردن چھوڑو۔“ شیراز نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اور آرام سے بات کرو، ورنہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

فرحان نے اس کی گردن چھوڑنے کے بجائے مزید قوت سے دبائی تو شیراز گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ ”میری گردن چھوڑو ورنہ......“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک دم پسٹل نکالا اور فرحان کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

فرحان نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

”اب دفع ہو جا یہاں سے ورنہ میں تیری کھوپڑی میں اس پسٹل کی تمام گولیاں اتار دوں گا۔ میں تیرا......“

فرحان نے اچانک لات ماری اور پسٹل شیراز کے ہاتھ سے نکل گیا۔ فرحان نے جھپٹ کر پسٹل اٹھا لیا اور بولا۔ ”گھٹیا آدمی، تو خود کو میرا دوست کہتا ہے اور وہاں راجا کو یہ حکم دے رہا تھا کہ فرحان کو زندہ مت چھوڑنا۔“

”کون راجا؟“ شیراز نے پوچھا۔

”دلاور کا آدمی۔“ فرحان نے کہا۔ ”تیرے کالے کرتوتوں کے کئی ثبوت میرے پاس ہیں، دیکھے گا؟“ فرحان نے شیراز کی کلائی پکڑ کر اسے بیڈروم کی طرف گھسیٹا۔ پھر دراز کھول کر وہ میگزین اور اخبارات نکال لیے جن میں سے حروف کاٹ کر فرحان کے لیے خط بنایا گیا تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”میں نہیں جانتا کہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔“ شیراز نے کہا۔

فرحان نے الماری کھولی اور ٹی شرٹ نکال کر شیراز کے سامنے ڈال دی۔ ”اس ٹی شرٹ کو پہچانتے ہو؟“

”ایسی ہزاروں ٹی شرٹس مارکیٹ میں ملتی ہیں۔“

”میرے پاس جو ویڈیو ہے اس میں یہی ٹی شرٹ ہے جس میں کمر کے پاس دائیں جانب چھوٹا سا ایک سوراخ ہے، جیسا عموماً سگریٹ سے جلنے پر پڑ جاتا ہے۔ اس ٹی شرٹ میں بھی ٹھیک اسی جگہ ایک سوراخ ہے۔“

شیراز کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"اور دیکھے گا؟" فرحان نے کہا اور الماری سے اس کی ڈائری نکال لی اور وہ صفحہ نکال کر بولا۔ "یہ تیری ہی تحریر ہے نا؟"

"ہاں، یہ میری ہی تحریر ہے۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔" شیراز نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تو نے میری بیوی کا خون کر دیا۔ تُو اسے بھابی کہتا تھا نا؟"

"میں نے کہا نا کہ کومل کی محبت نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔"

"تیرا اور کومل کا دلاور سے کیا تعلق ہے؟"

"تم کیسے جرنلسٹ ہو؟" شیراز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آرائین کمپنی میں میجر شیئر یعنی سکسٹی پرسنٹ کومل کے باپ کا ہے۔ کومل کا اس بزنس سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن وہ دلاور کے بارے میں جانتی تھی۔ اس نے ایک دفعہ پہلے بھی شمسہ کو دلاور کے ہاتھوں قتل کرانا چاہا تھا لیکن شمسہ بچ نکلی تھی۔ نیویارک جانے سے پہلے کومل نے کہا تھا کہ تمہاری واپسی تک شمسہ کو ہر قیمت پر موت کی نیند سلا دینا۔ میں دلاور کے لیے کام کرتا تھا۔ مجھے موقع مل گیا اور میں نے شمسہ کو......" وہ بولتے بولتے ایک دم خاموش ہو گیا۔ اس کی نظریں دروازے پر تھیں۔

فرحان نے گھوم کر دیکھا۔ وہاں کومل کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں نے شیراز کی تمام باتیں سن لی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ محبت، ایسی چیز نہیں ہے جسے بازار سے خریدا جا سکے یا چرایا جا سکے۔"

"محبت۔" فرحان زہریلے لہجے میں بولا۔ "یہ محبت نہیں خودغرضی ہے، ہوس ہے۔ یہ کیسی محبت ہے کہ تم نے ایک انسان کی جان لے لی۔"

"میں نے کہا نا کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔" کومل نے کہا۔

"تم اگر دل کے ہاتھوں مجبور تھیں تو میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔" فرحان نے کہا۔ "میرے دل نے تمہیں اور تمہارے اس کارندے کو سزائے موت دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہی موت جو تم لوگوں نے شمسہ کو دی، حامد کو دی، اسکول کی اس پرنسپل کو دی، عابد کو دی، سی ڈی شاپ والے بلال کو دی۔" عابد اور بلال کے نام فرحان نے جان بوجھ کر لیے تھے۔

"عابد اور بلال کو بھی میں نے کومل ہی کے حکم پر ختم کیا تھا۔"

"اسے حکم دو کہ یہ اپنے گلے پر چھری پھیرے۔" فرحان نے کومل سے کہا۔ "لیکن یہ تمہارا ایسا کوئی حکم نہیں مانے گا۔ تم سے زیادہ اسے اپنی زندگی سے پیار ہے لیکن میں خود کو حکم دے چکا ہوں کہ تمہیں قتل کر دیا جائے۔ تم جیسے لوگ تو صرف قزاق ہوتے ہیں، میں قزاقِ اجل ہوں۔ دل تو چاہ رہا ہے میں تم دونوں کو تڑپا تڑپا کا ماروں لیکن......"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ شیراز نے اس پر چھلانگ لگائی تھی اور اس کا پسٹل والا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

شیراز نے دوسرا جھٹکا دیا تو پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ وہ دونوں لڑتے ہوئے فرش پر آ گرے۔ شیراز نے بیڈ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور اچانک برف توڑنے والا نکیلا سُوا نکال لیا۔

"اسی قسم کا سُوا تھا جس سے میں نے شمسہ کو مارا تھا۔ اب تجھے بھی شمسہ کی طرح ماروں گا۔" اس نے فرحان پر وار کیا۔ فرحان عین وقت پر کھڑا ہو گیا۔ سُوا اس کے سینے کے بجائے ران کا گوشت ادھیڑتا ہوا نکل گیا۔ فرحان لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دوسرا وار پوری قوت سے کیا۔ فرحان اچانک دوسری طرف قلابازی کھا گیا اور لوہے کا نکیلا سُوا کومل کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کے شیراز کو دیکھا۔ پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل سے شیراز پر یکے بعد دیگرے تین فائر کیے اور خود بے دم ہو کر گر گئی۔

فرحان اس پر جھک گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

"فرحان...... مم...... مجھے...... معاف...... کر دینا، میں نے......" اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

اسی وقت جاوید کمرے میں داخل ہوا اور کمرے کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ فرحان کا زخم بھی خاصا گہرا تھا۔ اس کے جسم سے بہت تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ جاوید نے فرحان کو بیڈ پر لٹا دیا اور اس کا زخم صاف کر کے فوری طور پر اس پر تولیا لپیٹ دیا۔

پھر اس نے دو فون کیے۔ ایک ایمبولینس کے لیے اور دوسرا پولیس کو۔

☆☆☆

دوسرے دن کے اخبارات اور ٹی وی چینلز پر ایک ہی بریکنگ نیوز تھی۔ K-24 چینل کے سی ای او آغا صاحب کو ایف آئی اے نے حراست میں لے لیا ان پر جعلی دوائیں بنانے اور عوام کی زندگیوں سے کھیلنے کا الزام تھا۔

فرحان نے اسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے یہ خبریں سنیں اور آسودگی سے آنکھیں موند لیں۔